۱۹۶۷ء
ج ۱، شمارہ ۱-۴

# تحریر

## علمی مجلس دِلّی کا تماہی رسالہ

1



مرتبہ:
مالک رام

شعرائے اردو کے تذکرہ کا کچھ ڈھنگ ڈالا تھا غرض اس نے نئی صورت پکڑ لی تھی کہ (۱۲۰۱ ہجری و ۱۷۸۶ء و ۱۷۸۷ء) میں حیات مستعار باقی نہ رہی اور یہ مسودہ امام بخش کشمیری کے ہاتھ لگ گیا اس نے بے خوف و خطر اپنے نام سے مشہور کیا۔

تذکرہ امام بخش کشمیری [۳۱] اس تذکرہ کا بیان فقط مصحفی کے تذکرہ میں دیکھنے میں آیا اور اس سے بھی نہ کچھ تذکرہ نہ مصنف کی کیفیت حقیقت اچھی طرح معلوم ہوئی۔ مصحفی فقط یہ لکھتا ہے کہ امام بخش نے فقط جہاں دار کی تصنیف سے سرقہ نہیں کیا بلکہ میری تصنیفات سے بھی اس نے بہت کچھ چرایا ہے۔ مصحفی کے

---

مجموعۂ سخن دو حصے لکھنؤ میں چھپے ہیں پہلے حصے میں ۱۰۸ صفحے دوسرے کے ۸۸ صفحے۔

مجموعۂ واسوخت معروف بہ شعلۂ جوالہ۔ دو جلدیں ضخیم منشی نول کشور نے چھاپا ہے۔

سخن شعرا [۳۲] عبد الغفور خاں نساخ۔

قطعۂ منتخب۔ نساخ نے قطعات جمع کیے ہیں ۱۰۶ صفحہ پر چھپا ہے۔

گلشن ہمیشہ بہار [۳۳] ۱۲۷۱ھ

بزم سخن۔ ۳۴

نگارستان سخن [۳۵] ۲۰۸ (صفحے)

شمع انجمن [۳۶] ۱۲۹۹ ۱۲۹۲ (۵۴۴ صفحے)

طور کلیم۔ ۱۵-۱۲۴ (لندا) (۱۰۱ صفحہ)

صبح گلشن [۳۷] (۶۴۹ صفحے)

روز روشن [۳۸] (۸۶۸ صفحے)

شعرائے ہنود [۳۹] تذکرہ ہنود۔ بشاش (۲۰۴ صفحے)

تذکرہ ضیغم [۴۰] ۱۳۰۳ جہانگیر آبادی (۵۰۴ صفحے)

تذکرہ غنچہ ارم [۴۱] ۔ بخت علی ۸۰ مطبع کلکتہ

آب حیات [۴۲] مولانا آزاد ۵۶۰ صفحے ۱۲۹۰ (?)

انتخاب یادگار [۴۳] منشی امیر احمد ۱۲۸۷ شعرائے رام پور کے حال میں ہے

# علمی مجلس دلی

## مقاصد

۱ - اُردو میں علمی، ادبی، لسانی و تہذیبی موضوعات سے متعلق تحقیق

۲ - غیر مطبوعہ متون کی تلاش اور طباعت کا انتظام

۳ - علمی اور تحقیقی کتابوں کی اشاعت

۴ - ایک تماہی علمی اور تحقیقی رسالے کا اجرا

۵ - ایک بنیادی کتاب خانے کا قیام

۶ - دوسرے تحقیقی کام کرنے والے اداروں اور افراد سے رابطہ اور تعاون۔

علمی مجلس

۱۴۲۹، چھتہ نواب صاحب

فراشخانہ۔ دہلی

# تحریر

## علمی مجلس دلی کا سہ ماہی رسالہ


سالانہ ۱۲ روپیہ — مرتب
اس شمارہ کی قیمت ۵۰ر۳ روپے — مالک رام

جلد ۱ — ۱۹۶۷ء — شمارہ ۱


فہرست

[illegible]

[illegible]

# تعارف

اردو میں علمی تحقیق ابھی ابتدائی مراحل میں ہے اور اس پر اتنی توجہ نہیں دی
یہ مستحق ہے۔ جب تک کسی زبان میں اعلیٰ پایے کی علمی اور تحقیقی کتابیں نہیں
اس کا وقار قائم نہیں ہوسکتا۔ ہمارے ہاں ایسے رسالے جو صرف تحقیقی مو
کے لیے وقف ہوں، گویا ناپید ہیں۔ یاد رہے کہ اگر تعلیم کے نتیجے میں سچائی
صحیح جذبہ پیدا نہیں ہوتا، تو ہمارا علم بے مصرف ہے؛ اسی طلب کا دو
تحقیق ہے۔

پچھلے سال آل انڈیا اورئینٹل کانفرنس کا اجلاس اکتوبر کے اواخر میں علی
ہوا تھا۔ میں نے اس کے شعبۂ اردو کے خطبۂ صدارت میں اردو میں تحقیقی
متعلق اپنے خیالات کا قدرے تفصیل سے اظہار کیا، اور توجہ دلائی کہ
علمی اور تحقیقی رسالوں کی افسوسناک حد تک کمی ہے۔ بعد کو خیال آیا کہ محض
کر دینے سے حاصل! گفتار کا غازی تو ہر کوئی بن سکتا ہے، کیوں نہ کچھ کام
چنانچہ میں نے بعض احباب سے فرداً فرداً مشورہ کیا۔ سب نے بالاتفاق کہا کہ ا

ہے کی اشد ضرورت ہے۔ بالآخر ایک جلسہ بلایا گیا، جس میں یہ اصحاب موجود تھے:
لی جواد زیدی، جگن ناتھ آزاد، گوپی چند نارنگ، سید امیر حسن عابدی، عابد رضا بیدار
سید اوصاف علی، اکبر علی ترمذی، تنویر احمد علوی، نعیم احمد، ظل عباس عباسی
الک رام۔
طے پایا کہ علمی مجلس کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جائے اور اس کی طرف سے
یک تماہی رسالہ شائع ہو۔ 'علمی مجلس' کے اغراض و مقاصد کی تفصیل آپ کو اسی
شمارے میں کسی اور جگہ ملیگی۔
ہم چاہتے ہیں کہ اردو میں تحقیقی کام کرنے والے اصحاب اور اداروں سے تعاون کر کے
یسی چیزیں منظر عام پر لائیں، جن سے واقعی زبان کے سرمایے میں اضافہ ہو اور اس کا
معیار بلند ہو۔ کام بہت ہے، اور کام کرنے والے تھوڑے ہیں۔ ضرورت اس بات کی
ہے کہ ہر ایک شخص کو اپنی صلاحیتوں کے مطابق کچھ مفید کام کرنے کا موقع دیا جائے۔
علمی مجلس، کا قیام اور تماہی 'تحریر' کا اجرا اسی مقصد کے حصول کے لیے ایک عملی
اقدام ہے۔
ناظرین کو یہ معلوم کر کے خوشی ہوگی کہ 'علمی مجلس' کی پہلی کتاب تذکرہ گلشن ہند مولفہ
سید حیدر بخش حیدری شائع ہو گئی ہے۔ یہ تذکرہ آج تک شائع نہیں ہوا تھا، بلکہ بہت کم
لوگوں کو اس کا علم بھی تھا۔ اسے ڈاکٹر مختار الدین احمد (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) نے
آکسفورڈ اور برٹش میوزیم کے دو مخطوطوں کی مدد سے مرتب کیا ہے۔
اس شمارے میں ایک مضمون "غبار خاطر" کے عنوان سے شامل ہے۔ جیسا کہ بعض احباب
کو معلوم ہوگا، میں ساہتیہ اکادیمی کی طرف سے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی تمام تحریروں
کی ترتیب و تدوین کا کام کر رہا ہوں۔ اس سلسلے میں مولانا آزاد کی کتاب غبار خاطر
شائع ہو گئی ہے۔ یہ مضمون میرے مرتبہ نسخے کے مقدمے کا ایک حصہ ہے اور اسے
ساہتیہ اکادیمی کی اجازت سے یہاں شامل اشاعت کیا گیا ہے۔
انسان کوشش کی حد تک آزاد ہے، البتہ ارادے اور عزم میں خلوص ہونا چاہیے۔ اس کام کا آغاز ہم نے

کوتاہیوں اور وسائل کی کمی کے احساس کے باوجود پوری ذمہ داری سے کر رہے ہیں۔ ہم کوشش کریں گے کہ پرچہ کا معیار بڑھے تاکہ ہم اسے اپنی زبان کے شایانِ شان کر سکیں۔ دعا ہے کہ خدا اسے کامیابی اور قبولِ عام کا درجہ عطا فرمائے۔ آمین!

مالک رام

سید مسعود حسن رضوی ادیب

# کرم علی مرثیہ گو

## برادرِ فضلی مصنّفِ کربل کتھا

### مختصر تعارف

کربل کتھا کے مصنّف فضل علی فضلی کے چھوٹے بھائی کرم علی اپنے عہد کے ایک بڑے مرثیہ گو تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ زیادہ تر مرثیے کہتے تھے، دوسرے اصنافِ سخن بالخصوص صنفِ غزل میں ان کا کلام نہیں تھا یا بہت کم تھا۔ اس وجہ سے تذکرہ نویسوں نے دوسرے بلند پایہ مرثیہ گویوں کی طرح ان کا بھی ذکر نہیں کیا ہے۔ انھوں نے کثیر تعداد میں سلام اور مرثیے کہے، جن کا ایک ضخیم مجموعہ میرے کتب خانے میں موجود ہے۔ یہ اُن کے بعد کے کلام پر مشتمل ہے، اس سے پہلے وہ بہت سے مرثیے کہہ چکے تھے جیسا کہ بعض مرثیوں کے عنوانوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ ایک مرثیے کا عنوان ہے: "مرثیۂ دیگر از فکرِ قدیم کہ داخلِ ایں نسخہ گردید" اور ایک مرثیہ کا عنوان ہے، "مرثیۂ دیگر از مرثیہ ہائے قدیم"۔
اس مجموعے میں کرم علی نے سلاموں اور مرثیوں کو ردیف وار دیوان کی صورت میں مرتب کر دیا ہے۔ اس میں کئی مربّع مرثیے ہیں، جن پر یہ عنوان ملتا ہے: "مراثی چار مصرعی از دیوانِ مرتّع المصائب"۔ یہ عنوان بتاتا ہے کہ موجودہ مجموعے سے پہلے کرم علی اپنے مرثیوں کا دیوان مرتّع المصائب کے نام سے مرتب کر چکے تھے۔
کرم علی تخلّص کی جگہ اپنا پورا نام لاتے ہیں، اور کرم اور علی کو دو مستقل لفظوں کے طور پر لے آنا بھی کافی سمجھتے ہیں مثلاً کرم سے علی کے مجھے ہے امید، کرم مرتضیٰ علی ولی،

## کرم علی مرثیہ گو

یا علیؑ حشر میں کر اپنا کرم"۔ ان دو لفظوں میں سے کسی ایک کو تنہا تخلص کے طور پر کبھی نہیں لاتے ہیں۔

اس مجموعے کی ابتدا فاتحوں سے ہوتی ہے جن کی تعداد ڈیڑھ درجن کے قریب ہے؛ یہ بیشتر فارسی نظم میں ہیں۔ ان فاتحوں میں سے ایک بادشاہِ دیں پناہ محمد عالمگیر ثانی کی سلامتی کے لیے، ایک نواب جلال الدین حیدر کی سلامتی کے لیے، ایک عشرۂ محرم کے بعد مرشدآباد میں اور ایک قیام الہ آباد کے زمانے میں کہا گیا۔ اس سلسلے میں یہ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہاں "فاتحہ" سے کیا مراد ہے۔ مجالسِ عزا میں پہلے ایک نظم پڑھی جاتی تھی، جس میں حاضرین سے خواہش کی جاتی تھی کہ انبیا، ائمہ اور شہدا کی ارواح کو ایصالِ ثواب کی غرض سے، یا بانیِ مجلس، حاضرینِ مجلس اور جملہ عزاداران حسینؑ کو افکار و آلام سے نجات دلانے کے لیے، یا خود اپنی حاجت روائی کے واسطے، اور کبھی کبھی بادشاہِ وقت یا کسی وزیر و امیر کی سلامتی اور دولت و اقبال کی ترقی کے لیے سورۂ فاتحہ اور سورۂ اخلاص پڑھیں۔ پھر ایسی نظم کو بھی فاتحہ کہنے لگے۔ کرم علی نے فاتحے بہت سے کہے ہیں جو زیادہ تر فارسی میں ہیں۔ یہ منظوم فاتحہ پڑھنے کا طریقہ اب تقریباً ختم ہو گیا ہے۔ اب ذاکر منبر پر جا کر خوانندگی شروع کرنے سے پہلے لفظ "فاتحہ" ذرا بلند آواز سے کہتا ہے، جس پر حاضرینِ مجلس ہاتھ اٹھا کر سورۂ فاتحہ پڑھ دیتے ہیں۔

اس مجموعے میں فاتحوں کے بعد چھیاسٹھ سلام اور سلاموں کے بعد ایک سو بارہ مرثیے ہیں۔ اکثر سلاموں اور مرثیوں کے عنوان فارسی نثر میں لکھے گئے ہیں۔ جن سے کرم علی اور ان کی مرثیہ گوئی کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو جاتا ہے۔ یہ تعارفی مضمون لکھتے وقت ان عنوانوں پر ایک سرسری نظر ڈالی گئی ہے۔ لیکن وہ جس تحقیق و تفتیش کے طالب ہیں، اس کے لیے کافی محنت کی ضرورت ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ کرم علی شاہی ملازم تھے اور ملازمت کے سلسلے میں ان کا قیام مرشدآباد اور الہ آباد میں بھی رہا تھا۔ شاہ عالم بادشاہ اپنی سلطنت کی ابتدا میں

## کرم علی مرثیہ گو

جب دارالخلافت میں وارد ہوئے تو کرم علی بھی ان کے حکم سے دہلی پہنچے۔ ایک مرتبہ بنگالے سے واپس ہو کر محرم کی پانچویں تاریخ کو دہلی پہنچے۔ اثنائے سفر میں ایک سلام کہا جو دہلی پہنچ کر ایک مجلسِ عزا میں پڑھا۔ اس سلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے سال محرم کے مہینے میں وہ دہلی میں نہیں تھے۔ اہل و عیال کی جدائی اُن کو بہت شاق تھی۔ وہ کربلا جانا چاہتے تھے، مگر انگریزوں نے انھیں جانے کی اجازت نہیں دی۔ ہندوستان میں قیام اُن کے لیے ذلت و خواری کا باعث تھا۔ وہ کربلا کی زیارت اور زادِ سفر کی فراہمی کے لیے دعا کے طالب تھے۔ یہ سلام ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:

سلام کرنے پھر آیا ہے یہ غلام قدیم — امیدوار تفضّل کا ہو ز لطفِ عمیم
سلام تجھ پہ سزاوار، اے نبیؐ کے جگر! — درود تجھ پہ ہے شایاں ز کردگارِ قدیم
یہ غیر حاضرِ سالِ گزشتہ پُر تقصیر — گناہگار ترا ہے اے حکمرانِ جحیم
سواب رضا ہے تری بخش یا عقوبت کر — مجھے تو کچھ نہیں چارہ رہا بجز تسلیم
رکھا ہے مجھ کو پریشانی اب سدا بیمار — مرے مرض کا خدا نے تجھے کیا ہے حکیم
چھڑائے مجھ ستی قسمت نے میرے اہل و عیال — رکھا ہے مجھ کو اکیلا بغیر یار و ندیم
جو کربلا کو ہوں جاتا، تو راہ نہیں پاتا — کہ سدِّ راہ ہوئے ہیں فرنگیانِ لئیم
وگر یہاں ہی ہوں رہتا، تو ہوں ذلیل و خوار — بس اب میں کیا کروں اے گوشوارِ عرشِ عظیم!
امیدوار ہوں فریاد میری کا انصاف — کر اپنے لطف سوں، یا شاہِ واجب التعظیم
پڑھو اے مومنو! اک فاتحہ برائے خدا — کہ جورِ چرخ سے پاوے نجات مجھ سا سقیم
ہو کربلا کی زیارت شتاب مجھ کو نصیب — رہے نہ زادِ رہِ کربلا کا دل پہ بیم

کرم علی نہ کر اب عرضِ حال، رہ خاموش
کہ ہے یہ شرطِ ادب اور قواعدِ تکریم

ایک سلام کے عنوان سے معلوم ہوتا ہے کہ کرم علی کو کربلا کی زیارت کی جو تمنا تھی، وہ آخرکار پوری ہو گئی۔ اس سلام کے چند شعر مع عنوان ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

# کرم علی مرثیہ گو

"ذکرِ ایں سلام طول دارد۔ مختصر ایں کہ در مرضے مہلک شفا شد و ظہورِ معجزہ گردید، بکربلا رسیدم"۔

(ترجمہ: اس سلام کا ذکر طول رکھتا ہے۔ مختصر یہ کہ ایک مہلک مرض سے شفا ہوئی اور معجزہ ظاہر ہوا۔ میں کربلا پہنچ گیا۔)

حضرتِ عباسؑ، اے دیں کے علمدار السّلام! — کربلا کے دشت کے مظلوم بے یار، السّلام!

اے حسینؑ ابنِ علیؑ کے بیکسی کے ہم سفر — اے سکینہؑ تشنہ لب کے غم گسار، السّلام!

اے امیر المومنین حیدرؑ کے فرزندِ عزیز — اے جہاں میں یادگارِ شیرِ جبّار، السّلام!

اے دعائے سیفی و حرزِ سپاہِ تشنگاں — اے ریاضِ گلشنِ ایماں کے گلزار، السّلام!

اے گلِ عبّاسیِ بستانِ فردوسِ بریں — اے امامت کی صدف کے دُرِّ شہوار، السّلام!

تجھ کو سب قدرت دیے حق نے، جو چاہو سو کرے — وصف تیرے کو نہیں حاجت بہ تکرار، السّلام!

یہ غلامِ آزار مند اور خستۂ جورِ فلک — تجھ جناب پاک میں کہتا جو ہر بار، السّلام!

دے شفا اس کو مرض سے اور چھڑا اس درد سے — ایسے کاموں کو ترا عالی ہے دربار، السّلام

اپنے بھائی کے تصدّق سے نہ رکھ اب ناامید — تجھ بن اس کا کوئی نہیں جگ میں خریدار، السّلام

ہو کرم اس پر علیؑ کا جو کہے از صدقِ دل
حضرتِ عباسؑ اے دیں کے علمدار السّلام!

کرم علی کا ایک سلام جو انھوں نے بقولِ خود "اولِ فکر و صغرِ سن" میں کہا تھا اور اسے انھوں نے تیمناً بدونِ اصلاح و نظرِ ثانی اس مجموعے میں شامل کر دیا ہے یہ سلام ہے۔ ان کے ابتدائی کلام کا نمونہ ہے، جوں کا توں ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:

محبّاں! کہو مصطفےٰؐ پر سلام — پھر اس بعد شبیرِ خدا پر سلام

بہ صدقِ دل و اعتقادِ درست — کہو جگ کی خیر النسا پر سلام

امام حسنؑ خلقِ عالی صفات — حسنؑ سرورِ مجتبا پر سلام

حسینؑ علیؑ شاہِ لب تشنگاں — خداوندِ غم آشنا پر سلام

شہِ عابدیں، نورِ چشمِ آلِ رسولؐ — ستم دیدۂ اقربا پر سلام

# کرم علی مرثیہ گو

محمدؐ کے ہمنام، باقرؑ امام — جگر گوشۂ مصطفےٰؐ پر سلام
شہِ انس و جاں، جعفرؑ دیں پناہ — محبوں کے مشکل کشا پر سلام
کلیم اللہ طورِ عز و شرف — سعادات کے رہ نما پر سلام
مددگارِ درماندگانِ جہاں — شہِ دیں، علی الرضاؑ پر سلام
زکیِ زمانہ، تقیِ جوادؑ — گراں گوہرِ اہتدا پر سلام
علی النقیؑ، قدوۃ المتقین — دو عالم کے حاجت روا پر سلام
حسن عسکریؑ قبلۂ اہلِ دیں — امامت کے کشور کشا پر سلام
شہِ دادگر قاتل المشرکین — قیامت کے صاحب لوا پر سلام

کرم سے علیؑ کے ہوا امیدوار
کہو شافعانِ جزا پر سلام

اگر یہ کرم علی کا پہلا سلام ہے تو ظاہر ہے کہ انھوں نے کافی استعداد اور کافی مشق کے بعد سلام اور مرثیہ کہنا شروع کیا۔

کرم علی کے ایک سلام کا عنوان حسبِ ذیل ہے:۔

"بعد واقعۂ برادر مغفور فضل علی خان مرحوم در استدعاے آمرزش و مغفرتِ اُوشان بفکر آمدہ"

یہ سلام درج کیا جاتا ہے:

عدم میں کہتا ہے فضلی ہو بے حجاب سلام — تری جناب میں اے ابنِ بوتراب، سلام
حصولِ زندگی اتنا ہی تھا اُسے کہ مدام — کہے تھا نادر تری کہ بہ آب و تاب سلام
ہوا ہے ایسی سعادت سے اب وہ بے مقدور — قبول اس سے کرائے معدلت مآب، سلام
کیا ہے صرف وہ عمر اپنی، تجھ محبت میں — مواظبت تھی اسے اے فلک جناب! سلام
تصدق اپنے کئے سر کا یا امام حسینؑ! — کر اپنے فضل ستی اس کا فتح باب سلام
بہارِ عمر خزاں ہو گئی ہے اب اس کی — لحد میں کرتا ہے تو بھی ادا بہ خواب، سلام
وُہ عندلیبِ گلستانِ تعزیت تھا ترا — سوالِ قبر میں دیوے گا وُہ جواب سلام

# کرم علی مرثیہ گو

تری ولا کا سدا بوستان رنگین ہے — سُن اُس غلام کو بھی کر کے باریاب سلام
تری جناب میں سونپا ہے اس کو ہم سب نے — کہ واں پہنچ کے کرے جوں درِ خوش آب سلام
کرم علی کو بھی طالع اگر مدد کرتے
تو پڑھتا ساتھ وُو بھی اُس کے آشتاب سلام

ان اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ فضلی مرثیے اور سلام کہا کرتے تھے اور اس کو اپنی زندگی کا ماحصل سمجھتے تھے۔ ایک بے نقط سلام کے چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

موردِ احکام اسرار السّلام — مصدرِ اولادِ اطہار السّلام
عالمِ علم و عمل، عادل امام — سرور و سردار و سالار السّلام
رہبرِ راہ ہدا معصوم اور — داورِ ارواحِ احرار السّلام
دل کا والا درد کا ماہر کمال — مالکِ املاکِ ادوار السّلام
یہ سلام بے نقط کرم علی!
تجھ بے جانا سزاوار السّلام!

کرم علی نے ندیم، ہوشدار، مسکین، سودا، مرزا احمد علی خان، عبد الجلیل خاں، مرزا ظہور علی پسر مرزا ہوشدار کے مرثیوں کے جواب میں اور ولی اور سراج کی غزلوں کی زمینوں میں مرثیے کہے ہیں۔ ان لوگوں میں مرزا ندیم، مرزا ہوشدار، عبد الجلیل خاں، مسکین اور سودا کے ناموں کے ساتھ "مرحوم" یا "علیہ الرحمۃ" لکھا ہے اور مرزا احمد قلی خان، کے نام کے ساتھ "سلمہ اللہ" اس طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ کرم علی، سودا کے انتقال یعنی ۱۱۹۵ھ کے بعد تک زندہ تھے۔

کرم علی نے متعدد مرثیے مخصوص تاریخوں اور خاص موقعوں پر پڑھنے کے لیے کہے ہیں۔ مثلاً آٹھویں شب، شہادت کی رات، شہادت کی صبح، شہادت کا دن، سویم کا دن، چہلم کا دن، ماتم کے ساتھ علم نکلنے کے وقت، علی اصغر کا گہوارہ مجلس میں لاتے وقت۔

کرم علی کے زمانے میں مرثیہ بالعموم لحن کے ساتھ پڑھا جاتا تھا اور کامل مرثیہ خوان موسیقی سے پوری واقفیت رکھتے تھے۔ کرم علی نے اپنے متعدد مرثیوں کے عنوانوں میں

# کرم علی مرثیہ گو

ان راگ راگنیوں کے نام بھی بتا دیے ہیں جو اُن مرثیوں کے لیے موزوں ہیں۔ مثلاً کانھڑا گوری، ملار، پرج، بھیم پلاس، بھیرویں، شہانہ، آہنگ۔ لیکن اس زمانے میں تحت اللفظ یعنی بلغیر لحن کے مرثیہ پڑھنے کا طریقہ بھی نکل آیا تھا۔ کرم علی سے پیشتر خواجہ عاصمی کے فرزند میر امامی منبر پر تحت اللفظ مرثیہ پڑھتے تھے۔ کرم علی نے بھی اپنے ایک مرثیے کے عنوان میں لکھا ہے کہ یہ مرثیہ روزِ شہادت سے مخصوص ہے اور اس کو منبر پر تحت اللفظ پڑھنا چاہیے۔

فارسی مرثیوں میں سب سے بہتر محتشم کاشی کا مرثیہ "دوازدہ بند" ہے۔ اس کے بعد مقبل اصفہانی کے مرثیے ہیں جو "واقعات" کہلاتے ہیں۔ ان کے لیے مثنوی کی شکل اور ایک بحر مخصوص ہو گئی ہے۔ کرم علی نے ایک واقعہ فارسی میں کہا ہے اور آغا مخلص ایرانی کے ایک "واقعے" کا مضمون اردو میں نظم کیا ہے۔ بحر اس کی بھی وہی ہے، جو "واقعات" کے لیے مخصوص ہے۔

کرم علی کے اس مجموعۂ مراثی میں امام حسینؑ کی مدح میں چوہتر شعر کا ایک قصیدہ بھی ہے، جو "گلشنِ اعجاز" کے نام سے ۱۱۸۹ھ میں کہا گیا تھا۔ اس کی تصنیف کا سال خود مصنف نے ذیل کے شعر میں بتایا ہے:

ہزار و یک صد و ہشتاد و نُہ تھے از ہجرت    کیا جو گلشنِ اعجاز کا میں استشہار

کرم علی کی ایک عزیزہ خاتون جو مجنون ہو گئی تھیں، امام حسینؑ کے اعجاز سے تندرست ہو گئیں۔ کرم علی نے یہ واقعہ تفصیل سے بیان کیا ہے اور اسی واقعے سے متاثر ہو کر یہ قصیدہ امام حسینؑ کی جناب میں پیش کیا ہے۔ اس کا مطلع ہے:

ہوا جو باغِ ولا کا میں ایک دن سیّار    نظر کیا کہ ہر اک طرف ہو رہی ہے بہار

کرم علی کے مرثیوں میں صوری تنوّع بہت ہے۔ یہ مختلف بحروں میں مثنوی، قصیدہ، مستزاد، مثلث، مربع، مخمس، مسدس، ترکیب بند، ترجیع بند، اور دوہرہ بند مثلث کی شکل میں ہیں۔ لیکن مربع مرثیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ کرم علی قصیدہ نما مرثیے کو دو مصرعی اور مربع کو چار مصرعی مرثیہ کہتے ہیں۔ کرم علی کے ایک مرثیے کے

# کرم علی مرثیہ گو

چند بند نقل کیے جاتے ہیں:

(۱) حسینؑ ابن علی رہنمائے راہِ نجات — سرورِ جہان پیمبرؑ ستودہ صفات
سو اس کو ظلم ستی مل کے شامیِ بدذات — کیے شہید ہزاراں جفا ستی، ہیہات!
(۲) روایت ہے کہ جب اشرف ترینِ خلقِ جہاں — ہوا مدینے ستی دشتِ کربلا کو رواں
جب ارضِ ماریہ میں آیا وُہ بلند مکاں — کیے وُہ شامیِ بے دین آ کے اس پر گھات
(۳) حرم کو کر کے تسلّی کہا وُہ سرورِ دیں — کہ صبر سب کرو دکھ میں مرے، ہو پردہ نشیں
مجھے بغیرِ حق اس دم کسی سے کام نہیں — خدا کو میں تمھیں سونپا چھٹا ہمارا سنگات
(۴) یہ کہہ کے رَن میں گیا سبطِ احمدِ مختار — ستم گروں کو مخاطب کیا وہ یکہ سوار
کہ اے گروہِ ستم میں جواب ہوں بے کس و یار — جو رحم مجھ پہ کرو اب، تو پاؤ راہِ نجات
(۵) نظر کرو کہ پیمبرؑ کا میں نواسا ہوں — اور اس جنگل میں سمیت اہلِ بیت پیاسا ہوں
سو قطرہ آب سے اس دم جو میں ترسا ہوں — قریب ہے کہ نہ دیکھوں جہاں میں آج کی رات
(۶) یہ سن کے تب عمرِ سعد شامیوں سے کہا — کہ ہے حسینِ علی اب جو بے کس اور تنہا
سو حملہ ور ہو سبھی اُس اُپر کرو گھیرا — کہ ایسا وقت نہ آئے گا پھر تمھارے ہات
(۷) سُن اس شقی سے وُہ سرگروہِ لشکرِ شام — ہوئے جو حملہ ور اس دم وُہ روسیاہ تمام
کیے ستم ستیں بارانِ تیر بہرِ امام — خدا ستی نہ ڈرے وہ ستم گرِ بدذات
(۸) جب ان لعینوں ستیں ظلم بے شمار ہوا — امامِ کون و مکاں ضعف سے نزار ہوا
گرا زمیں کے اُپر اور بے قرار ہوا — وہ ظلم دیکھ کے روئے جنگل کے جھاڑ اور پات
(۹) پڑا تھا خاک میں لب تشنہ وُہ امامِ زمن — زمیں لیے تھی سر اس شاہِ دیں کا بردامن
فلک لرزتا تھا دیکھ اس کے تئیں بہ رنج و محن — ہوا تھا دشتِ بلا جیسے عرصۂ عرصات

ایک مرثیے کے عنوان سے ہے کہ جب احمد شاہ ابدالی دہلی کو تباہ کر کے قندھار واپس گ[یا] تو کرم علی حوادث میں مبتلا ہو کر دہلی سے دریا پار جا کر شاہ درہ میں مقیم ہو گئے۔ جب وہ یہ مرثیہ کہہ رہے تھے، صفدر جنگ مرحوم کے مقبرے کے ایک عرب قاری سید محمدؒ جن سے مطلق جان پہچان نہ تھی، اپنے کسی کام سے کرم علی کے پاس آئے اور ان ک

دی، جس کا جلد ظہور ہوا اور حضرت سید الشہدا کی مدد سے آٹھ دن میں ان کا لکھنؤ جانا ہو گیا اور تکلیفوں کے دن ختم ہو گئے۔ جن تکلیفوں نے دہلی کا قیام ترک کرنے پر مجبور کیا تھا وہ لکھنؤ پہنچ کر دور ہو گئیں۔ ممکن ہے کہ کرم علی نے لکھنؤ میں مستقل سکونت اختیار کر لی ہو۔ اور ان کی آخری عمر یہیں گزری ہو۔

یہ مرثیہ منفردہ چار پارہ ہے۔ اس کا مطلع یہ ہے:

دشتِ بلا کے بن میں آ، کہتی ہیں نبتِ مصطفےٰ ‏ ‏ ‏ دیوے کوئی مجھے بتا، میرا حسین کیا ہوا

مرثیے کے آخری شعروں میں کرم علی نے عرضِ مدّعا کے سلسلے میں اُس واقعے کی طرف اشارہ کیا ہے جس کا ذکر انھوں نے مرثیے کے عنوان میں کیا ہے۔ وہ اشعار درج کیے جاتے ہیں:

عرض کرے ہے یہ غلام، تجھ سے اے دینِ کے امام! ‏ ‏ ‏ وہ جو عرب نے اک پیام مجھ کو دیا ہے گھر میں آ
تیری جناب میں اگر رتبہ مرا ہے اس قدر ‏ ‏ ‏ ظاہر اُسے شتاب کر، یا شہِ دشتِ کربلا!
اب ہے یہی مرا سوال، دیکھوں کبھو ترا جمال ‏ ‏ ‏ لطف سے مجھ کو کر نہال، نورِ جمال پس دکھا
لایا ہے صدقِ دل ستی، مرثیہ کہہ کرم علی ‏ ‏ ‏ تو ہے حسینؑ بن علی، وُو ترے در کا ہے گدا

کرم علی کے تین مرثیے ایسے ہیں جو انھوں نے دہلی کی ایک شاہزادی صاحبۂ عالم قطبی بیگم بنتِ کام بخش کے حسبِ حکم کہے تھے۔ اس سے دہلی کے شاہی خاندان سے کرم علی کے روابط کا پتا چلتا ہے۔

جس مرثیے کے لیے کرم علی نے لکھا ہے کہ اُس کو منبر پر تحت اللفظ پڑھنا چاہیے، اس کے ابتدائی چند بند حسبِ ذیل ہیں:

ہے آج روزِ حشر عیاں، وامصیبتا! ‏ ‏ ‏ ماتم میں ہیں زمین و زماں، وامصیبتا!
جن و ملک ہوں سب بفغاں، وامصیبتا! ‏ ‏ ‏ کہتے ہیں ہو کے سینہ زناں، وامصیبتا!
افلاک نے کیا ہے لباس اپنا سب کبود ‏ ‏ ‏ سوزش زمیں کی کر گئی افلاک پر صعود
خورشید ماہ نور سے ہو گئے ہیں بے نمود ‏ ‏ ‏ اشکِ الم ہے سب کا رواں، وامصیبتا!
خیلِ ملائک آج سیہ پوش ہو تمام ‏ ‏ ‏ روئے ہیں زار ہو سبھی در ماتمِ امام
جبریلؑ تعزیت میں ہو مشغول صبح و شام ‏ ‏ ‏ کہتا ہے ہو کے اشک فشاں، وامصیبتا!

## کرم علی مرثیہ گو

ارواحِ انبیا سبھی اس غم سے زار ہیں　　کرّوبیانِ عرش بریں بے قرار ہیں
حوراں بہشت بیچ سبھی اشکبار ہیں　　سن کربلا کے بن کا بیاں، وامصیبتا!
ختم الرسل ہے گلشنِ فردوس بیں ملول　　لوہو کے آنسوؤں ستی روتی کھڑی بتول
رضواں کے تئیں سرورِ بہشتی گیا ہے بھول　　ہے عرشیوں کا وردِ زباں، وامصیبتا!
مطلب ہے اس الم کا عزائے غمِ حسین　　جس نے لیا دلوں سے ہر اک کے آج چین
روتی ہے کائنات سبھی کر کے شور و شین　　در ماتمِ امامِ زماں، وامصیبتا!

مجلسِ عزا میں علی اصغر کا گہوارہ نکالنے کا دستور بہت قدیم ہے۔ کرم علی نے ایک مرثیہ اس موقع پر پڑھنے کے لیے کہا ہے، جس کے چند شعر درج کیے جاتے ہیں:

اصغر شہ کے نور العین، خالی تیرا پالنا　　اماں رو رو کرتی بین، خالی تیرا پالنا
ہے ہے بچّے پیاسے زار، تیر کے زخمی دل افگار　　تجھ بن جینا ہے دشوار، خالی تیرا پالنا
تجھ کو پیاسا دیکھ، صغیرا! بابا گیا تھا لانے نیر　　نیر بدل واں کھایا تیر، خالی تیرا پالنا
اصغر پیارے ماں سے بول، سوکھے ہونٹ اپنے تک کھول　　گھر کے آنگن میں اب ڈول، خالی تیرا پالنا
داغ لگا ہے اب کاری، جینا مجھ کو ہے بھاری　　اماں تجھ پر بلہوداری، خالی تیرا پالنا
گور اندھیری کیا بھائی، جہاں نہ اماں تے دائی　　دل میں تیرے کیا آئی، خالی تیرا پالنا
بس کر، مت کہہ کرم علی، برچھی غم کی دل میں سلی　　ہے ہے اصغر جانِ علی، خالی تیرا پالنا

شمالی ہند کے دو مرثیہ گو ہوشدار اور ندیم اسی انداز کے مرثیے کرم علی سے پہلے کہہ چکے تھے۔ اُن کے مرثیوں کے مطلعے اور مقطعے ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں:

اصغر شہ کے نونہال! خالی تیرا پالنا　　گزرا تو ہو لہو میں لال، خالی تیرا پالنا
ہوشدار اب نت رو رو کر، عمر صرف کر غم بھیتر　　کہتا ہے ہے اے اصغر! خالی تیرا پالنا
ہے ہے اصغر ابن حسین، سُونا تیرا پالنا　　رو رو بانو کرتی بین، سونا تیرا پالنا
آج ندیم اس غم کے بین کرتا تجھ بِل سیر کر نین　　اصغر شہ کے نور العین، سُونا تیرا پالنا

علی جواد زیدی

# جدید مرثیے کے بانی ضمیر لکھنوی

[اسی موضوع پر میرا ایک مختصر سا مضمون مارچ ۱۹۶۴ء کے "نیا دور" لکھنؤ میں شائع ہوا تھا۔ اب مزید مواد کی فراہمی کے بعد از سر نو لکھا گیا ہے]

ضمیر کا پورا نام سید مظفر حسین تھا لیکن عرف عام میں ضمیر لکھنوی یعنی اپنے تخلص ہی سے مشہور ہیں۔ ان کا تعلق خواجہ باسط کے خانوادے سے ہے۔ خواجہ باسط صاحبزادے تھے خواجہ مظفر کے اور موخر الذکر محمد شاہ کے وزیر صمصام الدولہ، خانِ دوراں کے بڑے بھائی تھے۔[1]

ضمیر کے والد کے نام میں جزوی اختلاف ہے۔ مصحفی اور افضل حسین ثابت نے قادر حسین بتایا ہے[2] لیکن کلب علی خاں نادر، نساخ، گارسین دتاسی اور سری رام نے قادر علی[3]۔ گواہ تو دونوں ناموں کے موجود ہیں لیکن قرینِ قیاس یہی ہے کہ صحیح نام قادر حسین ہوگا۔ مصحفی ضمیر کے استاد تھے، انھیں ٹھیک نام معلوم ہونا چاہیے پھر خود ضمیر کا نام مظفر حسین ہے، مظفر علی نہیں ہے۔

ثابت نے قادر حسین کو سنگھوڑا (ضلع گوڑگانواں) کا باشندہ اور نادر و نساخ نے لکھنؤ کا

---

۱۔ مکتوب جناب نقی احمد ارشاد بنام راقم

۲۔ ریاض الفصحا: ۱۸۰؛ دربار حسین: ۱

۳۔ تذکرۂ نادر: ۱۰۱؛ سخن شعرا: نساخ: ۳۸۹؛ خمخانۂ جاوید، ۵: ص ۲۷۶؛ تاریخ ادب ہندوی و ہندوستانی [فرانسیسی]، ۳: ۳۲۳

ساکن بتایا ہے۔ ظاہری اختلاف کے باوجود ان بیانات میں تضاد نہیں ہے۔ ضمیر کے آباؤ اجداد پنگھوڑا آہی کے رہنے والے تھے۔ پتا نہیں کہ انھوں نے کب ترکِ وطن کیا، لیکن یہ یقینی ہے کہ قادر حسین نے فیض آباد میں آصف الدولہ کے درباری اور خواجہ سرا میاں الماس علی خاں کی ملازمت و مصاحبت اختیار کرلی تھی۔ اس سلسلے میں ان کا قیام پہلے فیض آباد میں رہا۔ جب ۱۸۸ھ/۱۷۷۵ء میں دارالحکومت فیض آباد سے لکھنؤ کو منتقل ہوا تو قادر حسین بھی ضمیر کو ساتھ لے کر لکھنؤ چلے آئے[۴] اور یہیں رہ پڑے۔ اس لیے انھیں جائز طور پر لکھنؤ کا باشندہ یا "لکھنوی" کہا جاسکتا ہے۔

لکھنؤ میں ضمیر کا قیام سرائے معالی خاں میں تھا۔ اسی سرائے کے پاس الماس علی خاں کا امام باڑہ بھی تھا۔ جس میں انھوں نے پہلی مرتبہ بڑی بڑی اینٹیں لگوائی تھیں یہ بڑی اینٹ انھیں کی ایجاد تھی اور انھیں کے نام پر الماس خانی مشہور ہوگئی۔

**ولادت:** کسی تذکرہ نگار نے ضمیر کا سالِ ولادت نہیں لکھا ہے۔ البتہ مصحفی کے بیان سے اتنا پتا چلتا ہے کہ جب وہ ضمیر کے حالات لکھ رہے تھے اُس وقت اُن کے اندازے کے مطابق ضمیر کی عمر تیس سال کی تھی۔ ریاض الفصحا کی تالیف کا زمانہ ۱۲۲۱ھ سے ۱۲۳۶ھ تک ہے۔ یوں ضمیر کی ولادت ۱۱۹۱ھ اور ۱۲۰۶ھ کے مابین ہوئی ہوگی۔ جناب قاضی عبدالودود کا تخمینہ ہے کہ ریاض الفصحا میں ضمیر کے حالات ۱۲۲۷ھ کے آس پاس لکھے گئے۔ اس حساب سے ضمیر کی ولادت ۱۱۹۷ھ میں قرار پاتی ہے۔ اس تخمینے کو صحیح ماننے میں مشکل یہ ہے کہ فیض آباد سے منتقلی کے وقت (۱۱۸۷-۱۱۸۸ھ) ضمیر پیدا بھی نہ ہوئے ہوں گے اگر ہم یہ بھی مان لیں کہ فیض آباد سے لکھنؤ آتے وقت ضمیر گود کے بچے تھے۔ تب بھی کم از کم ۱۱۸۷ھ کو اُن کی ولادت کا سال ماننا پڑیگا۔

اس میں بھی ایک قباحت ہے اور وہ یہ کہ ریاض الفصحا کی تالیف ۱۲۲۱ھ میں شروع ہوئی۔ اگر ضمیر کے حالات پہلے ہی سال لکھے گئے ہوں تو بھی تحریرِ تذکرہ کے وقت ان کی عمر ۳۴ برس کی قرار پاتی ہے، جو مصحفی کے بیان سے میل نہیں کھاتی۔ بظاہر مصحفی نے

---

۴۔ حیاتِ دبیر ۸۹؛ دربار حسین، ۱؛ "لکھنؤ کا دبستان شاعری"، ص ۶۷۲

تخمینی عمر لکھ دی۔ تین چار برس کا فرق اس زمانے کے تذکرہ نویسوں کے لیے کوئی بڑا فرق نہیں تھا۔

**تعلیم:** میر ضمیر کی تعلیم و تربیت کے بارے میں ہمارے پاس تفصیلی معلومات نہیں ہیں۔ محمد حسین آزاد کا بیان ہے کہ "طبعِ شعر کے ساتھ عربی و فارسی وغیرہ علوم رسمی میں استعداد کامل رکھتے تھے۔"[5] مصحفی نے بھی ضمیر کو "ذوفنون" لکھا ہے اور اعتراف کیا ہے کہ وہ بیس برس کے سن تک پہنچتے پہنچتے غایتِ علمِ شعر کو پہنچ گئے تھے۔[6]

خود ضمیر کی مثنویوں اور مرثیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے احادیث، مناقب اور تاریخ کی مروجہ کتابوں کا خاصا مطالعہ کیا تھا۔ اُس وقت تک ایسی کتابیں بیشتر عربی یا فارسی ہی میں تھیں، اس لیے آزاد کا بیان اگر سماعی بھی ہو تو صحت کے قریب ہے۔ آیاتِ قرآنی کے ٹکڑے، احادیث کی تلمیحیں اور کتابوں وغیرہ کے نام بھی اکثر مرثیوں اور مثنویوں میں آئے ہیں۔ ولادت و مناقبِ حضرت علی سے متعلق مثنوی میں جا بجا احادیثِ نبوی کے حوالے ملتے ہیں۔ ان تمام داخلی شہادتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ احادیث و مناقب کی کتابوں پر اُن کی نظر وسیع تھی۔ مثنوی "مظہر العجائب" میں ضمیر نے اپنی اس خصوصیت کی طرف خوبی سے اشارہ کیا ہے:

جس کی پڑھ جانے جنّ و انس میں دھوم　　ایسا اک معجزہ کروں مرقوم
ہاں مگر ہو جسے عبورِ کتاب　　ہو وہیں آگاہ جس سے کم احباب[7]

ضمیر نے نہ صرف مثنویوں میں بلکہ مرثیوں میں بھی اپنی اس وسعتِ مطالعہ سے فائدہ اٹھایا ہے، لیکن اُن کی علمیت شاعری پر حاوی نہیں ہو جاتی۔ وہ واقعات کے اخذ و رد میں یا شاعرانہ تفاصیل کے فکّ و اضافے میں یا مبالغہ وغیرہ کے اختیار میں صرف شاعر ہیں، مورخ یا محدث و مفسر ہرگز نہیں ہیں۔ ثابت کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ضمیر نے صرف فارسی زبان میں تاریخ اور حدیث کی کتابوں کا مطالعہ کیا تھا، لیکن نہ تو انھوں نے راوی کا نام لکھا ہے نہ کوئی اور حوالہ دیا ہے۔

---

۵۔ آبِ حیات: ۴۶۹　۶۔ ریاض الفصحا: ۱۸۰　۷۔ دربارِ حسینی: ۴

**شاعری:** ضمیر نے اپنی مثنوی "مظہر العجائب"[۹] میں سببِ تالیف بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انھوں نے دس برس کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا۔ لیکن ابتدا میں وہ صرف غزلیں لکھا کرتے تھے۔ کہتے ہیں:

یہ جو ہے بندۂ فقیر و حقیر　　کمترین ذاکرِ حسین، ضمیر
شعر کہنے کا اُس کو شوق ہوا　　سنِ دہ سالگی سے ذوق ہوا
جا کے بزمِ مشاعرہ میں مدام　　پڑھا کرتا تھا عاشقانہ کلام
غزلِ پُر معانی و [illegible] رنگین　　پڑھ کے ہوتا تھا موردِ تحسین

. . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . .

اسی اثنا میں کی درست تمام　　مثنوی "نسخۂ محبت" نام
ذاکری کا خیال و ذوق نہ تھا　　کچھ مجھے مرثیے کا شوق نہ تھا

آگے چل کر لکھا ہے:

رہا مدت زبسکہ یہ مجبور　　شعرا میں بشاعری مشہور
بزمِ احباب میں بحسنِ کلام　　تھا غزل خوانیوں سے مجھ کو کام
گر قصیدہ، کبھی مخمس و فرد　　مثنوی ہائے پُر فسانۂ درد
ذکرِ تاریخ و قصہ ہائے غریب　　ہم حکایات و نقل ہائے عجیب
قصۂ عشق جب سناتا تھا　　گہ ہنساتا تھا، گہ رلاتا تھا

اس کا مطلب یہ ہے کہ ضمیر نے ۱۱۹۷ء کے قریب شاعری شروع کر دی تھی اور ابتدا ہی سے مشاعروں میں شریک ہو کر دادِ سخن پانے لگے تھے۔ ثابت کا یہ قول یقیناً غلط ہے کہ ضمیر نے فیض آباد ہی میں شاعری شروع کر دی تھی۔ انھوں نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ فیض آباد میں ضمیر کی ایسی شہرت ہو چکی تھی کہ وہ مرثیہ گو استاد مانے جاتے تھے۔ جیسا کہ لکھ چکا ہوں وہ بہت ہی کم سنی میں فیض آباد سے لکھنؤ چلے آئے تھے۔ وہاں شاعری شروع کرنے یا دس برس کے سن تک وہیں مقیم رہنے کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ "استادِ مرثیہ گو" ہونا تو بڑی بات ہے۔

---

۹ ۔ دربارِ حسین ۱

شاگردی: مصحفی ہی کے ایک شاگرد شیخ محمد بخش واجد کے ہمراہ ضمیر مصحفی کے پاس پہنچے اور شیرینی تقسیم کر کے اُن کے حلقۂ شاگردی میں شامل ہو گئے۔ شروع ہی سے یہ ارادہ تھا کہ جب شعر نظم کرنا سیکھ لیں گے تو امام حسین کا مرثیہ وسلام کہنے لگیں گے۹۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ جب ضمیر نے ابھی تک مرثیے نہیں کہے تھے، شاعری کے رموزِ فن سے بھی پوری طرح واقف نہیں تھے۔ ضمیر نے یہ سب مراحل طے کیے، پھر غزلیں لکھیں، مثنویاں لکھیں۔ قصیدے لکھے، مخمس و فرد لکھے اور پھر یہ سب ترک کر کے صرف مرثیہ گوئی کی جانب مائل ہوئے۔ یہ سب منزلیں ضمیر نے یقیناً بہت سُرعت سے طے کی ہوں گی کیونکہ ۱۲۲۱۔۱۲۲۲ء کے آس پاس مصحفی نے خود یہ سند دی کہ "وہ غایتِ فن کو پہنچ چکے ہیں اور مرثیہ گوئی میں نام پیدا کر لیا ہے"۱۰۔

واجد ضمیر سے سن میں کئی برس چھوٹے تھے اور ضمیر سے پہلے ہی مصحفی کے شاگرد ہو چکے تھے۔ اس لیے گمان یہی ہے کہ ضمیر نے کافی دنوں تک اپنی ہی طبیعت کو رہبر بنائے رکھا اور بہت دیر میں مصحفی سے رجوع کیا۔ مصحفی کی شاگردی اختیار کرنے کا مقصد تکمیلِ فن رہا ہوگا، اور یہ بہت جلد حاصل ہو گیا۔ مصحفی نے جہاں شاگردی کا ذکر کیا ہے وہیں یہ بھی لکھ دیا ہے کہ تکمیلِ فن کے بعد ضمیر نے مرثیہ گوئی میں نام پیدا کیا۔ یہی نہیں بلکہ ۱۲۲۹ھ/۱۲۳۰ء تک اتنا مرتبہ بھی پا لیا تھا کہ دبیر جیسے مرثیہ گو نے ان کی شاگردی اختیار کر لی۱۱۔

ثابت لکھتے ہیں کہ ضمیر سے پہلے صرف غزل گو شاعر مصحفی کے شاگرد تھے۔ اس میں ضمیر کا کوئی استثناء نہیں ہے، کیونکہ انھوں نے جب مصحفی کی شاگردی اختیار کی ہے تو وہ بھی غزل گو ہی تھے۔ ہاں مرثیہ گوئی کا قصد ضرور رکھتے تھے۔ ایک مرثیے میں ایک شعر ایسا بھی ہے جس سے شبہہ ہوتا ہے کہ شاید مرثیہ گوئی کے آغاز کے بعد بھی ضمیر نے اصلاح لینے کا سلسلہ بند نہیں کیا تھا۔ اس بند میں ضمیر نے مصحفی کا نام تو نہیں لیا لیکن استاد کا اشارہ مصحفی کے سوا کسی اور کی طرف نہیں ہو سکتا۔ بند کی بیت یوں ہے:

---

۹: ریاض الفصحا: ۱۸۰ ۱۰: ایضاً

۱۱: حیات دبیر: ۲۲۰

## جدید مرثیے کے بانی ضمیر لکھنوی

اس طرح سے کہنے کا سلیقہ مجھے کب ہے
واللہ کرا استاد کی شفقت کا سابب ہے

اگر آج کل کے معیار سے دیکھا جائے تو یہ غیر ضروری انکسار، معلوم ہوگا لیکن ضمیر کے کلام پر مصحفی کی اصلاحوں کا اثر زبان بیان کی صفائی اور متوازن صناعی کی شکل میں صاف نظر آتا ہے۔

**مرثیہ خوانی کا آغاز:** مصحفی کا یہ بیان کہ ضمیر لکھنوی، مرثیہ گوئی کی خاطر تکمیلِ فن کرنا چاہتے تھے اور ارادی طور پر اس مقصد کے لیے اپنے کو تیار کر رہے تھے، خود میر ضمیر کے بیان کے مطابق نہیں۔ انھوں نے مثنوی "مظہر العجائب" کی تالیف کا سبب بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مرثیہ گوئی کی طرف ان کی توجہ یکایک ہوئی۔ یہ شوق انھیں ایک ایسے واقعے سے ہوا جسے وہ معجزے سے تعبیر کرتے ہیں۔ ہوا یہ کہ ضمیر کے مکان کے پاس ایک مردِ مومن، غلام علی نامی رہا کرتے تھے۔ یہ میر باقر کے "پالیدہ" مشہور تھے۔ غلام علی بڑے پُر خلوص عزادار تھے، اور سال بھر کی کمائی محرم پر صرف کر دیا کرتے تھے۔ ایک عاشور کی شب انھیں مجلس پڑھنے والا نہیں ملا، تو وہ ضمیر کے پاس آئے، کیونکہ وہ مشاعروں میں ضمیر کی خوانندگی کی تعریف سن چکے تھے:

شعر پڑھنا ہے آپ کا مشہور　　کوئی ویسا پڑھے تو کیا مقدور!

لیکن ضمیر قصیدے، غزلیں اور مثنویاں تو پڑھ لیتے تھے۔ مرثیہ پڑھنے کی کبھی نوبت نہیں آئی تھی۔

میں کہ اس سے کبھی نہ تھا آگاہ　　مرثیے کا ہے کیا طریقہ و راہ
میں نے یہ عرض کی کہ "مشفقِ من!　　مرثیہ خوانی کا جدا ہے فن"
مجھ کو کچھ اس سے رسم و راہ نہیں　　اس میں بندے کو دستگاہ نہیں"

اس پر بھی غلام علی اصرار کرتے رہے، مگر میر ضمیر معذرت کرتے گئے بالآخر غلام علی نے عاجز آ کر کہا کہ "اچھا نہ پڑھیے، لیکن یاد رکھیے کہ میں حشر میں دامن گیر ہوں گا اور رسولِ خدا سے شکایت کروں گا کہ عاشورہ کے روز میرے گھر میں مجلسِ حسین برپا تھی لیکن یہ جوانے کو

سید کہتے ہیں، انھوں نے مرثیہ نہ پڑھنا تھا نہ پڑھا اور ذکرِ مصائب کے بغیر ہی مجلس منتشر ہوگئی۔ یہ سن کر میر ضمیر کانپ اٹھے اور صاحبِ خانہ سے ان کی بیاضِ مراثی لے کر گدا[12] نامی شاعر کا ایک مرثیہ منتخب کیا اور پڑھنے پر آمادہ ہوگئے۔ حالت یہ تھی کہ ـ

کبھی مجلس میں تھا پڑھا نہ سلام　　　رعب سے جسم کانپتا تھا تمام

بہرحال انھوں نے مرثیہ پڑھا۔ مجلس میں غیر معمولی رقّت ہوئی، خاص کر عورتوں کی حالت شدّتِ گریہ سے غیر ہوگئی۔ دریافت کرنے پر انھوں نے بتایا کہ انھوں نے حضرت فاطمہ زہرا کو مجلس میں آتے، گریہ و بکا کرتے اور مرثیہ پڑھتے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے[13]۔ لکھتے ہیں:

میں نے یہ سانحہ سنا جس دم　　　بس اثر کر گیا حسین کا غم
یا کہی تھی رباعی اور نہ سلام　　　یا کئی مرثیے کیے ارقام

لیکن انھوں نے یہ مرثیے کہہ کر رکھ لیے اور پڑھنے کی نوبت نہیں آئی۔ غالباً اسی زمانے میں انھیں مرثیہ گوئی کے لیے تکمیلِ فن کا خیال آیا اور انھوں نے مصحفی سے اپنا ارادہ ظاہر کیا۔ چونکہ وہ مرثیے پڑھتے نہ تھے اس لیے اُن کی مرثیہ گوئی کی خبر استاد کو نہ ہوسکی ہوگی۔
اب مرثیہ خوانی کا آغاز تو ہو ہی چکا تھا۔ ایک اور واقعے سے اس میں باقاعدگی کی تحریک و تائید ہوئی ـ

اسی عرصے میں اے گروہِ سعیدا　　　ہوئی الحق یہ دوسری تائید

یعنی ایک روز مرزا علی شریف کے بھائی مرزا مظفر علی کے گھر میر ضمیر کا جانا ہوا۔ مرزا مظفر علی ایک عالم و فاضل حکیم آدمی تھے۔ حاجی اور زائر متقی اور پرہیزگار۔ انھوں نے ضمیر سے کہا:

آپ میں نے سنا کہ شاعر ہیں　　　بلکہ اس فن میں خوب ماہر ہیں

---

۱۲۔ مرزا گدا علی گدا۔ م ۱۲۳۳ھ ناسخ نے تاریخِ وفات کہی ع مرثیہ گوے سید الشہدا

۱۳۔ افضل حسین ثابت نے دربارِ حسین میں لکھا ہے کہ یہ مجلس ایک بیوہ کے گھر میں تھی اور اثنائے ذاکری میں کچھ عورتیں نظر آئیں جو دو ہی تھیں اور بعدِ مجلس غائب ہوگئیں۔ یہ بیان یقیناً سنی سنائی روایتوں پر مبنی ہے اور ضمیر کے ذاتی بیان کے مقابلے میں قابلِ قبول نہیں ہے۔

## جدید مرثیے کے بانی ضمیر لکھنوی

اگر اس کے عوض کہیں تو، بجا      مرثیہ ہائے سید الشہدا
عرض کرنے لگا تب ان سے نحیف      میں نے ہیں مرثیے کیے تصنیف

اس سے میرے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ شب عاشورہ والے واقعے کے بعد سے میر ضمیر مرثیے کہنے لگے تھے لیکن پڑھتے نہ تھے۔ کافی دنوں تک لوگ انھیں صرف ایک غزل گو کی حیثیت سے جانتے رہے۔ بہرحال یہ سن کر کہ میر ضمیر مرثیے بھی کہتے ہیں، مرزا ظفر علی نے اُن سے کہا کہ ہر دوشنبہ کو میرے مکان پر مجلس عزا ہوتی ہے، اگلے دوشنبہ کی مجلس میں آپ بھی مرثیہ خوانی کیجیے۔ اُس وقت تک رواج یہ تھا کہ ایک مجلس میں کئی کئی مرثیہ خوان پڑھا کرتے تھے۔ چنانچہ مقررہ دن، ایک مرثیہ خوان کے بعد، میر ضمیر کی باری آئی۔ ضمیر کی اپنی روایت ہے کہ یہ اُن کی پہلی مجلس تھی۔

الغرض، از خدا سے میں نے رجوع      کہا شہ سے بصد خضوع و خشوع
سنو یہ عرض، اے شہ دلگیر      آج پڑھتا ہے پہلے روز ضمیر
آج رقت ہوئی یہاں گر خوب      اور ہوا مرثیہ مرا مرغوب
تو تو پھر مرثیوں کا لوں گا نام      ورنہ کرتا ہوں آج ہی سے سلام

یہ دعا کر کے انھوں نے مرثیہ پڑھنا شروع کیا۔ مرثیے میں قاصد صغریٰ کا حال تھا۔ یہ مرثیہ صرف تمہید تھا۔ چنانچہ بقول ضمیر مطلع ہی سے دلوں پہ غم طاری اور آنکھوں سے اشک جاری ہو گئے۔ جب مرثیہ زور پر آیا تب تو ع

قلزم گریہ شور پر آیا

سامعین ہر بند رو رو تے روتے غش کھا گئے۔ اگرچہ کئی مرثیہ خوان پڑھنے کو باقی تھے لیکن انھیں منبر دان کھولنے کا موقع ہی نہ ملا اور میر ضمیر ہی پر مجلس ختم ہو گئی۔

اس واقعے کا میر ضمیر پر بہت اثر ہوا اور اس کے بعد وہ مرثیہ گوئی میں ہمہ تن مصروف ہو گئے:

نہ رہا مجھ کو شغل پھر کوئی      ہو گیا صرف مرثیہ گوئی

مثنوی "مظہر العجائب"، جس سے یہ اقتباسات درج کیے گئے ہیں بہت بعد کی، لیے

# جدید مرثیے کے بانی ضمیر لکھنوی

۱۲۴۴ھ کی تصنیف ہے جیسا کہ علی جان عالم کے اس قطعۂ تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے:

جس دم کہی ضمیر نے یہ مثنوی تمام　　عالم نے دل میں فکر کی، تاریخ میں کہا

آئی صدائے غیب یہ اس وقت کانمیں　　یہ معجزات خوب کہے کیا ہی "واہ وا"

ہمارے اندازے کے مطابق، ضمیر کا سن اس وقت کوئی چھپن برس (۱۲۴۴ھ) کا رہا ہوگا۔ وہ غزل گوئی ترک کر کے صرف مرثیہ گوئی میں محو تھے۔ اس وقت تک وہ اپنے بیان کے مطابق صرف مرثیے کے چونتیس ہزار اشعار نظم کر چکے تھے۔ اس کے بعد ضمیر ۲۸ برس اور زندہ رہے اور مرثیہ گوئی میں مصروف۔ انھوں نے یقیناً لاکھوں اشعار مرثیوں کے کہے ہوں گے۔ ۱۲۴۴ھ تک یہ صورت تھی:

کروں ابیات کا گر آج شمار　　ہوں گے البتہ سی و چار ہزار

یہ فقط مرثیوں کے ہیں ابیات　　ورنہ کرتا جو جمع کلیات

آج سب ہو اگر کہیں موجود　　بیت ہو صد ہزار سے افزود

اگرچہ ضمیر کے بہت سے مرثیے ضایع ہو گئے لیکن اب بھی بہت کچھ باقی ہے۔ نول کشور پریس سے مجموعہ مرثیہ میر ضمیر" کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ میں نے نول کشور پریس، کان پور کا مطبوعہ پہلا ایڈیشن (جولائی ۱۸۹۸ء) دیکھا ہے۔ اس میں یہ عبارت درج تھی کہ اس پہلے یہ مجموعہ لئی بار "مطبع منشی نول کشور موسوم بہ اودھ اخبار واقع لکھنؤ" سے شائع ہو چکا ہے۔ اس میں پچاس کے قریب مرثیے اور کچھ سلام اور رباعیات بھی ہیں۔ ان کے علاوہ، پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب کے ذاتی کتاب خانے میں ضمیر کے مرثیوں کا بہت بڑا ذخیرہ ہے، جو ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔

مطبوعہ جلد کے مطلعے یہ ہیں:

۱۔ جب ظالموں نے خاتمۂ پنجتن کیا　　۲۔ گھوڑے سے جو نوشاہ گرا رُو دے زمیں پر

۳۔ نیزہ جو کھا کے سینے میں اکبر ہوئے تمام　　۴۔ چوں آفتاب صبح شہادت بلند شد

۵۔ میداں میں دوپہر جو دم جنگ ڈھل گئی　　۶۔ یارب صغیر سن میں کوئی بے پدر نہ ہو

۷۔ جب فوج حسینی گئی گلزار ارم کو　　۸۔ جب بادشاہ یثرب و بطحا ہوا شہید

# جدید مرثیے کے بانی ضمیر لکھنوی

۹. میں نے دیکھی جو احادیثِ بحارالانوار

۱۰. قریب شام حرم جب قریبِ شام آئے

۱۱. خلعت جو ستاروں کا ہوا پیرہنِ شب

۱۲. اے مومنو، عباس کی ہمت پہ فدا ہو

۱۳. آبِ دمِ شمشیر سے جب پیاس بجھا کر

۱۴. کیا بزم ہے، کیا مجمعِ اربابِ تمرد ہے!

۱۵. جس وقت کیا مہر نے زرّیں طبقِ صبح

۱۶. کس نور کی مجلس میں مری جلوہ گری ہے

۱۷. یارو، جہاں میں عشق کا انجام مرگ ہے

۱۸. مومنو آج ہے دنیا سے سفر مسلم کا

۱۹. آفاق میں کیا رتبۂ مہرِ پدری ہے

۲۰. عزیزو! آج شہادت کی رات آئی ہے

۲۱. مرنے پہ کمر باندھی جو شہ کے رفقا نے

۲۲. ہاں ساکنانِ ارض و سما، فکرِ غم کرو!

۲۳. شفقت علی پہ ختم، سخاوت علی پہ ختم

۲۴. سپیدۂ صبح کا جب رن میں آشکار ہوا

۲۵. آمد آمد علی اکبر کی جو مشہور ہوئی

۲۶. اے مومنو یہ زیست کا عالم ہے غنیمت

۲۷. میدان میں آمد آمدِ قاسم کی دھوم ہے

۲۸. آمد آمد جو ہوئی ماہِ بنی ہاشم کی

۲۹. عزیزو! آج یہ نیرنگ ہے زمانے میں

۳۰. مومنو آج عجم تازہ رقم ہوتا ہے

۳۱. کیا شور آمد آمدِ عباس رن میں ہے

۳۲. غل ہے، میدان میں عباسِ علی آتے ہیں

۳۳. تا زیست فاطمہ پہ جو رنج و محن رہا

۳۴. اے مومنو کس باغ میں عالم یہ خزاں کا

۳۵. جس گھڑی نہر پہ سقائے حرم جا پہنچا

۳۶. عباس جو مشہور تھا ماہِ بنی ہاشم

۳۷. جب شاہ سے میدان کی رضا پا چکے اکبر

۳۸. لاشیں زینب کے جگر گوشوں کی لاتے ہیں حسین

۳۹. صنعت سے ثبوتِ غمِ شاہِ شہدا ہے

۴۰. شہ نے سفر عراق کو کعبہ سے جب کیا

۴۱. واضح کیا جب حق نے حدوث اور قدم کو

۴۲. مرکبِ طبعِ رسا آج رواں کرتا ہوں

۴۳. جس دم ہوئے عباس خریدارِ شہادت

۴۴. جس دم دہم ماہِ محرم کی شب آئی

۴۵. جب کیا کوفیوں نے شہ کو طلب کوفے میں

۴۶. دکھلائے خدا داغ نہ فرزندِ جواں کا

۴۷. نکلا جو سرِ مہر گریبانِ سحر سے

جنابِ سید مسعود حسن رضوی کے کتاب خانے میں ان کے علاوہ ضمیر کے جو مراثی ہیں، اُن کے مطلعے حسبِ ذیل ہیں!

---

۴۸. یارو! تقدیر سے میں کارِ قلم کرتا ہوں

۴۹. یارو، حسینِ فاطمہ کیا صرفِ جدال ہے

.. یارو! کوئی دنیا میں نہ یوسف سا حسین تھا
۵۱. یارو! غم شہ کے لیے اعضائے بشر ہیں

.. نہ ہو جہاں میں کسی دل کو غم جدائی کا
۵۳. آفاق میں ہے رشک عطارد قلم اپنا

.. ایک دن فاطمہ کو دیکھ کے گریاں زینب
۵۵. جب رن کی رضا اکبرِ مظلوم نے پائی

. شبیر چلے جب کہ مدینہ سے سفر کو
۵۷. شبیر کو خالق نے سکینہ جو عطا کی

.. دنیا میں سخی ہوتی ہے اولاد سخی کی
۵۹. شور ہے شام کے لشکر میں کہ عباس آئے

. صغرا جو مبتلائے فراقِ پدر ہوئی
۶۱. عابد کو رہائی جو ملی قیدِ ستم سے

.. ملی کی چاہ میں لطفِ زلالِ کوثر ہے
۶۳. رن میں جب آمدِ عباسِ علمدار ہوئی

.. جب شاہ ہوئے واردِ میدانِ شہادت
۶۵. رن سے اب خیمے کو زینب کے پسر آتے ہیں

.. رن کے میدان میں صف آرا جو ستمگار ہوئے
۶۷. روزِ عاشور ہے، خوب آج تو رو لو، یارو!

. کثرت سے لگے زخم جو جسمِ شہِ دیں پر
۶۹. حیدر کو محبت تھی جو عباسِ علی سے

. لشکرِ شام میں جس دم نظر آئے قاسم
۷۱. عزیزو! جب سفرِ کربلا تمام ہوا

.. اے مومنو! کیا مرتبۂ ابنِ علی ہے
۷۳. لکھتے ہیں مُلا محمد باقرِ شیریں کلام

.. جب عرصۂ گردوں پہ نشاں مہر کا چمکا
۷۵. مریم شمیم آفاق میں یہ کلک ہے میرا

. مورخوں نے تواریخ میں کیا ہے رقم
۷۷. جب سے سرسبز ہوا باغِ جہانِ گلزار

. جب رن میں دمِ عصر شہِ بحر و بر آئے
۷۹. آج دنیا سے ہے، اے یارو! سفر مسلم کا

. جب شام ہوئی شہ کو غریب الوطنی میں
۸۱. برپا ہوئے جب خیمۂ زنگاریِ شبیر

. جب صبح نے اٹھا دیا پردہ حجاب کا
۸۳. نیزہ جو کھا کے سینے پہ اکبر ہوا شہید

. جب موت نے چھینا علی اکبر کو پدر سے
۸۵. اک ہاتھ پر طبق رطب تازہ کا دھرا

. جب ہوا بعد شبِ قتل کے سامانِ سحر
۸۷. جس وقت فتح جنگِ احد مرتضیٰ نے کی

. جس وقت کیا مہر نے زریں طبقِ صبح
۸۹. دشتِ بلا میں پہنچے جو سلطانِ کربلا

. روشن کیا جب نامِ چراغِ حسنی نے
۹۱. لٹ گیا اُس دشت میں جس دم حرم کا کارواں

. اے مومنو! کچھ فکرِ سرانجام کرو تم
۹۳. جب بے چراغ قبرِ رسولِ خدا ہوئی

---

. دیکھیے مندرجہ بالا مطلعوں میں شمارہ ۱۸ پر درج مطلع

۹۴۔ آتے ہیں اہلِ بیتِ رسالت مدینے میں
۹۵۔ جب کہ مشکیزہ کو بھر کر چلے عباس علی
۹۶۔ جب خیمے سے روانہ حسن کا پسر ہوا
۹۷۔ بخدا، قلعہ سا اس بزم کی واقعے تھا
۹۸۔ صبحِ شبِ عاشورہ کا چمکا جو ستارا
۹۹۔ میدان میں جو اعدا کا صف آرا ہوا لشکر
۱۰۰۔ جب رن میں آمدِ سلطانِ دیں ہوئی
۱۰۱۔ شیرِ خدا کے وصف کہاں تک رقم کروں
۱۰۲۔ یارو! سنو فضیلتِ ماہِ صیام کو
۱۰۳۔ ہے روایاتِ صحیحہ سے بحار الانوار
۱۰۴۔ قاسم ابنِ حسن نے جو شہادت پائی
۱۰۵۔ جب شاہ سے رخصت طلب آئے علی اکبر
۱۰۶۔ جب دوپہر میں باغِ رسالت کا لٹ چکا

ان میں بیشتر مراثی چالیس پچاس بند سے زیادہ کے ہیں۔ ان کے علاوہ وہ مخمس، تضمین، اور مثنویوں کی شکل میں بھی مرثیے ہیں۔ غرض، کیا بلحاظ کیفیت اور کیا بلحاظ کمیت ضمیر کے مراثی اردو ادب کی تاریخ میں بہت اہم ہیں، اور اس کے مستحق کہ ان کا تفصیلی جائزہ لیا جائے۔ باقاعدہ مرثیہ گوئی کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ کہاں تو ضمیر سبھی اصنافِ سخن میں زورِ طبع صرف کرتے تھے، اور کہاں اب انھوں نے مرثیہ، سلام اور رباعی ہی پر قناعت کر لی۔ بعد کو کچھ مذہبی مثنویاں اور لکھیں، جن میں "مثنوی مظہر العجائب" بھی شامل ہے۔ غزل، عشقیہ مثنوی، واسوخت وغیرہ یکسر موقوف ہو گئے۔ گویا ایک نئے ضمیر نے جنم لیا۔

ضمیر کے مرثیوں کا حجم بھی اہمیت رکھتا ہے، لیکن سب سے زیادہ اہمیت اُن فنی ایجادات کی ہے، جن سے مرثیہ کی ہیئت ہی بدل گئی اور ضمیر اس فن کے مجدد قرار پائے۔ اس اختراعی تجدد پر تفصیلی گفتگو ذرا بعد کو ہوگی پہلے اُن کی غزل اور دوسرے اصنافِ سخن کا ذکر ضروری ہے۔

غزل: یہ بات پہلے بھی ضمناً کہی جا چکی ہے کہ ضمیر نے دس سال کے سن سے غزل گوئی شروع کر دی تھی اور مشاعروں میں شرکت کرنے لگے تھے۔ رفتہ رفتہ انھوں مشاعروں کی بدولت شعر خوانی میں نام پیدا کیا۔ ان کے شعر پڑھنے کا طریقہ بھی اچھا اور مقبول تھا چنانچہ جب ان کے پڑوسی غلام علی نے ان سے مرثیہ خوانی کی فرمائش کی، تو ان کے اندازِ شعر خوانی کی بھی تعریف کی تھی۔

ضمیر صاحبِ دیوان تھے، لیکن آج ان کا دیوان ناپید ہے۔ کئی تذکرہ نویسوں نے

ضمیر کے دیوان کا ذکر کیا ہے۔[15] گارسین دتاسی نے بھی اس کا تذکرہ کیا ہے، وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ محسن کے تذکرہ سراپا سخن میں اسی دیوان سے غزل نقل کی ہے۔ یہ وہی "دل" کی ردیف والی غزل ہے جو ناقد نے بھی اپنے تذکرے میں درج کی ہے۔

آج بڑی مشکل سے ضمیر کی صرف چند غزلیں دستیاب ہوتی ہیں۔ ان کی بنیاد پر ضمیر کی غزل گوئی کے بارے میں کوئی قطعی رائے قائم کرنا درست نہ ہوگا، لیکن تبرکاً ان کا وہ سارا متغزلانہ کلام جو دستیاب ہوتا ہے یہاں درج کر دیا جاتا ہے تاکہ ایک جگہ محفوظ ہو جائے۔ مصحفی نے ریاض الفصحا میں یہ اشعار انتخاب کیے ہیں ؎

صدمے سے شب ہجر کے، کب جان بر آئی — یہ شام نہیں آئی، قضا ہی مگر آئی
دیکھا مرا بستر جو کل اُس شوخ نے خالی — ہر چند کیا ضبط، مگر آنکھ بھر آئی
کرتا ہے کئی دن سے مرے قتل کی تدبیر — صد شکر کہ، اُس بت کی طبیعت ادھر آئی!
آتے ہی ترے آگئی اک جان سی تن میں — اے نکہت گیسوے معنبر، کدھر آئی؟
تصویر خیالی کی ترے کیا کہوں شوخی — گر چھپ گئی نظروں سے، تو گاہے نظر آئی!
گلشن میں خزاں آئی، تو بلبل یہ پکاری — اب فصل بہاری، گل داغ جگر آئی!
ہر تارِ نہانی ہی کو سمجھا میں رگ گل — یاد اس گل نازک کی جو مجھ کو کمر آئی؟

پوچھو تو، ضمیر جگر افگار کہاں ہے
جس دن سے گیا وہ، نہ پھر اس کی خبر آئی

حالت مری جب اُس کو دگرگوں نظر آئی — اوروں کی تو کیا، چشم مسیحا کی بھر آئی
کاہیدہ کیا آہ، جنوں نے مجھے یاں تک! — زنجیر مرے پاؤں کی آخر اُتر آئی
کس وقت پھنسی تھی کہ رہا ہو کے چمن میں — اے وائے، نہ پھر بلبل بے بال و پر آئی!

حسرت کا داغ لے کے چلے ہم بجائے گل — سب سے کہیں کہ ہم بھی گلستاں سے لائے گل

آیا ہوں سننے نالۂ مرغ چمن ضمیر
لائی نہیں ہے مجھ کو چمن میں ہوائے گل

---

۱۵۔ سخن شعرا: ۲۸۹؛ سراپا سخن: ۲۹؛ شمیم سخن، ۱۵۷؛ تذکرہ نادر، ۱۰۱

## جدید مرثیے کے بانی ضمیر لکھنوی

جب تک کہ تو جلوہ گر نہ ہووے — میری شب غم سحر نہ ہووے
افسوس کہ جی سے ہم گزر جائیں — اور ترا ادھر گزر نہ ہووے
عاشق ترا اپنی جان کھووے — پر حیف! تجھے خبر نہ ہووے!
مرجائیں ہم آہ کرتے کرتے — اور دل میں ترے اثر نہ ہووے!

صد حیف ضمیر ہم تو روئیں
اس کی کبھی چشم تر نہ ہووے

ضمیر کی یہ غزل ملتی ہے سراپا سخن اور تذکرۂ نادر میں:

کیا کہوں میں کہ اب کہاں ہے دل — اس گلی میں رواں دواں ہے دل
گاہ پہلو میں، گاہ یار کے پاس — دیکھو تو، کہاں کہاں ہے دل
دیکھ کر عاشقوں کی ارزانی — ایک بوسے پہ بھی گراں ہے دل
ہائے، بے رحم اُسے اٹھا جاتا — خاک اور خون میں طپاں ہے دل

اے ضمیر اس پہ رکھ نہ بار فراق
ناتوانوں کا ناتواں ہے دل

ایک یہ غزل مثنوی "مظہر العجائب" میں منقول ہے۔

ہم رہے یاں تلک ترے غم میں — کہ ترا غم سما گیا ہم میں
کیوں نہ ہو عشق حسن گندم گوں — میں بھی آخر ہوں نسل آدم میں
ہے عرق میں بھی اس کے نکہت عطر — گل کی بو آگئی ہے شبنم میں
جیسا جام جہاں نما ہے دل — سیر وہ کب ہے ساغر جم میں
دل کا ناسور دل کے ساتھ چلا — گئے مرہم، تلاش مرہم میں
نزع کے وقت بھی فریب دیا — وہ جو آیا دم آگیا دم میں
اس میں ہیں ہم ہلاک، اس میں ہلاک — ہے یہی فرق ہم میں اور غم میں
شمع سے رات یہ کہا میں نے ق — کہ تو روتی ہے کس کے ماتم میں
بولی اے فخر عاشقاں جہاں — کیا کہوں میں کہ دم نہیں دم میں

ہو گیا خاک جل کے پروانہ — رہی میں آہ زیرِ ماتم میں
شب جو اک دوست اپنا یعنی دل — ق — پھنس گیا اس کی زلفِ پُرخم میں
اپنا کچھ بس نہ چل سکا، لیکن — اشک بھر آئے چشمِ پُرنم میں
تو چراغِ مزارِ غیر رہا — ہم گھلے شمع ساں ترے غم میں

ان غزلوں میں بالعموم وہ رجحان نہیں پائے جاتے جن کے باعث اکثر شعرائے لکھنؤ موردِ طعن بنے ہیں، لیکن ایسے اشعار موجود ہیں جو صناعی کی خاطر کہے گئے ہیں اور کیف و اثر سے عاری ہیں۔ یہ کیا لکھنؤ اور کیا دلّی اس دور کا عام مذاق تھا۔ تاہم، انشا کی شوخ مزاجی اور کمتر شعرا کی بے اعتدالی اور بے راہ روی ضمیر کے یہاں مفقود ہے؛ ان کا لہجہ ثقہ حضرات کا لہجہ ہے، ابتذال اور فحش سے اُن کے اشعار کا دامن پاک ہے۔

ان غزلوں کے مطالعے سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ تلامذۂ مصحفی کے یہاں بھی غزل ایہام تجنیس قسم کی صناعیوں میں کھو گئی تھی۔ اگر صنائع، بدائع و محاورہ وغیرہ سے قطع نظر کر لی جائے، تو غزل کے اعتبار سے اکثر اشعار سپاٹ نظر آئیں گے۔ دو غزلہ، طویل غزلیں اور قطعہ بند اشعار لکھنے کے عام رجحان کا بھی اس تھوڑے سے نمونے ہی سے پتہ چل جاتا ہے۔ انھیں غزلوں میں اس دور کے معیاروں کے مطابق، کچھ اچھے اشعار بھی ہیں۔ اگر ضمیر نے غزل گوئی ترک نہ کر دی ہوتی تو غالباً اپنے زمانے کے غزل گویوں میں امتیاز حاصل کر لیتے، لیکن ایک غزل گو کی حیثیت سے انھیں وہ نمایاں جگہ کبھی نہ مل پاتی جو مرثیہ گوئی کی بدولت ان کے حصے میں آئی۔

**داستان گوئی:** داستان گوئی دلّی میں بھی عام تھی اور لکھنؤ میں بھی۔ لکھنؤ میں آکر اس فن نے مزید ترقی کی۔ میر احمد علی ضمیر کے زمانے کے مشہور داستان گو ہیں۔ یہ داستان گوئی میں مرزا قاسم علی کے شاگرد تھے۔ ثابت نے روایت کی ہے کہ ضمیر نے میر احمد علی سے داستانیں سنی تھیں[16]۔ "مظہر العجائب" میں لکھتے ہیں کہ میں خود بھی قصے، کہانیاں، نقلیں اور حکایتیں دوستوں کی محفلوں میں سنایا کرتا تھا۔ انداز اتنا موثر تھا کہ لوگوں کو ہنسا اور رُلا دیتا تھا۔ یہ سلسلہ مدتوں جاری رہا۔ چنانچہ کہتے ہیں:

16۔ دربارِ حسین: ۲

رہا مدت زبسکہ یہ مجبور | شعرا میں بشاعری مشہور
بزمِ احباب میں بحسن کلام | تھا غزل خوانیوں سے مجھ کو کام
گہ قصیدہ، گہے مخمس و فرد | مثنوی ہائے پُر فسانہ و درد
ذکرِ تاریخ و قصہ ہائے غریب | ہم حکایات و نقل ہائے عجیب
قصۂ عشق جب سناتا تھا | گہ ہنساتا تھا، گہ رُلاتا تھا

**مثنوی خوانی:** ضمیر کی داستان گوئی سے اُن کی مثنوی نگاری اور مثنوی نگاری سے مرثیہ گوئی کا براہِ راست تعلق ہے۔ ۱۲۴۴ھ میں ان کا بیان کہ اس سال تک انھوں نے ایک لاکھ کے قریب اشعار کہے تھے۔ یہ ظاہر کرنے کے لیے کافی ہے کہ وہ بے حد پُرگو اور زودگو شاعر تھے۔ مرثیہ گوئی شروع کرنے سے پہلے وہ زیادہ تر غزلیں ہی کہتے تھے لیکن اسی زمانے میں انھوں نے ایک مثنوی "نسخۂ محبت" بھی لکھی تھی۔ اس کا کوئی نسخہ دیکھنے کو نہیں ملا: غالباً دستبردِ زمانہ کی نذر ہو گئی۔

"مظہر العجائب" کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ قصہ خوانی اور داستان گوئی کی عام فضا میں مثنوی خوانی کی محفلوں کا بھی انعقاد ہونے لگا تھا۔ مثنوی مولوی معنوی تو پہلے بھی خوش الحانی کے ساتھ محفلوں میں پڑھی جاتی تھی۔ قدیم تذکروں میں ایسے کئی شاعروں کا ذکر آیا ہے جو دلّی اور دوسرے شہروں میں مثنویِ مولانا روم پڑھتے تھے۔ عشقیہ مثنویاں بھی پڑھی جاتی رہی ہوں گی۔ لکھنؤ میں سحر البیان وغیرہ کی مقبولیت سے عشقیہ مثنویوں کے پڑھنے کا رواج عام ہو گیا ہوگا۔

"مظہر العجائب" میں اس کی طرف واضح اشارہ موجود ہے۔ اس سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ اس زمانے میں مثنویاں صرف ذاتی دلچسپی یا امرا اور بادشاہوں کی دل بستگی کے لیے نہیں لکھی جاتی تھیں، بلکہ مشاعرہ اور مجلس کی طرح مثنوی خوانی کے بھی عوامی اجتماعات ہوا کرتے تھے۔ جن میں دوست، احباب، اور ارباب ذوق اکٹھا ہو جاتے تھے۔ بالاقساط مثنویاں سنائی جاتی تھیں۔ غالباً داستان گوئی ہی کی طرح مثنوی خوانی بھی مرغوبِ خواص و عام رہی ہو گی۔ عام مثنویوں کی سہل اور بول چال کی زبان سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ عوا

کے لیے لکھی جاتی تھیں۔ خواص کے لیے صنائع و بدائع، محاورہ وغیرہ بھی شامل کیے جاتے تھے۔ "مظہر العجائب" میں ہے:

ہے کیا سہلِ ممتنع ارقام　　تاکہ محظوظ ہوں خواص و عام

مرثیہ گوئی شروع کرنے کے بعد مثنوی خوانی کو اپنے مرثیے سے گری ہوئی بات سمجھ کر میر ضمیر نے عشقیہ مثنویوں کا پڑھنا ترک کر دیا۔ احباب کو ان کی مثنوی خوانی بیحد پسند تھی۔ اس لیے اُن کا اصرار بدستور جاری رہا۔ اس لیے عام مجمعوں میں تو نہیں، لیکن "محبانِ صادق" کے مجمع میں وہ کبھی کبھی کچھ سنا دیا کرتے تھے۔ بعد کو انھیں یہ بھی بُرا معلوم ہوا اور اب وہ مذہبی مثنویاں لکھنے لگے۔ قرائن یہی بتاتے ہیں کہ "مظہر العجائب" اُن کی پہلی مذہبی مثنوی ہے۔ کہتے ہیں:

گو وہ اشغال اب نہیں یکسر　　طبعِ احباب ہے مگر خوگر
اب بھی جس انجمن میں پاتے ہیں　　لب پہ ذکرِ گذشتہ لاتے ہیں
اب جہاں مجلسِ موافق ہے　　مجمعِ دوستانِ صادق ہے
ہر طرف سے یہی بلند صدا　　کچھ تو فرمایئے، برائے خدا!
ہے غضب رنجِ دوستانِ اہل　　اور کفارۂ یمیں ہے سہل
جب زیادہ کوئی ستاتا ہے　　میر کا شعر یاد آتا ہے
"کیا کہوں کچھ کہا نہیں جاتا　　اور چُپ بھی رہا نہیں جاتا"
بے کہے کب نجات پاتا ہوں　　کچھ نہ کچھ اُن کو پڑھ سناتا ہوں
اب یہ ٹھہرائی ہے مگر تدبیر　　پڑھیے وہ شے کہ ہو ثواب کثیر
کیجیے ایک مثنوی ارقام　　معجزاتِ علی ہوں جس میں تمام

**ضمیر کی مثنویاں:** ضمیر کی مرثیہ گوئی کی وہ شہرت ہوئی کہ لوگ ضمیر کی غزلوں اور مثنویوں کو بھول ہی گئے، بالخصوص اُن کی عشقیہ مثنوی تو تقریباً نایاب ہو گئی ہے۔ البتہ اُن کی مذہبی مثنویاں موجود ہیں اور یہاں انھیں سے بحث مقصود ہے۔ ان میں سب سے پہلی اور اہم مثنوی "مظہر العجائب" ہے اس کے کئی اجزا اوپر درج کیے جا چکے ہیں، کیونکہ

یہ ضمیر کی خود نوشت سوانح حیات کی حیثیت رکھتے ہیں۔

**مظہر العجائب:** یہ مثنوی پانچ ابواب پر منقسم ہے، ہر باب کو "گنج" کا نام دیا گیا ہے۔ یہ مثنوی صرف معجزات کی تشریح و تفسیر کے لیے نہیں لکھی گئی، بلکہ اس میں رزم، بزم اور عشق سبھی کچھ موجود ہے۔ معجزہ غیر معروف کتابوں میں منقول ہے اور میر ضمیر نے صرف فارسی سے ترجمہ کر دیا ہے:

ایسا اک معجزہ کروں مرقوم — جس کی پڑ جائے جن و انس میں دھوم
ہو دیں آگاہ جس سے کم اصحاب — ہاں مگر ہو جسے عبورِ کتاب
آدمی پھر نہ کوئی کام کرے — نہ اسے جب تلک تمام کرے
اک ورق کی جو کوئی دید کرے — اپنے ایماں کو وہ مزید کرے
جو پڑھے اس کو ہو حصولِ ثواب — جو سنے، اس کو ہو امانِ عذاب
ہو تجھے شوقِ داستاں جو فزود — رزم اور بزم اس میں ہے موجود
گر تو ہے مائلِ ترانۂ عشق — اس میں موجود ہے فسانۂ عشق
اس میں اپنا نہیں تصرف ہے — ترجمے کا فقط تکلف ہے
ہے جو یہ معجزہ نیا مرقوم — فارسی میں ہے ہو چکا منظوم [17]

یہ مثنوی میر ضمیر کی مقبولِ عام مثنویوں میں سے ہے۔ اس کی مقبولیت کا ثبوت صرف اُن چند قلمی نسخوں سے نہیں ملتا جو جا بجا پائے جاتے ہیں بلکہ یہ کم از کم چار بار طبع بھی ہو چکی ہے: (۱) مطبع مطلع الانوار، سہارنپور، (۲) مطبع مظہر العجائب، فراش خانہ، وزیر گنج، لکھنؤ، (۳) مطبع اثنا عشری، لکھنؤ اور (۴) مطبع شیرِ ہند، وزیر گنج، لکھنؤ۔ یہ چاروں ایڈیشن پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب (لکھنؤ) کے کتاب خانے میں موجود ہیں۔

اس مثنوی کے جو قدیم ترین قلمی نسخے میرے دیکھنے میں آئے ہیں، وہ ۱۲۷۳ھ یعنی ضمیر کی وفات کے ایک سال بعد کے لکھے ہوئے ہیں۔ ان ایک نسخہ تو رضا لائبریری، رام پور کی ملکیت ہے، اور دوسرا لکھنؤ یونیورسٹی لائبریری کی: ۱۲۸۰ھ کا لکھا ہوا ایک قلمی نسخہ،

---

۱۷؎ یہ شعر صرف رضا لائبریری رام پور والے نسخے میں ہے لیکن نسخۂ مملوکہ پروفیسر اکبر حیدری کشمیری میں نہیں ہے۔

پروفیسر اکبر حیدری کے پاس سری نگر میں بھی ہے۔ سری نگر والے نسخے میں مثنوی کے نام والا یہ شعر نہیں ملتا، لیکن رضا لائبریری کے نسخے میں یہ موجود ہے:

نام اس کا رکھا عجائب ہے　　　نسخۂ "مظہر العجائب" ہے

یہ پہلے لکھ چکا ہوں کہ یہ مثنوی ۱۲۴۴ھ میں تصنیف ہوئی، جیسا کہ علی جان عالم کے اس مصرعۂ تاریخ سے ظاہر ہے: "یہ معجزات خوب کہے کیا ہی واہ وا" (۱۲۴۴) بعض لوگوں نے "واہ وا" کو "واہ واہ" پڑھا اور یوں اس پر پانچ کا اضافہ کر کے اسے ۱۲۴۹ھ کی تصنیف قرار دیا ہے۔ یہ مفروضہ غلط ہے کیونکہ "واہ وا" "کہا" کا قافیہ ہے، جو پہلے مصرع میں آیا ہے۔ لغت میں بھی عام طور سے واہ وا ہی ہیں۔ اسی غلطی کی بنیاد پر ڈاکٹر سید محمد عقیل نے اسے ضمیر کی دوسری مثنوی قرار دیا اور مثنوی "ریحان معراج" کو پہلی۔ [۱۸] "ریحان معراج" متفقہ طور پر ۱۲۴۷ھ کی تصنیف ہے، اس لیے یہ پہلی مثنوی "مظہر العجائب" کے تین برس بعد لکھی گئی ہے اور کسی طرح ان کی پہلی مثنوی قرار نہیں دی جا سکتی۔ خود مظہر العجائب میں بھی ایسی اندرونی شہادتیں موجود ہیں، جن سے اس کی اولیت کسی شک و شبہہ سے بالاتر قرار پاتی ہے۔

**رام پور اور ضمیر:** مثنوی "مظہر العجائب" کے قلمی اور مطبوعہ نسخوں، دونوں ہی میں ایک بیّن اختلاف یہ ہے کہ بعض میں نواب احمد علی خاں والیِ رام پور (ف ۱۸۴۰ء) سے اس کا انتساب ملتا ہے اور بعض میں نہیں۔ رام پور کے کتب خانے میں جو نسخہ ہے، اس میں یہ عبارت درج ہے:

"زیبِ نامۂ نامی و رونقِ صحیفۂ گرامی، مدحِ جنابِ مستطابِ کامیاب، مالک الرقاب، کیواں جناب، برجیس کتاب، بہرام احتساب، خورشید قباب، عطارد انتساب، قمر رکاب، نواب احمد علی خان بہادر دام اقبالہ الی یوم الحساب"

اس کے بعد ۴۹ اشعار انتساب کے درج ہیں۔ مطبع مطلع الانوار، سہارنپور کے مطبوعہ نسخے میں بھی یہ عبارت اور اشعار بہت ہی خفیف سے اختلاف کے ساتھ درج ہیں۔

۱۸: اردو مثنوی کا ارتقا شمالی ہند میں، ص ۲۲۷

# جدید مرثیے کے بانی ضمیر لکھنوی

بظاہر ضمیر نے شروع میں نواب رام پور کی مدح نہیں لکھی تھی، بعد کو یہ نسخہ نواب کی خدمت میں پیش کرنے اور اُن سے انتساب کرنے کا خیال آیا۔ ابتدائے مثنوی میں خدا سے جو دعا کی ہے، اس میں یہ اشعار شامل ہیں:

نہ رہوں مثلِ شاعرانِ جہاں ۔۔۔ بامیدِ فلان و ابنِ فلاں
مدح میں اس کی ہو زباں گویا ۔۔۔ جس میں موجود ہوں صفاتِ ثنا
کس و ناکس کی پر نہ مدح کروں ۔۔۔ بلکہ ایسوں کی ردّ و قدح کروں

اس میں شک نہیں کہ لکھنؤ میں مرثیہ خوانی اور مرثیہ گوئی کی جو قدر تھی، اس کی بدولت ضمیر کے رتبے کے مرثیہ گو کو کسی غیر کی مدح کیے بغیر بھی رزق بہم پہنچ ہی جاتا، لیکن غالباً نواب کی عقیدت اہلِ بیت سے متاثر ہو کر یا کسی معتد بہ صلے کی توقع میں یہ انتساب کیا گیا تھا۔ نواب رام پور کے بارے میں ضمیر نے من جملہ اور مدحیہ اشعار کے لکھا ہے کہ:

نہیں اس شہ میں کوئی ایسا ۔۔۔ نام خطبہ میں لائے تو جس کا
ہے مگر رام پور میں وہ نواب ۔۔۔ سو وہ نواب ہے ہلال رکاب
مالکِ منصبِ فراواں ہے ۔۔۔ نامِ پاک احمد علی خاں ہے
اس کے ایماں سے ہے نبی راضی ۔۔۔ فاطمہ راضی اور علی راضی
جب کہ ذکرِ حسین ہوتا ہے ۔۔۔ کیا وہ خوش اعتقاد روتا ہے

مدحِ نواب کی تمہید میں ضمیر نے لکھا تھا:

ہے یہ معمولِ شاعرانِ قدیم ۔۔۔ جب کہ کوئی کتاب ہو ترقیم
تحفہ بزمِ شاہ کرتے ہیں ۔۔۔ اور صلہ پر نگاہ کرتے ہیں
مجھ کو ہرگز نہیں صلہ پہ نگاہ ۔۔۔ پر یہ ہے فکر دل میں شام و پگاہ
یہ کلامِ لطیف ہے جیسا ۔۔۔ ملے ممدوح بھی کوئی ایسا

لیکن یہ استغنا نبھ نہ سکا۔ آگے چل کر انھوں نے صلے کا سوال بھی گھما پھرا کر اٹھا ہی دیا۔ پہلے تو مدح میں یہ گوشہ نکالا کہ

جب فقیروں کو مال و زر دیوے　　　جھولیاں ان سبھوں کی بھر دیوے

پھر عقل کی زبانی اپنے کو یہ صلاح دی:

نام خطبے میں اس کا جلد ملا　　　دو ہی اس مثنوی کا دے گا صلہ

اور آخر میں شاعرانہ تعلّی کے طور پر یہ بھی کہا کہ اس تصنیف سے انتساب کے باعث نواب کا نام بھی زندہ رہے گا:

نام کو تیرے اس لیے لایا　　　کہ یہ مضمون خیال میں آیا

یہ صحیفہ جو پائدار رہے　　　نام تیرا بھی یادگار رہے

**مثنوی ریحانِ معراج:** ضمیر کی دوسری مثنوی معراج نامہ مسمّٰی بہ ریحانِ معراج ہے۔ یہ مثنوی نصیر الدین حیدر بادشاہِ اودھ (۷ ربیع الاوّل ۱۲۴۳ھ تا ۳ ربیع الآخر ۱۲۵۳ھ) کے حکم سے لکھی گئی تھی اور ۱۲۴۷ھ میں مکمل ہوئی۔ تاریخ ہے:

یہ فرمائشِ صاحبِ تاج ہے　　　مسمّٰی بہ "ریحانِ معراج" ہے

ہوا ختم معراج نامہ جو ہیں　　　ہوئی فکر تاریخ کی دل نشیں

ندا آئی ہاتف سے بے اشتباہ　　　کہو اس کی تاریخ "فیضانِ شاہ" (۱۲۴۷ھ)

اس کے سببِ تالیف میں میر ضمیر لکھتے ہیں کہ ایک دن نمازِ صبح کے بعد وظیفے میں مشغول تھا کہ وزیر سلطنت، مہدی علی خاں کا طلبی کا پیغام پہنچا۔ وہاں پہنچنے پر مہدی علی خاں نے بادشاہ نصیر الدین حیدر کا یہ حکم سنایا کہ معراج نامہ لکھو۔ حکم سنتے ہی میں نے کام شروع کر دیا:

اگرچہ مجھے یاد تھا حرف حرف　　　کہ اوقات کی ان کتابوں میں صرف

مگر احتیاطاً کئی اور بھی　　　کتابیں منگائی فریقین کی

مطالب لیے انتخاب ان سے کر　　　کہ خُذ ما صَفَا اور دَعْ ما کَدَر

بتائیدِ حضرت رسالت مآب　　　اسی دن ہوا بس شروع کتاب

ضمیر کی زود گوئی اس موقع پر بھی بدستور قائم رہی۔ انھوں نے یہ مثنوی جس میں کل ملا کر اٹھارہ سو اشعار ہیں، بیس دن کے اندر مکمل کر دی۔ اس میں مطالعۂ کتب

اور نظر ثانی وغیرہ کا وقت بھی شامل ہے۔ گویا تقریباً دو سوا شعار دن کا اوسط رہا
اس مثنوی میں ہم عصر تاریخی اور تمدنی حالات سے متعلق معلومات بھی مل جاتی
مثلاً نصیر الدین حیدر بادشاہ کی علم دوستی کے بارے میں یہ اطلاع ملتی ہے:

سخن اس طرح کا کبھی ہے سنا | کہ شاعر کو پیش از سخن دے صلا!

شاہ کے بارے میں یہ مزید اطلاعیں بہم پہنچائی ہیں:

(۱) زہے بادشاہِ رعیت نواز! | زہے عادل و باذلِ کارساز!
رفاہِ رعیت کا خواہاں ہے وہ | کہ اس عہد میں فخرِ شاہاں ہے وہ
(۲) محرم کے عشرے میں کیا زار زار | یہ روتا ہے مانندِ ابرِ بہار
غمِ آلِ احمد میں ہے دل حزیں | سیہ پوش رہتا ہے تا اربعیں
(۳) ہمیشہ مطیعِ پیمبر ہے وہ | سدا ناصرِ دین حیدر ہے وہ

وزیر مہدی علی خاں سے متعلق ذرا تفصیل سے لکھا ہے:

وزیرِ خرد مند، باعدل و داد | وہ مہدی علی خانِ والا نہاد
ہوا اس سے رونق فزا یہ دیار | کیا حق نے آکر بمرکز قرار
دیا انتظامِ اموراتِ شاہ | ملک اور رعیت کا ہے خیر خواہ
ہوئیں گردنیں سرکشوں کی جو پست | زہے حکمِ نافذ، زہے بندوبست!
اِدھر گرگ ہے اور اُدھر گوسفند | سب اک گھاٹ پانی سے ہیں بہرہ مند
حیا آنکھ میں اور مروت کمال | ولیکن ہر اک سے علیٰ حسبِ حال

اس مثنوی کے بھی نسخے رضا لائبریری، رام پور میں اور پروفیسر اکبر حیدری، سری نگر کے پاس ہیں۔ ایک قلمی نسخہ جو دونوں سے قدیم تر ہے، پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب کے ذاتی کتاب خانے میں ہے جو ۱۲۶۲ھ کا لکھا ہوا ہے۔ یہ مثنوی پہلی بار مطبعِ محمدی، وزیر لکھنؤ سے ۱۲۸۱ھ میں شائع ہوئی تھی[1] اس میں ۱۸۰۶ اشعار ہیں اور معراجِ رسولؐ کے سلسلے میں آسمانوں کی سیر کا حال اور عجائباتِ فردوس کا ذکر ہے۔ ڈاکٹر سید محمد عقیل

(۱) اردو مثنوی کا ارتقا شمالی ہند میں: ۶۲۰

کا خیال ہے کہ غالباً منیر شکوہ آبادی نے معراج المضامین کے لیے اسی مثنوی کو بنیاد بنایا ہے۔

**دوسری مثنویاں:** پروفیسر اکبر حیدری کے پاس میر ضمیر لکھنوی کی ایک اور مختصر سی مثنوی بھی ہے، جس میں حضرت علی کی ولادت کا حال لکھا ہے۔ حالاتِ ولادت کے بعد فضائلِ علی بیان کیے ہیں، جا بجا حدیثوں کے حوالے بھی دیے ہیں۔ نسخے میں بیچ کا ایک ورق غائب ہے، اور اس کا نام بھی نہیں لکھا ہے۔

عشقیہ مثنوی نسخۂ محبت کا ذکر پہلے ہی آچکا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اور مختصر مثنویاں بھی ضمیر نے لکھی تھیں لیکن یہ مثنویاں میری دسترس سے باہر ہیں۔ دو مثنویاں شہدائے کربلا کے حال میں بھی لکھی تھیں۔ ان کے اجزا پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب کے پاس موجود ہیں۔

**دیگر اصنافِ سخن:** مثنویوں اور غزلوں کے علاوہ، ضمیر نے دوسرے اصنافِ سخن میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ رباعیاں اور سلام تو مرثیوں کے ساتھ ہی شائع ہو چکے ہیں۔ رباعیوں میں زیادہ تر اخلاقی مضامین نظم ہوئے ہیں نمونہ یہ ہے:

کسی کی عمر کا لبریز جام ہوتا ہے  کسی کا کندہ نگینے پہ نام ہوتا ہے
عجب سرا ہے یہ دنیا کہ جس میں شام و سحر  کسی کا کوچ کسی کا مقام ہوتا ہے

آرام سے کس دن تہِ افلاک رہے  عالم میں اگر رہے، تو کیا خاک رہے
عبرت کی جگہ ہے، ہم رہیں کب تک  دنیا میں نہ جب پنجتن پاک رہے

کوئی نہ کسی کا بعدِ مُردن ہوگا  اعمال رفیق، گور مسکن ہوگا
گر دل میں ہے آفتاب داغ شبیر  ہر شب کو لحد میں روزِ روشن ہوگا

باقی رباعیوں میں حزن اور بین کے مضامین، یا منقبت کے ہلکے اشارے ملتے ہیں۔ سلاموں کی ابتدا عموماً "مجرئی"، "سلامی" یا "سلام" اس پر وغیرہ سے ہوتی ہے۔ کچھ سلام خالص بین کے ہیں، کچھ میں منقبت اور مرثیت کی آمیزش ہے۔

ضمیر نے قصیدے، مخمس اور فردیات بھی لکھی تھیں اور غالباً ایسے اشعار خاصی تعداد

میں تھے لیکن یہ سبھی ضائع ہو گئے۔ ان کا کلّیات جمع نہیں ہو پایا۔ خود انھوں نے کبھی اس کی طرف توجہ نہیں کی، بلکہ یہ ان کی زندگی ہی میں ضایع ہونے لگا تھا۔

**ہرسیہ:** نجات حسین خاں[20] کے سفرنامے کے بعض اجزا "معاصر" پٹنہ میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس سفرنامے میں ایک جگہ لکھا ہے کہ انھوں نے مولانا سید حسن رضا کے یہاں کی مجلس میں میر ضمیر کی کچھ ظریفانہ رباعیاں اور "ہرسیہ" بھی سُنا تھا۔ افضل حسین ثابت نے تو میر ضمیر کو "ہرسیہ" کا موجد ہی بتایا ہے۔ ان کے خیال میں میر ضمیر کی ظرافتِ طبع نے یہ جدّت پیدا کی کہ قاتلانِ آلِ محمدؐ کی مذمّت نظم کرنے کا طریقہ نکالا۔ اس کا نام بھی انھوں نے مرثیہ کے وزن پر ہرسیہ رکھا۔ لکھنؤ میں ۹ ربیع الاول کو شیعی بڑی خوشی مناتے ہیں کیونکہ ایک تو اس روز بارہویں امام حضرت مہدیؑ کو مسندِ امامت ملی اور دوسرے اس دن امام حسینؑ کا قاتل عمر سعد قتل ہوا۔ اس عہد میں سب سے پہلے ضمیر نے ہرسیہ پڑھا۔ ان کی تقلید میں میر انیس اور مرزا دبیر نے بھی ہرسیے کہے[21]۔

اس قسم کے کلام کی ابتدا عرب شاعر ابوالحجاج نے کی تھی۔ علامہ ابن شہر آشوب نے ایسے اشعار اپنی کتاب "المثالب" میں جمع کیے ہیں[22]۔ میں نے خود کوئی ہرسیہ دیکھا نہیں ہے۔ لیکن بعض ہرسیوں کے کچھ اجزا دوسروں سے سنے ہیں۔ بالخصوص مُتَبّر کے ہرسیوں کے بارے میں جو کچھ سننے میں آیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہرسیہ گو بعض اوقات مبتذل گوئی تک سے گریز نہیں کرتے تھے۔

**چہاردہ بند:** نجات حسین خاں ۱۶ ربیع الاول ۱۲۵۹ھ/۱۶ اپریل ۱۸۴۳ء کو خود ضمیر کے مکان پر گئے تھے۔ یہ اخلاق و محبت سے پیش آئے اور "زبانِ ریختہ" کے جو سات بند تصنیف کیے تھے، ان میں سے چند خان صاحب کو بھی سنائے۔ غالـ

۲۰: ایک رئیس تھے جنھوں نے ضمیر کی حیات میں لکھنؤ کا سفر کیا اور وہاں کے شعرا و اُدَبا وغیرہ سے ملاقاتیں کیں۔ ان ملاقاتوں کا حال انھوں نے فارسی سفرنامہ کی شکل میں لکھ

۲۱: "دربارِ حسینؑ": ۱۲

۲۲: ایضاً: ۱۹

یہ وہی بند ہیں۔ جو ضمیر نے "ہفت بند" ملا کاشی کی طرز پر لکھے تھے، در حقیقت تعداد بعد کو بڑھا کر چودہ کر دی تھی۔ یہ چہاردہ بند ۱۳۱۱ھ میں مطبع اثنا عشری، لکھنؤ سے شائع بھی ہوئے تھے۔ میں نے پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب کے پاس اس کا ایک نسخہ دیکھا ہے۔

مرثیہ: میر ضمیر کی غزلیں دیکھ کر یہ فیصلہ کرنا دشوار نہیں ہے کہ انھوں نے غزل گوئی وغیرہ ترک کر کے اردو کو کوئی ناقابل تلافی نقصان نہیں پہنچایا۔ اگر وہ اسی روش پر قائم رہتے، تو لکھنؤ کے غزل گویوں میں امتیاز حاصل کرنے کے بعد بھی تاریخ ادب میں اپنے لیے کوئی امتیازی مقام نہ بنا پاتے، لیکن مرثیوں کا نیا ڈھانچا تیار کر کے اور اپنی زندگی ہی میں اس کا لوہا منوا کے میر ضمیر نے اردو ادب کو نئے آفاق سے روشناس کرایا۔ انھوں نے مرثیہ کو ایک اعلیٰ صنفِ ادب بنایا اور عربی اور فارسی کی کورانہ تقلید سے بچا کر اسے عوامی بین کی سطح سے بہت بلند کر دیا۔ عقیدت کے ساتھ انسانی محبت اور واقعیت کے ساتھ تخیلِ شاعرانہ کی آمیزش سے ضمیر نے مرثیوں کو روایت و حدیث کی تنگنا سے باہر نکالا اور مذہبی ہستیوں کے کردار کو انسانی کردار کے قریب تر کر دیا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ واقعۂ کربلا جو عربی اور فارسی میں صرف رثائیت پیدا کرنے کا ذریعہ تھا، اردو میں جوشِ مردانگی حمیتِ ملی، فرض شناسی، قربانی اور شہادت جیسے اہم جذبات کی ترویج کا وسیلہ بن گیا۔

اگرچہ سودا و میر وغیرہ نے مرثیوں میں کچھ ضمنی اصلاحیں کیں اور اس کی ادبی حیثیت پر بھی کچھ توجہ کی تھی، لیکن ابھی اس صنفِ شاعری کے ادبی خد و خال کا تعین باقی تھا۔ اور یہ کام میر ضمیر نے انجام دیا۔ مرثیوں کی دنیا میں میر ضمیر کی جدت پسندی اور اولیت لیے کئی پہلو ہیں۔ وہ نہ صرف مرثیے ہی میں بلکہ اردو شاعری میں بھی ایک اہم تبدیلی کے نقیب ہیں۔ انھوں نے ایک بڑے پیشرو کا کام کیا اور ایک نئے طرز کی بنیاد ڈالی، جس کی انقلابی حیثیت سے انکار ممکن نہیں۔ یہ انقلاب تھا مسدس کا باقاعدہ اور باضابطہ استعمال۔ مسدس پہلے بھی لکھے گئے اور مرثیوں میں بھی مسدس کا استعمال ہوا، لیکن میر ضمیر نے

## جدید مرثیے کے بانی ضمیر لکھنوی

مسدس کو مرثیوں کی مسلمہ عروضی ہیئت کی حیثیت سے تسلیم کرایا۔ مسدس کی شکل پر طویل مرثیے تو یقیناً ضمیر ہی نے لکھے۔ ضمیر کے زمانے ہی میں مسدس ایک محبوب شعری سانچہ بن گیا جو منقبت اور واسوخت وغیرہ کے لیے بھی استعمال کیا جانے لگا۔ انیس و دبیر کے بعد طویل نظموں میں مسدس کا استعمال ایک نئی ادبی روایت کا پیش خیمہ ثابت ہوا اور مرثیہ گویوں کو چھوڑ کر، حالی، آزاد، شبلی، اقبال، کیفی، چکبست، جوش، مجاز، اختر شیرانی، صفی کا طویل قافلہ جس شعری سانچے میں فلسفیانہ اور حکیمانہ خیالات اور عالی جذبات کو ڈھالتا رہا، اس کو تراش اور خراد کر کے ضمیر اور اُن کے متبع مرثیہ نگاروں ہی نے معزز و محترم بنایا تھا۔

میر ضمیر کے دور تک آتے آتے غزل اور قصیدہ دونوں ہی بے جان اصناف بن چکے تھے۔ تازہ گوئی، تمثیل اور صنائع و بدائع کے نام پر اب بھی کچھ لوگ ہاتھ پاؤں مار رہے تھے، لیکن ان اصنافِ سخن کے لیے خصوصی اور گلی انہماک ویسے بھی زیادہ دنوں تک باقی نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ مثنویوں کی طرف پھر توجہ بڑھ رہی تھی۔

یہ متفق علیہ ہے کہ ضمیر ہی مرثیہ کے طرزِ جدید کے بانی ہیں۔ مولانا حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں لکھا ہے:[۲۳]

> "اگرچہ یہ ترقی براہِ راست مرثیہ کی ترقی نہ تھی بلکہ اردو شاعری میں ایک قسم کا ایجاد تھا کہ جس نظم کی بنیاد محض بین اور مرثیت پر ہونی چاہیے تھی، اس میں بین اور مرثیت کے علاوہ مدح اور قدح، فخر و مباہات، رزم اور بزم بھی نہایت شد و مد کے ساتھ شامل ہو گئی۔ مگر حق یہ ہے کہ اس طرز میں سب سے پہلے جہاں تک ہم کو معلوم ہے، میر ضمیر نے مرثیے لکھے ہیں اور گویا وہی اس طرز کے موجد ہیں۔"

انھیں خیالات کا اعادہ علامہ شبلی نے بھی کیا ہے کہ "میر ضمیر تک یہ فن گویا ابتدائی حالت میں رہا۔ ... سب سے پہلے جس شخص نے مرثیہ کو موجودہ طرز کا خلعت پہنایا وہ میر ضمیر، مرزا دبیر

---

۲۳۔ مقدمہ شعر و شاعری: ۲۰۰

کے استاد ہیں[۲۴]۔ یہی بات بعد کو حکیم عبدالحی نے گل رعنا میں، ڈاکٹر اعجاز حسین نے مختصر تاریخ ادب اردو میں ابواللیث صدیقی نے لکھنؤ کا دبستانِ شاعری میں، سری رام نے خمخانۂ جاوید میں دہرائی ہے، اور لوگوں نے بھی انھیں باتوں کا اعادہ کیا ہے۔ ضمیر نے اپنی اس اولیت کا دعویٰ مثنوی "مظہر العجائب" میں یوں کیا ہے:

ہے ولے صد ہزار شکرِ خدا — کہ مری طرز ہے سبھوں سے جُدا
طرز یہ مرثیہ کی ٹھہرائی — کہ سراپا ہوا اور صف آرائی
پایا میرے کلام نے یہ رواج — کہ نہیں ہے بیان کا محتاج

جناب علی اکبر کی شہادت کے مرثیے میں دوبارہ اظہارِ خیال کرتے ہیں:

جس سال لکھے وصف یہ ہم شکل نبی کے — بارہ سوا انچاس (۱۲۴۹) تھے ہجرِ نبوی کے
آگے تو یہ انداز سنے تھے نہ کسی کے — اب سب ہی مقلد ہوئے اس طرزِ نوی کے

دِلّی میں کہوں، لکھنؤ میں کہوں، یہ وِرد ہے میرا
اس طرز میں جو جو کہے شاگرد ہے میرا

میر ضمیر کے اس اقتباس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ لوگ اُن کی حیات ہی میں اس طرز کی تقلید کرنے لگے تھے۔ چنانچہ اُن کے ہم عصر خلیق کے یہاں بھی ایسے مرثیے مل جاتے ہیں جن میں اس طرز کی جھلک ہے۔ غالباً اسی کو دیکھ کر اصغر حسین خاں نظیر لدھیانوی نے مرثیے کی طرزِ نو کی ایجاد میں خلیق کو بھی شامل کر لیا ہے۔ ان کا قول ہے کہ "مرثیہ کے اس اسلوبِ جدید کے موجد میر خلیق اور میر ضمیر تھے"[۲۵] محمد طاہر فاروقی نے بھی گویا ہاں میں ہاں ملائی ہے۔ "ضمیر و خلیق اور خاص کر ضمیر نے اس کی ماہیت بالکل بدل دی"[۲۶] البتہ فاروقی نے دونوں کا یہ باہمی فرق بھی ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ "خلیق نے رزمیہ مرثیے نہیں لکھے"، رزمیہ مرثیے میر ضمیر کے ایجاد ہیں۔

---

۲۴: موازنۂ انیس و دبیر: ۱۳۔۱۲

۲۵: مختصر تاریخ ادب اردو: ۱۷۸

۲۶: اردو مرثیہ از محمد طاہر فاروقی [مجلہ نقوش لاہور جون، ۱۹۶۰ء، ص ۲۰]

## جدید مرثیے کے بانی ضمیر لکھنوی

غالباً ان حضرات نے یہ رائے خلیق کے وہ مراثی دیکھ کر قائم کی ہے جو میر خلیق کے بہ یک واسطہ شاگرد، میر نواب، نے ۱۲۹۴ھ میں گلبرگہ سے شائع کیے تھے لیکن اس مجموعے کے بارے میں شبلی نے ایک شبہہ بھی ظاہر کیا ہے :

> "اس میں خلیق کے متعدد مرثیے ہیں۔ لیکن اکثر وہ ہیں جو آج میر انیس کے نام سے مشہور ہیں، اور یہ میر انیس کے چھپے ہوئے مرثیوں میں شامل ہیں۔ بعض ایسے ہیں جو مطبوعہ مرثیوں میں شامل نہیں ہیں لیکن زبان اور طرزِ ادا سے قیاس ہوتا ہے کہ میر انیس ہی کے نتائجِ فکر ہیں"[۲۰]

جو مرثیے میر انیس کے مراثی کی مطبوعہ جلدوں میں موجود ہیں، ان کے بارے میں شبہہ تو جائز ہے، لیکن جو مراثی شامل بھی نہیں ہیں ان کے حقِ تصنیف سے میر خلیق کو محروم نہیں کیا جا سکتا۔ خلیق اور انیس میں کوئی ایسا بُعدِ زمانی بھی نہیں ہے کہ اُن کی زبان میں نمایاں اختلاف ہو۔ علامہ شبلی کے فیصلے میں یہ منطقی الجھن بھی ہے کہ اگر خلیق کے مجموعۂ مراثی میں کسی مرثیے کی شمولیت اس کی دلیل نہیں ہے کہ وہ مرثیے خلیق ہی کے ہیں، تو انیس کے مجموعہ ہائے مراثی میں کسی مرثیے کا شامل ہونا اس بات کی دلیل کیونکر ہو سکتا ہے کہ وہ انیس ہی کا کلام ہے۔

میرا خیال یہ ہے کہ جب میر ضمیر کی نئی طرز لکھنؤ میں مقبول ہوئی اور سرکار دربار میں بھی لائقِ ستائش قرار پائی تو تقلیداً خلیق نے بھی اس طرز میں دو ایک مرثیے لکھے ہوں گے اس سے اولیت کا شرف میر ضمیر سے چھینا نہیں جا سکتا۔ اس دور میں خلیق کے علاوہ فصیح اور دلگیر بھی مستند مرثیہ گویوں میں مانے جانے لگے تھے۔ ان کے مرثیے موجود ہیں اور جگہ جگہ ان کے یہاں بھی وہ رجحانات نظر آجاتے ہیں جن کو ضمیر نے التزام کے ساتھ برتنا شروع کیا۔ گویا طرزِ ضمیر اسی دور میں مستند ہو گئی تھی۔

**ضمیر کی جدتیں :** اپنے ہم عصروں میں میر ضمیر ہی وہ تنہا مرثیہ گو ہیں جنھوں نے اس صنف کو حصولِ ثواب کے علاوہ، اظہارِ علم و فن کے لیے بھی استعمال کیا اور اس

۲۰. موازنہ انیس و دبیر : ۱۲

طرح برتا کہ یہ صنعت ایک باقاعدہ ادبی صنعت کا مرتبہ پا گئی۔ یہی بات محمد حسین آزاد نے ایک اور طریقے سے کہی ہے:[28]

"اظہارِ کمال میں دونوں استادوں کی رفتار الگ الگ تھی، کیونکہ میر ضمیر استعدادِ علمی اور زورِ طبع کے بازوؤں سے بلند پروازی کرتے تھے اور پورے اترتے تھے۔ میر خلیق مرثیت کے کوچے سے اتفاقاً ہی قدم آگے بڑھاتے تھے۔ وہ مضمون آفرینی کی ہوس نہ کرتے تھے اور ہمیشہ محاورے اور لطفِ زبان کو خیالاتِ دردانگیز کے ساتھ ترتیب دے کر مطلب حاصل کرتے تھے۔ اور یہ جوہر اس آئینہ کا کانی اور خاندانی وصف تھا، ان کا کلام بہ نسبت سبحان اللہ واہ واہ کے نالہ و آہ کا زیادہ طلب گار تھا"۔

جسے آزاد نے مرثیت کا نام دیا ہے، وہ مرثیوں کی قدیم خصوصیت ہے اور سبھی مرثیہ نگار اس پر زور دیتے چلے آئے ہیں۔ میر ضمیر کے مراثی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں، لیکن جو چیز میر ضمیر کو ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے مرثیے کی فنی ہیئت کا تعین کیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے ترتیبِ مضامین قائم کی۔ پہلے تمہید یا چہرہ، پھر میدانِ جنگ کے لیے رخصت، سراپا، میدان میں آمد، رجز خوانی، گھوڑے اور تلوار وغیرہ کا بیان، لڑائی، شہادت اور دعا پر خاتمہ۔ محاکات اور منظر کشی بھی موقع موقع سے شامل ہوتی۔ یہی وہ ڈھانچا ہے جسے ضمیر کے متبعین، یعنی دبیر اور انیس نے بھی برتا۔ یہ لوگ اسی عام ڈھانچے میں نئے نئے گوشے پیدا کرتے اور شعری لطافتوں کا اضافہ کرتے رہے۔ محمد حسین آزاد نے لکھا ہے:[29]

"میر ضمیر مرحوم نے ایک مرثیہ لکھا ع "کس نور کی مجلس میں مری جلوہ گری ہے" اس میں شہزادہ علی اکبر کی شہادت کا بیان ہے۔ پہلے ایک تمہید سے مرثیے کا چہرہ باندھا، پھر

---

۲۸: آبِ حیات: ۴۷۱-۴۷۰

۲۹: آبِ حیات: ۴۷۰، ۴۶۹۔ تقریباً یہ ساری عبارت کسی حوالے کے بغیر امجد علی اشہری نے "حیاتِ انیس" میں (ص ۱۶) نقل کر دی ہے۔

سراپا لکھا، پھر میدان جنگ کا نقشہ دکھایا اور بیان شہادت پر خاتمہ کر دیا۔ چونکہ پہلا ایجاد تھا اس لیے تعریف کی آوازیں دور دور تک پہنچیں، تمام شہر میں شہرہ ہو گیا اور اور اطراف سے طلب میں فرمایشیں آئیں (اس ایجاد) سے مرثیہ گوئی کے عالم میں پہلی روش متروک ہو گئی۔ باوجودیکہ انھوں نے مقطع میں کہہ دیا تھا:

دس میں کہوں، سو میں کہوں، یہ ورد ہے میرا
اس طرز میں جو کہوے سو شاگرد ہے میرا

پھر بھی سب اس کی پیروی کرنے لگے۔ یہاں تک کہ پہلے امانت نے، پھر اور شاعروں نے واسوخت میں سراپا کو داخل کیا"

سو بندوں کا یہ مرثیہ، میر ضمیر نے ۱۲۴۹ھ میں نظم کیا تھا۔ اسی مرثیہ کے آخری بند میں لکھتے ہیں:

تمو[illegible]ال کچھ وصف یہ ہمشکل نبی کے — سن بارہ سے[۳۰] انچاس تھے ہجر نبوی کے
آگے جو یہ انداز سخن تھے نہ کسی کے — اب سب ہی مقلد ہوئے اس طرز نوی کے
دس میں کہوں، سو میں کہوں، یہ ورد ہے میرا
اس طرز میں جو کہوے سو شاگرد ہے میرا

اس بند سے یہ تو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ ۱۲۴۹ھ کی تصنیف ہے، لیکن اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ پہلا مرثیہ تھا، جو ضمیر نے نئی طرز میں کہا تھا۔ آخر میر ضمیر کی ایجاد اور دوسروں کی تقلید کے درمیان کچھ وقفہ تو گزرا ہو گا۔ قیاس یہ کہتا ہے کہ پہلے ضمیر نے اس سلسلے میں جزوی تجربے کیے ہوں گے۔ کہیں دو ایک بند کا سراپا لکھ دیا، کہیں دو ایک بند چہرے، جنگ، رجز وغیرہ کے لکھ دیے۔ لیکن یہ پہلا مرثیہ ہے جس میں انھوں نے چہرے سے دعا تک مرثیہ کے تمام اجزا شامل کیے۔ انھیں معنوں میں ہم اسے جدید مرثیہ کا پہلا مکمل نمونہ کہہ سکتے ہیں۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ میر ضمیر کی ایجادیں کیا کیا تھیں؟ چہرہ یا تمہید کا رواج پہلے بھی مل جاتا ہے، سودا کے کئی مرثیوں میں تمہیدی بند نظم ہوئے ہیں۔ تعداد میں کم سہی

---

۳۰: سے: تتو

لیکن ہیں ضرور۔ رزم کے بعض اشارے ملتے ہیں، لیکن تفصیلی رزم یا گھوڑے، تلوار وغیرہ کی تفصیلی تعریفیں، یا رجز الشاذ کالمعدوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ البتہ سراپا یقیناً ضمیر ہی کی ایجاد ہے اور مرثیے میں اس کے استعمال کی اولیت کا شرف انھیں بے شرکتِ غیرے حاصل ہے۔ مرزا فصیح اور میر خلیق نے بھی رجز، سراپا میں کچھ لکھا ہے، لیکن ضمیر نے ان دونوں سے بہت پہلے لکھا ہے۔ مرزا دبیر نے حبیب ابن مظاہر کے حال کے مرثیے میں اس کی طرف ایک لطیف اشارہ کیا ہے:

معنیٔ ضمیر اہلِ بیاں سے نہیں اخفا　　روشن ہے دلوں پر شرفِ نام سراپا
ہیں سا تغیر بھی جو پیرِ وِ نظم اُن کے ہیں سمجھا　　یعنی کہ سخن سب کو پسند آئے ہر دل کا

شاہی ضمیر اوج پہ ہے ملکِ سخن میں
جس شکل سے دل حاکمِ اعضا ہے بدن میں

جنگ کا تفصیلی بیان بھی ضمیر ہی نے شروع کیا، اس ضمن میں انھوں نے رجز، شمشیر و اسپ کی تعریف، معرکہ آرائی کی تفصیلیں، جی کھول کر لکھیں اور مرثیہ کو رزمیہ عناصر سے مالا مال کر دیا۔ اُدھر چہرے میں مناظر قدرت کی تصویر کشی، جذبات نگاری اور مدح اور درمیان میں سراپا کا اضافہ کر کے اس صنف میں بزم کے عناصر بھی شامل کر دیے۔ مرثیت پر اب بھی زور رہا، لیکن ان ایجادوں سے مرثیہ ایپک کے قریب آ گیا۔ میں نے جہاں تک غور کیا ہے، میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ضمیر نے مثنوی اور قصیدے کے بعض اجزا دیدہ و دانستہ مرثیے میں شامل کیے۔ لیکن اس طرح سے کہ مرثیہ کا بنیادی رثائی پیکر برقرار رہا۔ انھوں نے حفظِ مراتب کا بھی خیال رکھا اور کوئی بات ممدوح کی شان کے خلاف نہ آنے دی۔ دوسری طرف انھوں نے مرثیوں کا ادبی معیار بھی بہت بلند کر دیا۔ اس نئی تبدیلی کو بروئے کار لانے میں اُن کی غزل نگاری اور مثنوی نویسی کی مشق کام آئی۔

علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ[۳۱]

"۴۔ میر ضمیر نے واقعہ نگاری کی بنیاد ڈالی، چنانچہ ایک ایک جزوی واقعہ

---

۳۱: موازنہ انیس و دبیر: ۱۳

کو تفصیل سے لکھا۔ ۵۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ کلام میں زور، بندش میں چستی اور صفائی پیدا کی، غلط الفاظ جو مرثیوں کے لیے گویا جائز مان لیے گئے تھے، اکثر ترک کر دیے۔ ان کے عمدہ کلام کا اگر انتخاب کیا جائے تو میر انیس کا کلام معلوم ہوگا۔

سری رام نے خمخانۂ جاوید[۳۲] میں اور ابواللیث صدیقی نے لکھنؤ کا دبستانِ شاعری[۳۳] میں انھیں باتوں کا اعادہ کیا ہے۔ صدیقی نے اس پر اتنا اور اضافہ کیا ہے،

"لکھنؤ کی شاعری میں اخلاقی شاعری کو مستقل حیثیت سے داخل کرنے کی یہ پہلی کوشش ہے اور کامیاب کوشش ہے۔"

ان تبدیلیوں کا یہ لازمی نتیجہ ہونا ہی تھا کہ مرثیوں کا حجم بڑھ جائے۔ چنانچہ جہاں پہلے مرثیہ ۳۰۔۴۰ بند پر ختم ہو جاتا تھا، وہاں ضمیر کے بعض مرثیے اب سو بند سے بھی متجاوز ہو گئے۔ مثلاً ع کس نور کی مجلس میں مری جلوہ گری ہے، میں ایک سو بند ہیں اور ع "شہ نے سفر عراق سے کعبہ کا جب کیا" میں ۱۲۸۔ ثابت ناقل ہیں[۳۴] کہ جس زمانے میں لکھنؤ مقابلے کی مجلسوں کا اکھاڑا بنا ہوا تھا، اس زمانے میں میر ضمیر نے ایک مرثیہ اٹھارہ سو بند کا لکھا جس میں سارے شہدائے کربلا کا حال نظم کیا تھا اور سراپا اور جنگ کی قید بھی باقی رکھی تھی۔ لیکن یہ ضخیم اور اہم مرثیہ ضمیر کے اخلاف نے بے پروائی سے ضائع کر دیا۔ بادی النظر میں یہ مبالغہ معلوم ہوتا ہے لیکن جب ضائع ہی ہو گیا، تو اس کی تصدیق کی صورت ہی کیا باقی رہی؟

**مرثیہ خوانی کا نیا طریقہ:** میر ضمیر کا یہی کارنامہ نہیں ہے کہ انھوں نے نئی طرز کے مرثیے کہنا شروع کیے، بلکہ انھوں نے تحت لفظ پڑھنے اور خاص کر اشاروں اور ہاتھ سے بتانے کا طریقہ بھی ایجاد کیا۔[۳۵] ظہیر نے اس طرز میں مزید جدتیں کر کے اسے ایک مستقل فن بنا لیا

---

۳۲: خمخانۂ جاوید، ۵: ۳۷۶

۳۳: لکھنؤ کا دبستانِ شاعری۔ ۶۸۰۔۶۷۹

۳۴: دربارِ حسین: ۳

۳۵: حیات دبیر: ۱۸

اور وہ مرثیہ پڑھنے پر بڑی محنت کرنے لگے۔ نواب سید محمد علی خاں عرف نواب دولہا رئیس شمس آبادی اپنے تذکرہ مرغوبِ دل (قلمی) میں لکھا ہے [36] کہ "میر ضمیر مرحوم جب تحت لفظ مرثیہ منبر پر پڑھتے تھے تو مضمون کی صورت ہو جاتے تھے۔ ان کے کسی بند پر واہ اور کسی پر آہ ہوتی تھی۔

آخری زمانے میں میر ضمیر نے مرثیہ یا سلام پڑھتے وقت بیچ بیچ میں کچھ سیدھی سادی اور موثر نثر پڑھنے کی روش بھی ایجاد کی تھی۔ وہ مرثیے کے چند بند یا سلام کے کچھ شعر پڑھ کر نثر میں ایسے مُبکی فقرے بھی پڑھتے تھے، جس سے مآل کار یعنی گریہ زیادہ ہو۔ خاص کر جہاں مختصر پڑھنا ہوتا تھا وہاں انھوں نے یہی طریقہ اختیار کر لیا تھا۔" [37]

شبلی نعمانی موازنۂ انیس و دبیر میں لکھتے ہیں [38]:

اب سے پہلے مرثیے سوز کے لہجے میں پڑھے جاتے تھے۔ اب تحت اللفظ کا رواج بھی ہوا اور غالباً پہلا شخص جس نے منبر پر بیٹھ کر تحت اللفظ پڑھا، میر ضمیر صاحب تھے۔"

اسی بات کو لالہ سری رام نے بھی دہرایا ہے لیکن آزاد کا بیان اس سے ذرا مختلف ہے۔ وہ لکھتے ہیں [39]:

"مرثیے کے لیے مسدس کا طریقہ آئین ہو گیا۔ وہ سوز اور تحت لفظ دونوں میں پڑھا جاتا تھا۔ اور جو کچھ اول متزاد کے اصول پر کہتے تھے، وہ نوحہ کہلاتا تھا، اسے سوز ہی میں پڑھتے تھے اور یہی طریقہ اب تک جاری ہے"

میں اس میں تھوڑی سی ترمیم کرنا چاہتا ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ مرثیے سوز اور تحت لفظ دونوں طریقے پر پڑھے جاتے تھے لیکن ضمیر کے زمانے سے دو طرح کے مرثیے لکھے جانے لگے۔ سوز خوانی کے مرثیے کلیتاً بینیہ ہوتے تھے اور تحت لفظ کے مرثیوں میں رزم اور بزم سبھی کچھ ہوتا تھا۔ اس زمانے میں یہ تبدیلی ہوئی کہ اب سوز خوانی کے مرثیے بالکل الگ ہو گئے۔ ضمیر کے

---

۳۶: دربار حسین: ۲ — ۳۷: ایضاً: ۷-۶

۳۸: ص ۵ — ۳۹: آب حیات: ۴۷۰-۴۶۹

یہاں کئی مرثیے سوز کے موجود ہیں۔ جنھیں وہ خود نہیں پڑھتے تھے بلکہ سوز خوانوں سے پڑھواتے تھے۔

سید علی بھی ضمیر ہی کے اہلِ خاندان سے تھے اور نامی سوز خوانوں میں شمار ہوتے تھے۔ رجب علی بیگ سرور نے فسانہ عجائب کے دیباچے میں لکھا ہے:

"مرثیہ خواں جناب میر علی صاحب نے وہ طرز مرثیہ خوانی کا ایجاد کیا کہ چرخِ کہن نے مسلم الثبوت استاد کیا۔ علمِ موسیقی میں یہ کمال بہم پہنچایا کہ اس طرح کا دُھرپت، خیال، ٹپہ گایا اور بنایا کہ کبھی کسی ایک کے وہم و خیال میں نہ آیا تھا۔ ایک رنگین احاطہ کھینچا ہے جو اس میں آیا، پھولا پھلا، دوان کا پیرو ہوا اور جس نے ڈھنگ جدا کیا، وہ ٹکسال باہر، بدرنگ ہوا۔ اگر تان سین جیتا ہوتا، ان کے نام پر کان پکڑتا، بھیک مانگ کھاتا، مگر یہ گاتا۔ ہزاروں شاگرد جگت استاد ہوا۔"

انھیں سید علی سوز خواں نے میر ضمیر کے مرثیوں کو پہلے پہل سوز میں باندھ کے لکھنؤ میں پڑھا پھر دوسرے سوز خواں بھی پڑھنے لگے۔ لیکن خود ضمیر نے کبھی سوز خوانی نہیں کی۔ اُن کی جدّتیں تحت لفظ ہی تک محدود رہیں۔

میر ضمیر کی مرثیہ خوانی کا وہ شہرہ تھا کہ ان مجلسوں میں ہزاروں کا مجمع اکٹھا ہو جاتا تھا۔ نجات حسین خاں نے اپنے سفرنامے میں صاف لکھا ہے کہ انھوں ضمیر کی جس مجلس میں شرکت کی تھی وہاں ضمیر کو سننے کے لیے بہت بڑا مجمع یکجا تھا اور خود انھیں کافی دور جگہ مل پائی تھی۔

**معاصرانہ چشمک:** میر ضمیر کے دور میں خلیق، فصیح اور دلگیر دو دوسرے مشہور مرثیہ گو تھے۔ موخر الذکر دو حضرات میں سے ایک کربلا زیارت کو گئے اور وہیں رہ پڑے اور دوسرے کی زبان میں لکنت تھی۔ لیکن خلیق اور ضمیر مدمقابل تھے اور دونوں ساتھ ساتھ طبیعت کی جولانیاں دکھاتے تھے۔ لکھنؤ کے تماشائی دو استادوں کو تعریفیں کر کر کے

---

[illegible]

لڑانے اور پھر دونوں کی استادیوں کا لطف اٹھانے میں ماہر تھے۔ مگر یہ دونوں با اخلاق اور سلامت رَو تھے۔ کبھی ایک ہی مجلس میں مجتمع نہ ہوتے تھے"[۴۱]
آخر ایک صاحب نے دونوں کو ایک مجلس میں جمع کرنے کی ترکیب نکالی۔ اس تجویز کے مطابق نواب شرف الدولہ کے مکان پر مجلس قرار پائی اور اعلان عام کر دیا گیا۔ ضمیر اور خلیق دونوں کو پڑھنے کی دعوت دی گئی مگر دونوں میں سے کسی پر یہ بات ظاہر نہیں کی گئی کہ دونوں کو ایک ہی مجلس میں پڑھنا ہوگا۔ البتہ دونوں کو پانچ پانچ سو روپیہ پیشگی ہی نذر کر دیے گئے۔ مجلس کے دن ہزاروں کا مجمع تھا۔ میر ضمیر ایک بجے منبر پہ گئے اور خوب داد پائی۔ ابھی وہ پڑھ ہی رہے تھے کہ انھوں نے میر خلیق کو آتے دیکھا اور پھر مرثیے کو اتنا طول دیا کہ بقول آزاد[۴۲] "آنکھوں میں آنسو اور لبوں پر تحسین بلکہ وقت میں گنجائش بھی نہ چھوڑی"۔ میر ضمیر کے بعد جب خلیق کی باری آئی تو انھوں نے مجلس کا رنگ بدل دیا۔۔ پندرہ بیس بند پڑھے تھے کہ ایک کو دوسرے کا ہوش نہ رہا۔ ۲۵۔ ۳۰ بند پڑھ کر اُتر آئے۔ دونوں کے کمال پر نعرۂ تحسین بلند ہوا اور دونوں کے ہوا خواہ خوش خوش اپنے گھروں کو پلٹے"[۴۲]
آزاد نے یہ روایت میر مہدی حسن فراغ کی زبانی نقل کی ہے لیکن میر علی حسن اشک[۴۳] کی روایت مختلف ہے۔ آزاد تک یہ روایت بالواسطہ مولوی شریف حسین خاں کی زبانی پہنچی تھی۔ اس روایت کے مطابق یہ معرکہ ایک غریب مگر خوش اعتقاد صاحب مجلس کے گھر پر ہوا۔ ان کی غربت اور خوش اعتقادی کی وجہ سے ہر نامی مرثیہ خوان ان کے یہاں

۴۱: آب حیات: ۴۷۱

۴۲: ایضاً: ۴۷۲۔ امجد علی اشہری نے حیات انیس میں بھی اس واقعہ کو اسی طرح دہرایا ہے بلکہ زیادہ تر آزاد ہی کے الفاظ جوں کے توں نقل کر دیے ہیں۔ صرف عبارت میں کہیں کہیں کمی بیشی کر دی ہے اور لطف یہ کہ حوالہ بھی نہیں دیا ہے۔

۴۳: اشک کے والد میر جنتی مرثیہ گو اور شاگرد دلگیر اور میر عماد خوش نویس کی اولاد میں تھے اشک شاگرد ناسخ اور صاحب دیوان تھے۔ حیدر آباد میں ملازم اور منصب دار تھے۔

جا کر پڑھتا اور خاص و عام سب ان مجلسوں میں شرکت کرتے۔ آتشک کی روایت کے مطابق یہ معرکہ میر ضمیر کے اشارے سے ہوا تھا۔ مجھے اس کے باور کرنے میں تامل ہے کیونکہ یہ ضمیر کی سلامت روی کے خلاف ہے۔ دوسرے یہ روایت بھی شاگرد خلیق کی ہے جو ضمیر کے حریف تھے۔

بہرحال، میر اشک کا بیان تھا کہ میر حسن کے انتقال کے بعد کچھ زمانہ میر خلیق پر خاصی تنگی کا گزرا۔ عیال فیض آباد میں تھے، لیکن والی اودھ اور امراء سب لکھنؤ میں رہتے تھے اور ما ان رزق یہیں تھا۔ خلیق لکھنؤ آتے رہتے اور سال بھر تین چار سو روپیہ جمع کر کے لے جاتے تھے جس سے بال بچوں کی پرورش کرتے تھے۔ لکھنؤ آتے تو ایک ٹوٹی پھوٹی عمارت میں، جو خالی پڑی رہتی تھی، اُترتے تھے۔ ایک دفعہ یوں ہی آئے۔ بستر کھولا، آگ سلگائی اور آٹا گوندھ رہے تھے کہ یہ بانی مجلس وارد ہوئے۔ ہاتھ جوڑ کر کہا کہ مجلس تیار ہے۔ مرثیہ پڑھ دیجیے۔ خلیق نے گندھا ہوا آٹا جوں کا توں چھوڑا اور ہاتھ دھو کر ساتھ ہو لیے۔ وہاں پہنچ کر دیکھا کہ میر ضمیر منبر پر مصروف مرثیہ خوانی ہیں۔ یہ واقعہ وہیں ہوا اور اُسی دن سے خلیق کی مرثیہ خوانی کی دھوم مچ گئی۔"[۴۴]

دبیر حلقۂ تلامذہ میں: مرزا سلامت علی دبیر جو بعد کو خود مرثیہ گوئی کی حیثیت سے مشہور آفاق ہوئے، ضمیر کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔ ثابت نے لکھا ہے کہ "مرزا دبیر گیارہ برس کی عمر میں تحصیل فارسی اور کسی قدر عربی کی فرما چکے تھے کہ رجحان طبعی دیکھ کر اُن کے والد ماجد میر ضمیر مرحوم کی خدمت میں لائے (یہ ۱۲۲۹ھ یا ۱۲۳۰ھ کا ذکر ہے) اور میر ضمیر کی خدمت میں پیش کر کے کہا کہ یہ بندہ زادہ ہے۔ اس کو مداحیٔ اہل بیت کا شوق ہے۔ میر ضمیر نے نام اور تعلیم وغیرہ کے بارے میں استفسار کیا، کلام سنا اور تخلص دریافت کیا تو مرزا دبیر نے عرض کیا تخلص ابھی تک نہیں رکھا۔ حضور کوئی تخلص تجویز فرما دیں، فرمایا 'دبیر' اور پھر کہا بر دبیران روشن ضمیر مخفی و محتجب

---

۴۴: آب حیات، ۴۷۳۔ ۴۷۲

۴۵: حیات دبیر

نمائندہ ور مسکرا کر بولے "صاحبزادے! میں نے اپنے نفس و نام پر تم کو مقدم کر دیا کہ اس مشہور جملے میں دبیر اول اور ضمیر بعد کو ہے۔ میں تم کو بتاؤں گا، ضرور کہا کرو۔

کچھ دنوں بعد ہی شاگرد دبیر نے استاد کی رہنمائی میں وہ مشق بہم پہنچائی کہ ان کا شمار بھی اس دور کے اچھے مرثیہ گویوں میں ہونے لگا۔ بعض بڑی مجلسوں میں لوگ ضمیر کے ساتھ دبیر سے بھی دعا لینے لگے۔ صورت یہ ہوتی کہ دبیر پیش خوانی کرتے اور ضمیر پر مجلس کا خاتمہ ہوتا۔"

**رنجش اور صفائی:** دبیر کی اس شہرت سے ضمیر کے دوسرے شاگردوں میں حسد کا جذبہ کروٹ لینے لگا۔ ان میں عابد علی بشیر پیش پیش تھے۔ یہ لوگ اس گھات میں لگ گئے کہ کسی طرح استاد شاگرد میں ٹکر کرادی جائے۔ لکھنؤ کے ایک رئیس افتخار الدولہ کے یہاں شبوں (۱۹ رتا ۲۱ ر رمضان) کی مجلسوں میں استاد شاگرد دونوں ساتھ ساتھ مجلس پڑھا کرتے تھے۔ بیسویں کو دبیر اپنا نیا مرثیہ اصلاح کے لیے استاد کے پاس لائے اور پوچھا کہ "آپ نے بھی کچھ فکر فرمائی ہے؟" ضمیر نے جواب دیا کہ میں عدیم الفرصتی کی وجہ سے تازہ فکر نہیں کر سکا، ایک پرانے مرثیے ہی میں کچھ نئے بند بڑھا لیے ہیں۔ مرزا دبیر اور میر بشیر دونوں ہی نے کہا استاد کا پرانا اور شاگرد کا نیا مرثیہ پڑھنا مناسب نہیں ہے۔ میر ضمیر کا تکیہ کلام "اور میرا صاحب" تھا۔ انھوں نے اس کا سہارا لیتے ہوئے کہا کہ ایسی باتیں ان کے ذہن میں بھی نہیں ہیں۔ دبیر نے اپنا نو تصنیف مرثیہ استاد کو پڑھنے کے لیے پیش کیا۔ آپ نے دبیر کے شاگرد میر ظہیر کے روایت پر لکھا ہے کہ بالآخر اس پر فیصلہ ہو گیا کہ مرثیہ کا ابتدائی حصہ مرزا دبیر پڑھیں اور آخر کا میر ضمیر۔ لیکن عین مجلس میں بشیر نے کچھ ایسا جوڑ توڑ کیا کہ استاد شاگرد میں کشیدگی پیدا ہو گئی اور اگرچہ دبیر نے صرف ابتدائی حصہ ہی پڑھا لیکن ضمیر اپنے پرانے مرثیے کے چند بند پڑھ کر منبر سے اتر آئے۔ میر ضمیر کے غصے کا یہ عالم تھا کہ جب مجلس کے خاتمے پر خلعت لایا گیا تو ٹھوکر مار کر کہا "اٹھا لے جاؤ" اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ دبیر نے بھی یہ کہہ کر خلعت پھیر دیا کہ "استاد کے فائدے پر جو اپنے فائدے کو مقدم رکھے، وہ ملعون ہے۔" اگلے دن دبیر استاد کے پاس گئے تو ان کی طرف سے کم التفاتی

کا اظہار ہوا۔
شاد عظیم آبادی نے میر ضمیر کے داماد، میر صفدر علی، کی زبانی یہ واقعہ یوں بیان کیا ہے کہ ماہ رمضان کا نہیں، بلکہ محرم کا تھا۔ ہوا یہ کہ اس سال ضمیر کی چھوٹی صاحبزادی کا انتقال ہو گیا تھا؛ اسی غم و الم کے باعث وہ گومتی پار چلے گئے تھے۔ اسی اثنا میں محرم قریب آ گیا اور جو مرثیہ انھوں نے شروع کیا تھا، اسے تمام نہ کر پائے۔ مجبوراً مرزا دبیر کے اصلاحی مرثیے کو پڑھنے کے لیے تیار ہو گئے۔ مگر مرزا دبیر قرارداد کے خلاف مجلس میں اپنا پورا مرثیہ پڑھ گئے۔ اسی دن سے میر ضمیر نے تحت لفظ پڑھنا شروع کیا۔"[46]

اس خفیف اختلافِ روایت کے باوجود یہ صحیح ہے کہ کشیدگی کا آغاز اسی طرح کی واردات سے ہوا؛ اور یہ سلسلہ چلتا رہا۔ بالآخر ایک روز وزیر اودھ، نواب علی نقی خان کی مجلس میں مرزا دبیر پڑھنے کو گئے۔ ضمیر بھی موجود تھے۔ مجلس میں شہزادے اور عمائد بھی آئے ہوئے تھے۔ جب تعریف کا غلغلہ بلند ہوا اور خود نواب علی نقی خاں نے اٹھ کر تعریف کی تو دبیر نے ضمیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ سب استاد کا تصدق اور فیض ہے۔ مجلس کے خاتمے پر استاد نے شاگرد کو گلے سے لگا لیا اور وہیں سے انھیں اپنے گھر لے گئے۔ یوں گلوں شکووں کے بعد صفائی ہوئی۔"[47]

مرزا محمد زکی واَلَم (شاگردِ انیس) کا بیان ہے کہ نواب علی نقی خاں کے یہاں عشرۂ محرم کی آخری تین مجلسیں تینوں نامی مرثیہ گو علی الترتیب پڑھتے تھے۔ ساتویں کو انیس، آٹھویں کو دبیر اور نویں کو ضمیر۔ ایک سال ۲۹ کو مطلع ابر آلود تھا اور رویتِ ہلال نہ ہوئی۔ ساتویں کو میر انیس مجلس پڑھ چکے تھے کہ باہر سے آنے والے ۲۹ کے چاند کی خبر لائے اور عادل گواہوں کی شہادت پر یقین کر کے مجتہدوں نے اعلان کر دیا کہ رویت انتیس ہی کی ہے۔ اب آٹھویں کی مجلس میں مرزا دبیر اور میر ضمیر دونوں ہی آئے۔ میر ضمیر کی تو باری ہی تھی کیونکہ نویں تاریخ ہو چکی تھی۔ نواب خود دبیر کے شاگرد تھے اس لیے اُن کو بھی پڑھوانا

---

۴۶: مکتوب مورخہ ۲۵، فروری ۱۹۶۷ء، جناب سید نقی احمد ارشاد بنام راقم

۴۷: حیاتِ دبیر، ۲۰۹۔ ۳۶

ضروری تھا۔ یہ وہ وقت ہے کہ استاد اور شاگرد میں صفائی ہو چکی تھی۔ نواب نے دونوں کے پاس آکر کہا کہ "قدرت نے بھی آپ دونوں کی صفائی کی تائید کر دی ہے۔ آج پہلے میرے استاد، پھر استاد الکل پڑھیں۔" ضمیر راضی ہو گئے۔ جب دبیر مرثیہ پڑھ چکے تو وزیر اور دبیر نے مل کر میر ضمیر سے پڑھنے کی درخواست کی۔ ضمیر نے رباعیوں سے ابتدا کی۔ اس زمانے میں دبیر کی رباعیاں "دبیر آیا ہے"، "فقیر آیا ہے" بہت مشہور تھیں۔ ضمیر نے بھی اسی ردیف و قافیہ میں رباعی پڑھی:

پہلے تو یہ شہرہ تھا ضمیر آیا ہے — اب کہتے ہیں استادِ دبیر آیا ہے
کر دی مری پیری نے مری قدر سوا — اب قول یہی ہے سب کا پیر آیا ہے

اسی مجلس میں میر ضمیر نے غالباً وہ مرثیہ پڑھا تھا جس کا مطلع یہ تھا:

پھر فکرِ کہن سلسلہ جنبانِ سخن ہے — پھر جوشِ معانی پہ مری طبعِ کہن ہے
خالی دُرِ دندان سے اگر دُرجِ دہن ہے — مضموں سے مگر معدنِ دُرہائے عدن ہے

ہو نطقِ جواں سے سخنِ پیر زیادہ
کھنچنے سے کماں کے ہو رواں تیر زیادہ[48]

پھر اس باہمی صفائی کے بعد دبیر، میر ضمیر کے گھر کی ماہانہ مجلس میں برابر مرثیہ پڑھا کیے۔ یہ مجلس سرائے معالی خاں میں ہوا کرتی تھی۔ یہ سلسلہ ضمیر کی حیات تک قائم رہا۔ اُن کے مرنے پر اُن کے سویم کی مجلس بھی دبیر ہی نے پڑھی تھی۔[49] اس کے علاوہ ۲۵ رجب کی مجلس امام باڑہ میر باقر میں ضمیر زندگی بھر پڑھتے رہے تھے۔ عہدِ محمد علی شاہ سے مرزا دبیر پڑھنے لگے۔[50] غرض، صفائی کے بعد ضمیر کے دل میں ذرا بھی کدورت نہیں رہ گئی تھی۔ بلکہ جس مجلس میں دبیر نے اشتہار دے کر اپنا غیر منقوط مرثیہ پڑھا تھا، میر ضمیر اور آتش بھی اسے سننے کے لیے گئے تھے اور منبر کے سامنے کوٹھے پر بیٹھے تھے۔[51]

**استادیِ انیس:** افضل حسین ثابت نے لکھا ہے۔[52]

---

۴۸: دربارِ حسین: ۳۰۲ — ۴۹: حیاتِ دبیر: ۳۸ — ۵۰: ایضاً: ۸۶
۵۱: ایضاً: ۴۴ — ۵۲: دربارِ حسین ۲۱

# جدید مرثیے کے بانی ضمیر لکھنوی

"بزرگوں کی زبانی سنا ہے کہ جب میر خلیق مرحوم فیض آباد سے لکھنؤ میں آئے ہیں اور میر ضمیر اور میر انیس مغفور فیض آباد ہی میں رہے تو میر خلیق اپنے فرزند کو میر ضمیر مرحوم کے سپرد کر آئے تھے۔ خلیق و ضمیر دونوں کا خاندانِ شاعری ایک ہے۔ دونوں صاحب میاں مصحفی کے شاگرد ہیں، اس لیے میر انیس کی شاگردی کی ہدایت فرمائی تھی۔"

شاگردانِ انیس کو اس سے انکار ہے کہ انیس نے کبھی ضمیر کی شاگردی بھی اختیار کی تھی۔ اس روایت میں یہ ٹکڑا تو یقیناً صحیح نہیں ہے کہ خلیق ضمیر سے پہلے لکھنؤ آئے، ضمیر ان سے بہت پہلے آ گئے تھے۔ ہاں، اس میں شک نہیں کہ انیس معنوی لحاظ سے ضمیر کا اتباع ضرور کرتے تھے۔ ثابت کی روایت درست نہیں معلوم ہوتی۔

**شاگردانِ ضمیر:** دبیر کا نام تو سرِ فہرست ہے ہی، لیکن ان کے علاوہ بھی کئی شاگرد تھے۔

(۱) مرزا اکبر علی منیر: یہ ریاست دھولپور میں ملازم تھے۔ خود بھی مرثیہ کہتے تھے اور ان کا طرزِ خوانندگی بھی بالکل ضمیر ہی کا تھا۔ مصرعوں کو بہت بتاتے تھے اور ہر مصرع پر مضمون کی تصویریں بناتے تھے

(۲) میر محمد عباس وقار: میر ضمیر کی زندگی بھر انھیں کے شاگرد رہے، لیکن ان کے انتقال کے بعد مرزا دبیر کو کلام دکھانے لگے

(۳) سید حسن عسکری: شیعہ مجتہدوں کے مشہور "خاندانِ اجتہاد" کے رکن تھے۔ اچھا مرثیہ کہتے تھے لیکن خود نہیں پڑھتے تھے بلکہ میر محمد رضا ظہیر سے پڑھواتے تھے۔ حسن عسکری بھی ضمیر کی وفات کے بعد مرزا دبیر سے اصلاح لیتے رہے۔

(۴) میر امیر علی امیر: امجد علی شاہ والیِ اودھ، کے میر منشی تھے۔ ضمیر کے شاگرد اور مرزا دبیر کے گہرے دوست تھے۔ انھوں نے مرثیہ و سلام کے علاوہ، اردو میں ایک مثنوی ضربتِ حیدری بھی لکھی ہے۔

(۵) منشی مظفر علی خاں اسیر: ثابت نے لکھنؤ کے معمرا اور معتبر باشندوں سے

سنا تھا کہ یہ بھی مرثیہ گوئی میں ضمیر کے شاگرد تھے۔[۵۳]

(۶) میر صفدر علی بھی ضمیر کے شاگرد تھے۔ انھیں سے نواب پیارے صاحب رئیس شمس آباد نے وہ رباعی سنی جو دبیر نے میر ضمیر کے چہلم میں پڑھی تھی۔[۵۴]

(۷) میر عابد علی بشیر: ان کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ میر ضمیر اور مرزا دبیر کی باہمی رنجش کا باعث یہی تھے۔ صفائی کے بعد مرزا دبیر نے میر ضمیر سے ان کا قصور بھی معاف کرایا۔

(۸) مرزا قادر شکوہ قادر دہلوی۔ یہ بھی میر ضمیر کے طرز پر مرثیے لکھتے تھے ان کا تعلق خاندانِ تیموریہ سے تھا۔[۵۵]

محسنینِ ضمیر: حکیم مہدی علی خاں وزیر اودھ کا تفصیلی ذکر مثنویوں کے ضمن میں آچکا ہے۔ اپنے دورِ اقبال میں انھوں نے ضمیر کے ساتھ سلوک کیا تھا۔ جب یہ معتوب و معزول ہوکر لکھنؤ کی سکونت ترک کرنے پر مجبور ہوئے اور وزارت اِن کے مخالف کو مل گئی، تو دنیا ان سے پھر گئی۔ اکثر شاعروں نے اِن کی ہجو لکھی۔ میر ضمیر سے بھی فرمائش کی گئی انھوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ معتوب وزیر دشمنِ اہلِ بیت نہ تھے کہ میں اُن کی ہجو کروں۔ اور نئے وزیر کی ناخوشی کا ذرا بھی خیال نہیں کیا۔ بارے، جلد ہی محمد علی شاہ بادشاہ ہوگئے اور حکیم مہدی علی خاں بحال کر دیے گئے۔ ورنہ شاید، ضمیر کو کوئی نقصان پہنچ جاتا۔[۵۶]
مرثیوں کے سلسلے میں وزیر علی نقی خاں کا بھی تذکرہ کیا جاچکا ہے۔ ضمیر کے ایک مرثیے کا مطلع ہے ع "مصحف سے ثبوتِ غم شاہ شہدا ہے" اس کے آخری بند میں ضمیر نے علی نقی خاں کا ذکر کیا ہے:

خاموش ہو گو خاتمۂ مرثیہ ہے دُور بیماری نے رکھا ہے ضمیر اب مجھے مجبور
ہاں دستِ دعا جلد اٹھا بادلِ رنجور اے صاحبِ اسرارِ خدا، سیدِ پُرنور!
نوّاب ہے محسن مرا، آباد رہے یہ
ہمنام علی اور نقی، شاد رہے یہ (علی نقی)

---

۵۳: ایضاً
۵۴: دربار حسین
۵۵: گلستانِ سخن ۳۹۵
۵۶: دربار حسین، ۵

## جدید مرثیے کے بانی ضمیر لکھنوی

نواب اشرف الدولہ ضمیر کے بڑے قدرداں تھے۔ ضمیر ان کے ہاں مجلسیں پڑھتے اور معقول معاوضہ پاتے تھے۔ محمد حسین آزاد نے لکھا ہے[50] کہ نواب صاحب ضمیر سے ہزاروں روپے کا فیاضانہ سلوک کرتے تھے۔ ابتدا میں انھیں کی قدر دانیوں کی وجہ سے دوسرے محسنین بھی ضمیر کی مائل ہوئے۔

نواب افتخار الدولہ بھی ضمیر کی قدر کرتے اور ان سے کچھ سلوک کیا کرتے تھے۔

شاہانِ اودھ میں نصیر الدین حیدر شاہ اور محمد علی شاہ نے بھی ضمیر پر نوازشیں کی ہیں۔ پوری تفصیلات تو معلوم نہیں لیکن ۱۲۵۳ھ میں جب حسین آباد کا امام باڑہ تعمیر ہوا تو اس کے لیے ذاکر مقرر کیے گئے تھے۔ وزیر مہدی علی خاں نے سو روپیہ ماہانہ تنخواہ پر ضمیر کو بھی اس امام باڑے میں ذاکری کے لیے مقرر کر دیا۔ یہ شاہی وظیفہ انھیں تا عمر ملتا رہا۔ میر ضمیر کے انتقال پر یہ عہدہ مرزا دبیر کو منتقل ہوا اور ان کی وفات پر مرزا اوج کو۔[58]

**اولاد:** ضمیر کے کئی فرزند پیدا ہوئے، لیکن ان کی زندگی ہی میں قضا کر گئے۔ قدرتاً اولاد کے زندہ نہ رہنے کا انھیں بڑا صدمہ تھا ایک مرثیے میں خاص طور پر دعا کی:

اس مرثیے کا بس یہ خدا مجھ کو صلا دے
اکبر کا تصدّق، مری اولاد جِلا دے

خدا کے فضل سے آخر عمر میں ایک صاحبزادے پیدا ہوئے۔ لیکن یہ ابھی دو ہی برس کے تھے کہ میر ضمیر کا انتقال ہو گیا۔ انھوں نے معمولی طور پر اردو پڑھی تھی۔ ثابت نے انھیں دیکھا تھا لیکن نام نہیں بتایا ہے۔ یہ صاحبزادے شعر نہیں کہتے تھے مگر مرثیے پڑھتے تھے۔

ضمیر کے کم از کم دو صاحبزادیاں بھی تھیں۔ ایک صاحبزادی اُس عہد کے مشہور مرثیہ گو، آغا عشق کو منسوب تھیں۔ دوسری میر سفدر علی کو بیاہی تھیں۔ یہ بھی مرثیہ گو اور سادات بارہ سے تھے۔

**اخلاق و عادات:** مصحفی نے ضمیر کو "سرآمدِ صلحائے عالی مقدار" کے خطاب سے یاد کیا ہے[59] یہ اس وقت کی بات ہے کہ ابھی ضمیر کا سن تیس پینتیس برس سے اوپر نہیں ہوا تھا۔

---

۵۰: آب حیات ۲/۲۱ ۵۸: دربارِ حسین: ۶ ۵۹: ریاض الفصحا: ۱۹۰

آزاد کا قول ہے کہ "وہ نہایت متقی اور پرہیزگار شخص تھے، تعجب یہ ہے کہ ساتھ اس کے طبیعت میں شوخی اور ظرافت بھی اتنی رکھتے تھے: گویا سودا کی روح نے حلول کیا ہے"۔[۶۰]
اپنے اتقا کی طرف خود ضمیر نے بھی ایک مرثیے میں اشارہ کیا ہے:

دل کعبہ صفت، مسکین معبود ہے میرا
عصیاں سے نہ دامن کبھی آلودہ ہے میرا

صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے اور صبح کی نماز کے بعد اوراد و وظائف میں مشغول رہا کرتے تھے۔ رسولؐ اور آلِ رسولؐ سے خاص شغف تھا۔ مرثیہ خوانی اور مرثیہ گوئی سب اسی رجحان کی آئینہ دار ہیں۔ ایک مرثیے میں یہ دعا کی ہے کہ ایک عزا خانے کی تعمیر کا انتظام ہو جائے:

مجھ پہ یہ عنایاتِ شہنشاہِ زماں ہو
تعمیر جو اک تعزیہ داری کا مکاں ہو

ضمیر کی مذہبی معلومات وسیع تھیں۔ زیادہ تر مذہبی لوگوں سے رسم و راہ تھی۔ لیکن جیسا کہ ذکر ہوا اُن کی رسائی امرا و وزرا تک بھی تھی۔ نواب رام پور اور بادشاہِ اودھ کے درباروں میں تصانیف لے کر حاضر بھی ہوئے۔ وہاں سے کیا کچھ عطیہ ملا اس کا علم تو نہیں ہے، لیکن اس کے ثبوت موجود ہیں کہ امرا اور صاحبانِ حیثیت اُن کی مالی اعانت کرتے رہتے تھے۔ ضمیر کی ایسی دعائیں بالکل ہی بے غرضانہ نہیں تھیں:

جب تلک اس فلکِ پیر کی بنیاد رہے
جس نے یہ مرثیہ کہوایا وہ آباد رہے

اسی کے ساتھ یہ بھی تسلیم شدہ ہے کہ اگر کسی بات کو اپنے خلافِ شان سمجھتے تھے، تو مال و زر کو ٹھکرا دینے میں بھی تامل نہیں تھا۔ رزقِ ضروری کی حد تک کوشش کرتے تھے، زیادہ کی ہوس نہ تھی۔ مثنوی مظہر العجائب میں خدا سے دعا کرتے ہیں:

| | |
|---|---|
| وا رہاں قیدِ درد و غم سے مجھے | اور تہی دستی کے الم سے مجھے |
| ہو نہ اتنا بھی مال و زر کا وفور | کہ مجھے ہو خیالِ کبر و غرور |

---

۶۰: آبِ حیات: ۴۶۹

بس فقط ہے یہ آرزو میری — جانے پاوے نہ آبرو میری
کیجیو مت مجھے پریشان وش — کسی نامرد خو کا منت کش
دل میں ہو جمع مال کی نہ ہوس — دے بقدرِ کفاف و دیگر بس

میر ضمیر اپنے ماں باپ کی بیحد عزت کرتے تھے، جو کچھ پاتے، اُن کی نذر کر دیتے تھے۔ خود کہا ہے:

ہو جو زر، نذرِ والدین کروں

وہ اربابِ حق کی خدمت کو، چاہے وہ بوڑھے ہوں یا جوان، ثواب جانتے تھے اور سب سے اخلاق سے پیش آتے تھے:

ہیں جو اربابِ حق چہ شیخ و چہ شاب — اُن کی خدمت کروں بکسبِ ثواب

امجد علی اشہری نے میر ضمیر کی مرنجان مرنجی اور سلامت روی کا خصوصی ذکر کیا ہے۔ نواب دولہا نے تذکرۂ مرغوب دل میں ضمیر کے بارے میں لکھا ہے: "یہ بزرگوار خوش مزاج، لطیفہ پرداز، نفیس طبع، خلقِ مجسم، وضعدار، پختہ رنگ، کشیدہ ابرو، متوسط قامت، لاغر اندام اور عادی افیونی تھے۔"[61]

**وفات:** میر ضمیر کا انتقال شنبہ ۲۳ محرم ۱۲۷۲ھ/۶ نومبر ۱۸۵۵ء کو ہوا۔
حاتم علی مہر نے تاریخ وفات لکھی جو ان کے دیوان میں موجود ہے۔ آخری بیت جس سے ہجری اور عیسوی تاریخیں نکلتی ہیں، یہ ہے:

ہجری و عیسوی لکھی تاریخ — جا کے حیدر سے مل ضمیر اب تو
۱۸۵۵ء

اگر حیدر کے اعداد ضمیر کے اعداد میں ملائے جائیں تو ۲۲۲+۱۰۵۰=۱۲۷۲ ہوتے ہیں جو ہجری تاریخ ہے۔ پورے مصرعے سے عیسوی سال یعنی ۱۸۵۵ برآمد ہوتے ہیں۔

مرزا مہدی قبول نے سالِ وفات کے علاوہ دن اور تاریخ بھی لکھ دی ہے:

ذاکرِ عالی نسب، والا حسب، یعنی ضمیر — رفت حسب الحکم خالق چوں ز عالم آہ وائے!
سالِ فوتش صوری و ہم معنوی گفتم، قبول — شنبہ و بست و سیم بود از محرم آہ وائے!

میر ضمیر کے بھانجے، میر تفضل حسین اکبر نے ضمیر کے چالیسویں کی مجلس میں یہ تاریخی قطعہ پڑھا تھا: (۱۲۷۲ھ)

---

۶۱: تذکرۂ مرغوب دل، نواب سید محمد علی خاں عرف نواب دولہا، قلمی، بحوالہ "دربارِ حسین": ۲

جب سیدِ ضمیر نے جامِ اجل پیا — دل نے خیال مصرعۂ تاریخ کا کیا
آئی ندا یہ غیب سے اے آبر کان میں — دستِ اجل نے پیرہنِ آخرت سیا

آخرت سیا سے ۱۲۷۲ کے اعداد ضرور نکلتے ہیں لیکن یہ تاریخ گوئی کے مسلمہ قاعدوں کے خلاف ہے کہ مضاف اور مضاف الیہ تک کو بیچ سے توڑ دیا جائے۔

میر ضمیر کے چالیسویں کی مجلس شان سے ہوئی تھی۔ اس میں آبر کے علاوہ مرزا دبیر نے بھی یہ تعزیتی (مگر غیر تاریخی) قطعہ پڑھا تھا:

آفاق سے استادِ یگانہ اُٹھا — مضمون سے جوہر کا خزانہ اٹھا
انصاف کا نوحہ ہے یہ بالائے زمیں — سرتاجِ فصیحانِ زمانہ اٹھا

تاریخی قطعہ کے علاوہ آبر نے اس موقع پر ایک غیر تاریخی اور تعزیتی قطعہ بھی پڑھا تھا:

رونق فزائے معنی و رنگیں بیاں اٹھا — سرتاجِ شاعرانِ فصیح جہاں اٹھا
پژمردگی سی گلشنِ مضموں پہ چھا گئی — جب سے ضمیر بلبلِ ہندوستاں اٹھا

## کتابیات


۱۔ ریاض الفصحا: غلام ہمدانی مصحفی (مرتبہ عبدالحق)۔ جامعہ برقی پریس، دہلی، ۱۹۳۴ء
۲۔ تاریخ ہندوی و ہندوستانی [فرانسیسی] (۳): گارسین دتاسی۔ پیرس، ۱۸۷۱ء
۳۔ آبِ حیات: محمد حسین آزاد۔ سرفراز پریس، لکھنؤ
۴۔ گلستانِ سخن: قادر بخش بہادر صابر دہلوی۔ نول کشور پریس لکھنؤ ۱۲۹۹ھ / ۱۸۸۲ء
۵۔ سراپا سخن: محسن علی موسوی محسن۔ نول کشور، لکھنؤ، ۱۲۷۷ھ
۶۔ سخن شعرا: عبدالغفور نساخ۔ نول کشور، لکھنؤ، ۱۸۷۴ء
۷۔ تذکرۂ نادر: کلب علی خاں نادر (مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب) لکھنؤ، ۱۹۵۰ء
۸۔ شمیم سخن: محمد عبدالحی صفا بدایونی۔ مطبع عین الہند و عین الاخبار، مرادآباد، ۱۳۰۱ھ / ۱۸۸۴ء
۹۔ خمخانۂ جاوید (۵): سری رام بدو مرتبہ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، ۱۹۴۰ء
۱۰۔ تذکرۂ مرغوبِ دل: نواب سید محمد علی خاں عرف نواب دولھا (قلمی، شمس آباد)

۱۱۔ دربار حسین: افضل حسین رضوی ثابت۔ مطبع اثنا عشری، دہلی، ۱۹۲۲ء
۱۲۔ حیات دبیر: افضل حسین رضوی ثابت۔ سیوک اسٹیم پریس، لاہور
۱۳۔ مختصر تاریخ ادب اردو: سید اعجاز حسین۔ یونین پرنٹنگ پریس، دہلی، ۱۹۵۳ء
۱۴۔ لکھنؤ کا دبستان شاعری: ابواللیث صدیقی۔ گیلانی پریس، لاہور (طبع دوم)
۱۵۔ اردو مثنوی کا ارتقا: شمالی ہند میں: سید محمد عقیل۔ اسرار کریمی پریس، الہ آباد، ۱۹۶۶ء
۱۶۔ مختصر تاریخ ادب اردو: اصغر حسین خاں نظیر لدھیانوی
۱۷۔ موازنہ انیس و دبیر: شبلی نعمانی۔ مفید عام پریس، آگرہ
۱۸۔ مقدمہ شعر و شاعری، حالی۔ نیشنل پریس، الہ آباد، (طبع سوم)
۱۹۔ حیات انیس: امجد علی اشہری
۲۰۔ مجموعۂ مرثیہ میر ضمیر: میر مظفر حسین ضمیر لکھنوی (نول کشور پریس، کانپور، جولائی ۱۸۹۸ء
۲۱۔ مراثی ضمیر: میر مظفر حسین ضمیر لکھنوی (قلمی مملوکہ سید مسعود حسن رضوی ادیب)
۲۲۔ مثنوی مظہر العجائب: میر مظفر حسین ضمیر لکھنوی (قلمی، ۱۲۷۲ھ و ۱۲۸۰ھ؛ مطبوعہ:
(۱) مطابع الانوار، سہارنپور، (۲) مظہر العجائب، لکھنؤ (۳) اثنا عشری، لکھنؤ (۴) شیخ ہند، لکھنؤ
۲۳۔ مثنوی ریحان معراج: میر مظفر حسین ضمیر لکھنوی۔ قلمی، ۱۲۶۲ھ؛ مطبوعہ مطبع احمدی لکھنؤ ۱۲۸۱ھ
۲۴۔ چہاردہ بند: میر مظفر حسین ضمیر لکھنوی (مملوکہ سید مسعود حسن رضوی ادیب)
۲۵۔ تین مختلف مثنویاں: میر مظفر حسین ضمیر لکھنوی (قلمی)
۲۶۔ فسانۂ عجائب: رجب علی بیگ سرور۔ نول کشور، لکھنؤ، ۱۲۸۳ھ
۲۷۔ نقوش، لاہور، جون، ۱۹۶۰ء؛ اردو مرثیہ: محمد طاہر صدیقی
۲۸۔ معاصر پٹنہ: سفرنامہ نواب نجات حسین خاں (          سید حسین)

## استدراک

ضمیر نے ایک مرثیہ رسول اللہؐ کی وفات سے متعلق بھی لکھا ہے، یہ راقم الحروف کے پاس موجود ہے۔ یہ حاشی ذرا کرم خوردہ ہیں۔ مطلع یہ ہے:

بپا غم رسول خدا ہے، کرو خروش

یہ مرثیہ بالا مراثی میں شامل نہیں ہے۔

مالک رام

# غبارِ خاطر

اس ملک پر انگریزوں کے سیاسی اقتدار کے خلاف ہماری پچاس سالہ جدّوجہد کا نقطۂ عروج وہ تھا، جسے "ہندستان چھوڑ دو" تحریک کہا گیا ہے۔ ۸ اگست ۱۹۴۲ء کو انڈین نیشنل کانگریس کا خاص اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا، جہاں یہ قرارداد منظور ہوئی کہ انگریز اس ملک کے نظم و نسق سے فوراً دست بردار ہو کر یہاں سے سدھاریں اور ہمیں اپنے حال پر چھوڑ دیں۔ اسی لیے اس کے بعد جو تحریک شروع ہوئی، اس کا نام "ہندستان چھوڑ دو" تحریک پڑ گیا۔

اس وقت دوسری عالمی جنگ اپنے پورے شباب پر تھی۔ انگریز بھلا ایسی قرارداد اور ایسی تحریک سے کیونکر صرفِ نظر کر سکتا تھا۔ اخباروں میں اس طرح کی افواہیں پہلے سے چھپ رہی تھیں کہ کانگریس اس مفاد کی قرارداد منظور کرنے والی ہے۔ اس لیے حکومت نے حفظِ ماتقدم کے طور پر سب انتظام کر رکھے تھے۔ اس زمانے میں مولانا ابوالکلام آزاد کانگریس کے صدر تھے۔ ۸ اگست کی شب کو دیر تک یہ جلسہ ہوتا رہا جس میں یہ قرارداد منظور کی گئی تھی۔ اسی رات کے آخری حصّے میں یعنی ۹ اگست کو علی الصباح حکومتِ وقت نے کانگریس کے تمام سرکردہ رہنماؤں کو سوتے میں بستروں سے اٹھا کر حراست میں لے لیا اور ملک کے مختلف مقامات پر نظر بند کر دیا۔ مولانا آزاد اور ان کے بعض دوسرے رفقا احمد نگر کے قلعے میں رکھے گئے تھے۔ مولانا آزاد کا یہ سلسلہ قید و بند کوئی تین برس تک رہا۔ اوّلاً

اپریل ۱۹۴۵ء میں وہ احمد نگر سے بانکوڑا جیل میں منتقل کر دیے گئے، اور یہیں سے بالآخر ۱۵ جون ۱۹۴۵ء کو رہا ہوئے۔ اسی نظر بندی کے زمانے کا ثمرہ یہ کتاب غبارِ خاطر ہے۔

غبارِ خاطر مولانا آزاد مرحوم کی سب سے آخری تصنیف ہے، جو اُن کی زندگی میں شائع ہوئی کہنے کو تو یہ خطوط کا مجموعہ ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ دو ایک کو چھوڑ کر، ان میں سے مکتوب کی صفت کسی میں نہیں پائی جاتی۔ یہ دراصل چند متفرق مضامین ہیں جنھیں خطوں کی شکل دے دی گئی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم کچھ ایسی باتیں لکھنا چاہتے تھے، جن کا آپس میں بظاہر کوئی تعلق یا مربوط سلسلہ نہیں تھا۔

عین ممکن ہے کہ اس طرح کے مضامین لکھنے کا خیال اُنھیں شہرۂ آفاق فرانسیسی مصنّف او فلسفی چارلس لوئی مونٹسکیو کی مشہور کتاب "فارسی خطوط" (۱۷۲۱ء) سے آیا ہو۔ اس کتاب میں دو فرضی ایرانی سیاح ——— ازبک اور ریکا ——— فرانس پر عموماً اور پیرس کی تہذیب و تمدّن پر خصوصاً [illegible] اور طنزیہ تنقید کرتے ہیں، اسلام اور عیسائیت کا موازنہ کرتے اور عیسائیت پر آزادانہ اظہارِ خیال کرتے ہیں، جو اُس عہد کی خصوصیت تھی۔ اس میں اور متعدد سیاسی اور مذہبی مسائل بھی زیرِ بحث آ گئے ہیں۔ اس کتاب کا دوسری زبانوں کے علاوہ عربی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔

لیکن وہ ان باتوں کو الگ الگ مضامین کی شکل میں بھی قلم بند نہیں کرنا چاہتے تھے، کیونکہ اُس صورت میں باہمی تعلق کے فقدان کے باعث، بعد کو اُنھیں ایک شیرازے میں یکجا کرنا آسان نہ ہوتا۔ اس مشکل کا حل اُنھوں نے یہ نکالا کہ اُنھیں کسی شخصِ واحد کے نام خطوں کی شکل میں مرتب کر دیا جائے۔ اُن کے حلقۂ احباب میں صرف ایک ہستی ایسی تھی، جو علم کی مختلف اصناف میں یکساں طور پر دلچسپی لے سکتی تھی۔ اُنھوں نے عالمِ خیال میں اُسی کو مخاطب تصور کر لیا اور پھر جب کبھی، جو کچھ بھی، ان کے خیال میں آتا گیا، اُسے بے تکلّف حوالۂ قلم کرتے گئے۔ یہ نواب صدر یار جنگ بہادر، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم کی ذات تھی؛ اور

نہیں مضامین یا خطوط کا مجموعہ یہ کتاب ہے۔

نروانی خاندان بہت مشہور ہے اور اس کی تاریخ بہت قدیم۔ ہندستان کے اسلامی عہد ب اس خاندان کے متعدد افراد بڑے صاحبِ اثر و نفوذ گذرے ہیں، یہاں تک کہ کئی رتبہ حکومتِ وقت کے ردّ و بدل میں اُن کی حیثیت 'بادشاہ گر' کی ہوگئی۔ اُن کے ں عہد کے کارنامے ہماری تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں۔

یکن اُن کا یہ دورِ دورہ یہاں سلطنتِ مغلیہ کے قیام سے پہلے ہی تک رہا چونکہ ہمایوں ے مقابلے میں شروانیوں نے شیر شاہ سُوری کا ساتھ دیا تھا، اس لیے جب ایرانیوں کی مدد ے ہمایوں نے دوبارہ اس ملک پر اپنا تسلّط جمالیا، تو اب قدرتی طور پر، شروانیوں کا تارہ زوال میں آگیا۔ اُن کی جمعیت شمالی ہند میں منتشر ہوگئی؛ اُن میں سے بیشتر نے کمریں سول دیں اور سپاہ گری کی جگہ کشاورزی کو اپنا پیشہ بنالیا۔ اُن کے زیادہ تر افراد پنجاب ے اطراف اور علی گڑھ اور ایٹہ کے اضلاع میں بس گئے؛ یہاں انھوں نے بڑی بڑی جاگیریں اور زمینداریاں پیدا کرلیں۔

پہلے اُن کے ہاتھ میں تلوار تھی، تو اب ہل تھا؛ اس لیے مدّتوں ان لوگوں نے قلم سے بہت کم سروکار رکھا۔ زیادہ سے زیادہ کسی نے ہمّت کی تو دینی پہلو سے اتنی استعداد پیدا کرلی کہ روزمرّہ کے مسائل میں شُدبُد ہوجائے۔ لیکن یہ صورتِ حال زیادہ دن تک قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ سیاسی انقلاب کی جو آندھی مغرب سے اٹھی تھی، دیکھتے ہی دیکھتے اُس نے سارے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ سیاسی استحکام و اقتدار حاصل ہوجانے کے بعد انگریزوں نے یہاں نئے طور طریقے، نئے انتظام، نئی زبان، نئی تعلیم جاری کردی۔ قدرتی طور پر اس کا اثر بہت وسیع ہوا۔ اب یہ ناممکن تھا کہ آبادی کا کوئی طبقہ اس سے مستغنی رہ سکے۔ چنانچہ رفتہ رفتہ شروانیوں کا رجحان بھی پڑھنے لکھنے کی طرف ہوا، اور انگریزی عہد میں انھوں نے جدید تعلیم سے متمتّع ہوکر ملکی معاملات میں برادرانِ وطن کے دوش بدوش

کام کرنا شروع کیا۔ انگریزی استیلا و اقتدار کے خلاف ہماری جنگِ آزادی میں بھی اس خاندان کے بعض افراد کی خدمات بہت نمایاں اور قابلِ قدر رہی ہیں۔

اسی شروانی خاندان کے گلِ سرسبد نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمٰن خاں مرحوم تھے۔ وہ ۵ جنوری ۱۸۶۷ء (۲۸ شعبان ۱۲۸۳ھ) کو بھیکم پور میں پیدا ہوئے۔ اُن کا خاندان یہاں انیسویں صدی کے اوائل میں آکر آباد ہوا تھا، اور اُن کے آبا و اجداد یہاں کے رئیس تھے۔ اُن کے والد محمد تقی خان صاحب (ف ۱۹۰۵ء/۱۳۲۳ھ) نے اپنے بڑے بھائی عبدالشکور صاحب کی حینِ حیات خاندانی جاداد اور زمینداری کے نظم و نسق میں کوئی حصہ نہیں لیا؛ بلکہ خود مولانا حبیب الرحمٰن خان کی تعلیم و تربیت بھی اپنے تایا صاحب کی نگرانی میں ہوئی۔ ان کی علومِ عربیہ و فارسیہ کی متعدد شاخوں میں تعلیم خاص اہتمام سے مختلف اساتذہ کی رہنمائی میں مکمّل ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے انگریزی کی طرف توجّہ کی، اور اس میں بھی بقدرِ ضرورت خاصی استعداد پیدا کرلی۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، شروع ہی سے اُن کی ذہانت و فطانت اتنی نمایاں تھی کہ ان کے والد نے موروثی صدر مقام بھیکم پور سے متصل ایک نئی گڑھی تعمیر کی؛ اس کے اندر دلکش باغات اور عالیشان مکان بنوائے، اور اس کا نام اپنے بیٹے کے نام پر حبیب گنج رکھا۔ عبدالشکور خان صاحب کا سفرِ حج سے واپس آتے ہوئے ۱۹۰۷ء (۱۳۲۵ھ) میں جدّہ میں انتقال ہوگیا۔ چونکہ چھوٹے بھائی محمد تقی خان صاحب اُن سے دو برس پہلے رحلت کرچکے تھے، اب ریاست کے انتظام کی ذمّہ داری مولانا حبیب الرحمٰن خان کے کندھوں پر آپڑی۔ اسے اُنھوں نے اپنی خداداد فہم و فراست اور دور اندیشی سے ایسی عمدگی سے انجام دیا کہ نہ صرف پانچ لاکھ کی مقروض ریاست اس بارِ گراں سے سبکدوش ہوگئی بلکہ اس میں دن دگنی رات چوگنی ترقی ہوتی گئی؛ اس کی تفصیل میں جانے کا نہ یہ موقع و محل ہے، نہ اس کی ضرورت۔ لیکن اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ صرف صاحبِ علم اور علم دوست ہی نہیں تھے، بلکہ اُن میں انتظامی

قابلیت اور دنیوی سوجھ بوجھ بھی بلا کی تھی ——— دو چیزیں جو بہت کم کسی ایک شخصیت میں جمع ہوتی ہیں۔

مولانا حبیب الرحمٰن خان کی تعلیم و تربیت جس نہج اور معیار پر ہوئی تھی، اُس نے بہت جلد انھیں ملک کے علمی حلقوں میں متعارف کرا دیا۔ اُن کا مزاج خالص علمی تھا۔ اُنھوں نے اپنے ذاتی شوق سے زرِ کثیر خرچ کر کے حبیب گنج میں ایسا نادر اور قیمتی کتاب خانہ جمع کیا کہ اس کی شہرت ملک سے باہر تک پہنچی۔ ان کے علم و فضل کو دیکھتے ہوئے اصحابِ مجاز نے انھیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات کا صدر مقرر کر دیا۔ یہیں سے اُن کا شہرہ دکن پہنچا، جس پر آصف جاہ ہفتم میر عثمان علی خان بہادر نظامِ دکن نے انھیں اپنی ریاست کے اُمورِ مذہبی کا صدر الصدور بنا کر جون ۱۹۱۸ء میں حیدرآباد بلوا لیا۔ دکن میں اُن کی علمی اور تعلیمی اور دینی خدمات ایسی وسیع اور گوناگوں ہیں کہ ان کے لیے الگ دفتر درکار ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے، حیدرآباد میں دارالترجمہ اگست ۱۹۱۷ء میں قائم ہوا تاکہ کتابوں وغیرہ کے ترجمے اور اصطلاحات کے وضع کرنے کا کام کیا جا سکے؛ لیکن عثمانیہ یونیورسٹی اس سے دو سال بعد ۲۸ اگست ۱۹۱۹ء کو قائم ہوئی۔ اپنی عمارت نہ ہونے کے باعث اس کی افتتاحی تقریب آغا منزل میں ہوئی تھی۔ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی اس کے پہلے "شیخ" (وائس چانسلر) مقرر ہوئے۔ اسی سال اپنے عہدے کی مناسبت سے انھیں اعلیٰ حضرت نظام کی طرف سے 'صدر یار جنگ' خطاب عطا ہوا۔ حیدرآباد میں اُن کا قیام اپریل ۱۹۳۰ء تک رہا۔

ملک جس سیاسی بحران اور کشمکش سے گذر رہا تھا، اس کے پیشِ نظر کسی شخص کا سیاسیات سے بالکل بے تعلق رہنا ناممکن تھا؛ تاہم نواب صدر یار جنگ نے اس میں کوئی عملی حصّہ نہیں لیا۔ حیدرآباد سے واپسی کے بعد اُنھوں نے اپنی تمام توجہ ملک کے متعدد تعلیمی اور علمی اداروں کے فروغ و ترقّی پر مبذول کر دی۔ ملک کی شاید ہی کوئی ایسی قابلِ ذکر علمی انجمن

ہوگی، جس سے اُن کا تعلق نہ رہا ہو۔

مرحوم شاعر اور مصنّف بھی تھے۔ حسرتؔ تخلّص تھا۔ اُردو میں منشی امیرؔ مینائی کے شاگرد تھے۔ فارسی کلام آغا سنجرؔ ایرانی کو دکھاتے تھے؛ کچھ مشورہ خواجہ عزیزؔ لکھنوی اور مولانا شبلیؔ سے بھی رہا۔ اُردو اور فارسی، دونوں زبانوں میں دیوان مطبوعہ موجود ہیں ــــــ اُردو میں کاروانِ حسرت اور فارسی میں بوستانِ حسرت۔ اور بھی متعدد کتابیں اُن سے یادگار ہیں: سیرۃ الصدیق، تذکرۂ بابر، حالاتِ حزیں، علمائے سلف، نابینا علما۔ ان میں سے زیادہ مشہور ہیں۔ ان کے متفرق مضامین کا مجموعہ بھی مقالاتِ شروانی کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔

ان کا بروز جمعہ ۱۱ اگست ۱۹۵۰ء (۸ ذی قعدہ ۱۳۷۰ھ) کو علی گڑھ میں انتقال ہوا۔ علی گڑھ سے تقریباً ۱۵/۲ میل کے فاصلے پر بھمّوری میں اپنے موروثی قبرستان میں آسودۂ خوابِ ابدی ہیں؛ یہ جگہ حبیب گنج سے کوئی میل بھر دُور ہوگی۔

نواب صدر یار جنگ سے مولانا آزاد کے تعلّقات ۱۹۰۶ء میں قائم ہوئے۔ میرا خیال ہے کہ اس میں مولانا شبلی مرحوم واسطۃ العقد ثابت ہوئے، جن سے مولانا آزاد کی پہلی ملاقات ۱۹۰۵ء کے وسط میں بمبئی میں ہوئی تھی۔ جب یہ مولانا شبلی سے ملے ہیں، تو وہ ان کی وسعت مطالعہ، ذہن کی برّاقی اور حافظے سے بہت متاثر ہوئے۔ وہ خود اُن دنوں حیدرآباد میں ملازم تھے۔ انھوں نے مولانا آزاد کو دعوت دی کہ یہاں آجاؤ اور الندوہ کی ترتیب و تدوین اپنے ہاتھ میں لے لو۔ لیکن مولانا آزاد کسی وجہ سے یہ دعوت قبول نہ کر سکے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مولانا شبلی کی عمر اس وقت ۴۸ سال کی تھی اور مولانا آزاد کی ۱۷ کے لگ بھگ۔ اس وقت ملک کے علمی حلقوں میں شبلی عالم اور ادیب اور مصنّف کی حیثیت سے مشہور ہو چکے تھے؛ اور الندوہ بھی ہر علمی پرچہ تھا۔ ایسی صورت میں ان کا اس نوجوان کو اپنا ہمکار بننے اور اس علمی رسالے کی باگ ڈور سنبھالنے کی دعوت دینا، جہاں ایک طرف

ان کی اپنی وسعتِ قلب اور علم دوستی، قدر شناسی اور خُرد نوازی کا بیّن ثبوت ہے، وہیں مولانا آزاد کے غیر معمولی علم و فضل اور صلاحیتوں کا بھی بہت بڑا اعتراف ہے۔

اس کے تھوڑے دن بعد مولانا شبلی حیدر آباد سے مستعفی ہو کر اگست ۱۹۰۵ء میں لکھنؤ چلے آئے اور یہاں دار العلوم ندوۃ العلما کے معاملات کے گویا کرتا دھرتا بن گئے۔ لکھنؤ پہنچ کر انھوں نے تجدیدِ دعوت کی۔ اب کی مولانا آزاد نے اسے قبول کر لیا۔ چنانچہ یہ اکتوبر ۱۹۰۵ء سے مارچ ۱۹۰۶ء تک سات مہینے الندوہ (لکھنؤ) کے ادارۂ تحریر سے منسلک رہے۔ نواب صدر یار جنگ سے ملاقات اسی ۱۹۰۶ء کی پہلی سہ ماہی میں ہوئی تھی۔ مولانا شبلی اور نواب صاحب مرحوم کے باہمی تعلقات کی طرف اوپر اشارہ ہو چکا ہے۔ مولانا آزاد بھی لکھنؤ کے دورانِ قیام میں دار العلوم میں مولانا شبلی ہی کے ساتھ مقیم تھے۔ اسی لیے میرا گمان ہے کہ جب نواب صاحب اس زمانے میں لکھنؤ گئے، تو مولانا شبلی کے مکان پر ان دونوں کی ملاقات ہوئی ہوگی۔

جوں جوں زمانہ گذرتا گیا، ان تعلقات میں خُلوص کی پختگی اور ایک دوسرے کی مقام شناسی کا جذبہ پیدا ہوتا گیا۔ انھی تعلقات کا ایک باب یہ کتاب ہے۔

(۲)

غبارِ خاطر کئی لحاظ سے بہت اہم کتاب ہے:

مولانا مرحوم کے حالات، بالخصوص ابتدائی زمانے کے، اتنی شرح و بسط سے کسی اور جگہ نہیں ملتے، جتنے اس کتاب میں۔ ان کے خاندان، ان کی تعلیم اور اس کی تفصیلات، عادات، نفسیات، کردار، اَمیال و عواطف، ان کے کردار کی تشکیل کے محرّکات —— ان سب باتوں پر جتنی تفصیل سے انھوں نے ان خطوں میں لکھا ہے، اور کہیں نہیں لکھا؛ اور ان کے سوانح نگار کے لیے اس سے بہتر اور موثّق تر اور کوئی ماخذ نہیں۔

اس کتاب کی دوسری اہمیت اس کا اسلوبِ تحریر ہے۔ جہاں تک معلوم ہو سکا ہے، وہ

بارہ تیرہ برس کی عمر ہی میں نظم و نثر لکھنے لگے تھے اور اسی زمانے میں ان کی تحریریں رسائل و جرائد میں چھپنے لگی تھیں۔ ظاہر ہے کہ ابتدائی تحریروں میں وہ پختگی نہیں تھی، جو کبھی نہیں سکتی تھی، جو مشق اور مرورِ زمانہ ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ اپنی زندگی کے مختلف ادوار میں انھوں نے بہت کچھ لکھا۔ اگر ہم اس پورے مجموعے پر تنقیدی نظر ڈالیں تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ زبان و بیان کے لحاظ سے اُن کے اُسلوبِ نگارش کا نقطۂ معراج غبارِ خاطر ہے۔ اس کی نثر ایسی نپی تُلی ہے، اور یہاں الفاظ کا استعمال اس حد تک افراط و تفریط سے بَری ہے کہ اس سے زیادہ خیال میں نہیں آسکتا۔ اُن کی ابتدائی تحریروں میں ناہمواری تھی۔ مثلاً الہلال اور البلاغ کے دَور میں اُن کے ہاں عربی اور فارسی کے ثقیل اور عسیر الفہم جملوں اور ترکیبوں کی بھرمار ہے۔ بیشک، ان پرچوں کا خاص مقصد تھا اور ان کے مخاطب بھی تعلیم یافتہ لوگ، بلکہ بہت حد تک طبقۂ علما کے افراد تھے۔ ان اصحاب سے توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ نہ صرف ان تحریروں کو سمجھ سکیں گے، بلکہ ان سے لطف اندوز بھی ہونگے۔ لیکن اس کے باوجود یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ یہ مطالب اس سے آسان تر زبان میں بیان نہیں ہو سکتے تھے۔ پس ظاہر ہے کہ عوام تو درکنار، متوسط طبقہ بھی ان سے پورے طور پر مستفید نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے برعکس غبارِ خاطر کو دیکھیے، تو یہاں ایک نئی دنیا نظر آتی ہے۔ اس میں عربی فارسی کی مشکل ترکیبیں آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ اس کی نثر ایسی شگفتہ اور دل نشیں ہے کہ یہ نہ صرف ہر کسی کے لیے قریب الفہم ہے، بلکہ اس سے لطف لیا جاسکتا ہے۔ آپ کہیں گے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں موضوع سہل ہے۔ بیشک، یہ توجیہ ایک حد تک درست ہے؛ لیکن بس ایک حد ہی تک۔ اسی مجموعے میں انھوں نے دو خطوں میں خدا کی ہستی سے تفصیلی گفتگو کی ہے (خط ۱۲ و ۱۳)۔ یہ موضوع آسان نہیں، بلکہ واقع یہ ہے کہ دنیا کا سب سے اہم اور مشکل اور پیچیدہ موضوع یہی ہے۔ ابتدا سے دنیا بھر کے فلسفی اور عالم اور عاقل اس سے متعلق لکھتے آئے ہیں، اور تمام مذاہب کی علّتِ غائی اور بنیاد یہی مسئلہ ہے۔

اگر اسی مسئلے پر انھوں نے اس سے تیس برس پہلے لکھا ہوتا تو اس زمانے میں ان کی جو افتاد تھی، اسے مدِّ نظر رکھتے ہوئے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس کا انداز اور اُسلوب کیا ہوتا لیکن یہاں انھوں نے جس طرح سے اس سے متعلق بحث کی ہے، اُس سے جہاں ان کے طرزِ استدلال کی دل نشینی نمایاں ہے، وہیں اُسلوبِ تحریر کی دلکشی بھی لفظ لفظ سے پھوٹی پڑتی ہے۔ ایک ایک لفظ احتیاط سے، کانٹے کی تول لکھا ہے —— کہیں تکرار نہیں ہے، کہیں الجھاؤ نہیں ہے، نگاہ اور زبان کسی جگہ نہیں اٹکتے ہیں۔

سی طرح ایک دوسرے خط (نمبر ۱۷) میں "انانیت" کا مسئلہ زیرِ بحث آگیا ہے۔ یہ موضوع بھی آسان نہیں؛ اور ذرا سی بے احتیاطی سے یہ نفسیات کی بھول بھلیاں اور علمی اصطلاحات کا مجموعہ بن سکتا ہے۔ لیکن یہاں بھی انھوں نے نہایت احتیاط سے کام لیا ہے؛ بحث کو عام سطح پر رکھا ہے تاکہ پڑھنے والا اسے سمجھے اور لطف اندوز ہو۔ اس سے معلوم ہوگا کہ واقعی اب نہایت مشکل مسئلوں اور موضوعوں سے متعلق بھی وہ ایسے انداز میں گفتگو کرسکتے تھے لہ یہ نہ صرف علمی پہلو سے وقیع ہو، بلکہ زبان و بیان کے لحاظ سے بھی وہ ایسی دلکشی کا حامل ہو کہ ہماری تاریخِ ادب کا حصہ بن سکے۔

اس مجموعے کے بعض خطوط بادی النظر میں بہت معمولی باتوں سے متعلق ہیں۔ مثلاً حکایتِ زاغ و بلبل (خط ۱۸) یا چڑیا چڑے کی کہانی (خط ۱۹، ۲۰)۔ بظاہر یہ ایسے عنوان ہیں، جن سے متعلق خیال نہیں ہوتا کہ کچھ زیادہ لکھا جاسکتا ہے۔ لیکن مولانا آزاد کی جولانیِ قلم کا یہ کرشمہ ہے کہ ان پر ۵۴ صفحے قلم بند کردیے ہیں۔ اُن کی دقّتِ نگاہ، جزئیات کا احاطہ، غیر عادی اور غیر معمولی چیزوں سے دل چسپی اور ان کی تفصیلات کا علم —— غرض کس کس بات کی تعریف کی جائے۔ اور پھر یہ سب کچھ ایسی سہلِ ممتنع زبان میں بیان ہوا ہے کہ اس کا جواب نہیں۔ یا مثلاً خط (۱۵) لیجیے جس میں اپنے چائے کے شوق کا ذکر ہے۔ یہاں پھر اُن کی باریک بینی اور مسئلے کے مالہٗ و ماعلیہ کا تفصیلی ذکر نمایاں ہے۔

چائے کی پتی، اس کی کاشت کی تاریخ، اس کے دوسرے لوازمات ——— ان سب باتوں کا ذکر ایسے چٹخارے لے لے کر کیا ہے کہ خیال ہوتا ہے، یہ چائے نہیں، بلکہ شراب طہور یا آبِ کوثر و تسنیم کا ذکر ہو رہا ہے۔ پینے کو چائے سب ہی پیتے ہیں، لیکن مولانا آزاد کا یہ خط پڑھنے کے بعد ایسا لگتا ہے کہ ہم نے آج تک چائے کبھی پی ہی نہیں، بلکہ کوئی نقلی چیز ہمیں دے دی گئی تھی، جسے ہم لاعلمی میں اصلی سمجھتے رہے۔ یہ ان کے حُسنِ انشا اور قوتِ بیان کا معجزہ ہے۔

پھر ان خطوں کا ایک اور مابہ الامتیاز ان کا ہلکا سا مزاحی رنگ ہے جو جا بجا الفاظ کا پردہ چاک کر کے جھانکنے لگتا ہے۔ انھوں نے الہلال میں بھی بعض مقالے ایسے لکھے تھے، جن میں مزاح کا رنگ چوکھا تھا۔ وہاں موضوع سیاسی تھا، یہاں موضوعِ سخن سیاسی چھوڑ، ادبی بھی نہیں؛ لیکن اس میں بھی وہ وہ گل افشانیاں کی ہیں کہ صفحۂ کاغذ کو کشتِ زعفران بنا کے رکھ دیا ہے۔ مثلاً احمد نگر کے قلعے میں باورچی رکھنے کا قصہ پڑھیے (خط ۸)، یا ڈاکٹر سیّد محمود کا گوریاؤں کی ضیافت کا سامان کرنا (خط ۱۸)، یا چڑیا چڑے کی کہانی (خط ۲۰) میں قلندر اور مُلّا کا حال ——— ان سب مقامات پر بین السطور مزاح کی کارفرمائیوں نے پوری تحریر کو اتنا شگفتہ اور دلکش بنا دیا ہے کہ یہی جی چاہتا ہے: وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔

اسی سے ایک اور بات کا خیال کیجیے۔ یہ ان کی مختلف جانوروں کی شکل وصورت اور عادات واطوار کی جزئیات کی تصویر کشی ہے۔ ہم میں سے کتنے ہیں جو اپنے حلقۂ احباب میں سے کم وبیش روز کے ملنے والوں سے متعلق بھی اتنی تفصیل سے جانتے اور اپنی معلومات اور تاثرات کو قلم بند کر سکتے ہیں! یہ مولانا آزاد کا کمال ہے کہ انھوں نے ان پرندوں کو حیاتِ جاودان بخش دی ہے۔ موتی اور قلندر، صوفی اور مُلّا جیتے جاگتے کردار ہیں، اور ان کی شخصیت عام گوریاؤں اور چڑوں کی بھیڑ سے کئی گنا نمایاں ہو گئی ہے۔

اور یہ بات صرف پرندوں ہی سے متعلق نہیں ہے۔ یہ تصویر کشی اور مواقع پر بھی ملتی ہے؛ مثلاً باغ میں پھول لگائے ہیں۔ ان زندانیوں نے دن رات کی محنت سے چمن تیار کیا؛ کچھ دن بعد اس میں رنگا رنگ کے پھول اپنی بہار دکھانے لگے۔ یہ ہم میں سے ہر ایک کا روز مرّہ کا مشاہدہ ہے۔ لیکن مولانا مرحوم کے لیے یہ اس سے بھی بڑھ کر کچھ چیز ہے۔ وہ ان پھولوں کی ابتدا اور نشو ونما، ان کی خاصیتوں، ان کی شکل وصورت، حسن وجمال، دلفریبی اور دلکشی وغیرہ سے متعلق ایسی تفصیل سے لکھتے ہیں کہ چشمِ تصوّر کے سامنے ایک ہرا بھرا باغ لہلہانے لگتا ہے۔

اور پھر ان سب سے بڑھ کر قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ معمولی سفر کا بیان ہو کہ پرندوں کا، کسی جنگ کا ذکر ہو کہ علمِ موسیقی کا، وہ اسے پند و موعظت اور دائمی صداقتوں اور ابدی اقدار سے الگ کر کے دیکھ نہیں سکتے؛ وہ اسے فوراً کسی کلیے کی شکل دے دیتے اور فطرت کے عالمگیر قوانین کے بالمقابل دیکھنے لگتے ہیں۔ مثلاً جب ان لوگوں کو بمبئی سے گرفتار کر کے احمد نگر لے گئے ہیں، تو یہ وہاں کے ریلوے اسٹیشن سے قلعے تک موٹر کاروں میں گئے تھے۔ لکھتے ہیں: "اسٹیشن سے قلعہ تک سیدھی سڑک چلی گئی ہے، راہ میں کوئی موڑ نہیں۔ میں سوچنے لگا کہ مقاصد کے سفر کا بھی ایسا ہی حال ہے؛ جب قدم اٹھا دیا، تو پھر کوئی موڑ نہیں۔" (ص ۲۷ - ۲۸) اسی سفر کا بیان ہو رہا ہے۔ سڑک پر موٹر کار پوری تیزی کے ساتھ مسافت طے کر رہی ہے۔ قلعہ جو پہلے فاصلے پر دکھائی دے رہا تھا، اب قریب نظر آنے لگا۔ چشم زدن میں یہ چند قدم کا فاصلہ بھی پورا ہو گیا اور موٹر کاریں صدر پھاٹک کے اندر داخل ہو گئیں۔ فرماتے ہیں: "غور کیجیے تو زندگی کی تمام مسافتوں کا یہی حال ہے۔ خود زندگی اور موت کا باہمی فاصلہ بھی ایک قدم سے زیادہ نہیں ہوتا۔" (ص ۲۸)۔ بالآخر زندانیوں کا یہ قافلہ قلعے کے اندر داخل ہو گیا اور پھاٹک بند کر دیا گیا۔ یہ روز مرّہ کا معمولی وقوعہ ہے، اور کوئی اس پر دھیان بھی نہیں دیتا۔ لیکن پھاٹک کے بند ہونے کی آواز سنتے ہی ان کا ذہن

کہیں اور پہنچ گیا اور یہ سوچنے لگے: "اس کارخانۂ ہزار شیوہ و رنگ میں کتنے ہی دروازے کھولے جاتے ہیں، تاکہ بند ہوں؛ اور کتنے ہی بند کیے جاتے ہیں، تاکہ کھلیں۔" (ص ۱۹)

جب پچھلی صدی کے شروع میں روسیوں نے بخارا پر حملہ کیا، تو امیرِ بخارا نے حکم دیا تھا کہ مدرسوں اور مسجدوں میں ختمِ خواجگان کا وِرد کیا جائے۔ اُدھر روسیوں نے قلعہ شکن توپوں سے گولے برسانا شروع کر دیے اور آخر کار بخارا فتح ہو گیا۔ لکھتے ہیں: "بالآخر وہی نتیجہ نکلا جو ایک ایسے مقابلے کا نکلنا تھا جس میں ایک طرف گولہ بارود ہو، دوسری طرف ختمِ خواجگان۔ دعائیں ضرور فائدہ پہنچاتی ہیں، مگر انہی کو پہنچاتی ہیں جو عزم و ہمت رکھتے ہیں۔ بے ہمتوں کے لیے تو وہ ترکِ عمل کا حیلہ بن جاتی ہیں۔" (ص ۱۴۹)

چڑیا کا بچہ جو ابھی گھونسلے سے نکلا ہے، ہنوز اُڑنا نہیں جانتا اور ڈرتا ہے؛ ماں کی متواتر اُکساہٹ کے باوجود اُسے اُڑنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ رفتہ رفتہ اس میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے اور وہ ایک دن اپنی تمام قوتوں کو مجتمع کر کے اُڑتا اور فضائے ناپیدا کنار میں غائب ہو جاتا ہے۔ پہلی ہچکچاہٹ اور بے بسی کے مقابلے میں اُس کی یہ چھُٹ اور آسمان پیمائی حیرتناک ہے۔ اسی طرح کا ایک منظر دیکھ کر لکھتے ہیں: "جونہی اس کی سوئی ہوئی 'خودشناسی' جاگ اٹھی اور اسے اس حقیقت کا عرفان حاصل ہو گیا کہ 'میں اُڑنے والا پرند ہوں'، اچانک قالبِ بیجان کی ہر چیز ازسرِنو جاندار بن گئی۔" پھر اسی سے حکیمانہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں: "بے طاقتی سے توانائی، غفلت سے بیداری، بے پروبالی سے بلند پروازی، اور موت سے زندگی کا پورا انقلاب چشم زدن کے اندر ہو گیا۔ غور کیجیے تو یہ ایک چشم زدن کا وقفہ زندگی کے پورے افسانے کا خلاصہ ہے۔" (ص ۲۳۲)

غرض پوری کتاب میں اس طرح کے جواہر ریزے منتشر ہیں، اور یہ اُن کی عام روش ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ وہ بنیادی طور پر مفکر ہیں۔ جیسا کہ انھوں نے خود کسی جگہ لکھا ہے، کچھ اسلاف چھوڑ گئے تھے، وہ انھوں نے ورثے میں پایا اور اُس کے حصول اور محفوظ رکھنے

انھوں نے کوتاہی نہیں کی؛ اور جدید کی تلاش اور جستجو کے لیے انھوں نے اپنی راہ خود بنالی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی ذات علومِ قدیمہ وجدیدہ کا سنگم بن گئی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہی ہونا چاہیے تھا کہ اُن پر غور و فکر کے دروازے کھل جاتے اور وہ ان راہوں سے ایک نئی دنیا میں پہنچ جاتے؛ اور یہی ہوا۔ یہ اقوال جو گویا ضرب الامثال کی حیثیت رکھتے اور انسانی تاریخ اور تجربے کا نچوڑ ہیں، اسی قران السّعدین کا نتیجہ ہیں۔

(۳)

مولانا آزاد مکّہ (حجاز) میں پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ ایک عرب خاندان کی چشم و چراغ تھیں۔ ظاہر ہے کہ گھر میں بات چیت عربی میں ہوتی ہوگی جو گویا ان کی مادری زبان تھی۔ جب تک خاندان حجاز میں مقیم رہا، وہاں اُردو کی باقاعدہ تعلیم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ البتہ گھر میں والد سے گفتگو اُردو میں ہوتی تھی؛ اور جو ہندُستانی استاد اُن کے پڑھانے کو مقرر کیے گئے تھے، ان سے بھی۔ لیکن قدرتی طور پر ابتدا میں ان کے اُردو سیکھنے کا کوئی اطمینان بخش انتظام نہ ہو سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب ان کے والد خاندان سمیت آخری مرتبہ ۱۸۹۸ء میں حجاز سے ہندُستان آئے، تو اس وقت تک مولانا آزاد کو جن کی عمر کم و بیش دس سال کی تھی، اُردو کی بہت کم واقفیت تھی؛ مزید براں اُردو کے غلط الفاظ اور غلط مخارج جو مکّہ میں عرب بولتے ہیں، اُن کی زبان پر بھی رائج تھے، جنھیں انھوں نے بتدریج کوشش کر کے دُور کیا۔ چونکہ حجاز سے واپسی پر ہندُستان میں بھی خاندان کا قیام کلکتہ میں رہا، جو اُردو کا علاقہ نہیں اور اُردو مراکز سے بھی دُور ہے؛ اس پر تعلیم بھی سراسر عربی اور فارسی کی رہی، اس لیے اس دوران میں بھی اُردو میں ترقی کرنے کے امکانات کم تھے۔ اس کے بعد اگرچہ مشق اور مزاولت اور محنت سے انھیں زبان پر پوری قدرت حاصل ہو گئی لیکن ان کے تلفظ میں کہیں کہیں غرابت اور قدامت کے اثرات آخر تک قائم رہے۔ مثلاً وہ سوچنا کی جگہ سونچنا (باضافہ نون غنہ) لکھتے ہیں (بولتے بھی اسی طرح تھے)۔ اس کے

تمام مشتقات میں بھی وہ اس نون کا اضافہ کرتے ہیں۔ مثلاً سونگھنا (ص ۲۰، ۴۴، ۴۸، ۴۴، ۸۲، ۲۲۶)، سونگھنے (۲۷، ۲۴۴)، سونگھتا ہوں (ص ۲۴۵)، سونگھا (ص ۱۰۶، ۱۶۵)، سونگھیں (ص ۱۱۴)، سونگھ (ص ۱۰۹، ۱۸۶)۔ اسی طرح ایک اور مصدر ڈھونڈنا ہے۔ اس کی قدیم شکل ایک ہائے ہوز کے اضافے کے ساتھ ڈھونڈھنا تھی۔ مرحوم اسی طرح لکھتے تھے۔ چنانچہ اس کتاب میں آپ کو قدم قدم پر اس کی مثالیں ملیں گی: ڈھونڈھنا (ص ۹۳، ۱۱۱، ۱۲۸) ڈھونڈھنے (ص ۸۷)، ڈھونڈھا (ص ۸۳)، ڈھونڈھی (۹۸، ۲۶۶)، ڈھونڈھیں (ص ۶۹)، ڈھونڈھتے (ص ۶۸، ۶۹، ۸۲، ۲۷۰)، ڈھونڈھتی (ص ۸۰)، ڈھونڈھوایا (ص ۸۷)، ڈھونڈھ (ص ۶۹، ۷۷، ۸۳، ۹۲، ۱۷۷، ۱۸۲)، یہ سب شکلیں ملتی ہیں۔ گھاس کو بھی پہلے گھانس بولتے اور لکھتے تھے۔ اب گھانس متروک ہے، اور گھاس ہی فصیح ہے۔ لیکن اسی کتاب میں ایک جگہ گھانس بھی آیا ہے (ص ۲۴۶)۔ بعض لفظوں کے دو دو املا بھی ملتے ہیں، مثلاً پاؤں اور پانوں (ص ۹۶) اگرچہ میرا گمان ہے کہ انھوں نے پانوں ہی لکھا ہوگا، پاؤں کاتب کا تصرف ہے۔

ابتدا میں اعراب بالحروف کا رواج عام تھا: الفاظ میں پیش کی جگہ واؤ، زبر کی جگہ الف اور زیر کی جگہ یائے لکھتے تھے۔ یہ دراصل ترکی زبان کی تقلید کا نتیجہ تھا۔ ۱۹۲۲ء تک، جب اتاترک نے ترکی کے لیے رومن رسم الخط اختیار کیا، یہ زبان بھی عربی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی اور اس میں اعراب کی جگہ حروف ہی استعمال ہوتے تھے۔ بتدریج یہ رواج کم ہوتا گیا اور بالآخر بالکل ترک ہو گیا۔ مولانا نے ان خطوں میں کم از کم تین لفظوں میں پرانے رواج کا تتبع کیا ہے۔ انڈیل کی جگہ اونڈیل (ص ۶۷، ۱۰۷)، اونڈیلی (ص ۱۰۶)، اور پرانی کی جگہ پورانی (ص ۲۴۱)، اگرچہ ایک جگہ پرانی بھی لکھا ہے (ص ۳۰)؛ اور اولجھن (ص )

زندہ زبان کی یہ خصوصیت ہے کہ نہ صرف خود اس میں تخلیق و تشکیل کا عمل جاری رہتا ہے، بلکہ وہ ہمیشہ طوعاً بھی دوسری زبانوں سے الفاظ لے کر اپنا خزانہ معمور کرتی رہتی ہے؛ اسے

ضرورت کے مطابق غیر زبانوں سے الفاظ لینے میں عار نہیں ہوتی۔ اُردو تو اس معاملے میں ہے بھی معذور اور حق بجانب، کیونکہ اس کا خمیر ہی متعدد ملکی اور غیر ملکی زبانوں کے اختلاط سے اٹھا تھا۔ ہم نے بیرونی زبانوں میں فارسی اور فارسی ہی کے واسطے سے عربی اور ترکی، اور سب سے آخر انگریزی سے سب سے زیادہ استفادہ کیا۔ انگریزی الفاظ اُس دور کی یادگار ہیں، جب انگلستان کا سیاسی غلبہ اس ملک پر مسلط ہو گیا۔ اِکا دُکا لفظ تو ہمیشہ آتا ہی رہتا ہے اور اسے آنا بھی چاہیے، لیکن چونکہ انگریزی کے ساتھ غیر ملکی اقتدار بھی وابستہ تھا، اس لیے غیر شعوری طور پر انگریزی لفظوں کے ساتھ کچھ ناپسندیدگی اور کراہت کا احساس ضرور رہا۔ اس کے باوجود ان لفظوں کا آنا ناگزیر تھا۔ یہ الفاظ دو حصوں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔ اول ان چیزوں کے نام جو انگریزوں کے ساتھ آئیں اور پہلے سے ہمارے ہاں موجود نہیں تھیں، یا ان نئے علوم کی اصطلاحات جو مغرب میں وجود میں آئے اور یہاں ان کی تعلیم انگریزی زمانے میں شروع ہوئی۔ ہم علمی اصطلاحات کو جوں کا توں لینے پر کسی حد تک مجبور تھے۔ لیکن یہ بات پہلی قسم سے متعلق نہیں کہی جا سکتی۔ ان سے ملتی جلتی چیزیں ہمارے یہاں موجود تھیں؛ ان کا آسانی سے عام فہم ترجمہ کیا جا سکتا تھا۔ ستم یہ ہوا کہ کچھ لوگوں نے اپنی تحریروں میں اندھا دھند انگریزی کے لفظ استعمال کرنا شروع کر دیے، حالانکہ اس کی کسی عنوان ضرورت نہیں تھی؛ اور لطیفہ یہ ہے کہ اس کی ابتدا سر سید اور اُن کے دوستوں سے ہوئی جو یا تو انگریزی بالکل نہیں جانتے تھے، یا بہت تھوڑی جانتے تھے۔ سر سید کی اپنی تحریروں میں انگریزی کے بہت لفظ ہیں؛ رہی سہی کمی ان کے مقلدین میں ڈپٹی نذیر احمد اور حالی اور شبلی نے پوری کر دی۔ انھوں نے غیر ضروری طور پر انگریزی کے ایسے لفظ بھی اپنی تحریروں میں استعمال کیے ہیں؛ جن کے لیے ان کے پاس کوئی عذر نہیں تھا۔

مولانا آزاد نے ان خطوط میں انگریزی کے بہت لفظ لکھے ہیں۔ ان میں سے بہت سے پہلی قسم میں شامل ہیں، مثلاً موٹر کار (۱۰)، اسٹیشن (۱۳)، ٹرین (۱۲)، ٹائم پیس (۱۳)، سگریٹ کیس (۱۴)، علا

وارنٹ (۱۶) سول سرجن (۵۲) وغیرہ۔ یہ تمام الفاظ اب عام طور پر اُردو میں بولے اور سمجھے جاتے ہیں اور انھیں زبان سے خارج کر کے ہم کوئی دانشمندی کا ثبوت نہیں دینگے لیکن بعض جگہ ان کے قلم سے کچھ ایسے لفظ بھی نکل گئے ہیں، جن کے مرادف ہمارے ہاں ملتے ہیں۔ مثلاً پریس (۹)، آفس (۵۹)، پریسیڈنٹ (۲۱)، میس (۸۷، ۱۹۵)، ہیٹر (۱۷۲)، ٹیبل (۱۳، ۱۶، ۲۴۰) وغیرہ ہیں۔ ان کا مفہوم آسانی سے ہم اپنے موجودہ ذخیرۂ الفاظ سے ادا کر سکتے ہیں، اور ہمیں قطعی ضرورت نہیں کہ ہم خواہی نخواہی ان سے اپنی تحریروں کو بوجھل بنائیں۔

زبان کی طرح مصنف کا اسلوب بیان بھی بدلتا رہتا ہے، اور بعض حالتوں میں تو یہ اس کے کردار کا آئینہ بن جاتا ہے۔ مولانا کی تعلیم خالص مشرقی انداز پر ہوئی۔ قدرتی طور پر مدتوں ان کا مطالعہ بھی زیادہ تر دینی علوم کا یا عربی فارسی کا رہا۔ لیکن جب انھوں نے انگریزی میں کافی مہارت پیدا کر لی، تو اس کے بعد انھوں نے مغربی علوم سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے انگریزی کتابیں بھی کثرت سے پڑھیں۔ اس کا اثر ان کی طرزِ تحریر پر پڑنا ہی چاہیے تھا۔ اب وہ غیر شعوری طور پر انگریزی روزمرہ کا تتبع کرتے ہیں بلکہ کہیں کہیں تو یہ خیال ہونے لگتا ہے کہ وہ انگریزی میں سوچ رہے اور اس کے محاوروں، جملوں کا ترجمہ کر رہے ہیں۔ غبارِ خاطر میں بھی اس کی مثالیں کچھ کم نہیں۔ مثلاً صبح مسکرا رہی تھی (۲۲، ۶۹)، یہ اس دورِ صبوحی کا آخری جام ہوتا ہے (۵۴)، مشغولیتوں میں گم ہو جاتا ہوں (۷۲)، آسمان کی بے داغ نیلگونی اور سورج کی بے نقاب درخشندگی (۷۲)، یہ خیال بس کرتا ہے (۷۷)، میرے اختیار کی پسند نہیں تھی (۸۴) حالات کی مخلوق (۹۴) گرد و پیش کے موثرات (۹۴) ——— یہ سب جملے اور ترکیبیں اپنی ساخت میں بنیادی طور پر انگریزی کی ہیں۔ چونکہ قلعۂ احمد نگر کی نظربندی کے ایام میں عام طور پر انگریزی کتابیں ان کے مطالعے میں رہیں، وہی ترکیبیں ان کے ذہن میں بسی ہوئی تھیں اور جب وہ [illegible] اُردو کا جامہ پہن لیا

گوپی چند نارنگ

# اردو کے افعالِ مُرکّبہ پر ایک نظر

اردو گرامر میں جو چیز سب سے زیادہ پیچیدہ، سب سے زیادہ مشکل اور اس لحاظ سے جس کا تجزیہ سب سے زیادہ دلچسپ ہے، وہ افعال ہیں، اور افعال میں بھی مرکّب افعال۔ میں انھیں اردو گرامر کی اصل بنیاد کہتا ہوں۔ مولوی عبدالحق نے صحیح لکھا ہے کہ اردو میں "سب سے زیادہ کارآمد اور کثیرالاستعمال امدادی فعل ہوتا ہے۔ امدادی افعال کی مدد سے بے شمار لطیف اور نازک معنی پیدا ہو جاتے ہیں اور اردو زبان میں امدادی افعال نے بڑی وسعت اور نزاکت پیدا کر دی ہے"۔ اردو اور ہندی میں افعالِ مرکّبہ کے ارتقا کے بارے میں کئی طرح کی قیاس آرائی کی جا سکتی ہے، مثلاً یہ کہ قدیم آریائی نسل وقت کی رفتار کا عجیب و غریب احساس رکھتی ہوگی، یا یہ کہ وہ ریاضیاتی ذہن رکھتی تھی اور اُس کا اثر افعال کے استعمال پر بھی پڑا، یا یہ کہ ہندستان کی گرم آب و ہوا کی وجہ سے کاہلی اور آہستہ روی کی جو ایک عادت سی پیدا ہو جاتی ہے، ہندی اور اردو افعال کا پھیلاؤ اُسی کا نتیجہ ہے۔ بہرحال وجہ کچھ ہو، اتنی بات واضح ہے کہ افعال کی کثرت کی وجہ سے اردو کا معنوی رُتبہ بہت بلند ہے اور انھیں کی بدولت اردو میں زمانے اور حالت کے نازک سے نازک فرق کو نہایت صحت کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے۔

# اردو کے افعالِ مرکبہ پر ایک نظر

افعالِ مرکبہ کی بحث شروع کرنے کے لیے سب سے پہلے ان چند جملوں کو لیجیے:

| | | |
|---|---|---|
| (۱) احمد آیا | ف[1] | فعل |
| (۲) زید بیمار ہے | ف | فعلِ ناقص |
| (۳) اُس نے کوشش کی | س + ف | فعلِ مرکب |
| (۴) میں نے اُسے سمجھا دیا ہے | ف + ف + ف | فعلِ مرکب |
| (۵) وہ چائے پی رہا ہے | ف + ف + ف | فعل |

پہلے جملے میں ایک فعل ہے "آیا"۔ اسے سادہ فعل کہا جاتا ہے۔ دوسرے جملے میں بھی ایک فعل ہے لیکن چونکہ اس سے کام کا کرنا نہیں، ہونا ظاہر ہوتا ہے اسے فعلِ ناقص کہتے ہیں۔ تیسرے چوتھے اور پانچویں جملے میں فعل کی ساخت مختلف ہے۔ تیسرے جملے میں کوشش اسم ہے اور کرنا مصدر سے مل کر فعل بنا ہے (یعنی س + ف)۔ ہماری گرامروں میں اسے فعلِ مرکب کہا جاتا ہے۔ چوتھے جملے میں "سمجھا + دیا + ہے" کل تین فعل ہیں (یعنی ف + ف + ف)۔ یہ بھی فعلِ مرکب ہے۔ پانچویں جملے میں بھی فعل کی ساخت یہی ہے: پی + رہا + ہے (یعنی ف + ف + ف) مگر اسے ہماری گرامروں میں سادہ افعال ہی کے تحت پیش کیا جاتا ہے۔ (ملاحظہ ہو قواعدِ اردو از مولوی عبدالحق، حالِ ناتمام کا بیان، وہ لا رہا ہے، وہ لا رہے ہیں، وغیرہ، جیسے وہ لایا، وہ لائے وغیرہ سادہ افعال کی گردانوں کے ساتھ جگہ دی گئی ہے)۔ اس سے اتنی بات ظاہر ہے کہ ہماری گرامروں میں افعالِ مرکبہ کا کوئی واضح تصور موجود نہیں ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ فعلِ مرکب وہ ہے جو امدادی افعال یا اسما یا صفات کے ساتھ ترکیب دینے سے بنتا ہو۔ اس تعریف کی روشنی میں پانچویں جملے میں پینا کو رہنا کے ساتھ ترکیب دیا گیا ہے، گویا ساخت کے اعتبار سے یہ اتنا ہی مرکب فعل ہے جتنا سمجھا دینا۔ لیکن ہماری گرامروں میں اسے سادہ فعل بتایا جاتا ہے! ان گرامروں کا یہ پہلو دلچسپی سے خالی نہیں کہ ایک طرف تو تین فعل والے فعل کو سادہ فعل کہا جاتا ہے اور دوسری طرف ایک فعل والے فعل یعنی کوشش

[1] ف = فعل؛ س = اسم۔

# اردو کے افعال مرکبہ پر ایک نظر

کرنا کو فعلِ مرکب کے تحت درج کیا جاتا ہے ۔ (یہ صحیح ہے کہ پرانے انداز کی فارسی عربی تعلیم دینے والے ترکیبِ نحوی کرتے ہوئے پہلے حصے کو اسم اور دوسرے کو فعل بتائینگے لیکن اردو گرامر انھیں فعلِ مرکب ہی کہتی ہے)۔ واقعہ یہ ہے کہ کوشش کرنا، شروع کرنا، یقین کرنا، بات کرنا وغیرہ اسمیہ فعل ( Nominal Verbs ) ہیں کیونکہ ان کی ساخت س+ف ہے اور اس لحاظ سے یہ سمجھا دینا، سنا دینا، گر پڑنا، بلا لینا، رکھ لینا سے مختلف ہیں جن کی ساخت ف+ف ہے۔ ساختی لسانیات ( Structural Linguistics ) کی رُو سے اردو کے افعالِ مرکبہ صرف وہ ہیں جو ایک سے زیادہ فعل سے ترکیب پائیں۔

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ ساختی لسانیات کی مقبولیت سے پہلے کی گرامریں خواہ وہ اردو کی ہوں یا فارسی کی، سنسکرت کی یا انگریزی کی، سب کی سب اطالوی گرامروں کی روایت کی پیروی کرتی ہیں، انھیں جدید لسانیات کی اصطلاح میں روایتی Traditional گرامر کہا جاتا ہے۔ یہ گرامریں صدیوں سے رائج ہیں اور تعلیمی کاموں کے لیے ان کی خوبیاں مسلّم ہیں۔ لیکن ان میں نقص یہ ہے کہ ان کا انداز فلسفیانہ ہے یعنی یہ زبان کو بندھے ٹکے صرفی اور نحوی تصورات کے چوکھٹے میں تو پیش کر دیتی ہیں لیکن جدید ذہن کے تجزیاتی تقاضوں کا اس لحاظ سے ساتھ نہیں دیتیں کہ یہ زبان کی ساخت کے ساتھ پورا پورا انصاف نہیں کرتیں۔ گویا ان گرامروں کا حال تیار شدہ کپڑوں کا سا ہے۔ یعنی چیز پہلے سے تیار ہے، اب اُسے کسی نہ کسی طرح جسم پر درست کرنا ہی پڑیگا۔ یوں ذرا سا جھول تو شاید رہیگا ہی، اسے نظر انداز کر دیجیے۔

افعالِ مرکبہ کی اس بحث کے لیے میں نے مولوی عبدالحق کی گرامر کو پیشِ نظر رکھا ہے، یہ بلاشبہ اردو کی سب سے جامع گرامر ہے۔ اردو کی دوسری گرامروں اور تمنا عمادی کی کتاب افعالِ مرکبہ (کراچی، ۱۹۶۱ء) میں بھی چونکہ افعال کی بحث کا انداز یہی ہے، اس لیے اُن کو بھی اسی پر قیاس کرنا چاہیے۔

مولوی عبدالحق نے مرکّب افعال کے بیان میں فعل کے دوسرے جُز یعنی دینا، لینا، جانا، ڈالنا، پڑنا، چکنا، رکھنا، سکنا، لگنا، چلنا وغیرہ کو بحث کی بنیاد بناتے ہوئے

# اردو کے افعالِ مرکبہ پر ایک نظر

لکھا ہے کہ ان کے ساتھ لگنے سے اس سے کیا کیا نئے یا اضافی معنی حاصل ہوتے ہیں۔ ان کی چند مثالیں حسبِ ذیل ہیں۔

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| بتا دینا ۱ | آنے دینا ۴ | آیا کرنا ۳ | بکے جاتا ہے ۵ | بولتا رہا ۲ |
| کہتا رہا ۲ | کہے جاتا ہے ۵ | چلا جانا ۳ | اڑنے پانا ۴ (اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے) | |
| جانے دینا ۴ | لے لینا ۱ | سوتا رہا ۲ | رویا کرنا ۳ | سن لینا ۱ |

نا امیدی مٹائے جاتی ہے

شوق نقشہ جمائے جاتا ہے

جدید لسانیات ان افعال کو بالکل دوسری طرح پیش کرے گی۔ یعنی وہ پہلے امدادی فعل کو نہیں، بلکہ اصل فعل کو لیگی، اور خاص طور پر اصلی فعل کی بھی اُن شکلوں کو جو بنیادی کا کام دیتی ہیں۔ اس بات کی وضاحت کے لیے ان ہی افعال پر دوبارہ نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ اگر ان کو ساخت کے نقطۂ نظر سے دیکھیے، تو معلوم ہوگا کہ ان میں کم از کم پانچ طرح کی نحوی ترکیبیں Phrase Structures ملتی ہیں۔ ان کی تفصیل یوں ہے:

۱. م + ف[1]

۲. ح + ف

۳. مض + ف

۴. مص + ف

۵. ع + ف

مندرجہ بالا افعال میں ساخت کی اس خصوصیت کو ہندسوں سے ظاہر کر دیا گیا ہے۔ یعنی "بتا دینا" کے نیچے ہندسہ ۱ لکھا ہوا ہے، اس کا مطلب ہوا: مادۂ فعل + فعل، "آنے دینا" کے نیچے ۴ لکھا ہوا ہے، یعنی مصدر + فعل، علیٰ ہذا القیاس۔ افعالِ مرکبہ کا ذکر کرتے ہوئے ان کی ساخت کا یہ احساس نہایت ضروری ہے، کیونکہ فعل کا پہلا جزو یعنی اصلی فعل ہی بنیادی چیز ہے۔ یہ اکثر و بیشتر جملے میں جوں کا توں قائم رہتا ہے، جب کہ دوسرا جزو یعنی

---

[1] م = مادۂ فعل؛ ح = حالِ مطلق؛ مض = ماضی مطلق؛ مص = مصدر؛ ع = مضارع

## اردو کے افعالِ مرکبہ پر ایک نظر

امدادی فعل لازماً تعداد، جنس، زمانے اور حالت کا اثر قبول کرتا ہے اور تبدیل ہوتا رہتا ہے چنانچہ افعالِ مرکبہ کا وہی بیان زیادہ با اصول اور سلجھا ہوا ہوگا جو اصلی فعل کی مختلف شکلوں کو بنیاد بنا کر پیش کیا جائیگا۔ یہ بات خاطر نشان رہنی چاہیے کہ زبان کی بحث میں ساخت مقدم ہے، معنی کی سطح ساخت کی سطح کے بعد آتی ہے۔ ان افعال سے متعلق اس طرح کے تجزیے کی ایک کوشش میں نے وسکانسن یونی ورسٹی (ریاست ہائے متحدہ امریکہ) میں کی تھی، اس کے نتائج مختصراً یہاں پیش کیے جاتے ہیں:

ا۔ مادۂ فعل سے مل کر بننے والے (م+ف):

Completives کام کا تمام و کمال ختم ہونا بحالت، بول چکنا۔ کر چکنا کھا چکنا

(ب) Potentials (امکانی حالت، قابلیت یا اجازت):

کر سکنا سن سکنا لکھ سکنا جا سکنا

(ج) Intensives (تکمیلِ فعل، تقیید اور زور، جبر، بے اختیاری، اچانک پن):

مار ڈالنا چیر ڈالنا کاٹ ڈالنا کھو بیٹھنا بتا دینا پی جانا لڑ پڑنا گر پڑنا دبا رکھنا سن رکھنا لے جانا ہٹا دینا سن لینا بول اٹھنا کر بیٹھنا چڑھ بیٹھنا لوٹ جانا پھینک لینا بگڑ جانا نہ نکلنا چھوٹ نکلنا آ ملنا بکھر جانا اٹھ جانا دیکھ آنا دیکھ لینا دیکھ جانا (اردو میں زیادہ تعداد اسی قسم کے افعالِ مرکبہ کی ہے)۔

(د) Continuatives-A (جاری ہونا) کھا رہا ہے رکھا رہا ہوگا۔

(ہ) Statics (ایک حالت پر قائم رہنا)۔ بیٹھ رہنا سو رہنا اٹک رہنا

(و) Personals (فاعل کی قربت): بلا لینا رکھ لینا لے لینا

۲۔ حالِ مطلق سے مل کر بننے والے (ح+ف)

Continuatives-B (فعل کا جاری رہنا رہونا آہستہ آہستہ):

بولتے رہنا لکھتے رہنا گاتے رہنا لکھتے جانا بہتے جانا پڑھتے جانا

(مادہ جنس اور تعداد سے متاثر ہوتا ہے)۔

۳۔ ماضی مطلق سے مل کر بننے والے (ض+ف):

(الف) Habituatives (عادت): بولا کرنا رویا کرنا مارا کرنا آیا کرنا کہا کرنا سنوارا کرنا

(ب) Continuatives-C (فعل کا جاری رہنا اور ختم ہونا): پڑے رہنا کھڑے رہنا بیٹھے رہنا (مادہ جنس اور تعداد سے متاثر ہوتا ہے)۔

(ج) Desiratives (خواہش): بولا چاہنا کیا چاہنا ہوا چاہنا

۴۔ مصدر سے مل کر بننے والے (ص + ف):

(الف) Inceptives (کام کا شروع ہونا): بولنے لگنا رونے لگنا مارنے لگنا کھانے لگنا کرنے لگنا سننے لگنا

(ب) Permissives (اجازت): بولنے دینا کھانے دینا آنے دینا اڑنے پانا ملنے پانا جانے دینا

۵۔ مضارع سے مل کر بننے والے (ع + ف)

Continuatives-D (فعل کا تسلسل): کہے جانا بکے جانا روئے جانا

اس خاکے میں صرف خاص خاص افعال کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں سے بعض صرف خاص حالتوں اور بعض صرف خاص زمانے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ اکثر امدادی افعال تنہا بھی استعمال ہوتے ہیں، لیکن بعض نہیں بھی ہوتے۔ ان سب کا احاطہ کرنے کی یہاں کوشش نہیں کی گئی۔ اردو میں مرکب افعال کا استعمال بہت متنوع اور خاصا پھیلا ہوا ہے۔ ان سے بننے والے محاوروں اور ترکیبوں کی تعداد بلاشبہ ہزاروں تک پہنچےگی۔ میں نے جو تجزیہ پیش کیا ہے، یہ محض اس ضرورت کا اظہار ہے کہ اگر افعال کو ان کی ساخت کے اعتبار سے لیا جائے تو انھیں سمجھنا اور سمجھانا نسبتاً آسان ہے، اور انھیں حتمی صحت سے پیش بھی کیا جا سکتا ہے۔

عابد رضا بیدار

# مصحفی کا مطالعہ

عجیب شاعر ہے یہ مصحفی بھی

اتنے اشعار اردو کے کسی شاعر نے نہیں کہے جتنے مصحفی نے۔ [آٹھ قلمی اردو دواوین (ایک دیوان نصائد) فارسی کا قلمی دیوان (رام پور الگ رہا)] میر کے بھی نہیں۔ اور ان اشعار کی تو کچھ گنتی ہی نہیں جو وہ اپنے ان گنت شاگردوں کو کہہ کے دیتے رہتے تھے۔

اردو کے کسی شاعر کا سلسلۂ شاعری اتنا وسیع نہ ہو سکا جتنا مصحفی کا۔ اور کم شاعروں کو شاگردوں کی اتنی بڑی تعداد میسر آئی ہوگی۔ میر اور قائم کے سوا (ہمارے عہد سے پہلے) اردو کے بڑے شاعروں میں مصحفی کی اس خصوصیت میں کوئی شریک نہیں کہ وہ ایک نقاد شاعر ہیں۔ اچھے سخنور ہونے کے ساتھ ساتھ خوش ذوق سخن فہم ہونے کے ثبوت بھی شعرا کے تذکروں کی شکل میں چھوڑے ہیں۔ اور پھر اس لحاظ سے تو ان کا کوئی اتنا بھی شریک نہیں کہ فارسی شعرا کا تذکرہ تو ان کے علاوہ ان میں سے بھی (میر، قائم) کسی نے نہیں لکھا! اور خود اردو شعرا کے بھی دو تذکرے لکھے۔

مصحفی سے ہم اردو تہذیب کے اس دوراہے پر ملتے ہیں جہاں دہلی کی شکست و ریخت پر لکھنؤ کی تعمیر ہو رہی تھی۔ انھیں دنوں سماج اور شاعری میں وہ قدیم کلاسکی روایات جن میں سادگی، شرافت، شائستگی، ضبطِ غم و نشاط، وضعداری، اعلیٰ قدروں کی پاسداری، اور (جسم کے بجائے) روح پرستی کی جگہ منفی تصورات دراندازی کرتے چلے گئے تاآنکہ وہ خود مثبت سمجھے جانے لگے۔

# مصحفی کا مطالعہ

جسے اردو ادب کی تاریخ میں اس سانحہ کو دہلویت کا لکھنویت یا داخلیت کا خارجیت میں بدلنا کہنے لگے ہیں[1] مصحفی اس دور کے سب سے بڑے نمائندے ہیں۔

اور سب سے بڑھ کے یہ کہ تجربات کا اتنا تنوع، سماج کے مختلف طبقوں سے تعلقات، زمانے کے سرد و گرم کی ایسی چشید، غرض زندگی کا ایک بھرپور مطالعہ متوسط طبقہ کے ایک اوسط ذہن نمائندے کے ذہن پر جو اثرات چھوڑ سکتا تھا وہ مصحفی نے ایمانداری کے ساتھ ہم تک منتقل کر دیے ہیں۔

مصحفی کے اس ضخیم مجموعہ کلام کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ اگر کبھی اردو کا کوئی مستند لغت تاریخی ترتیب پر مرتب کیا گیا تو مصحفی ۱۸ویں صدی سے ۱۹ویں صدی کے ربع اول کے آخر تک کے عہد کے لیے سب سے بڑا، اور کارآمد، ماخذ قرار دیا جائے گا۔

یہ وجوہات بجائے خود ایسی ہیں کہ کسی بھی شاعر کو مطالعہ کا اہم موضوع بنا سکتی ہیں۔ مصحفی تو شاعر بھی اس پایہ کا ہے کہ، (عہد جدید کو چھوڑ کے) اردو کے دس بڑے شاعروں کے نام منتخب کیے جائیں تو ان میں سے ایک، بلا اختلاف رائے مصحفی ضرور ہوگا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اس گونا گوں اہمیت کے باوجود مصحفی کا مجموعۂ کلام آج تک چھپ کے منظر عام پر نہیں آیا، اور خدا جانے کب تک نہ آسکے[2]

---

[1] حیرت نہ کیجیے کہ مصحفی نے اس قسم کی شاعری بھی کی ہے۔

تھا مصحفی یہ مائلِ گریہ کہ پس از مرگ
تھی اس کی دھری چشم پہ تابوت میں انگلی

جتنی میں نے خم بہ تہ تیغِ ناز کی گردن
تو اس نے کوٹھے سے دو میں دراز کی گردن

گدازِ دل سے ہو جاتا ہے حاصل تنبۂ عاشق
حقیقت کانچ کی پوچھو تو پہلے یہ بھی پتھر تھا

یہ خط نامہ بر لاتا ہے کہ شہر عشق کے بیچ
جو ڈھونڈیے تو کبوتر کا پر نہیں ملتا

ع اس کے موباف سے شانہ بھی شب پوچھتا تھا

ع پان کھا کر جو مسّی زیب کیے تو نے وہ لب

اور ــــ ردیفیں مثلاً: سرخیِ پان و رنگ مسّی اور۔

کبھی کانٹوں کے شاکی ہو کبھی ناخنوں کی کاوش سے
سیا کرتے ہیں ہم دن بھر گریباں آستیں دامن

[2] نثار احمد فاروقی نے کچھ عرصہ ہوا اسے مرتب کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ ذکر مصحفی کے مؤلف کی حیثیت

## مصحفی کا مطالعہ

مصحفی کی ہمہ جہتی اہمیت کے پیشِ نظر میں ان اگلے کئی برسوں کا انتظار نہیں کروں گا جب اس کے دواوین کی اشاعت ممکن ہو سکے گی۔ میں نے اس کے تمام قلمی دواوین کا مطالعہ مندرجہ بالا امور کی روشنی میں کیا ہے اور اس کا نچوڑ آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ ان دواوین میں مصحفی کی لگ بھگ پندرہ سولہ سال کی عمر سے لے کر اسّی سے اوپر تک کا کلام موجود ہے۔ یہ زمانہ بارھویں صدی ہجری کے آخری ربع سے ۱۲۴۰ھ (وفات) تک [یا اسی سے انیسویں صدی عیسوی کے ربع اول تک سمجھ لیجیے] پھیلا ہوا ہے۔ اتنا طویل عرصۂ حیات اور ایسا ضخیم مجموعۂ کلام (جن دونوں خصوصیات میں اردو غزل گویوں میں صرف میر ان کے ہم پلہ ٹھہرتے ہیں) ہندستان کی تہذیبی تاریخ کے کسی بھی طالب علم کے لیے مصحفی کو ایک ناگزیر موضوع بنا دیتا ہے۔ یہی ناگزیری میرے مطالعہ کی بنیاد ہے۔ مصحفی نے ایک جگہ کہا ہے:

؏ ہے آپ ہی دیوان مرا نامۂ اعمال

سو یہ مقالہ مصحفی کے بارے میں ہے لیکن ہے مصحفی ہی کی زبانی۔ شاعر اپنے بارے میں بہترین تعارف ہوتا ہے، صرف تھوڑی سی ترکیب و ترتیب کی ضرورت پڑتی ہے۔ مصحفی کا کلام اس بارۂ خاص میں دوسروں سے کچھ زیادہ ہی مددگار ثابت ہوا ہے۔ میں اپنے موضوع کے حدود سے ناواقف نہیں ہوں اور یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ غزل اور قصیدے کا شاعر قافیہ ردیف کا اچھا خاصا تابع ہوتا ہے، اتنا کہ کبھی تو کوئی خاص حقیقت محض کسی ردیف یا قافیہ کی اوٹ میں آ کے

؏ انجم زفلک می نگرد سوے زمیں را

---

؎ شاید وہ اس کا حق بھی ادا کر دیتے مگر پھر نور الحسن نقوی نے یہ ذمہ داری سنبھال لی اور پہلا دیوان انھوں نے چھاپ کر دہلی سے شائع کر دیا ہے۔ ان کے پاس پٹنہ، رام پور اور پنجاب کے نسخوں کی نقول موجود ہیں۔ پٹنہ والے نسخوں کی نقلوں سے میں نے بھی استفادہ کیا ہے جو رام پور میں محفوظ نہیں ہیں۔ اس کے لیے ان کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

؎ اس سے پہلے رام پور سے امیر اور اسیر نے (قدرے اصلاح کر کے) استاد کا کلام چھاپا تھا پھر حسرت موہانی نے بھی ایک انتخاب شائع کیا۔ پھر "نگار" کا مصحفی نمبر بھی نکلا لیکن ان میں سے کسی نے شروع کے تین دیوانوں سے آگے بڑھنے کی ہمت نہ کی۔ بعد میں ابواللیث صدیقی نے البتہ ایک کوشش ضرور کی گو ناتمام!

بس ایک ہلکا سا اشارہ ہی دیا جاتا ہے۔ اور کبھی اس کے بالکل برخلاف کسی خاص ردیف یا قافیہ کی خاطر کوئی خاص حقیقت شاعر اس طرح پیش کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے اصل پس منظر یا اصل حدود سے کہیں زیادہ مبالغہ آمیز ہو کے سامنے آتی ہے! اس کا بھی امکان ہے کہ سرے سے ان کا وجود ہی نہ ہو۔ اس لیے ذہن میں یہ حاشیہ رکھ کے مطالعہ کیجیے گا۔

●

مصحفی نے تخلص شعوری طور سے مصحف سے نسبت دے کر اختیار کیا۔ شاعری میں ان کا کوئی استاد ضرور تھا جس نے ان کی ایسی راہنمائی کی کہ بالآخر مصحفی استاد ہو گئے، ہر زمین کو آسمان پر پہنچانے والے فرمائش پر فی البدیہہ کہنے والے۔ اور آخر آخر میں تو محض قافیہ بندی ہی کرنے لگ گئے اور ڈھونڈ ڈھونڈ کے غریب لغات استعمال میں لانے لگے (مثلاً زمیں صید قمرغہ کلہ ہے میداں۔ سفر کی راہ ہر چار سو بند) خود یہ دعویٰ کرنے لگے کہ وہ لغت میں ابونصر فراہی کے رتبہ تک پہنچ گئے ہیں۔ اور فوائد رقم ہیں پھر تو ایک ایک ردیف میں اور ایک ایک غزل میں لگاتار شعر در شعر کہتے چلے جاتے تھے دوغزلہ، سہ غزلہ، چہار غزلہ، جسے انھوں نے خود بکواس لگ جانے سے تعبیر کیا ہے۔ علم کا انھیں شوق تھا در تعلیم کے اعتبار سے وہ قدیم مکتبی تعلیم کے اہم منازل طے کیے ہوئے تھے جہاں صد ہا

---

۱۔ مصحفی کی دلّی، ان کے لکھنؤ کا ادب، ماحول، عمومی انداز فکر ——— شخص اور زمانہ ——— کے سلسلہ میں مصحفی کے بیانات پر مشتمل یہ اہم حصہ تمام تذکرہ نگاروں کی (شاید بہت سے مورخوں کی بھی) بہم پہنچائی ہوئی اطلاعات سے زیادہ اہم ہے۔ تاہم حالات و سوانح کی ان جھلکیوں کو آپ واقعاتی تتمے دینا چاہیں تو ان کو اپنے لکھے ہوئے شعرا کے تذکروں عقد ثریا، تذکرۂ ہندی، ریاض الفصحا میں اپنے بارے جو کچھ کہا ہے وہ اور بعض معاصرین کے تذکرہ کے ذیل میں (مثلاً قائم، حسن، جرأت) اپنے قریبی لگاؤ [illegible] میں جو بیانات دیے ہیں وہ مع ان کی مستقل بالذات خود نوشت سوانح عمری (مجمع الفوائد) [illegible] کے ——— مستند ترین تتمہ کا کام دے سکتا ہے۔ بعض معاصر تذکرے بھی اس میں کچھ [illegible] سکتے ہیں (گلزار ابراہیم، تذکرۂ میر حسن، مجموعۂ نغز) ہاں ان کی اپنی نوشتہ ایک چیز اور [illegible] ششم نسخہ بانکی پور کا دیباچہ۔ کچھ اور جستجو ہو تو نگار کا مصحفی نمبر آج بھی حرف آخر ہے [illegible] عبدالودود ”اردو ادب“)

پڑھائی جاتی تھی۔ لیکن قابلیت میں وہ صدرا کے اور رسالہ جامی کے درجوں سے، بقول خود، بہت آگے نکل گئے تھے۔ عربی سے واقف تھے اتنا کہ متنبی کی شاعری تک کو پسند کر لیتے تھے۔ ابتدائے عمر میں فارسی میں بھی شاعری کی [ایک مکمل دیوان رضا لائبریری میں موجود ہے]؛ کچھ کچھ شعر عربی میں بھی کہے، اگرچہ عربی کی طرف رغبت کم ہی رہی۔ اپنی فارسی شاعری کی تعریفیں کی ہیں [لیکن واقع یہ ہے کہ اسقدر پھیکے اور بے مزہ شعر کہے ہیں کہ باید و شاید] شعرائے فارسی میں سعدی، نسبتی، عرفی، سلیم و کلیم، انوری، نظیری کے قائل تھے اور عربی میں متنبی کے۔ اردو میں سودا، قدر، میر اور یقین کے تو یا ہیں، اور رنگین، سرب سکھ دیوانہ، فاخر مکیں، منت، میر سوز، جرأت، حسن، قتیل اور انشا کے معاصروں میں قائل تھے۔ لیکن اصل میں صرف سودا اور میر کو مانتے تھے اور ان دونوں میں بھی مقابلہ کی بات آ پڑے تو صرف سودا کو۔ دلی کے ابوالآبائے شعرائے اردو ہونے کے قائل تھے

امروہہ سے کوئی وطنی سا تعلق ضرور تھا لیکن وطن اصلی دلی ہی کو مانتے تھے، اور میر کی زبان میں پوچھنے والوں کو بتلاتے تھے کہ ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے۔ دلی سے اجڑ کے پھر چین کم ہی ملا۔ ادھر ادھر [روہیل کھنڈ وغیرہ] گھوم کر آصف الدولہ کے لکھنؤ میں پہنچے اور وہیں بس گئے۔ دلی یاد آتی رہی لیکن بالآخر اسے وطنِ ثانی تسلیم کر ہی لیا۔ اور اسی برس کی عمر میں زندگی کا اعتماد چھوڑ بیٹھے۔ اسی پر دو تین برس گذرے ہونگے [۱۲۴۰ھ/۱۸۲۴ء] کہ لکھنؤ کی خاک نے اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔

●

کیا ہوا شعر میں کہتا تھا بوقتِ پیری
مصحفی دل تو لگا مصحفِ تفسیر میں تھا

اے مصحفی استاد وہی ہووے گا آخر
جو میری طرح عزتِ استاد کرے گا

اس کا ثانی آج تک تو کوئی دیکھا نہیں
مصحفی کہتے ہیں جس کو ہے وہ استاد آدمی

فکرِ بلند سے مرے دیوان میں مصحفی
وہ کون سی زمیں تھی کہ جو آسماں نہ تھی

فرمائشِ وزیر کو فی الفور مصحفی
لادیں وہی بجا جو مرصع بیان ہیں

قافیوں کی بندش کا مصحفی ہے تم کو شوق
ہم غزل اسی باعث مختصر نہیں کہتے

# مصحفی کا مطالعہ

میرے لغاتِ شعر کے عالم کو مصحفی — سمجھے ہیں وہ جو صاحبِ فرہنگ لوگ ہیں

مصحفی علمِ لغت سے جنھیں آگاہی ہے — جانتے ہیں وہ ابونصر فراہی ہم کو

اک غزل اور بھی لکھ مصحفی اس میں ہر لفظ — تو ہے فولادِ رقم گو کہ زمیں پتھر ہے

بکواس لگ گئی تجھے یہ کیسی مصحفی — شعرِ غزل میں اب کی کرے بے حساب لے[1]

تھا زندگی میں علم کا خوگر میں مصحفی — تربت بنائیو مری خشتِ کتاب کی

ہم سمجھتے تھے کہ اس کی صدرا تک تحصیل ہے — مصحفی ایسا بڑا فاضل کہاں سے ہو گیا

سیکھے مصحفی کے تئیں یاد خود قوافی شعر — وہ پڑھ کے جامی کا جز بھر رسالہ کیا کرتا

میں خوش ہوں مصحفی متنبیؔ کی نظم پہ — مجھ کو اگرچہ شوق ہے شعرِ عرب سے کم

ہوں شیخ مصحفی کا میں حیرانِ شاعری — اللہ رے مفلسی میں یہ کچھ شانِ شاعری

روندا گیا ہے تمام مرے رخشِ کلک نے — سودا سے بچ رہا تھا جو میدانِ شاعری

میں اپنا اے عمر میں مدت تلک بہت — چھانا ہے فارسی کا صفاہانِ شاعری

کچھ کچھ کہے ہیں پھر عربی میں جو شعر نظم — اس میں بھی بن گیا ہوں سحبانِ شاعری

دیوانِ فارسی کو مرے ٹک تو جا کے دیکھ — کیا کیا ہر ایک شعر میں ہیں اس کے شاعری

مجھے تو اس کا ہی عالم پسند آتا ہے — ہوا ہوں جب سے بہ اشعارِ فارسی محظوظ

کیا ریختہ کم ہے مصحفی کا — بو آتی ہے اس میں فارسی کی

●

ع سودا کی زمیں ہے یہ تجھے جاے ادب ہے — ع مرزا و میر سے مجھے کیا ہے برابری

مُوئے ہی جو تھے فن کے استاد — یہی اک ریختہ گو اب رہا ہے

کلام میر کا ہو مصحفی کہ مرزا کا — نہ کھا سکے گا مرے انتخاب سے پیوند

مجھ میں جرأت نہیں اے مصحفی سحر بیاں — میر و مرزا سے لڑانے یہ غزل جاؤں گا

مسند نشینِ ریختہ جب تک ہے مصحفی — جیتا ہے میر درد بھی سودا نہیں موا

اے مصحفی ملا نہ وہ کافر بقولِ درد — ایسے ہمارے طالعِ بیدار سو گئے

---

[1] مصحفی کے اس اعتراف سے اپنے عہد میں فراق کی یاد آتی ہے

غزل اے مصحفی یہ میر کی ہے — تمھاری میرزائی ہو چکی بس
مرزا و میر کا تو نہ کر ذکر مصحفی — اشعر ہیں اب تو کشورِ ہندوستاں میں ہم
حسد کی جا نہیں اے مصحفی کلام ان کا — کہ اپنے وقت کے مرزا و میر ہم بھی ہیں
یہ ریختہ کچھ اور زباں میں ہے مصحفی! — سچ ہے کہ یہ چلن نہیں مرزا رفیع کا
راہِ سخن میں میر بھی گو خوش رقم پڑا — مرزا سے پیشتر نہ پر اس کا قدم پڑا
سودا کے خیال کو نہ سمجھے کوئی کم — سودا فنِ ریختہ میں گزرا رستم
ہے میر تقی بھی تو اگرچہ استاد — پر اس کے کلام کا ہے قائل عالم
گو کہ تو میر سے ہوا بہتر — مصحفی، پھر، میر میر ہی ہے
اے مصحفی ہمارا عالم ہی کچھ جدا ہے — صنعت میں ریختے کی، سودا ہیں بے یقیں ہم
وہ محمد تقی میر کہ تھا — ریختے میں ہر ایک کا سرتاج
ہندِ جنت نشاں میں رکھتی تھی — غزلِ عاشقانہ اس سے رواج
خرمنِ عمر اس کا برقِ اجل — کر گئی جس دم آن کر تاراج
از سرِ دردؔ مصحفی نے کہا — حق میں اس کے "تا مُوا نظیری آج"
جو مخمس ہے مرے دیوان میں اے مصحفی — آج کل مارے ہے دیوانِ یقیں پر پشتِ دست
ریختہ گوئی کی بنیاد دکنی نے ڈالی — بعد ازاں خلق کو مرزا سے ہے اور میر سے فیض
گرچہ زمرے میں یہ ان کے نہیں پر لیتے ہیں — کتنے مشتاقِ سخن مصحفی پیر سے فیض
مصحفی کو کوئی جرأت سے جدا مت جانو — ہیں فنِ شعر میں البتہ یہ ہم دونوں ایک
جب قلندر بخش جرأت مر گیا — ہو گئی کیا بلبلِ نالاں خموش
اور تو ثانی کوئی اس کا نہیں — مصحفی کا ہے قتیل البتہ جوڑ
کوئی سمجھو تو مصحفی و قتیل — شعر میں یادگار ہیں دونوں

ع ایک تو میں تھا، مرے ساتھ مرا یار قتیل

حسن کا شعر ہے میاں مصحفی... اپنی — سنو تم اس کو ہم سے خانماں وار ولے مت پوچھو

## مصحفی کا مطالعہ

مقام اس کا گر ادرہ میں ہو تو کاش... کوئی یہ شیخ سدو کی ہے یاں درگاہ بول اٹھے
دلی کہے ہیں جس کو زمانے میں مصحفی ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

میں جب سے آیا ہوں لکھنؤ میں گیا ہے دلی کا بھول نقشہ
مگر تصور میں اپنے عالم ہے پیش دیدہ کہیں کہیں کا

غربت میں وطن گرچہ کیا ہم نے مقرر اس پر بھی نہ نکلا ہمیں غم بے وطنی سے
قریب ساحل آ پہنچی ہے کشتی غنیمت ہے کوئی دم زندگانی
ہمیں اے مصحفی اسّی برس میں نہیں اب اعتمادِ زندگانی

●

مصحفی کا عہد (۱۱۶۵ھ/۱۷۵۱ء — ۱۲۴۰ھ/۱۸۲۴ء) اس ملک کی تاریخ میں ایک مرتے ہوئے عہد کی انتہا تھی۔ یہ ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے، لیکن پلاسی کے بعد کی بات ہے جب مصحفی کے شعور نے انگڑائی لی (۱۷۵۷ء میں مصحفی پندرہ سولہ کے رہے ہوں گے) ابھی دلی کی چار دیواری سلطنت قائم تھی اور لکھنؤ بھی عیش کر رہا تھا لیکن اوپر اوپر پھول کھلے تھے بھیتر بھیتر آگ۔ اس کی بے میل تصویر تاریخ میں اتفاق بحث زن سے کہیں مل جائے تو مل جائے انھیں اتفاقات میں سے ایک، (اگر آپ تاریخ کی اصطلاح میں تھوڑی سی لچک پیدا کر دیں جو تہذیبی تاریخ کے لیے شاید ناگزیر بھی ہے) شعرا کا اپنی غزلوں اور نظموں میں ان حالات کا تذکرہ اور ان پر تبصرہ ہے۔ اور اردو کے غزل گو اور قصیدہ نگار شعرا میں یہ گذارشِ احوالِ واقعی، جیسی تفصیل کے ساتھ مصحفی کے یہاں ملتی ہے ایسی غالباً کہیں اور نہ ملے۔

یہ اس وقت کی بات ہے۔ جاتی ہوئی تہذیب جب آخری سانسیں لے رہی تھی اور آنے والی تازہ و توانا تہذیب اپنی پرچھائیں ڈالنے لگی تھی۔ عجیب زمانہ ہوتا ہے یہ بھی۔ قدروں کی شکست و ریخت، معیاروں کا تغیر و تبدل، اور احوال و اطوار میں کچھ ایسی عدمِ استواری، بے یقینی، کم اعتباری اور ناپائداری آ جاتی ہے کہ لوگوں کے برسوں کیا صدیوں کے جمے جمائے عقیدوں کی بنیادیں ہل کے رہ جاتی ہیں۔ فرد سماج کے اندر رہ کے بھی کچھ اکیلا اکیلا سا محسوس کرتا ہے، اس لیے کہ سماج پر سے اس کا اعتبار اٹھ چکا ہوتا ہے۔ سماج اس پر تو اپنی ساری ذمہ داریاں

اور بوجھ ڈالتا ہوا لگتا ہے لیکن خود اس کے بدلے میں کچھ بھی نہیں دیتا، نہ روزی، نہ بقدرِ استحقاق ناموس و نیک نامی، نہ کبھی عزت یا جان و مال کے بچاؤ کی ضمانت، کچھ بھی تو نہیں دیتا، اور ان سب پر لعنت بھیج کے کوئی صرف اتنا چاہے کہ کوئی ایک مانوس چہرہ تو مل جائے جس کے سینے میں اگر وہ اپنا دکھ درد اتار دے تو وہ اسے اپنی امانت سمجھ کے بھینچ لے، جس سے وہ جب جو کچھ چاہے کہہ لے سن لے، جس کے خلوص پر اسے اتنا اعتماد ہو کہ وہ اُسے اپنا کہہ سکے ـــ تو یہی مسرت کچھ کم قیمتی نہیں۔ پر ایسے زمانے میں تو خلوص کا بھی کال پڑ جاتا ہے اور ایسے زمانے میں کوئی ایسا میاں آدمی ہو، جیسے اپنے مصحفی، تو اس غریب کے لیے تو اطمینان و سکون کی ایک سانس بھی دوبھر ہو جاتی ہے۔

یہ کچھ ہمارے زمانے ہی کے ساتھ مخصوص نہیں، ہر زمانے میں لوگ یہی کہتے ملیں گے کہ ان کا عہد بدترین عہد ہے ایسا کہ اس سے پہلے گزرا نہ آئندہ گزرے گا۔ پرانوں میں گلستاں بوستاں والے سعدی سے صوفیہ کے پیرِ مغاں حافظ شیرازی تک، اور ہندیوں میں مصحفی سے لے کر ساحر لدھیانوی تک سب ایک دھن میں "گلۂ حیات" کرتے نظر آتے ہیں اور وہی بات کہ حادثے ہوتے ہی تھے زمانے میں، اس قدر انقلاب کس دن تھا۔

پھر معاش کی بے اطمینانی، زندگی سے بے زاری اور جیسے تیسے اسے طے کرنا، خواری و پریشانی، ستمِ روزگار اور سدا فکرِ روزی کا تذکرہ، پھولوں کے خرمن لٹنے اور ساقی کا سبو لوٹ جانے کے بعد اپنی باری آنے کا حسرتناک بیان، زمانے کی بے ادائی، خلوص و صفا کی ناپیدگی اور غمِ ایام سے دل گیری کا ذکر، گزر جانے والوں کے اچھے دنوں اور پیچھے رہ جانے والوں کے سخت دنوں کی توجیہہ کا یہ انھیں کے عیش کی مکافات ہے، پھر اپنی زندگی کے لیے ایک انوکھا اندازِ بیان کہ زیرِ تیغ ایک عمر گزار دی۔ اپنے ساتھ کے لوگوں کے اس جہانِ فانی سے رخصت ہو جانے کا غم جنھیں پکار پکار کے آواز تھک گئی لیکن جانے والا کوئی بھی نہ رکا۔ مصحفی کو غم ہے کہ وہ کیوں ان کے پیچھے رہ جاتا ہے، جوانی بیت گئی، بال سپید ہو گئے، یہ زندگی کی شب تاریک ہے کہ چلے چلی جاتی ہے اور اس سالخوردگی سے ملتا ہے تو بس اتنا کہ زمانے کا ہر رنگ اور ہر رُخ سامنے آجاتا ہے، ہر تجربہ ہوتا جاتا ہے۔

لیکن شاعر تو تجربے کرتے کرتے تھک کے چور ہو گیا ہے۔ دلّی اس کا وطن، جو اس کے دیکھتے دیکھتے کیا سے کیا ہو گیا۔ وہاں کی آب و ہوا، وہاں کے جامہ زیب، وہاں کا لہجہ، وہاں کے پری پیکر، دلّی کے محرم، بارہ وفات، قطب کی چھڑیاں، بسنت، قطب صاحب، میراں، نبی کریم، ترکمان، سرمد، نظام الدین، بھرا پُرا شہر اور اس کی یہ پوری تہذیب رفتہ رفتہ سب خواب و خیال ہوتا گیا اور مصحفی کے لیے نئے نئے تجربے سامنے آتے گئے۔

دلّی کے تجربے جہاں آدمیت ناپید ہوتی جا رہی تھی۔ بھری بستی ایسی اجڑتی جا رہی تھی کہ جو باقی بچے تھے وہ بھی ادھر ادھر بلا اودھ، بنگالہ اور روہیلکھنڈ میں پناہیں ڈھونڈنے نکل کھڑے ہوئے تھے کبھی مرہٹہ گردی ہے تو کبھی جاٹوں کی یلغار۔ دلّی کا تاجدار، عظیم مغلوں کا ضعیف وارث، ایرانی افغانی فرنگی اور مرہٹی تلواروں کو تولتا رہتا تھا، جو بھاری پڑ گیا یہ ادھر جھک گئی۔ ملک کا نقشہ یہ تھا کہ ہر وقت کربلا کا منظر پیش ہے ایک بار تلواریں نیام سے نکلیں تو پھر ان کے چلنے کی آواز کبھی نہ رکی۔ دلّی کا عالم یہ تھا کہ نادر گردی میں اس کا انگ انگ ٹوٹ چکا تھا۔ لٹی پٹی دلّی جسے حملہ آور فوجیوں نے جی بھر کے لوٹا تھا۔

شاہ عالم (شاہ عالم جو کچھ اس کی بے سروسامانی پہ عیاں ہے) جو از دلّی تا پالم حکمران رہ گئے تھے اور وہ بھی کسی نہ کسی کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنے تماشا دیکھتے، یہاں کا عہد تھا۔ دلّی کے اطراف میں غنڈوں کا راج تھا۔ راتوں کو ڈاکے پڑتے تھے۔ مرہٹہ گردی نے حالات کی صورت کچھ اور دگرگوں کر رکھی تھی۔ جہاں دن ڈھلے دلّی کے باشندے اودھ کی طرف قافلہ در قافلہ کوچ کر رہے تھے۔ چور اچکوں کا یہ زور کہ شام پڑتے ہی لوگوں کی پگڑیاں اترنے لگتیں۔ صرف لال قلعے کے آس پاس تلنگے فوجیوں کے ڈر سے کچھ امن و سکون قائم تھا۔ پانی کی نہریں اور نل بری حالت میں تھے امرا کے قصر فلک بوس بوسیدگی کی آخری منزلوں میں پہنچ چکے تھے۔ نہ اب کج کلاہوں کی مسندیں تھیں نہ عالیشان دروازوں پر بھڑکدار رنگ و روغن، نہ گھروں کی رعب دار محرابیں۔

خون کی ارزانی کے اس دور میں جب لوگوں کو کھانے پینے کے لالے پڑ گئے تھے صبح گزر گئی تو شام کی فکر اور شام گزر گئی تو صبح کا دغدغہ! روکھی سوکھی جیسی مل گئی صبر شکر کر کے کھالی، فراغت کا تو کیا ذکر۔ اور ایسے عالم میں جب خالی پیٹ جلتے ہیں تو نہ مسجدیں آباد رہتی ہیں

# مصحفی کا مطالعہ

نہ مندر، نہ ناقوس کی آواز آتی ہے نہ اذان کی صدا، پیٹ بھر دل کی باتیں جو ٹھہریں پیشا ؛ رہنر جاننے والوں کے لیے تو کوئی در بند نہیں ہوتا لیکن ایسے سماج میں جہاں کے متوسط طبقہ کو خود جینے کے لالے پڑے ہوں کون گھوڑوں کے زین سلوائے گا اور کون اس کے متعلقات کا خرچہ اٹھائیگا۔ وہاں تو جسے بھی ذرا بھاری جیب کا دیکھا اور کوئی اچکا پیچھے لگ گیا امرا نے تھیلی کاندھے پر رکھی سو وہ غائب۔ جو عزت دار تھے وہ بے عزت ہو گئے جو کمین تھے وہ مسند نشیں ہونے لگے۔ گوجرا اپنے کو نواب کہلوانے لگے اور میواتی، خان۔ گاؤ کشی بند ہو گئی مگر رعیت کا خون اس سے بھی ارزاں ہو گیا۔ شاہی خاندان کے وہ لوگ جو رشتہ در رشتہ دور دراز سیڑھی پر پہنچ کر منسلک تھے وہ نانِ جویں کو ترسنے لگے۔ سلطنت تو اب برائے نام ہی کہیے ورنہ تو دلّی کو خزاں نے مکمل طور سے گھیر لیا تھا ہندوستان کی جو دولت و عظمت تھی وہ تو سب فرنگیوں کی نذر ہو گئی اب تو یہ شیرازہ ہی بکھر چلا۔ فرنگیوں کے ساتھ بسکٹوں کا چلن، فرنگنوں کا فیتا لگانا، انھیں دیکھنے نیلام میں جانا۔ ان کے اثر سے کرنجی آنکھ کا شاعری میں داخلہ، سندوقچہ، فرنگ، فرنگی لوٹا جوڑ جس سے وہ کلکتہ اور پھر رفتہ رفتہ دہلی کے بھی مالک بن بیٹھے، ان کی تہذیب و دانش کی برتری کہ دوا دارو میں بھی انھیں آخری مرتبہ حاصل ہو گیا تھا، یہ سب کچھ مصحفی نے ریکارڈ کر دیا ہے!

پھر جب ہندوستان یعنی دلّی پر پے بہ پے مصیبتیں آئیں اور رزق کی تنگی بڑھتی گئی تو مصحفی کبھی دکن اور کبھی کلکتہ جانے کی سوچتے رہے۔ پھر پورب کو جو قافلے روانہ ہوئے ان میں سے ایک میں مصحفی بھی چل پڑے، ادھر ادھر چھ دن گزار کے (ردہیلکھنڈ وغیرہ) لکھنؤ میں آ بسے اور یہاں آ کے نو دولتوں سے پہلی ہی ملاقات میں چھکے چھوٹ گئے۔ لکھنؤ اب دلّی کے مقابلے میں ویرانہ لگنے لگا اور اپنی حیثیت بن کے بھول جیسی ہو گئی، تاہم آصف الدولہ کے دور تک (۱۲۱۱ھ / ۱۷۹۷ء) انھوں نے لکھنؤ کے ساتھ بڑی حد تک ساز کیے رکھا۔ یہاں کے میلے ٹھیلے، بول چال، طور طریق، سب پسند آنے لگے دلّی کے بعد اب یہی تو ایک بستی بسی تھی، دلّی کبھی کبھی یاد آ جاتی تھی۔ لیکن پھر رفتہ رفتہ نئے جہان سے طبیعت مانوس ہوتی چلی گئی۔ گویا احساس کبھی نہیں مٹا کہ یہ غربت اور بے وطنی کی زندگی ہے! تاہم یہاں دل آصف کی نوبت پچھلے پہر

## مصحفی کا مطالعہ

شہنائی کی آواز، گومتی کے بجرے، یہاں والوں کی سج دھج ادا فصاحت تقریر، اور نوچندی جمعراتوں کو کربلا پر میلے ٹھیلوں نے مل ملا کے مصحفی کے لیے لکھنؤ کو اس حد تک گوارا بنا دیا اور خاص کر آصف الدولہ اور سلیمان شکوہ کی قدردانی نے، کہ لکھنؤ اصفہان اور تہران ثانی لگنے لگا۔ اس عہد کے ممدوحین میں ان کے قصائد و غزلیات میں آصف الدولہ اور سلیمان شکوہ کے علاوہ امرا شہزادگان میں مرزا مینڈھو، مرزا علی حسن، کلب علی خاں، صفدر علی خاں، حسن رضا خاں، محمد رضا خاں، شاداب علی خاں، مہدی علی خاں، مرزا جعفر، میر نعیم، محبت خاں، بارگا قلی خاں، مرزا جوان بخت، سیف علی خاں، خیالی رام، میر فضل علی، اور مرزا ہوس وغیرہ کے نام ملتے ہیں اور خصوصی طور سے لالہ ٹیکا رام کا۔ لیکن پھر جب آصف الدولہ کے بعد زمانے نے کروٹ لی تو پھر مصحفی کو چین کم ہی ملا!

لکھنؤ آ کے شعر شاعری کا چرچا اور بڑھا، شاگردوں کا ہجوم ہونے لگا اور ان کے ساتھ شاعر دنیا یہاں مصحفی کے دو قریبی دوست تھے قتیل اور جرأت۔ ان کے سہارے کچھ اچھی گزر جاتی تھی لیکن سرزمین ہند گویا ہند صرف دلی تھی لکھنؤ نہیں ہے کے مقابلہ پر لکھنؤ کا زنداں کچھ بھی دہا وہاں کتنے ہی رشتے ناتے تھے، سلسلہ نظام الدین اولیا کے بزرگ مصحفی کے پیر و مرشد شاہ فخر الدین تھے جن کے قدموں میں دفن ہونا بھی سعادت و برکت کی بات تھی، وہاں محبوبہ تھی جس کا دیدار وہیں مشکل سے ہو پاتا تھا، نہ کہ یہاں۔

جب یہاں دیکھ پہنچے تو دلی کے جامہ زیب، دلی کے زبان داں، دلی جو یہاں آ کے آباد نگر لگنے لگا جہاں کی آب و ہوا میں بھی نیا آب و رنگ آ گیا، "لاکھوں کوس" آنے کے بعد دلی کا ہر رنگ یاد آنے لگا۔ دیاروں میں مسافرین کے زندگی گزارنے کی منزل بھی کیسی کٹھن ہوتی ہے!

شاعری کا حال یہ تھا کہ شاعری میں عمر بسر کرنے کے باوجود بعضے اب بھی مصحفی کے قائل نہ ہوتے تھے حالانکہ مصحفی استاد زود گو شاعر تھا کہ دیوان تو دلی ہی میں مرتب کر لیا تھا جو کسی نے چرا بھی کر لیا۔ پھر اس میں سے کچھ یادداشت لکھا ہوتا لکھا ہوگا۔ لکھنؤ میں تو انشا اور رنگین کی شاعری چل رہی تھی اور انہیں کا دور دورہ تھا۔ دلی گداختہ کی شاعری کے مقابلے پر تیغ او رپھالے کی شاعری کا زمانہ آ گیا تھا۔ مشاعروں سے وہ اگلی تہذیب رخصت ہو چکی تھی بس وہی مزا آتا

جو مرغوں کی پالی میں آتا ہے۔ شرافت اور انسانیت کے معیار ایسے گر گئے تھے کہ شہر میں رہنا مشکل ہو چلا تھا، ایسے میں مصحفی کو ڈر مدح خود بہت کچھ لکھنا پڑا جس میں کبھی کبھی اپنے کو سودا اور میر تک سے بڑھا دیا۔

کبھی ایک چکر چلتا کبھی کوئی دوسرا۔ کوئی سلیمان شکوہ سے جا کے کچھ جڑ دیتا، کوئی کسی دوسرے امیر کو چڑھا دیتا، اور مصحفی کو سیکڑوں معذرتیں پیش کرنا پڑتیں۔ مصحفی و مصحفن کے مشہور معاملے میں رسوائی بھی اپنی ہی ہوئی اور پھر معذرتیں بھی خود ہی کرنی پڑیں کہ یہ سب کچھ انشا نے کیا تھا سوانگ کی ابتدا بھی اس نے کی تھی: میں آپ فاقہ کش اتنا مجھے کہاں مقدور، کہ فکر اور کروں بغیر آتش شعر۔ مصحفی کہتے رہے کہ اگر کوئی شرارت کرے گا تو میں سوا شیر ہوں لیکن انشا تو بلاے بے درماں تھا "تھا مصحفی کا ناجو، چھپانے کو پس از مرگ۔ تھا رکھے ہوئے چشم پہ تابوت میں انگلی" اس کے جواب میں مصحفی سے کیا بن پڑتا ایک چشمی ردیف البتہ مل گئی پھر ایک دوسرے موقع پر بھی ایسے ہی کسی چکر میں اظہار حال کرنا پڑا کہ مصحفی جیسے رنگین، میر حسن، میر سوز، منت، سرب سکھ دیوانہ، فاخر مکین، جرأت، قتیل، بلکہ میر تک مانتے ہیں اور خود فیضی زماں انشا تک معترف ہیں اس کے بارے میں لوگوں کے دلوں میں ایسے فتور بھر جاتا کہ منہ پر دوستی اور غیبت میں سازشیں!

آخر مصحفی نے بہت سے ان لوگوں پر جو اس کے مضامین سرقہ کرنے لگے تھے ردعمل میں جل کے منہ مارا

ع ہے ننگِ خلائق وہ جو شاعر ہے سخن چور

● مصحفی اور عہد مصحفی

میں سال خوردہ ہوں، ہے تب تو مصحفی ہر دم | نظر میں میری زمانے کے انقلاب کا رنگ
یہ زمانہ وہ ہے جس میں ہیں بزرگ و خورد جتنے | انھیں فرض ہو گیا ہے گلۂ حیات کرنا
حادثے ہوتے تھے زمانے میں | اس قدر انقلاب کس دن تھا
اب ہم غلام اور وہ صاحب ہیں، یا نصیب | ملنے سے جن کے اپنے غلاموں کو ننگ تھا

# مصحفی کا مطالعہ

ہم اسیرانِ قفس کو تب خبر دی تو نے آہ
لٹ گئے جب باغ میں پھولوں کے خرمن اے صبا

بدنصیبی کا گلہ ہے کہ ہم اس دم پہنچے
گر کے جب ہاتھ سے ساقی کے سبو ٹوٹ گیا

کیوں عبث شکوہ کریں اس کا کہ ہم لوگوں کے ساتھ
بے ادائی ہے ہمیشہ سے زمانے کی ادا

مجھ پہ کیونکر نہ ہنسے خلق کہ ہوتا ہے یہی
جب کسی شخص کی اوقات بگڑ جاتی ہے

رکھتا ہے سدا میرے تئیں خوار و پریشاں
اے مصحفی مجھ ساتھ زمانے کی ادا دیکھ

ہم اور شخص کی کہتے نہیں خدا کی قسم
بہت سہا ستمِ روزگار ہم نے تو

مصحفی کی کوئی امید تو بر لا یارب[1]!
مدتوں سے یہ ترے در کا مناجاتی ہے

اے مصحفی اب تو اس زمانے کے بیچ
جس طرح سے ہووے زندگانی کیجے

اک ہاتھ صرفِ سینہ زنی جس طرح ہوا
ماتم میں دل کے وقفِ گریباں ہے دوسرا

مصحفی اب تلک آیا نہیں ہرگز بحال
غمِ ایام سے ہے طبعِ حزیں ویسی ہی

پھولوں کی چھڑی جس کے ہاتھوں سے نہ اٹھتی
اب نامِ خدا اس نے تلوار اٹھالی ہے

مجھ سے اور اتنا تلخ بولے تو
یہ بھی پیارے خدا کی باتیں ہیں

گردشِ چشم کبھی مشفقِ من ادھر بھی
بارے اس دور میں اک ہم کو بھی ساغر پہنچے

سادگی دیکھ کہ بوسے کی طمع رکھتا ہوں
اُن لبوں سے کہ میسر نہیں دشنام مجھے

اب جفاؤں کے اٹھانے کی نہیں تاب مجھے
کاش ہو جائیں ہم اے چرخِ کہن پتھر کے

مصحفی تب ابرِ رحمت کو مری پہنچی خبر
ہو گیا جب خشک سب نخلِ تمنا دھوپ میں

بلبل نے آشیانہ چمن سے اٹھا لیا
اب اس چمن میں بوم بسے یا ہما رہے

کنجِ قفس میں ہم تو رہے مصحفی اسیر
فصلِ بہار باغ میں دھومیں مچا گئی

غم بڑا یہ ہے کہ اس فصلِ بہار آنے تک
کوئی جیتا نہ بچا تازہ گرفتاروں سے

یک آہوئے وحشی نظر آتا نہیں اس میں
اس سال بیاباں کو خدا جانے ہوا کیا

اس آسماں سے دل اپنا تنگ آیا ہے
بنا دیں گے کوئی اور آسماں زمیں کے تلے

---

[1] فانی کا یارب یاد آیا، ہائے سے

اپنے دیوانے پر اتمامِ کرم کر یارب
در و دیوار دیے اب انہیں ویرانی دے

# مصحفی کا مطالعہ

یارب تو اس جہان سے لے چل مجھے شتاب
ہوں جس جگہ زمین نئی آسماں نئے

نرگس کی ہیں وہ آنکھیں نہ گل کا وہ رنگ ہے
کچھ ان دنوں چمن کی ہوا ہی پلٹ گئی

سادگی پر مجھے قاتل کی بہت رحم آیا
اپنی شمشیر کا پونچھے تھا لہو داماں سے

کوچے میں ترے گرچہ ہیں کشتوں کے پشتے
اس پر بھی ابھی تشنۂ خوں ہے یہ زمیں اور

یوں تو دنیا میں کیا نہیں ملتا
پر دلِ با صفا نہیں ملتا

اور سب کچھ ملے ہے دنیا میں
لیکن اک آشنا نہیں ملتا

پیش دستِ منعماں سائل بکف پیدا ہوا
دودماں اپنے میں، یکیں اک ناخلف پیدا ہوا

یارانِ رفتہ عیشِ طرب کر چلے گئے
ہم رہ گئے انھوں کی مکافات کے لیے

کیا عمر زیرِ تیغ تو کاٹی تھی، مصحفی!
کڑھتا ہے جی مرا تری اوقات کے لیے

سدا فکرِ روزی ہے تا زندگی ہے
جو جینا یہی ہے تو کیا زندگی ہے

نہ کر اے مصحفی روزی کا شکوہ
خدا بیزار ہوتا ہے گلے سے

سنے ہے مصحفی اب تکیہ کر کے بر رزاق
تو بیٹھ رہ کہ نہیں تیرے روزگار کے دن

ہووے اس شخص سے کیا معنیٔ رنگیں کی تلاش
خونِ دل سے ہی سدا جس کی رہے وجہ معاش

اب تو میاں مصحفی کی ہے یہ معاش
پتّے بیٹھے ہوئے اُبالتے ہیں

بے لطف زندگی کے ہیں دن آ بھی اے اجل
تیرے ہی انتظار میں بیٹھے ہیں کب سے ہم

ہے تین دن کے فاقہ سے بے چارہ مصحفی
توڑے نہار کچھ تو یہ مستِ الست کھائے

مصحفی شاعری رہی ہے کہاں
اب تو مجلس کے روضہ خواں ہیں ہم

اے مرگ جلد آ کہ شتابی رواں ہوں میں
بھاری ہوں آسماں پہ زمیں پر گراں ہوں میں

ایامِ جوانی گئے اور آئی سپیدی
اے مصحفی اب اٹھ کہ سحر ہو گئی یہ شب

روتا پھرا ہوں تنہا میں قافلے میں یارو
منزل میں میرے ساتھی مجھ سے بچھڑ گئے ہیں

کھڑا نہ سن کے صدا میری ایک یار رہا
میں رہروانِ عدم کو بہت پکار رہا

اندک اے پیش رواں وقفہ کہ اس منزل میں
اک مسافر سا کوئی پیچھے رہا جاتا ہے

اے ہمرہانِ پیش قدم صبر کیجیو
یعنی کوئی ضعیف بھی اس کارواں میں ہے

جا ملے اپنے رفیقوں سے جو تھے گرم رواں    میں ہی اک قافلے کے پیچھے رہا جاتا ہوں

## مصحفی کی دلّی: تباہ حالی

نہیں آدمیت کا دلّی میں چرچا    جدھر دیکھو بھڑوے زنانے بہت ہیں
میاں مصحفی کیا خاک۔ لگے دلّی میں اب دل    یہ بستی گئی کچھ اجڑ ایسی کہ نہ پوچھو
ہندوستاں نمونۂ دشت بلا ہے کیا    جو اس زمیں پہ تیغ ہی چلتی ہے اب تلک

ع کہ جیسے فوجِ شاہ آ کر جہان آباد لوٹے ہے

ع وقار ہند میں کمتر ہے اب سپاہی کا

کہتا ہے اُسے خلق جہاں سب شہِ عالم    شاہی جو کچھ اس کی ہے سو عالم پہ عیاں ہے
اطراف میں دلّی کے یہ لٹھ ماروں کا ہے شور    جو آوے ہے باہر سے وہ بشکستہ وہاں ہے
اور پڑتے ہیں راتوں کو جو نت شہر میں ڈاکے    باشندہ جو واں کا ہے بہ فریاد و فغاں ہے
اس شہر کا جس دن سے ہوا سیندھیا حاکم    چوروں کی وہاں سیندھ سے ہر اک نگراں ہے
بیداد سے نائب کی یہ احوال ہے وہاں کا    ہر روز نیا قافلہ پورب کو رواں ہے
اترے ہیں وہاں پگڑیاں بس شام کے ہوتے    چالاکیِ دست ایسی، یہ اندھیر کہاں ہے
دو چار تلنگے جو کھڑے رہتے ہیں، ان سے    بس قلعہ کے نیچے ہی تلک امن و اماں ہے
جز دیدۂ گریاں نہیں منبع کسی گھر میں    تا سور ہے سینے کا اگر آب رواں ہے
آتا ہے نظر چوں دلِ عشاق شکستہ    اس شہر میں جو قصرِ فلاں ابن فلاں ہے
بیٹھے تھے جہاں کج کلہاں تکیہ لگا کر    وہاں اب جو نظر کیجیے تو تکیہ کا مکاں ہے
وہ رنگِ نزاکت نہیں دروازوں کے اوپر    محراب جو ان کی ہے سو خم دیدہ کماں ہے
خونریزی ہی اس خاک پہ رہتی ہے ہمیشہ    اب سنگ بھی واں ہے تو یہی سنگِ فساں ہے
اس شہر کے باشندوں سے جا کر کوئی پوچھے    جز خونِ جگر کچھ بھی غذا ے دل و جاں ہے
ملتا ہے بصد رنج انھیں رزق کم و بیش    اور چاہیں فراغت، سو فراغت کو کہاں ہے
بُت خانہ و مسجد میں جو پھیلی ہے خرابی    ناقوس کا نالہ نہ موذن کی اذاں ہے

زیں دوز کی صورت نظر آتی نہیں مفلس — اور ہے بھی تو جوں سوزنِ گم گشتہ کہاں ہے
زردار سا دیکھے ہے جسے راہ میں جاتے — طرار بھی پیچھے ہی سے جوں سایہ رواں ہے
صراف لیے جاتا ہے کاندھے پہ جو تھیلی — اتنے میں اسے پھر کے جو دیکھے تو کہاں ہے
نواب نہ خاں کوئی رہا شہر میں باقی — نواب جو گوجر ہے تو میواتی بھی خاں ہے
گو گا ذکشی شہر میں موقوف ہوئی ہے — اب ان کی بجگہ خون رعیت کا رداں ہے
احوالِ سلاطیں کی لکھوں کیا میں خرابی — یعنی کہ مہِ عید اب ان کو لبِ ناں ہے
فاقوں کی زبس مار ہے بے چاروں کے اوپر — جو ماہ کہ آتا ہے وہ ماہِ رمضاں ہے
گل جائے زباں میری کروں ہجو گراں کی — یہ تنگ، معاشی کا سلاطیں کی بیاں ہے
کہتے ہیں جسے سلطنت، القصہ کہ یارو — نے نام ہے اس چیز کا نے اب تو نشاں ہے
اے مصحفی اس کا کروں مذکور کہاں تک — ہے صاف تو یہ گلشنِ دلّی میں خزاں ہے

●

## مصحفی کی دلّی: جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب

خاکِ دہلی کی ذرا سیر تو کر — کہ عجب آب و ہوا رکھتی ہے
ہائے دیکھی نہیں انھوں نے مگر — وضع دلّی کے جامہ زیبوں کی
نیل کے کٹرے کا جانا کیوں نہ یاد آوے کہ ہائے — واں بھی آتے تھے نظر کیا کیا پری زاد آدمی

ع گو زمزمۂ دہلی و گو لہجۂ پورب

ع دلّی کے پری پیکر ہیں زور پری پیکر

بانکا ہوں اس چمک کا کہ دلّی سے شہر میں — زنجیرِ برق باندھ کے سر پہ پھرا ہوں میں
داغ دلّی کی ہے جدائی کا — یاد آتی ہے سیر بارہ وفات

ع دلّی کہاں، کہاں وے راتیں محرموں کی

دو چار چرخ قطب کی چھڑیوں میں کھا دلا — میواتیوں کے جھنڈ میں ہر سو ہنڈولا ہیں

ع مدتوں ڈھونڈا کیے دلّی میں ہم عصمت کا گھر

آخری شب میں مری نیند اچٹ جاتی ہے　　لطف دیتا ہے جو بجنا مجھے شہنائی کا
کیا اندر مصحفی میں کروں وصفِ لکھنؤ　　روئے زمیں پہ آپ صفاہاں ہے دوسرا
سچ درج ادا فصاحت و تقریر کیا کہوں　　دیکھا تو لکھنؤ کی قیامت ہیں بولیاں
نوچندی پنجشنبہ ہے چل تو بھی مصحفی　　جاتی ہیں کربلا کو حسینوں کی ڈولیاں
کیوں لکھنؤ نہ ثانیِ تہران ہو مصحفی　　ملتی ہے گفتگو تری شاپور سے بہت
پایۂ تختِ سلیماں کا ہے شاعر مصحفی　　ہے اسی کے، خاتمِ دستِ سلیماں، ہاتھ میں
اے سلیماں ہو مبارک تجھے یہ شاہی تخت　　تیرا آصف بھی بہ سامانِ وزیری آیا
دگولہ باری ہوئی اعدا پہ یہاں تک، کہ غنیم　　رام پور کر کے تہی بادل جگمگیں بھاگا
مصحفی سے یہی تب آ کے کہا ہاتف نے　　فتح آصف کی ہوئی دشمنِ بیدیں بھاگا
آصف الدولہ مرحوم تھا وہ شستہ مزاج　　جس کے گلزار میں پڑتا تھا صبا سے دھبہ
رونق تھی لکھنؤ کی تو آصف سے مصحفی　　اب کیا کرے گا رہ کے کوئی اس دیار میں
آبادی لکھنؤ کی نہ اگلی سی رہ گئی　　عالم ہوا تباہ تو عالم نکل گیا
حسن کی خاطر رہا ہم کو وطن ہی میں سفر　　لکھنؤ میں سال بھر ہم نے سرائیں بدلیاں
کشمیری ٹولہ میں ہم جاتے تھے روز لیکن　　جی آج تک ہوا ہے نہ گھر کے سرائے ٹھنڈا
اے مصحفی آخر تو ہے نواب کا ایسا　　اس طرفہ زمیں میں تو غزل خواں ہو مکرر
اگرچہ مجھ کو قصیدے سے کچھ رہا نہیں کام　　ولے ضرور ہے اب مدحِ لالہ ٹیکا رام
کیا اس نے مرتب وہ انتخابِ کتب　　کہ جس کو دیکھ کے حیراں ہوئے ہیں اہلِ کلام
میں آیا دلی سے جب، میرا اولیں دیوان　　لکھا تھا آپ سب اس نے، باشتیاقِ تمام
مرے خزینۂ معنی کا ہے امانت دار　　ہے پاس اس کے جہاں تک کہ سب مرا ہے کلام

●

## لکھنؤ کا مصحفی سے سلوک

کہتے ہیں کہ سودا نہیں اس عہد میں، ہے ہے　　یہ حرف بھی کیا محض غلط رکھتا ہے تشبیہ

سودا جو نہیں ہے تو نہ ہوا میں تو بھلا بیٹھا     سودا کی جگہ مسندِ معنی پہ ہوں تو قیصر

پر دیدۂ انصاف زبس کور ہیں، مجھ کو     دُردی کشِ سودا بھی سمجھتے نہیں بے پیر

سودا سے قصیدہ میں کہا لغز، یہی نا     کچھ اس کے سوا اور تو میری نہیں تقصیر

آویں نا! کریں مجھ سے فنِ شعر میں پنجہ     سودا نہیں، بیٹھے تو ہیں سودا کو چکھے میر

سودا تھا قصیدے میں اگر دوسرا بہزاد     میرے بھی قصیدے کی ذرا دیکھیے تصویر

اور میر غزل میں ہیں گر استادِ زمانہ     کرتا ہوں غزل بھی میں زباں ان کی ہیں تحریر

---

یہ گوے یہ میداں، یہ زباں اور یہ بیاں ہے     دعویٰ ہے جسے شعر کا آوے نا، کہاں ہے

سودا کے تئیں کہتے ہیں تھا شاعرِ مغلق     سو شاعری اس کی بھی بلیغوں پہ عیاں ہے

مضمون و معانی سے نہیں بہرہ کچھ اس کو     سچ پوچھو تو اردو کی فقط صاف زباں ہے

سو اس میں بھی تو غور سے دیکھے تو بہت جا     معنی ستمِ لفظ سے فریاد کناں ہے

پر مجھکو مناسب نہیں اس بات کا کہنا     سودا کے تئیں دو کھوں میں، یہ میرا دیا لعہ ہے!

کس واسطے، گزرا ہے وہ مقبولِ خلائق     ویسا بھی کوئی ڈھونڈ ہے اگر اب تو کہاں ہے

اک میر ہے سو یہ تو کبھی ہجو و قصیدہ     کہتا نہیں ہرگز کہ مشیخت کا زیاں ہے

ہوتی ہے غزل سے ہی عیاں شاعری اس کی     جیتا رکھے اللہ، عجب سحر بیاں ہے

سچ پوچھو تو مجھ سے تو انھیں لوگوں کی دولت     یہ ریختہ گوئی کی جہاں میں جو زباں ہے

سودا ہی ہر اک شخص سے یاں سینہ سپر تھا     یہ حملہ اٹھاوے یہ کسے تاب و تواں ہے

پر جب تئیں میری بھی زباں تر ہے زباں سے     ہرگز نہ کہوں گلشنِ معنی میں خزاں ہے

اک ہجو کے کہنے میں زباں میری ہے قاصر     ورنہ جو قصیدہ ہے مرا، کوہِ گراں ہے

سو اس کی قباحت، جو شناسا ہے سخن ہیں     محتاج بہ تقریر نہیں، ان پہ عیاں ہے

کچھ اتنا بڑا کام نہیں، ہجو کا کہنا     لیکن کوئی ہجو اس سے کہے بھی قابل، سو کہاں ہے

---

ہو چکا دورِ میر اور مرزا     اب زمانے میں ہے مرا دورہ

## مصحفی کا مطالعہ

درد کو شاعروں میں سمجھوں میں — یہ تو ہونا نہیں ہے وا دردا
کیونکہ دلّی کے بیچ گزرے ہیں — ڈھائی شاعر سر آمدِ شعرا
اس کی تفصیل یہ کہ کہتے ہیں[۱] — میر و مرزا دو، اور دردؔ آدھا
یہ مسلّم کہ ہے فصیح و بلیغ — جو کچھ اس نے غزل کی قسم کہا
لیک جو ناتمام ہووے اُسے — شاعروں میں گنوں میں کیوں پورا
اس سے میری غرض یہ ہے فلاں — تو تو ہے اعتقاد کا بندہ
شاعری کے تئیں تو کیا جانے — ہے بہت دور شعر کا رتبہ
پوچھ مجھ سے کہ میں نے اپنی عمر — دی ہے سب فنِ شاعری میں گنوا
دلّی کے سب مشاعرے دیکھے — اور ہم طرح میر کا میں رہا
بلکہ جب سب سے اٹھ گئی ہمت — اپنے ہاں بھی مشاعرہ میں کیا
مجھ سے دبتے رہے بڑے چھوٹے — میں کسی سے وہاں کبھی نہ دبا

. . . . . . . . . . . . . . . . . . . .

---

یارب شہر اپنا یوں چھڑایا تو نے — ویرانے میں مجھ کو لا بٹھایا تو نے
میں اور کہاں یہ لکھنؤ کی خلقت — اے وائے یہ کیا کیا خدایا تو نے

---

۱؎ اس "کہتے ہیں" سے آبِ حیات کی پونے تین شاعروں والی میر سے منسوب روایت دیا دشاعر سوزؔ کی ایک اصل تو مل ہی جاتی ہے۔ اس اندازِ بیاں سے ظاہر ہے کہ یہ بات مصحفی کے نظم کرنے سے پہلے سے پھیلی ہوئی تھی! اور یہ بھی ممکن ہے کہ پہلی بار میر ہی نے کہی ہو! یا پھر یہی کہ کسی نے بھی کہی ہو لیکن آزاد تک میر ہی سے منسوب پہنچی ہو۔ بات بے اصل بہرحال نہیں رہی ہے۔ مزید ملاحظہ ہو مسعود حسن رضوی: "آبِ حیات کا تنقیدی مطالعہ"؛ قاضی عبدالودود: اردو ادب میں مضامین۔ اس سلسلہ میں مزید توثیق دلّی کے سلسلہ میں "از شیطان مشہور تر" والی روایت کی مصحفی کے یہاں موجودگی سے بھی ہوتی ہے، جو آبِ حیات سے پہلے اس کے ماخذ مجموعۂ نغز میں درج ہے۔ مصحفی کا شعر ہے:

ہونا بہت آسان ہے شیطان سے مشہور — پر ہو تو لے اول کوئی دنیا میں ولی سا

زمینِ ہند میں تھا میرا زاد بوم و لے    لے آئی کھینچ کے واں سے مجھے یہاں تقدیر
فلک نے مجھ کو کیا لکھنؤ میں زندانی    اگرچہ کچھ مری ثابت نہیں ہوئی تقصیر
[لکھنؤ والوں کا کیا دوش کہ دلّی میں بھی    عمرو عیار تھے ایسے ہی مرے فنا گرداں]
سن کے آبادی کا شہرہ طرفِ مشرق کے    چھوڑ کر دلّی کو یک بار جو آیا میں یہاں
میرے اشعار زبانوں پہ لگے جب پھرنے    چونک اٹھے سن کے انھیں تھے جو یہاں کے گرگاں
آخرِ کار خبر آنے کی سن کر میرے    صحبتِ شعر کا بانی ہوا اک طرفہ جواں
ایک تو میں تھا مرے ساتھ مرا یار قتیل    دوسرا رات کے رہنے میں شریک اس کے وہاں
نظام الدین کو ان کا[1] سلسلہ پہنچے ہے باعث    نظامِ خاندانِ چشت ان سے معتبر تر ہے [جرأت]
وہ حضرت کون ہیں بتلاؤں، میرے پیر و مرشد ہیں    کہ جن کے فیض سے میرا چراغِ دل منور ہے
میں اک ادنیٰ غلاموں میں ہوں ان کے پر ستم دیکھو    کہ جورِ آسماں سے طرفہ بیداد مجھ پر ہے
کہ میں ہوں لکھنؤ میں اور وہ دلّی میں آسودہ    بس اب آگے مرا قصہ بھی فیصل ہو تو بہتر ہے
گر اس خاکِ معطر میں ہوؤں مدفوں تو ہر ساعت    سمجھیے یہ کہ خاکِ پاکِ دلّی روح پرور ہے
شرف رکھتی ہے واں کی موت یاں دریا کے جینے سے    یہی جینا ہے تو جینے سے ایسے موت بہتر ہے
جیتا تو ہوں میں اب تئیں میاں مصحفی و لے    کیا خاک زندگی ہے اکیلے کی زندگی
اوقات مجرد کی کس طرح بسر ہووے    جنگل ہے یہ بکتی ہے یاں نانِ نہاری بھی
مصحفی شوق تو تھا ہم کو بھی تمباکو کا    لیکن آیا نہیں مصرف میں کئی سال سے کال
اس قدر نزلہ گرا ان پہ کہ بس ہلنے لگے    مصحفی ہوتا نہیں اب ہم سے دنداں کا علاج

ع   مصحفی دنداں جو تیرے گر گئے کچھ غم نہ کھا

●

اے مصحفی شاعر نہیں پورب میں ہوا میں    دلّی میں بھی چوری مرا دیوان گیا تھا
کیا چمکے اب فقط مرے نالے کی شاعری    اس عہد میں ہے تیغ کی بھالے کی شاعری
اُن لوگوں کی مجلس میں غوغا میں نہیں دیکھا    بزمِ شعرا ہے یہ یا مرغوں کی پالی ہے

---
[1] شاہ فخر الدین دہلوی

بعضوں کو گماں یہ ہے کہ ہم اہلِ زباں ہیں — دلی نہیں دیکھی ہے زباں داں یہ کہاں ہیں
مصحفی یار ہیں اس وقت کے سب مردہ پسند — ورنہ تھا ہم بھی تخلص جو مزاری رکھتے
مصحفی مجھ سے تعجب ہے جو یہ بات کہوں — کہ مری طرزِ سخن کہنے کو کیا اچھی ہے
میں جن کو بات کرنا اے مصحفی سکھایا — ہر بات میں وہ میری اب بات کاٹتے ہیں
اے مصحفی بے لطف ہے اس شہر میں رہنا — سچ ہے کہ کچھ انسان کی توقیر نہیں یاں
تعب و رنج اٹھاتے نہیں کیا کیا شبِ فکر — دل مگر رکھتے ہیں یہ اہلِ سخن پتھر کے
کچھ شعر و شاعری سے نہیں مجھ کو فائدہ — الّا حصولِ کاوشِ بے جائے خلق ہے
صاحب نظر وطن میں مسافر ہوں اس لیے — ہیں حلقہ ہائے چشم میں نت بے قرار چشم
مصحفی لکھنؤ میں کیا مری قدر — اس خرابے میں ہوں میں بن کا پھول
ذرا اے مصحفی ان لکھنؤ والوں سے ہشیار رہ — تو تو ہے بے شہر اور یہاں دور ہے ناداں شہر پر تکا
کیا لکھنؤ میں ناداں تھا نال گڑا تیرا — کیوں مصحفی تو یاں سے شبگیر نہیں کرتا
کیا لکھنؤ کو چھوڑتے لگتا ہے مصحفی — جب ہم نے دلی شہر سا گلزار تج دیا

ع خطائے خصم نہیں کچھ یہ بخت کا ہے قصور

وہی ہوں میں کہ جیسے فیضیِ زباں انشا — سمجھ کے دل میں نہ لاتا تھا کچھ خیالِ غرور
وہی ہوں میں کہ جیسے خانہ زاد خاں صاحب — لکھے ہیں نثر میں اپنی کلیمِ طورِ شعور
وہی ہوں میں جیسے رنگین نے اپنا سب دیواں — دکھا کے تابہ تمامی کیا ہے رفعِ فطور
وہی ہوں میں کہ حسن شاد شاد جس سے ملا — کسی سے غیر ستایش نہ کچھ کیا مذکور
وہی ہوں میں کہ جیسے میر سوز سلمہٗ — کرے ہے یاد بہ لفظِ ستایشِ موفور
وہی ہوں میں کہ جیسے میر مفخر الشعرا — کہے ہے ماں، جو کچھ آ جائے ہے کبھی مذکور
وہی ہوں میں جیسے مرزا قتیلِ سحر بیاں — کرے تھا طرح پر اپنی بدستی مامور
وہی ہوں میں جیسے منت نے . . . جانا — اگرچہ تھا وہ نہایت بشاعری مغرور
وہی ہوں میں جیسے دیوانہ سرب سکھ نام — لگے تھا سر کو جھکانے، میانِ راہ از دور
وہی ہوں میں جیسے فاخر نے بعد ردّ و بدل — کہا تھا پیچھے حقہ، میانۂ جمہور

# مصحفی کا مطالعہ

وہی ہوں میں جسے جرأت بھی خوب جانے ہے
کہ فنِ ریختہ میں بھی ہے وہ برابر زور

وہی ہوں میں کہ رہا جس کی نظمِ دلکش پر
مشاعروں میں ہمیشہ ہے شورِ روزِ نشور

پر اب سخن میں مرے شاید آگئی سردی
کہ ان کی شورشِ تحسین ہو گئی کافور

عجب معاش ہے ان دوستانِ یک دل کی
اس اتحاد پہ یہ کچھ بھرے ہیں دل میں فتور

سرقے سے برا مانیے کیوں مصحفیؔ سچ ہے
کہتے ہیں جسے شاعری ہے آپ سخن چور

مت باندھیو اے مصحفی مضمون کسی کا
ہے ننگِ خلائق وہ جو شاعر ہے سخن چور

مصاحب ایسے کہ گر کچھ کسی سے لغزش ہو
تو اس کے رفع کی ہرگز نہ کر سکیں تدبیر

وگر کریں تو پھر ایسی کہ نارِ طیش و غضب
مزاجِ شاہ میں ہو مشتعل بصد تشویر

سو تابِ ذرّہ کہاں نورِ آفتاب کہاں
کہاں وہ سطوتِ شاہی کہاں غرورِ فقیر

مقابلہ جو برابر کا ہو تو کچھ کہیے
کہاں دبیقی و دیبا کہاں پلاس و حصیر

میں اک فقیر غریب الوطن مسافر نام
الٹ کے پھیر بحرفِ ذمیمہ دوں تغییر

یہ افترا ہے بنایا ہوا سب انشا کا
کہ بزم و رزم میں ہے پایۂ تخت کا وہ مشیر

مزاجِ شاہ ہو یوں منحرف، تو مجھ کو بھی
یہ چاہیے کہ کروں شکوہ اس کا پیشِ وزیر

وگر وزیر بھی بولے نہ کچھ خدا لگتی
تو جاؤں پیشِ محمدؐ کہ ہے بشیر و نذیر

شفیعِ روزِ جزا بادشاہِ اَوْ اَدْنیٰ
نہ کردہ جرم پہ جس نے نہیں لکھی تعذیر

کہوں یہ اس سے کہ اے جرم بخشِ بے گنہاں
تری غلامی میں آیا ہے دادخواہ فقیر

خطا ہو میری جو پہلے تو کر اسیر مجھے
وگر عدو کی ہو، ہاں اس کو طوق اور زنجیر

اگرچہ بازیِ انشاءِ بے حمیت کو
رہا خموش، سمجھ کر میں بازیِ تقدیر

ولے غضب ہے بڑا یہ کہ اب وہ چاہے ہے
خیال میں بھی نہ کھینچوں میں ہجو کی تصویر

سو میں فرشتہ نہیں ایسا، بشر ہوں تا کے چند
کہے سے اس کے کروں گا نہ ماجرا تحریر

. . . . . . . . . . . . . . . . . . . .

مگر یہ بات میں مانی کہ سوانگ کا بانی
اگر میں ہوں تو مجھے دیجیے بدتریں تعذیر

## مصحفی کا مطالعہ

میں آپ فاقہ کش اتنا مجھے کہاں مقدور
کہ فکر اور کروں کچھ بغیر آشِ شعیر

. . . . . . . . . . . . . .

گر اس پہ صلح کی ٹھہری رہے تو صلح سہی
دگر ہو پھر شرارت شروع ہوں میں بھی شریر

جواب ایک کے یہاں دس ہیں اور دس کے سو
نگاہ کرتے تھے اول بہ ایں قلیل و کثیر

حصول یہ ہے کہ جب کوتوال تک قضیہ
گیا ہوا ز پئے تہدیدِ شاعرانِ شریر

کہ کوتوال ہی بس ان سے اب سمجھ لے گا
یہ دم بدم کی شکایت کی ہے عبث تقریر

. . . . . . . . . . . . . .

اگر کانا بھی ہو شاعر تو اس کا کچھ نہیں نقصان
ہے شکلِ آبرو کو اب تلک توقیرِ یک چشمی

[یہ دربیاں، جو مہینوں بگاڑ رہتا ہے
وہی شریر نہیں کچھ شریر ہم بھی ہیں]

چالیس برس کا ہی ہے چالیس کے لایق
یاں مردِ معمر نہیں دس بیس کے لایق

اے وائے کہ پچیس سے اب پانچ ہیں اپنے
تھے ہم بھی کنھیں روزوں میں پچیس کے لایق

استاد کا کرتے ہیں امیر اب کی مقرر
ہوتا ہے جو درماہہ کہ سائیس کے لایق

ہے یہ بھی نوکری کچھ مصحفی کہ یاں تنخواہ
جو ایک سال ملے، ایک سال میں ڈوبے

قسم بذاتِ خدا ہے کہ ہے سمیع و بصیر
کہ مجھ سے حضرتِ شہ میں نہیں ہوئی تقصیر

سوائے اس کے کہ حال اپنا کچھ کیا تھا عرض
ولے بطورِ شکایت تھی اند کے تقریر

گر اس سے خاطرِ اقدس پہ کچھ ملال آیا
اور اک گنہ سے ہوا بندہ واجب التعزیر

سو وہ بھی ہو چکی، یعنی بصورتِ ایجاد
گلی گلی تو ہوئی سارے شہر میں تشہیر

عوض روپوں کے ملیں مجھ کو گالیاں لاکھوں
عوض دوشالے کے خلعت بہ شکلِ نقش بدیر

سلف میں تھا کوئی شاعر نواز ایسا کب
جو ہے تو شاہ سلیمان شکوہ عرش سریر

مزاج میں یہ صفائی کہ کر لیا باور
کسی کے حق میں کسی نے جو کچھ کہ کی تقریر

اول تو مدح گوئی پیمبر ہے مصحفی
پھر نغمہ سنجِ مدحتِ حیدر ہے مصحفی

مسکیں فقیر ہے نہ تونگر ہے مصحفی
ملکِ سخن کا صاحبِ افسر ہے مصحفی

سب جانتے ہیں اس کو کہ بے شر ہے مصحفی

## مصحفی کا مطالعہ

اس کا ذہن ہے یہ جو کرے شاہ کی ہجا — ہے سب یہ اس غریب پہ انشا کا افترا
بغض اپنا وہ نکالے ہے لے شہ کا اڑ تلا — کس واسطے کہ اس کا سخن اس پہ ہے رسا
فکرِ غزل میں لاکھوں سے بہتر ہے مصحفی
واقف ہیں میر سوز بھی خوب اس کے حال سے — کچھ مطلع ہے میر بھی اس کے کمال سے

. . . . . . . . . . . . . .

آیا تھا لکھنؤ کو سمجھ کر یہ جائے امن — گوشے میں پا شکستہ پڑا تھا برائے امن
اخبار میں لکھا ہے گیا ماجرائے امن — بگڑی نظر پڑے ہے مجھے اب ہوائے امن
جو حکم ہو سو کیجیے کہ مضطر ہے مصحفی
اس کا نہ کوئی یار نہ یاور ہے اس جگہ — نے خویش و اقربا نہ برادر ہے اس جگہ
پھر کیا کہے جو حادثہ اس پر ہے اس جگہ — ہر سو اسی کے ہجو کا دفتر ہے اس جگہ
ناحق مغلظات کا مصدر ہے مصحفی

مدت سے ہوں میں سرخوشِ صہبائے شاعری — ناداں ہے جس کو مجھ سے ہے دعوئ شاعری
میں لکھنؤ میں زمزمہ سنجانِ شہر کو — برسوں دکھا چکا ہوں تماشائے شاعری
اک طرفہ خر سے کام پڑا ہے مجھے کہ ہائے — سمجھے ہے آپ کو وہ مسیحائے شاعری
ہے شاعروں کی اب کے زمانے میں یہ معاش — پھرتے ہیں بیچتے ہوئے کالائے شاعری
لیتا نہیں جو مول کوئی مفت بھی اسے — خفت اٹھا کے آتے ہیں گھر وائے شاعری

## عہدِ مصحفی کچھ متفرقات

اس حصے میں اس قسم کی چیزیں ہیں:

نصیری فرقہ کا غالباً اودھ میں کچھ نہ کچھ وجود ضرور تھا، یہ لوگ علیؓ کو الوہیت کے درجے تک پہنچا دیتے ہیں مرثیہ پڑھنے کے لیے مجلس کو جاتے وقت اور لوٹتے وقت مرثیہ خواں کے ساتھ اچھا خاصا غول ہوتا تھا لیکن شاعری مرثیہ خوانی سے الگ چیز سمجھی جاتی تھی۔

# مصحفی کا مطالعہ

شیعی اثر کے تحت معلوم ہوتا ہے، استخارہ کا عام دستور تھا اور اودھ کی شیعی تہذیب کے
عناصر میں سے ایک اہم چیز تھی۔ ڈاک کی رفتار بھی غالباً تیز تر ہو گئی تھی۔
نوکری کا مفہوم زیادہ تر تیغ و سپر لگانا ہی سمجھا جاتا تھا۔ محرم ماتمی مہینہ سے زیادہ ایک
تیوہار کی حیثیت اختیار کر گیا تھا، اور محاورۃً بھی استعمال ہوتا تھا "کئی جاڑے گزر گئے"
"کئی برساتیں گزر گئیں" کی طرح "کئی محرم گزر گئے"۔ گیتی رکھنے کا رواج تھا۔
وعدہ کی پختگی کے لیے ہاتھ پر ہاتھ مارنا،
بلانے کے لیے سیٹی بجانے کا طریقہ،
اور گلی کوچوں کے دروازوں پر پھاٹک یا بڑے دروازوں کا رواج، جو مع دربان کے آج بھی
دلّی کے متعدد پرانے کوچوں میں رائج ہے۔
صدقہ کے طور پر اتارے کا چراغ چوراہے پر رکھنا عام تھا، غالباً ہندو تہذیب کے اثر سے پتنگ
بازی اور اس کے لوازم کا تذکرہ ظاہر کرتا ہے کہ خوب رواج تھا (شاید مصحفی بھی اڑاتے ہوں!)
قصیدے کا حاصل اکثر و بیشتر صرف کھانا تھا۔ مشاعرے کا ایک ضروری جز واہ وا بھی تھی لونڈا دہلی
اور لکھنؤ دونوں جگہ تہذیب کا ایک نشان تھا۔ ہلاکو مصحفی کے وقت تک ایک نشان بنا ہوا تھا؛ ہمارے
زمانے میں اقبال تک آیا ع خاکستر اسکندر و چنگیز و ہلاکو۔
نہاری کا رواج شاید لکھنؤ میں نہ تھا اور اس لیے دلی یاد آئی، دلی میں "اوقات بسر کی" آج بھی
نان نہاری پر بسر ہو جاتی ہے، ناشتہ لذیذ اور سہولت ملنے والا غریب پرور کھانا! حقہ پینا
سلفہ پینا، مے نوشی پر قدغن کے باعث کھلا پینا؛ شگن کے کپڑے کا رواج، شراب ہندی، شعر و
شطرنج بیکاری کے مشغلے؛
کوڑیاں، دمڑی، دھیلا یہ سکّوں کے نام ہیں۔ ملّا کوڑیوں پر فال نکالا کرتے تھے یا فال نکال کے
معاوضہ میں چند کوڑیاں لیتے تھے؛ پانوں کی ڈھولیاں دو دو پیسے آتی تھیں؛ چھٹی جمعہ کو ہوتی
تھی۔
نیدآبادی کمان؛ چنبیلی کا تیل؛ دروازے کی کنڈی لگانا؛ چوسر بازی اور اس کے متعلقات؛
گلی ڈنڈا، نام کا معمہ نکالنا علاوہ ازیں:

## مصحفی کا مطالعہ

پشاور کا خشک، بدایوں کے مزارات، کچھوچھہ شریف، سفرِ عراق کی صعوبتیں، کشمیر کا ویری ناگ کا چشمہ۔ (مصحفی کے علاوہ مضافاتِ کشمیر کا حوالہ اور کہیں نہیں ملتا۔ بات دلچسپ ہے، علی ابراہیم خاں کا مشہور تذکرۂ شعرا گلزارِ ابراہیم، جس میں بیشتر شعرا نے اپنے انتخابات خود بھیجے تھے (غالباً مصحفی نے بھی!) نادر شاہ کا حملہ، برسات کے موسم کی پریشانی، ملار کا میلہ۔

ہندوؤں کا خزانہ پر چراغ جلانے کا رواج، کسی خاص سال ہندوؤں کی کثرتِ اموات، راون کے ستر پوت، ہندو مسلم تعلقات کچھ خاص دلی خلوص کے ساتھ نہ ہونا، یہ سب مصحفی کے ان اشعار میں ملتا ہے۔

کھاتے نہیں اب ترے نُصیری — سوگند بھی مرتضیٰ علیؑ کی
تمھارے ساتھ میاں مصحفی ہیں جوق کے جوق — مگر تم آتے ہو مجلس سے مرثیہ پڑھ کر
کچھ میں شاعر نہیں اے مصحفی ہوں مرثیہ خواں — سوز پڑھ پڑھ کے محبوں کو رُلا جاتا ہوں
ایک نے تیرے مریضِ عشق کو دارو نہ دی — آ کے یوں لاکھوں اطبا استخارہ کر گئے
دو دن میں آ رہے گا خط کا جواب واں سے — اے مصحفی ہماری یہ ڈاک زندگی ہے
اے مصحفی بدن میں طاقت وہ کب رہی ہے — جو نوکری کی خاطر تیغ و سپر لگاؤں
پیارے کبھی محرم گزرے اسی طرح سے — تم نے تو ہم کو یوں ہی امیدوار رکھا
اے مصحفی تو ہاتھ میں گیتی تو رکھا کر — ہوتا ہے نگہبان ہر انسان کا لوہا
وعدۂ وصل زبانی ہے میں کیونکر مانوں — ہاتھ پر ہاتھ تو اس شوخ نے مارا ہی نہیں
شب گھر سے جو سیٹی کی وہ آواز پہ نکلا — نکلا تو ولیکن عجب انداز سے نکلا
غل چور کا ہوا تھا کہیں تب سے ہے یہ حکم — پھاٹک گلی کا اس کی سرِ شام بند ہو
سر کے صدقے رکھ دیا دل یوں میں اس کی راہ میں — جیسے چوراہے میں رکھتے ہیں اتارے کا چراغ
ہوتا ہے پہلے خون سے مانجھے کا رنگ سرخ — واں ساری ڈور پر نہیں اُڑتا پتنگ سرخ

ع کل پتنگ اس نے جو بازار سے منگوا بھیجا
ع اپنی نظروں میں ہے پتنگ کا ڈھانچ

وگرنہ یوں تو قصیدے بہت کہے میں رقم کسی سے کچھ بھی نہ حاصل ہوا، ہوا تو طعام

# مصحفی کا مطالعہ

طعام کونسی بخشش میں ہے کوئی یہ کہے ۔

میں مصحفی غزل اس انجمن میں اور پڑھوں کیا　　کہ کچھ ہوا ہی نہیں شعر واہ وا ابھی تو

ع۔ نظر آتا ہے یہ لونڈا مجھے ہرجائی سا

ع۔ قتل عالم میں بلا کو سے قدم آگے بڑھا

اوقات مجذ کی کس طرح بسر ہووے　　جنگل ہے یہ کٹتی ہے یاں نان نہاری کیا

جو دم حقے کا دوں لوٹ کا یہ حقہ نہیں پیتا　　بھروں حامدی سے گر سلفہ کہے سلفہ نہیں پیتا

وزیر الملک کا از بسکہ نوشنوں پہ قدغن ہے　　بجائے مے وہ ہے یاں کون جو کسفا نہیں پیتا

مصحفی چھینٹ سے جو ہمیں نفرت ہے　　ہم پہنتے ہی نہیں چھینٹ و ململ کا کپڑا

شراب پیتے ہیں اے مصحفی جو وہ ہندی　　تو کیوں نہ خندہ کو ان کے ہیں نوش خندہ کہوں

شعر و شطرنج سوا مشغلہ پھر کونسا ہے　　مصحفی کام کہی ہوتے ہیں بے کاروں کے

جب کوڑیوں کی فال پہ ٹالا کی ہو معاش　　کیوں آرہے نہ دمڑی و دھیلے کی زندگی

کام از بسکہ زمانے کا ہوا ہے برعکس　　چور کھنچواتے ہے اس عہد میں کوتوال کی کھال

خوباں سبز رنگ کی پورب میں کیا ہے …　　جب زرد دو پیسے بکتی ہوں پالوں کی ڈھولیاں

جمعہ کے دن بھی فغاں کرتے ہیں اس کوچے میں ہم　　نام چھٹی کا نہیں جس میں یہ وہ مکتب ہے

ع۔ تھی فرید آباد کی گو اپنی کمان ریختہ

ع۔ تیل کیوں ڈالو ہو بالوں میں چنبیلی کا میاں

ع۔ دروازے کی کنڈی نہ شب تار لگائی

ع۔ سچ ہے یہ خوب نہیں اتنی بھی چوسر بازی

ع۔ یہ بھی قدرت ہے خدا کی اسے بارہ آویں

ع۔ منظر عشق کی چوسر میں جو اک پو کا ہو

ع۔ کھیلتا پھرتا ہے لڑکوں میں گلی ڈنڈا وہ شوخ

ع۔ نام کا اس کے جو میں کہہ کے معمہ بھیجا

دیکھا نہیں نے ہونہ دیں جب تنکہ پشاوری　　لینے برنج اے مصحفی روح اپنی پشاور گئی

قاتل تری گلی بھی بلاؤں سے کم نہیں        ہر ایک گھر میں جس کے مزار شہید ہے
عشق کا جن سر سے کب اترے ہے آساں مصحفی        گو کہ یہ عامل کچھو چھے کا کریں روشن چراغ
مصحفی دشتِ بلا کا سفر آساں کیا ہے        سینکڑوں ابرہ و شیراز میں مرجاتے ہیں
کشمیر بھی جاؤں تو عجب کیا ہے جو یہ چشم        . . . چشمۂ ورناگ سے باندھے
یادِ کشمیر میں کل مصحفی اتنا رو یا        کہ سرِ تک اس کے گئے چشمۂ ورناگ ابل
مصحفی لکھ دیجیے اپنا اس میں گر رنگیں کلام        کیجیے گلزارِ ابراہیم کو گلزارِ عشق
فوجِ غم کو تھا جو عزمِ قتل نادر شاہ دل        رات بھر سینہ میں اس نے کتنی جائیں بدلیاں
موسم باراں میں تو ہیں مصحفی مختل حواس        سو جھ گئے غفلت میں فصلِ بہاراں سینکڑوں
میلے سے جب مدار کے جس دم چلا وہ شوخ        اس دم ہی تلخ ہو گئی میلے کی زندگی
نام دولت مند کا ہوتا ہے روشن مال سے        شب جلا لیتے ہیں ہندو یہ سرِ مخزن چراغ
مصحفی بھادوں کی راتوں میں نہ نیند آئی مجھے        سینکڑوں ہندو شوں سوار تھیاں مگھٹ گئیں
اللہ رے یہ کثرتِ امواتِ ہندواں        آتی ہے ہر گلی سے صدا رام رام کی

ع        مصحفی راون کے جو ستّہ تھے پوت

ہے زلف سے یوں انقباض عارض کو        کہ جیسے صحبتِ ہندو سے ہو مسلماں تنگ

## فرہنگ مصحفی

اس حصے میں جن الفاظ پر میں زور دینا چاہتا ہوں        یہ غریب نادر یا عام روش سے ہٹے ہوئے استعمالات، یا بعض جگہ تذکیر کا تانیث یا تانیث کا تذکیر کے طور سے استعمال ہے جو یہاں مصحفی کے کلام سے استناد کے طور پر جمع کر دیا گیا ہے، کسی لفظ کا نامانوس استعمال یا کسی نامانوس لفظ کا عمدہ استعمال، یا کوئی ترکیب یا کوئی اور اہم استعمال جس کے سلسلہ میں مصحفی سند یا حوالہ بن سکیں۔

آکسفورڈ کے طرز پر کبھی ہمارے یہاں بھی کسی کو اردو کے لیے تاریخی لغت کی ترتیب کا خیال آیا

تو یہ مطالعہ کچھ نہ کچھ کام دے جائے گا۔ ان مثالوں میں، جو خود توضیحی ہیں، اور اس لیے جن کے معنی کی وضاحت کسی جگہ نہیں کی گئی ہے، اس کا امکان ہے کہ بعض مستعملات آپ کو عامۃ الورود معلوم ہوں یا ان میں کوئی غرابت یا اجنبیت محسوس نہ ہو، تو پہلے تو ایک بار پھر اس نظر سے دیکھیے گا کہ کہیں آپ عامۃ الورود اپنے زمانے کے لحاظ سے تو نہیں کہہ رہے ہیں (حالانکہ میں نے مصحفی کا زمانہ پیش نظر رکھا ہے) یا کہیں ذہن میں آپ بول چال (colloqial) کو مستند فرہنگ کا درجہ تو نہیں دے بیٹھے ہیں۔ اس جائزے کے بعد بھی میری کوئی مثال نامناسب یا بھرتی کی لگے تو پھر زوائد میں شمار کر کے اسے ساقط سمجھ لیجیے اور میرا عذر پیش نظر رکھ لیجیے کہ میری توجہ اس طرف زیادہ رہی ہے کہ میں زیادہ لغات لے لوں بہ نسبت اس کے کہ زیادہ سے زیادہ چھوڑ دوں، اور یہ اس لیے کہ پہلی صورت میں تو میں محض بھرتی کا جرم کر رہا ہوں گا اور دوسری صورت میں جو الفاظ چھوڑ دیتا ان کا تو بدل ہی ممکن نہ تھا۔ یوں بھی یہ مثالیں کچھ اتنی زیادہ ہیں ہی نہیں کہ یہ بھرتی غیر معمولی ہو۔

شمشیر نکالنا، لمبے ہونا، لالہ لوجی، ہماری بھائیں، فطرت کرنا، استوا، پاہنا، اچھو، دھرماتما، پَن، خریدہ، پڑنا، صبح خیز یا ادر اٹھائی گیرا کی ترکیبیں، ڈیڑھ اینٹ کی مسجد، جدی (جدا، جدے) بہ ہیئتی دیہی لفظ بیر بہوٹی ہے۔ یہ نا نہیں یہ 'د' کے بجائے 'ی' کا استعمال مصحفی کے یہاں اور اس کے بعد رتن ناتھ سرشار کے یہاں بھی اس طرح کیوں ملتا ہے) گلی ڈنڈا، سنڈا، [لباس کی مختلف چیزیں، شب برات کے جشن میں استعمال میں آنے والی اشیا] وعدہ وعید، آغا، جاسوس و ہرکارہ، قلق گزری، ہر کدام کی، گرانڈیل، جی رندھنا، دردیلی، ہتی، کھرا، چوٹ کا یہ استعمال، دبیل، کاٹ (مذکر)، ارگن (انگریزی)، لیلام (انگریزی لفظ جواب ہمارے یہاں نیلام ہو گیا ہے دلچسپ بات یہ ہے کہ افغانستان میں یہ اب بھی لیلام ہی ہے)، پولا، پور، پور پور، ملولے (ملول سے بر اسم جمع ہیں!) بتولے، دھنکار، بکنا بھرنا، پنس (انگریزی)، ادر میانہ، رذالپن، ڈول بندھنا لچھن جھڑنا، ٹکڑگدا، کوے، بردباری کا یہ استعمال، اہل امتیاز (بطور جمع) لق لق (حاجی لق لق سے بہت پہلے)، پسماندہ کا یہ استعمال، گزری، افسر، صاحب سلامت، چھاچھ (مونث)، ڈاک (شاید رفتار بھی تیز)، چلم پر آگ رکھنا، تمردی کرنا، گنوار، برابر زور، سوسنانا، جق جق، شعلہ بند

فارغ البال کا یہ دلچسپ استعمال، پگڈنڈیاں، میری مزار، اچان چک، چھید، [اول جلول، ہلونق، فصحیا، کلابتو، ٹانگن، بگٹٹ، لبسکٹ کا رواج، بحثیں، کیفی مرحوم کے تومیانا اور برتانا کی توسیع زبان کے سلسلہ کی تجویز کا نقشِ اول، چال کا یہ استعمال، ڈانڈے (دہی بحثوں والا)، اسم کے فعل بنانا، کرایہ گھر لینا (بجائے کرایہ پر)، بازاری، چوکی بٹھانا، بارہ، نو، تیراک (پیراک بھی)، ادھیڑ میں لگا، قبولا (وہی توسیعِ زبان کا اصول بخشنا، ڈانڈنا کے طریقہ پر)، بساہنا، کمبختی آنا، کلاغ، بندوق کا نال، سراپ (شراپ)، الاپ، صور جگانی ہے، پیپل کا پتا، کنڈا، سرکنڈا، تیغا کرنا، جمنا کا نہان، حبا ناک، ابتدا (مذکر)، تڑخنا۔

●

ٹھیٹھرا کیا یہ نکالا ہے اجل نے مجھ سے
دشمنِ جاں کہیں آوے بھی اگر آتی ہے

لپٹے ہوئے جو کھاتے تھے زخم اس کی تیغ کے
بس ایک دم میں یاروں کی یاری نکل گئی

جب عشق کی کشش نے مجھ سے اُسے ملایا
تب بولے لالہ لوگ اہلِ ہوس، مبارک

کبھی سنتا نہیں اے مصحفی فریادِ مظلوماں
ہماری بھائیں تو یہ فلک گویا کہ بہرا ہے

بچایا رُخ تو بہت اس نے وقتِ سرگوشی
میں بوسہ لے ہی لیا جھک کے کیا ہی فطرت کی

جو نیم روز رُخ اس کے سے اٹھ گیا پردہ
تو استوا میں غروب آفتاب ہووے گا

دنیا ہے سرائے فانی اس میں
جو آیا ہے یاں سو پاہنا ہے

مصحفی اس نے مرے ہاتھ سے پانی نہ پیا
ناگہاں اس کو بہانہ جو ہوا اُچھو کا

یار دھرپاسما کا پیار کے ساتھ
بوسہ دینا بھی مجھ کو پُن سا لگا

اے برق کوند جا کے کسی کے کھیت پر
مت جی ڈرا کہ مری کھیتی خوید ہے

مصحفی جا کے وہاں بھول گئے کیا ہم کو
کبھی یارانِ عدم نے جو نہ پُرزا بھیجا

شیخ الحرام، موذن دونوں چلن کے بد ہیں
وہ صبح خیز یا ہے تو وہ اٹھائی گیرا

ضروری کیا مجھے دیر و حرم کی سیر کروں
میں ڈیڑھ اینٹ کی مسجد کہیں جدی نہ بناؤں

سچ جو پوچھو تو بدیہی ہے اثر صحبت کا
سُرخ ہو جاوے ہیں چاول بیر بہٹی سے برنج

کل تو کھیلے تھا وہ گلی ڈنڈا
ڈنڈ پیل آج ہو گیا سنڈا

## مصحفی کا مطالعہ

[لباس؛ شب برات کے جشن میں استعمال میں آنے والی اشیا!]

ع جاتے ہوئے تو ہم سے وعدہ وعید کر لے

ع اپنے آغا سے دغا کر کے بچا کون بھلا

ع بدگمانی سے کہ خود جاسوس ہر ہرکارہ تھا

ع تلق جو ہم پہ شب ماہتاب میں گزری

ع مجلس میں اس کی راہ ہوئی ہر کدام کی

ع جس گراں ڈیل کو تک تم نے گراں دیکھا ہے

ع یہ بھی زندہ کہ زیست سے بیزار ہم ہوئے

ع درد دل غزل ایسی تو اک مصحفی جس کا

ع کہ ہے سائیں ہمارا در نہ ہٹّی نہ کھیرا ہے

ع مصحفی کا ہے قتیل البتہ چوٹ

ع اے مصحفی ہے کچھ تو دبیل اس کا تیوردن رات

ع پہلے دیکھے ہے خرد گاؤ بہ تلوار کا کاٹ

ع . . . . . ارگن (باجا)

ع اے مصحفی لیلام میں کل ہم بھی گئے تھے

ع جس طرح کر آتش میں جلے ہے کبھی ببولا

ع تم نہ لیمو نک سے نیشکر کی پیوند میر

ع (ہر ربو) انگلیوں میں پہنے ہیں اس نے چھلّے

ع دن کیا گزر گئے تجھے اس کے ملولے میں

ع کھاتے ہیں جھوٹی قسمیں یہ ان کے توتلے ہیں

ع یا بولے یا بتائے وہ دھتکار، ہو سو ہو

ع جاتے جاتے اک اکنّا بھر لیا

ع تجھ پاس تو کبھی نہ بنسی تھی نہ میانہ تھا

# مصحفی کا مطالعہ

ع کتنی زباں کھلی ہے اس کی رذالپن میں

ہم گاہ گاہ اس سے رستے میں مل رہے ہیں
ملنے کا اب تو بارے اک ڈول بندھ رہا ہے

چہرا اتر رہا ہے نقشے بگڑ رہے ہیں
پھر اندنوں تو تیرے گلشن سے جھڑ گئے ہیں

کیا ہم ٹکڑ گدا ہیں جو مصحفی یہ سوچیں
ہے گرم اس کا چولھا اس کا ایاغ ٹھنڈا

مگر مصحفی خون رویا ہے چھپ چھپ
ہیں سرخ اب تلک اس کی آنکھوں کے کوئے

رقیب نے مجھے کیا کیا کہا نہ مجلس میں
میں کر رہا تری خاطر سے بردباری، رات

اتنا تو دھیان رکھو یہ کس کی انجمن ہے
بیٹھو ذرا سرک کے اے اہل امتیاز دو

ناصح . . . . . . .
خوش آئی کب ہے یہ لق لق کسی کو

عمر پسماندہ کچھ ذلیل سی ہے
زندگانی بھی کچھ قلیل سی ہے

سو بار جا چکا ہے یہ گزری ہیں مصحفی
وہ دل نہیں کہ جس کا خریدار ہو کوئی

لفر قہ نام سے بھاگے تھا جنھوں کے ان کا
کہیں دھڑ اور کہیں سر اور کہیں افسر دیکھا

اس کو پھر اپنی طرف سے ہم نہیں کرتے ہیں ترک
جن سے ٹک اک بار بھی صاحب سلامت ہو گئی

لازم ہے مجھے مصحفی وصف اپنے سخن کا
کہتی نہیں ہرگز کوئی چھاچھ اپنے کو کھٹی

دو دن میں آ رہے گا خط کا جواب واں سے
اے مصحفی ہماری یہ ڈاک زندگی ہے

رکھی ہے آگ بزرگوں کی میں چلم پہ بہت
عجب نہیں جو مرے ہو دیں داغدار انگشت

خوباں نے ہم سے شہر میں یوں کی تمردی
صحرا میں جوں غریب کو لیوے گنوار لوٹ

ع کہ فن ریختہ میں وہ بھی ہے برابر زور

ع وہ مجھ کو سنا جائے ہے سو غصہ میں آکر

ع مصحفی تیری تو جق جق نے جلا ڈالا جی

ع گو رات گزر جاوے بیٹھا ہوں میں بد کر شرط

ع منڈا کر سر کو ہو جا فارغ البال

ع پگڈنڈیاں نہیں ہیں برابر یہ مصحفی

ع راہ میں اس کے اگر میری مزار آئی ہے

## مصحفی کا مطالعہ

ع میں اچان چک جو نہیں آگیا مجھے دیکھ نظریں بچا گئے

ع جوشِ گریہ سے پڑا یوں دلِ افگار ہیں چھید

[ مثنوی چار پائی ہیں: اول جلول، ہونق، فضیحتا ] ع کلابتو کا ہے جو کام تیرے کفش پہ چھوٹا

تا نگن نو صنم آپ ترا جاوے ہے کھٹ کھٹ        کس واسطے دوڑا دوے ہے تو کہو اسے بگ ٹٹ

ہے یہ فلکِ سفلہ وہ پھیکا سا فرنگی        رکھتا ہے مہ و خور سے جو پاس اپنے دو بسکٹ

کیا بحثوں ہیں اے مصحفی ان سے عربی میں        معنی ہیں جہاں فرق نہ ہووے گُم و گُم کا

دل تنہا، صبر چلا، جی بھی چلا جاتا ہے        ٹک مدد کر تو کہ لشکر میں مرے چال پڑا

لت عاشقی کی کوئی جاتی ہے عاشقوں سے        گو بادشاہ ڈانڈے گو کوتوال باندھے

دیکھا ہے جب سے تجھ کو رہے ہے یہی خیال        گھر لیجیے کرایہ ترے متصل کہیں

بازاری اس کے کیونکہ نہ پیچھے پڑیں کہ وہ        کرتا گیا ہر اک سے اشارات راہ میں

کیونکہ گھر غیر کے جاوے گا تو دیکھوں گا ابھی        اب کے چوکی میں کوئی تجھ پہ بٹھا جاؤں گا

یہ بھی قدرت ہے خدا کی اسے بارہ آدمی        منتظر عشق کی چوسر میں ہو جو اک پو کا

[ کہاں گیا تھا تو اے دل ادھر تو آ جانی        تمام رات میں تیرے ہی انتظار میں تھا ]

اک پرزے پہ کیونکر میں لکھوں مصحفی اس کو        مضمونِ تمنا ہے عبارت سے زیادہ

ع قلزمِ عشق کے تیراک سبھی پار لگے

ع پھر یہ کیسا ادھیڑ بن سا لگا

ع ادھیڑ بن سی رہی مصحفی جو صبح تلک

ع . . . چوری جو پکڑی تو قبولا

ع کیا بحثوں ہیں اے مصحفی ان سے عربی اب

ع اسبابِ طرب بساہنا ہے

ع ارے کمبختی کیوں آتی ہے تیری

ع مثالِ آہو برہ بھرے ہے کلانچ

ع . . . . بندوق کا نال

ع . . . . . . سراپ
ع سخت مشکل ہے ان سردوں کی الاپ
ع اسے سورِ قیامت تو جگاتی ہے ہمیں کیا
ع پیپل کا پتّا ہم کو خشکی نے کر دیا ہے
ع حشر میں سب کو پڑے گی آپا دھاپ
ع آگ میں جیسے سُرخ ہو کنڈا
ع سوکھ کے ہو گیا ہے سر کنڈا
ع کر دیجیو آج تیغا، دروازہ سحر کو
ع جمنا میں کل نہا کے جو اس نے بال باندھے
ع مصحفی کب وہ حیا ناک ہوا مجھ سے دوچار
ع یہ تو بتلا دوستی کا ابتدا کیونکر ہوا
ع دیر رہے سے تڑخ جاتا ہے شیشہ دھوپ میں

●

## عقیدہ اور عمومی فکر

عقیدۃً مصحفی غزل گو تھے، غزل گو کا مسلک اگر کچھ ہوتا ہے تو صرف عشق۔ غزل گو کو شاید غزل خواں کو بھی، یہ کسی دین کا نہیں چھوڑتی، غزل کی ایک اپنی شریعت، اپنا مخصوص مسلک ہوتا ہے

ع اس آپ کی زمیں سے پرے آسماں سے دور

غزل جس نے وسیع النظری، رواداری اور انسانیت کا آدرش پیش کیا اور ایسے سماج کا خواب دیکھتی رہی جہاں لوگ مسلک اور نام کے بجائے شرافت اور کام کو ترجیح دیں گے، جس میں مندر، مسجد اور کلیسا سے زیادہ ان کو جنم دینے والوں اور ان میں عبادت کرنے والوں کی عزت ہوگی۔ جہاں اذان ناقوس ایک دوسرے کی آواز پر کف در دہن نہیں ہو پائیں گے۔ جہاں فہمیدگی کے ساتھ ہو تو خدا پرستی، اور بت پرستی دونوں کی قیمت ہوگی، جہاں کوئی اپنے وطن کی یہ شکایت نہ کر سکے گا کہ "عالم بے فیض میں خلق ہوئے ہم، جہاں نہ مسلمان اسلام کی روح سے

واقف، نہ ہندو نہ ہندو دھرم کی انسانیت اور وسیع النظری پر عامل، جہاں ہر فرقہ بے فیض ہے۔
مصحفی شیعہ نہیں تھے: عثمان اور ردِ اکفر دو اشارے اس پر دلالت کرتے ہیں۔ مصحفی سنی نہیں
تھے: کیا نبی نے علی کو وصی بہ خم غدیر، والے چار پانچ شعر اس کے گواہ ہیں (یہ الگ بات ہے کہ
یہ سعادت علی خاں کے صاحبزادہ کی مدح میں ایک قصیدے کے ذیل میں ہیں)۔ اندر روایتی قسم کے
مذہبی عقائد بلکہ عقیدتوں (ابر کا رہتا تھا ٹکڑا دھوپ میں) اور عوامی اوہام (کچھ بھی) کے قائل معلوم
ہوتے ہیں۔ اودھ کا کلچر شیعی کلچر تھا لیکن مصحفی اس تہذیب کا سنجیدہ حصہ کبھی نہ بنے۔ محرم کو محبوب
سے ملنے کا بہانہ بنانا، محرم میں روزے کو دل کا بخار نکالنے کا بہانہ بنانا، اور بعض دوسرے اسی
قسم کے بیانات سے پتا چلتا ہے کہ وہ اگر سماجی طور سے ظاہرا شیعی رہے بھی ہوں تو کبھی ان باتوں
کو سنجیدگی کا درجہ نہیں دیتے تھے۔ بلکہ سنی و شیعہ کا قضیہ تو ان کے نزدیک راہ دین کا ایک پتھر تھا
اور سارے اختلافات محض منافقین کی اختراع۔ اسی لیے وہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد
بنانے کی فکر میں رہا کیے۔ آزادہ روی اور وارستگی کے ساتھ مذہب کی پابندی یوں بھی کچھ چلتی
نہیں یوں جس کا کھانا اس کا گانا، جو مذہب آقا کا وہ مصاحب اور نوکر کا۔ تاہم مصحفی کا مذہب
اگر کچھ تھا تو وہی جو غالب کی طرح اس بات کا قائل تھا: کیوں نہ دوزخ کو بھی جنت میں ملا لیں
یارب۔ سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی۔ مصحفی ذرا آہنگ بدل کے کہتا ہے: مصحفی،
شرک بھی ایسے کا نہیں یار برا۔ کفر کے ساتھ ہو گر رغبتِ دیں تھوڑی سی۔ یوں دم نزع کلمہ
زبان پہ ہونے کی تمنا تھی لیکن عملاً نہ شریعت نہ طریقت نہ حقیقت نہ مجاز۔ مصحفی کسی خانہ
میں موزوں نہیں بیٹھتے تھے۔ وہ تو جیسا کہ میں نے پہلے کہا، سمجھ بوجھ کے ساتھ بت پرستی میں بھی
مزا پاتے تھے۔ (غالب بھی تو فہمیدگی نہ سہی وفاداری بشرط استواری، کو ایک قدرِ مطلق کی جگہ دے
کر برہمن کو کعبہ میں ایک قابل احترام جگہ دینے پر آمادہ تھے) یوں بھی غزل گو کی حیثیت سے
ان کی ساری عمر خدا پرستی کے بجائے حسن پرستی ہی میں گزری کہ یہی ان کے لیے اعلیٰ ترین قدر
بن چکی تھی۔

زیست کرنے کے جو اصول، اقدار اور ضوابط مصحفی کے نزدیک پسندیدہ ٹھہرے تھے وہ مختصراً
یہ ہیں کہ سچ بہرحال سچ ہے اور جھوٹ جھوٹ، اور یہ کہ ظلم کو بالآخر مٹنا ہی ہوتا ہے اور رادت

سان کو تباہ ہو کے ہی رہنا ہوتا ہے۔ قدیم اندازِ فکر کے مطابق مصحفی تقدیر کے لکھے کو قائل
پھر وہ کہتے ہیں: دنیا میں ایک جاتا ہے ایک آتا ہے اسی طرح دنیا کا کاروبار چل رہا ہے
زندگی کسی ایک فرد کے بل پر قائم نہیں ہے نہ کسی کی شخصیت اتنی اہم ہے کہ اس کے
جانے سے زندگی کا پہیہ رک جائے۔ دنیا میں کوئی مخلوق ایسی نہیں جس کے لیے اللہ نے
ق کا انتظام نہ کیا ہو (وَمَا مِنْ دَابَّةٍ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا)
لی کو ذمہ داری کے ساتھ گزارنا اور ہر اگلے لمحہ پر نظر رکھنا ضروری ہے زندگی کی آخری قدر موت
ہے جو ہر ایک کی گھات میں ہے۔ موت زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے جو زندگی کو معنی دار
اتی ہے۔ اس میں معنی پیدا کرنے کے لیے شاید یہ ضروری ہے کہ زندگی کے خالق کی توحید کا اقرار
جائے، اور اس اقرار کے لیے اس دنیا میں اور زمانہ کی پوری کارگاہ میں اتنے شواہد ملتے ہیں۔
سان کی فطرت اور کائنات کی ہیئت اس پر اتنی دلیلیں مہیا کر دیتی ہے کہ ماننا پڑتا ہے کہ
ر اس کارخانہ کو چلانے والا کوئی ہے تو وہ ایک ہی ہے۔ پھر اس کو ماننے کے ساتھ ساتھ،
جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا، یہ ضروری ہے کہ زندگی کی آخر کو نظر میں رکھا جائے اور اکثر کر نہیں رہا
جائے، زمین سے اپنے تعلق کو استوار رکھا جائے، کیا جانیے کس وقت وہ لمحہ آجائے جب
یں تمھیں اپنا پیوند بنا لے! یہاں آج کچھ ہے تو کل کچھ، آج کی حقیقت کل کا فسانہ بن جائے گی۔
س لیے اصل چیز یہ زندگی نہیں، یہ تو صرف آنے والی زندگی کے لیے تمھاری تیاری ہے۔
یہاں تو کل زمانۂ حیات یک تبسمِ گل ہے یوں بھی یہاں ایک خوش ہے اور دوسرا ملول، ایک
ی مسرت، کسی دوسرے کے غموں پر تعمیر کی ہوئی ہوتی ہے اور ایک کی دولت کسی نہ کسی دوسر
کو مزید غریب کرنے کا نتیجہ، ایسے میں اگر ایمانداری کے ساتھ کوئی انمول چیز بچا لے جانے والی
ہے تو وہ صرف وقت ہے اور وہ بھی اس طرح کہ اُسے کنجِ خلوت میں بچا کے دنیا کی حقیقتوں
کو سمجھنے اور نیک و بد پر غور کرنے کے لیے گزارا جائے۔ لیکن رہا بالکل الگ تھلگ جائے
ایسے کہ کوئی نام تک نہ جانے، سکون اسی میں ہے، ورنہ جہاں کہیں عام طور سے لوگ
جاننے لگے، شہرت ہوئی، بس اسی وقت سے تمھاری شخصیت اپنا پن کھو بیٹھی، اب تم
دوسروں کی ملکیت ہو گئے، دوسروں کو تم نے احتساب کا حق بھی دیدیا اور اپنے آپ کو

## مصحفی کا مطالعہ

کبھی سونپ دیا۔ اب تم دنیا میں ایک کامیاب تاجر بھلے ہی بن جاؤ شہرت کے تاجر، عزت کے تاجر، کرسیوں کے تاجر لیکن بے نام جینے کا پرسکون مزا تم سے ہمیشہ کے لیے چھن گیا!
دنیا کا حال تو یہ ہے کہ اکثریت ملول ہے اگر خوش ہیں تو دس ناخوش۔ زندگی کا عالم یہ ہے کہ رنہ زانقلاب سے دوچار ہے ناز و نعمت کے پلے ہوئے لوگ بھی قبروں میں دبے پڑے ہیں جن پر سایہ کرنے کے لیے کوئی درخت تک نہیں! واقع یہ ہے کہ زندگی بڑی احتیاط سے گزارنے کے لیے ہے جو اپنے آخری عمر تک اپنی شرافت اور انسانیت کو بچالے گیا وہ خوش نصیب ہے، ورنہ یہ دنیا ایسی خطرناک رہ گزر ہے کہ کم ہی کوئی دامن آلودگی سے بچ سکا ہے اور کم ہی کوئی اپنی پونجی راہزنوں سے بچالے جانے میں کامیاب ہو سکا ہے۔
دنیا کے لیے ایک اور تشبیہ دی جا سکتی ہے کہ یہ سارا کھڑاگ جس مصور نے بھی پھیلایا ہے تصویروں کو اس طرح بنایا ہے کہ بظاہر تو ایک دوسرے سے مکالمہ میں نظر آتی ہیں دنیا کے سب کام اسی طرح چل ہی رہے ہیں، لیکن واقع یہ ہے کہ ہر شخصیت صرف اپنے آپ پر توجہ مرکوز کیے ہوئے ہے جیسے کہ ہیں ساری کائنات کا مقصد، محور اور منہاج بس وہی ایک تصویر ہو۔ کوئی کسی کی نہیں سنتا ہے، سب اپنی کرتے ہیں روابط میں دو روئی اکثر دیکھنے میں آتی ہے اور یہ اچھا ہی ہوا کہ پہلی ہی کشاکش میں رشتۂ الفتِ یارانِ دو رو ٹوٹ جائے۔ جہاں مزاج یا مقاصد میں ہم آہنگی نہ ہو وہاں مصنوعی ربط پیدا کرنے سے کیا حاصل!
پھر زندگی کے بارے میں اور ایک بار اپنے قدیم موقف کو دوہرایا ہے دنیا میں وقت کو ٹھہراؤ نہیں ہے۔ نہ وقت کا سلوک ہر ایک کے ساتھ جا در رہا ہے، اس لیے مسرت و غم دونوں کو پائیداری نہیں ہے۔ ابھی بہار تھی ابھی خزاں نے اسے اچک لیا، ہر گھڑی منقلب زمانہ ہے، یہی دنیا کا کارخانہ ہے، آج یہ وقت اس کے ساتھ ہے تو کل کسی اور کے ساتھ!
عام حالات یہ ہیں کہ ہندو مسلمان کا کوئی سوال نہیں، کافر و مومن کی کوئی تخصیص نہیں، سب کو غرض مندیوں اور مادہ پرستیوں نے یا خواہش کی غلامی نے اندھا کر رکھا ہے اور

## مصحفی کا مطالعہ

پورا عالم بے فیض ہے۔ تجربہ نے بتایا ہے کہ زندگی میں فتوحات کی آرزو ہو تو شکستوں سے بددل نہ ہونا چاہیے، اور وصل کی تمنا ہو تو فراق کی خو کر لینا چاہیے۔ پھر تمھیں حق پہنچتا ہے کہ تم وصل کے آرزومند بھی رہو اس حوصلہ کے ساتھ کہ تم اسے حاصل کر کے رہو گے۔

مجموعی طور سے یہ دنیا رہنے کی جگہ تو ہے نہیں، جتنی جس کے حصّہ میں ہے لکھی بھل منساہت سے گزار کے چلے چلو، اور جتنی بھی گزرتی چلی جائے اور آنے والی زندگی سے قربت ہوتی چلی جائے، اسے غنیمت جانو۔

وقت پر ملے تو ضرورت پورا کرنے کے لیے کیفیت کمیت کا ازالہ بجا تی ہے اس لیے چیزوں کی تعداد اور مقدار کو پیمانہ نہ بناؤ بلکہ صرف اس پر نظر رکھو کہ تم تک مطلوبہ شے بروقت پہنچ جائے۔

مقصد کے تعین اور اس میں لگن کے بعد پھر جیت اور ہار کا فرق مٹ جانا چاہیے۔ محنت لگن اور کام خود اپنے انعام بن جاتے ہیں۔ ہواؤں میں جب جنون تیزی آتی ہے اور چمن کی فضائیں جنوں پرور ہوتی جاتی ہیں، اس وقت پھر کسی بیرونی مدد یا آلہ کار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، پھر تو سیے ہوئے گریبان خود بخود اندرونی دباؤ سے پھٹنے لگتے ہیں۔ شاید قوموں کی زندگی کا بھی یہی حال ہے! اور قوموں اور افراد کی موت کی صورت یہ ہے کہ جب تک ان کے سامنے ایک آدرش رہتا ہے، کوئی نصب العین ہوتا ہے جس کی خاطر انھیں جینا ہوتا ہے اور وقت کے ایک ایک لمحہ کو دانتوں سے پکڑ کے صرف کرنا ہوتا ہے اس وقت تک عموماً موت ڈر جاتی ہے دل دیکھ کے انسانوں کے اموت کے فرشتہ کو ایک ہاتھ کے اشارے سے انسان پرے ہٹا دیتا ہے کہ ابھی مجھے یہاں کچھ کام انجام دینے ہیں جو صرف میں کر سکتا ہوں!

شریفوں میں قریبی روابط میں شکایات پیدا ہوتی ہی رہتی ہیں لیکن ایسے میں کوئی غیر بیچ میں آ کے برائیاں کرنے لگے تو اچھا نہیں لگتا۔

فقیر مزاجی میں بھی دماغ ہونا فقیر مزاجی کو معزز بنا دیتا ہے۔ یوں لوگوں سے بیوہار میں ملنساری اور خاکساری روایتی مشرقی اوضاع میں سے رہی ہیں لیکن اگر کوئی دوسرا نخوت

## مصحفی کا مطالعہ

سے پیش آئے تو خاکساری ایک منفی قدر بن جاتی ہے جو انسان کو گرا سکتی ہے.
ایسے میں جب مقابل بے بس ہو، اور اس پر قابو پا کر اپنی شکستوں، ذلتوں، یا حسرتوں کا بدلہ لیا جا سکتا ہے، ایسے میں بخش دینا، معاف کر دینا، کچھ طلب نہ کرنا، کوئی مطالبہ نہ رکھنا بڑے ظرف سے انسانیت یہ چاہتی ہے!

---

کیا خون سے اپنے قرآں کو رنگیں — کہ عثمان میں تھی حیاے محمد
آفریں پر نہ روافض کہ دلا جائیو لتو — حرف نا رکھتے ہیں یہ موذی بہ بن دندان ثلث
قریب پہنچے جو رحلت کے دن سمجھ کہ بات — کہا نبی نے علی کو وصی بہ خم غدیر
کہ یعنی بعد مرے ہو یہ جانشین مرا — کریں متابعت اس کی سبھی صغیر و کبیر
سو بیعت اس سے اسی دم تو سب نے کی لیکن — ہوا بطون میں بعضوں کے دل شکست پذیر
بایں خیال کہ شایاں ہیں ہم خلافت کے — کہاں یہ مرد جواں، اور کہاں یہ امر خطیر
[جناب کلب علی خاں تمھیں مبارک ہو — یہ روز عشرت عید غدیر جم غفیرا
بس کہ تھا اللہ کو پاس رسول اے مصحفی — سر پہ اس کے ابر کا رہتا تھا ٹکڑا دھوپ میں
میں وہ وحشی ہوں کہ بے خوف ادھر جاتا ہوں — بھننے رانوں کو اچھالے ہیں جہاں راغ میں آگ
پیارے کئی محرم گزرے اسی طرح سے — تم نے تو ہم کو یوں ہی امیدوار رکھا
ہم بھی اسی دن جائیں گے عباس علی کو — جس دن کہ علم خانۂ دلبر کے اٹھیں گے
ہم روئے بس کہ خوب سا حسن کے مرثیہ — دل کا بخار ماہ محرم نکل گیا
اس خانہ خرابی کا برا ہو دے، نہیں تو — عشرے ہی میں گھر اس کو میں لاتا کسی ڈھب سے
اتنا مقدور مجھے دیجو تو اے مہدی دیں — مار کے کوڑوں کے اڑا دوں خر دجال کی کھال
رکھا ہے مار اس کے علی بند نے مجھے — وہ انگلیاں بھی کم نہیں کچھ ذوالفقار سے
سنی و شیعہ کے قضیہ میں ہے حیراں مری عقل — نہیں ہلتا یہ عجب درہ دیں پتھر ہے
کچھ اختلاف نہ تھا دین احمدی میں ذرا — منافقوں نے جو چاہا سو اختلاف کیا
ضروری کیا مجھے دیر و حرم کی سیر کروں — میں ڈیڑھ اینٹ کی مسجد کہیں جدی نہ بنا لوں

# مصحفی کا مطالعہ

نماز و روزہ کی میرے ہوئی پرسش فقیہوں کو
آزادگاں کا اور ہی مشرب ہے مصحفی
مذہب کا تو غم کھانا کیا جانیے غم یہ ہے
مذہب کی میرے یار اگر جستجو کریں
مصحفی کا نہ کرو ذکر میاں جانے دو
مجادیں پہ واعظ کی نہ ہو ہم کو اطاعت
[ ہر چند کہ تقویٰ بھی بڑی چیز ہے زاہد
ہوں مصحفی کہ ہم تو تب اسلام کے قائل
مصحفی شرک بھی ایسے کا نہیں یار برا
[ ہوں تو ملحد پہ عرض ہے میری
نزع کے دم زباں سے نکلے
نہ شریعت نہ طریقت نہ حقیقت نہ مجاز
سالکہ فہمیدگی کے ہو دے تو پھر
سب حسن پرستی میں کٹی اپنی عمر
آدمی ہے وہی جو دنیا میں
ایک بھی باقی رہی ہرگز نہ نسل
کھیل تقدیر کا جس وقت بگڑ جاتا ہے
تقدیرِ ایزدی پہ مرے کام ہیں تمام
جو کہ پیشانی میں لکھا ہے وہی ہوتا ہے
گر ایک آوے ہے تو اک یہاں سے جاوے ہے
بے رزق آفریدہ نہ دیکھا جہاں میں

میں ہوں وارستہ کچھ اتنا نہیں پابند مذہب کا
درویش وہ نہیں جو غمِ نیست ہست کھائے
یاں نوکری بھی آکر ٹھہری ہے رکابی کی
مرتے ہوئے مرا نہ سوئے قبلہ رو کریں
وہ بھی انسان ہے اس کا بھی تو کچھ مذہب ہے
اے مصحفی یہ کفر ہے اسلام میں اپنے
پر کیا کہوں میں تجھ سے جو لذت ہے گنہ میں ]
یہ کافر بے دیں جو مسلماں ہو مکرر
کفر کے ساتھ ہو گر رغبتِ دیں تھوڑی سی
بجنابِ رسول و حضرتِ شاہ
مصحفی لا الٰہ الا اللہ ]
کون کافر مجھے کہتا ہے مسلمان ہے یہ
بت پرستی بھی مزا رکھتی ہے
سچ یہ ہے کہ میں خدا پرستی کب کی
جھوٹ کو جھوٹ جانے سانچ کو سانچ
مصحفی راون کے جو ستر تھے پوت
حکما سارے دھرے رہتے ہیں تدبیر سمیت
میں معتقد نہیں ہوں رمل اور فال کا
نہیں ہوتیں کبھی اک شخص کی تقدیریں دو
ہوئی نہیں کبھی راہِ جہانِ فانی بند
پتھر کے کیڑے کے بھی ہو پتا دہن کے بیچ

---

اجل کی نگہہ سے مری جان بر ہر کسی پر ہے    بہ ہوش باش ! کہ عالم روا روی پر ہے

## مصحفی کا مطالعہ

دیکھے اگر تو چشمِ تامل سے مصحفی
جو بندۂ خاکی کہ فراموشِ زمیں ہے
جو آج نظر آئے ہے افسانہ ہے یہ بھی
لگا مت دل بد و نیک جہاں سے
ملتی نہیں کسی کو یاں جائے یک تبسم
اک وضع پر سلوکِ فلک کب ہے سب کے ساتھ
قدرِ اوقات کی اپنے اگر انساں جانے
عجب مزہ ہے زمانے میں بے نشاں جینا
حسابِ اہلِ جہاں مصحفی میں کر دیکھا
کیسی اب ان کی دھوپ میں جلتی ہیں تربتیں
جس بیابانِ خطرناک میں ہے اپنا گزر
بزمِ تصویر ہے طلسمِ جہاں
مصحفی خوب ہوا یہ کہ کشاکش میں ہم
زمانے کا چلن یکساں نہیں کچھ
مت پھول بہارِ رخِ گل رنگ پہ اتنا
دیدۂ تر سے ٹک دیکھ کر اک اک پل میں
آج وہ ہاتھ میں میرے ہے تو کل تیرے ہاتھ
عالمِ بے فیض میں خلق ہوئے ہم کہ ہے
غمِ ذات ہے اس کے اگر نہ ہو کرتے
چلو اے ہم رہو غنیمت ہے
وقت پر اپنے جو ہاتھ آئے لیے دفعِ خمار
کچھ یار کا اور ... کا اندیشہ نہ رکھے

اس کارگاہِ دہر کا مختار ایک ہے
اک دم میں جو دیکھو تو ہم آغوشِ زمیں ہے
آبادی پہ مت پھولیو ویرانہ ہے یہ بھی
سوانح یاں کے ہیں سب آسمانی
باغِ زمانہ یار دیاں تک تو کم فضا ہے
گر ایک اس سے خوش تو نالاں ہے دوسرا
کنجِ خلوت کے تئیں ملکِ سلیماں جانے
ہم اپنا صفحۂ ہستی سے نام پھیلیں گے
جو دس ملول ہیں اس میں تو شادماں ہیں نو
سایے میں میاں پلے تھے جو ناز و نعم کے ساتھ
مصحفی قافلے اس راہ میں کم نکلے ہیں
کم کوئی یاں کسی کی سنتا ہے
رشتۂ الفتِ یاراں دو دو ٹوٹ گیا
کہیں کچھ ہے کہیں کچھ ہے کہیں کچھ
یاں رنگ کی گردش ہی میں موسم ہے خزاں کا
رنگ بدلے ہے زمانے کی ہوا کیا کیا کچھ
طرح لٹو کی فلک یوں ہی پھرا دست بدست
گبر سے کچھ فائدہ اور نہ مسلماں سے فیض
تو روزِ وصل کی کس منہ سے آرزو کرتے
جو قدم اس جہاں سے اٹھتا ہے
ایک فنجان بھی کافی ہے شرابی کے لیے
جی داؤ محبت میں جب انساں لگا دے

--- جوش کی رباعی یاد آتی ہے: ... یہ ایک تبسم بھی کسے ملتا ہے

دستِ جنوں سرک کہ جب آئی ہے فصلِ گل — خود چاک ہو گئے ہیں گریباں سیے ہوئے
دیرا لے ملک الموت کہ اس کوہ کنی کا — ہے کام بہت سا ابھی فرہاد کے آگے[1]
اگرچہ ہم بھی ہیں شاکی، پہ جی یہ چاہے ہے — ہمارے یار کا ہرگز کوئی گلہ نہ کرے
مصحفی گو کہ ہے فقیر مزاج — تو بھی اس میں دماغ نکلے ہے
نخوت سے جو کوئی پیش آیا — کج اپنی کلاہ ہم نے کر لی
میں نے ہی نہ چھیڑا تجھے دانستہ وگرنہ — اپنا تو کہیں ہوش بھی تجھ کو نہ رہا تھا[2]

[1] غالب نے اسے کہاں پہنچا دیا ہے:
خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ — رہنے دے ابھی یاں کہ مجھے کام بہت ہے
[2] غالب یہاں بھی یاد آ رہا ہے۔

سید امیر حسن عابدی

# ساحر کاکوروی

لکھنؤ سے چند میل کے فاصلہ پر علما و فضلا کا ایک بہت بڑا مرکز کاکوری رہا ہے جس نے اودھ اور لکھنؤ کی تہذیب کے سنوارنے میں بہت نمایاں حصہ لیا ہے۔ یہیں کے صاحبان علم و فضل میں ایک ساحر کاکوروی ہیں۔

ان کا نام شیخ فضل حق عرف غلام مینا تھا۔ شجرۂ نسب یوں ہے، ابن شیخ فضل امام ابن شیخ محمد عیوض ابن مولوی محب الرحمن ابن شیخ عبدالرحمن ابن حافظ غلام محمد علوی۔ اس طرح یہ سلسلہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے صاحبزادے حضرت محمد بن حنفیہ تک پہنچتا ہے۔

مولانا حسین بخش شہید ابن حضرت شاہ میر قلندر ان کے ہم مکتب تھے طالب علمی کے ایام میں کاکوری سے ساحر اپنے والد کے ساتھ دلی گئے اور یہاں حضرت شاہ عبدالعزیزؒ دہلوی (ف ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء) کی خدمت میں درس کے لیے جانے لگے۔ مؤلف تذکرہ مشاہیر کاکوری نے ان کے تحصیل علم کو ایک کرامت کا نتیجہ بتلایا ہے لکھتے ہیں[1] ساحر شروع میں درس و تدریس کی طرف راغب نہیں تھے۔

> ایک روز ان کے والد نے اپنے حضرت پیر و مرشد غلام علی دہلوی خلیفہ حضرت مرزا مظہر جان جاناں دہلوی سے ان کی بدشوقی کا حال بیان کر کے خاص دعا اور توجہ چاہی۔ ان کے پیر و مرشد نے پانی آبخورے میں منگا کر کچھ پڑھ کر دم کیا اور ان کو پلا دیا۔ اس تاریخ سے طبیعت تحصیل علم کی طرف متوجہ

---
۱ تذکرہ مشاہیر کاکوری: ۳۰۹

ہو گئی۔ روز بروز علمی مذاق بڑھتا گیا اور چند ہی روز کے بعد آسمانِ ہندوستان میں آفتاب ہو کر چمکے۔[5]

اس قسم کی کرامتیں دوسرے بزرگوں کے سلسلے میں بھی بیان کی جاتی ہیں۔ حافظ شیرازی سے متعلق بھی اسی قسم کی داستان نقل کی گئی ہے۔ بہر حال اتنی بات صحیح ہے کہ ساحر نے حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی اور شاہ غلام علی دہلوی نقشبندی جیسے بزرگوں سے علمی اور روحانی فیض حاصل کیا۔ شاہ غلام علی کا غلام مینا عرف اور ساحر تخلص بھی عطا کردہ ہے۔

یہاں دہلی میں چند سال رہنے کے بعد ساحر واپس اپنے وطن چلے گئے۔ اب شعر و شاعری سے ان کی دلچسپی اتنی بڑھ چکی تھی کہ استاد کی ضرورت محسوس ہوئی چنانچہ وہ مصحفی کے شاگرد ہو گئے۔ اس کے علاوہ غالباً قتیل سے بھی کچھ استفادہ کیا۔[2] ان کے کمال کے مد نظر تذکرہ نگاروں کے نزدیک

"تلمذش مصحفی را سرمایۂ افتخار و شاگردیش قتیل را راس المال عز و افتخار"

تھی[3] بلکہ کہا گیا ہے کہ قتیل نے ان سے متعلق کہا تھا:[4] "ساحر شاگردِ مصحفی نیست، بل استادِ اوست، والحق کہ در نظم و نثر نظیر خود نداشت۔"

اس سے کم از کم اتنا ثابت ہے کہ اپنے معاصرین میں ان کی بزرگی اور عظمت مسلّمہ تھی۔ خوش قسمتی سے بلند مرتبہ استادوں کے ساتھ ساحر کو شاگرد بھی قابلِ فخر ملے۔ تذکرۂ مشاہیر کاکوری میں ان کے حسبِ ذیل مشہور اور قابل شاگردوں کے نام دیے ہیں:

نواب امیر حسن خاں بسمل کاکوروی۔

منشی مومن علی خاں مفتوں کاکوروی۔

---

۲۔ ایضاً

۳۔ نگارستان سخن: ۳۷

۴۔ ایضاً

۵۔ روز روشن: ۲۷۸

مولوی محی الدین خاں ذوقؔ کاکوروی۔
مرزا حیدر بیگ کاکوروی۔
مولوی غلام امام شہیدؔ امیٹھوی
منشی احمد حسین سحرؔ

ان حضرات کے علاوہ قاضی محمد صادق خاں اخترؔ بھی ساحرؔ کے بہت عزیز دوست تھے۔

امیر حسین خاں بسملؔ کاکوروی بیٹے تھے عاشق علی خاں کاکوروی سفیر شاہ اودھ کے جس زمانے میں غالبؔ کلکتہ گئے ہیں بظاہر بسملؔ بھی اپنے والد کے ساتھ وہاں موجود تھے۔ شیخ عاشق علی خاں سے غالبؔ کے تعلقات تھے: پنج آہنگ میں ان کے نام کے خطوط موجود ہیں۔ غالبؔ کی بسملؔ سے بھی یہیں ملاقات ہوئی۔ یوں معلوم ہوتا ہے[۶] کہ بسملؔ نے تعلّی سے ایک شعر کہا:

جملہ زاغ اند شاعرانِ جہاں لیک یک طوطیِ شکر خا من

کسی نے یہ شعر غالبؔ تک پہنچایا، تو انھوں نے اس پر کہا:

لاجرم می سزد کہ نکتہ وراں نامِ بسملؔ نہند ہیرؔ آمن

جب اس کی اطلاع بسملؔ کو ہوئی تو وہ ناراض ہو گئے۔ چونکہ ان کے والد غالبؔ کے دوست تھے اور ساتھ ہی سفیر شاہِ اودھ بھی، غالبؔ کو انھیں منانے کی فکر ہوئی۔ لیکن خیال ہوتا ہے کہ بسملؔ کے دل کی گرہ کھلی نہیں کیونکہ اس کے بہت دن بعد جب مظفر حسین خاں کلکتہ گئے ہیں، تو غالبؔ نے پھر ان سے درخواست کی ہے کہ ان کی بسملؔ سے سفارش کریں۔ پنج آہنگ میں بسملؔ کے نام دو خط اور کلیات نظم فارسی میں ان کی مدح میں دو رباعیاں ہیں[۷]۔

---

۶۔ تذکرہ مشاہیر کاکوری: ۵۱

۷۔ اس واقعہ کا ذکر جناب قاضی عبدالودود نے بھی ماثر غالب میں کیا ہے (ص ۵۲-۵۳) انھوں نے لکھا ہے کہ "بسملؔ کی مدح میں ایک رباعی کلیات میں ہے"۔ کلیات میں بسملؔ کی مدح میں ایک نہیں، دو رباعیاں ہیں۔ (کلیات: ۵۰۷)

# ساحر کاکوروی

منشی غلام امام شہید مشہور مداح رسول ہیں۔ ان سے بھی غالب کچھ خوش نہیں تھے۔ منشی احمد حسین سحر تذکروں کے مولف ہیں، طور معنی اور بہار بے خزاں۔ بہار بے خزاں بھی وہ تذکرہ ہے جس میں میر کے معاشقے کا ذکر ہے۔

اس سے معلوم ہوگا کہ ساحر کے تلامذہ کے ذریعے سے اردو ادب میں بھی قابل قدر اضافہ ہوا۔ ان کے دوست قاضی محمد صادق خاں اختر بھی اردو کے اچھے شاعر ہیں۔ انھوں نے ایک ضخیم تذکرۂ شعراء آفتاب عالمتاب بھی مرتب کیا تھا۔ بدقسمتی سے اس کا کہیں سراغ نہیں ملتا جس سے خیال ہوتا ہے کہ یہ ضائع ہوگیا۔ بھوپال کے بیشتر تذکرے اسی پر مبنی ہیں۔

ساحر نے ۲۳ ذیقعدہ ۱۲۵۰ ہجری یعنی ۲ مارچ ۱۸۳۵ء کو انتقال کیا اور کاکوری کے تکیہ شریف کاظمیہ میں اپنے خاندانی قبرستان میں دفن ہوئے۔ مومن علی خاں مفتوں کاکوروی نے تاریخ وفات کہی:-

| | |
|---|---|
| فریاد کہ از تفرقۂ پردازی گردوں | امروز جوان عمر جہانی ز جہاں رفت |
| زیں ماتم جانکاہ کہ بر جان زدہ ناخن | آرام ز دل، ہوش ز سر، صبر ز جان رفت |
| تبخالہ بلب از تپ غم شمع نمط زد | حرفی کہ ازیں قصہ مرا تا بزبان رفت |
| زد برق بلائی بہ سیہ خانۂ گردوں | بر نالہ کہ در ماتمش از لب کہ زبان رفت |
| زیں درد چساں خون دل از دیدہ نجوشد | ناوک بجگر آمد و در سینہ نہاں رفت |
| ایں واقعۂ صعب زدہ بر دل مفتوں | آں ظلم کہ بر فصل بہاری ز خزاں رفت |
| نیرنگ جہاں رنگ ثباتی نہ پذیرد | خوش رفت ہر آں کو ز جہاں گذراں رفت |
| آمد بزباں مصرعۂ تاریخ وفاتش | "ذاماں ز جہاں چید و سوی دار جناں رفت" |

(۱۲۵۰)

دیوان ساحر آج تک شائع نہیں ہوا۔ اس کا ایک قلمی نسخہ ابھی حال میں دہلی یونیورسٹی لائبریری کے لیے خریدا گیا ہے۔ یہ کبھی کسی پنڈت موہن لعل کی ملکیت رہا ہے۔ اس کے شروع میں ساحر کے شاگرد مومن علی خاں مفتوں کاکوروی کا نثری مقدمہ ہے، جنھوں نے اسے ساحر کی زندگی میں مرتب کیا تھا۔ مقدمہ کے بعض اجزا

فارسی نثر کی مثالیں یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

"نفس کشای کلک سخن طراز حمد صورت گر است کہ گلزرین صنوبر راازنم وپیچ الفاظ رنگین غیرت فرمائی نگارخانۂ چیں ساختہ . . . بعد گذارش حمد وصلوٰۃ اینکہ . . . . مومن علی کہ بفیض مطالعۂ نظم ونثر چکیدۂ کلک بلاغت زای جناب استادی سلمہٗ اکثرہا بتصوّر شیرازہ بندی اوراق نگین . . . . منقوش ذہن ناقص داشت وطبع ناسنجیدہ رالبسودای ترتیب دلکش درعمّان فکر متصل غوطہ می داد۔ لیکن گوہر دل نشیں مطلوب بہیچ گاہ آرایش دست نمی شد۔ دریں زماں کہ رسائی طالع بلند شہرستان مدعا دعنایت اوستادی برنگ بال ہماسایہ افگن گردید، خاصہ بارشاد آں صورت آرای نگارستان معنی طرازی، . . . سکہ زن دارالضرب خیال ہا آئینۂ صورت نمای سحر حلال، کوکب تابندۂ آسمان سخن، یعنی ساحر جادو طراز ساحری فن کہ ہر کلک اعجاز نگارش . . . . بکار فرمائی ہای آفتاب عرد طبع روانش ہم کار ید بیضای موسوی، نثر بہار پیرایش از فرط تازگی و رنگینی حکم جلوہ فروشی گل درچمن دارد۔ سبحان اللہ اگر نزاکت بیان ولطافت مضمون واشارات تمکین وطرامی زبان ولطافت لسان وانداز دلکش وفصاحت لفظ ومعنی . . . وسجع دلفریبش این است اوراق مجموعۂ زیبای بیدل را بہ میزان اعتبار کہ می سنجد ودر جنب بہار تحریرا او از رسائل طغرای مشہدی کہ طرف می بندد۔"

اس کے بعد ساحر کے اپنے رقعے ہیں جو منشی دین دیال، نگونوی منشی محمد مہدی، قاضی محمد صادق خاں اختر، عقیق محمد خاں وغیرہ کو لکھے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ دو نثریں ہیں جن میں لکھنؤ کے طاعون اور سیلاب وطوفان کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ رقعے اور نثریں ساحر کی انشا پردازی کا اچھا نمونہ ہیں، اگرچہ ان کا انداز بہت تصنّع اور آورد کا ہے۔ جگہ جگہ غزلوں اور اشعار سے عبارت کو آراستہ کیا گیا ہے جن میں سے کچھ یقیناً ساحر کے اپنے ہیں۔ ان کے بعض

## ساحر کاکوروی

حصے بھی بطور نمونہ نقل کیے جاتے ہیں:۔

منشی دین دیال کے نام:

آشوبِ زمانہ دلبرِ ہای سخن است    غارتگرِ ہوش ماجرای سخن است
آزادہ دلاں اسیرِ دامِ دگر اند    بیگانۂ خلق آشنای سخن است

ای خوشا باغِ بے خزانِ سخن!    حبذا نخلِ گلفشانِ سخن!

ازیں جا عنانِ فرس تافتم    زمیدانِ دیگر نشاں یافتم

ناگاہ طرفہ بہاری کہ ہما ہا بہارِ گل باستقبالش رفتہ بود، درپیش گاہ از نظر گل کرد، یعنی محبت نامۂ رنگیں مضمون باداینکہ رخسارِ نوخطان درچشمِ نظر بازاں جلوہ نمایند، رنگِ وصول ریخت۔"

مولوی مہدی صاحب کے نام کے خط میں ہے:

مدتی است کہ از قحطِ زبان دانانِ ہم نفس مانندِ چراغِ سحر خموشی آرزو دارم و زگم شدگان نشانِ جادو لفسان نفس در زیرِ لب دزدیدن می خواہم . . . . ملخصِ التماس اینکہ دریں روز ہا فقرۂ چند در جوشِ طوفانِ آب از کلکِ آشفتہ نگار تراوش کرد. آخر بخیالِ ناقص گذشت کہ دریں فن کامل تر از خدامِ جناب کسے نیست . . . . لہٰذا فقراتِ مذکور مع دو سہ قطعۂ نثرِ دیگر بخدمتِ سامی می گذارم . . .

قاضی محمد صادق خاں اختر کو لکھتے ہیں:

اے دستِ تو دستگیرِ اربابِ سخن    بر سیاہ کاریِ آسمان آتش افتد کہ برقِ مصیبت مجھو در دودمانِ آن وحیدِ روزگار انداختہ . . .

"یکے ست عالمۂ زنجیر دو خانۂ دنیا دریں دو خانہ فراغت نصیبِ مہمان نیست۔
معاذ اللہ از کشایشِ ایں زندانِ بلا کہ اسیرانِ زنجیر خانۂ حیات را بتقصیرِ
آزادہ رفتاریِ نفس در سیاست گاہِ قضا از دمِ شمشیر می گذرانند، الحذر

## ساحر کاکوروی

از سنگدلیہای چرخ کافر ماجرا کہ بساط نشینانِ بزمِ ایجاد را بگناہِ چاشنی گیریِ شہدِ زندگانی تلخابہ زہرِ اجل می چشاند. غنودگانِ خوابگاہِ امکان برنگِ نسیمِ گل مہیای برچیدنِ بساطِ ہستی نشستہ و مسافرانِ مہمان سرای جہاں مانندِ کاروانِ شرر بر ناقۂ صرصرِ حوادث محملِ سفر بستہ اند. آری صبحِ زندگانی چراغِ سحر دست و گریبانِ شامِ آغاز جلوۂ حبابِ دریای ساحل نشیں انجام است. خوابِ پریشانِ عمر نادیدنی و افسانۂ مختصرِ زندگی ناشنیدنی است. آمد و رفتِ قاصدِ انفاس پیغامِ اجل بگوشِ جاں رسانیدہ و برخاستنِ نگاہِ اولیں جا نگاہِ بازپسیں خانۂ چشم خالی گردانیدہ . . . بنیادِ جہانِ گذراں نقش برآب است . . . "

"امروز کہ تا کنگرۂ عرش فغاں رفت — در سینۂ قدسی نفساں نوکِ سناں رفت
اکنون ز حریفانِ سخنداں اثری نیست — گویا کہ ز عیسیٰ نفساں نام و نشاں رفت
بر بسترِ اندوہ مریضانہ فتادم — بیمار بجا ماند و مسیحای زماں رفت
تا خاکِ سرِ تربتِ او ہمرہ تابوت — اقبالِ جوان طبعِ جواں بختِ جواں رفت
ساحر ز ادای سخنت درد ترا دید — در نظم براہی کہ تو رفتی، نتواں رفت"

'استیلای وبا' کے عنوان سے لکھتے ہیں:

دریں زمانہ بلای وبا چناں برخاست — کہ تا فلک ز زمیں شورِ الاماں برخاست
چہ درد خیز حکایت نوشتہ ساحر — کہ نالہ ہا ز نیِ کلکِ نکتہ داں برخاست

. . . . قیامت انگیزیہای طاعون کہ دریں طرف ایام شہر لکھنؤ را گرفت ازاں لرزاں یکے از ہزار می نویسم . . . .

فرصت ندہد مرگ کہ عاشق سحرِ وصل — چشمی بہ بہارِ رخِ جانانہ کشاید
زاں بیم کہ شاید بسرِ راہ بمیرد — بیروں ز درِ خانہ کسی پا نکشاید

. . . . خیاط و بزازان بسکہ ماتمِ اقربای خود با گرفتہ اند ناچار بسیاری از مردگان را بی کفن

## ساحر کاکوروی

درتہِ خاک می سپارند. گورکن و غسالاں ازبس براہِ عدم رفتہ، ناگزیر نعش ہائے کافر و دیندار را اکثر بدریا می گذارند۔ ۔ ۔ ۔

نفس بساز طرب بسکہ آشنا گردید　　رسید ہر چہ ز دل تا بلب نوا گردید
صفیر مرغ چمن در گلو شکست از رشک　　دمیکہ ساحرِ بیدل سخن سرا گردید

ایک اور نثر "در استیلای طوفاں" کے عنوان سے ملتی ہے:

جوش سیلاب شہر ویران کرد　　خانۂ خلق نذرِ طوفان کرد
فکر ایں طرفہ ماجرا ساحر!　　طبع سنجیدہ را پریشان کرد

پیش ازیں آشوب و با برخاستہ بود۔ ۔ ۔ ۔ دریں روزگار قطرہ افشانیِ ابرِ سیاہ دل عجب طوفان برروی آب آورد کہ وقت بیانش زبانِ تقریر چون ماہیِ دریا غرق آب است وہنگامِ تحریر دوائر نقوش سر گذشتن از حلقۂ گرداب۔ ہمانا سقای ابراز دیدۂ عشاقِ شوریدہ طبیعت آب برداشت کہ در ہر کوچہ و بازار بر جاے عمارتِ محکم بنا ہاے ویراں گذاشت"

نثر کے آخر میں یہ عبارت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نسخہ کی کتابت ساحر کے انتقال کے بعد ہوئی تھی:-

"تمام شد نثر غلام مینا مرحوم"

اس کے بعد تین خطوط مثنوی کی صورت میں ہیں۔ ان میں غزلیں بھی ہیں۔ پہلا خط یوں شروع ہوتا ہے:

طرازم بنامِ خدا نامہ را　　زبانِ سخن واکنم خامہ را
ز دردِ جدائی فغان می کشم　　تو گوئی ز پہلو سنان می کشم
دبالِ نظر سیرِ گلزار شد　　رگِ گل بپاے نظر خار شد
سخن در سخنداں سخن گستر است　　بلدد سخن مہدیِ دیگر است
کنوں ہر چہ گفتم فراموش کن　　اگر نکتہ دانی غزل گوش کن
بخاکِ شہیداں نشانِ من است　　زبانِ سنان ترجمانِ من است

ازیں دشت ساحر سفر می کنم ہجوم بلا کاروانِ من است

ان خطوط کے اشعار کی تعداد مع غزلوں کے ۲۲۸ ہے۔ ان کی کتابت ۵ جمادی الثانی کو ہوئی، کاتب کوئی ہادی علوی ہیں بسال کتابت ۱۲۰۹ ہجری پڑھا جاتا ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے، یہ اشتباہ نسخہ کی خرابی کی وجہ سے ہوا ممکن ہے کہ صحیح ۱۲۵۹ ہجری ہو۔

اس کے بعد ایک مختصر سی مثنوی ہے جس میں تقریباً ۲۶۸ بیتیں ہیں۔ غالباً یہ وہی مثنوی ہے جو کسی زمانے میں رسالہ ادیب، الٰہ آباد (جولائی، ۱۹۲۱ء) میں شائع ہو چکی ہے۔ یہ اس بیت سے شروع ہوتی ہے:

بود ست بشہر دل کشائی زمیندہ جوانِ مہ لقائی

یہ ایک نوجوان کی داستانِ غم ہے، جو کسی لڑکی پر عاشق ہو گیا تھا:

گل چید نگہ بغرفۂ بام از جلوۂ دختری گل اندام

طاقت ز بدن کنارہ می کرد جان سوے اجل اشارہ می کرد

لڑکوں نے اس مجنون عاشق پر سنگ باری شروع کر دی، دوسرے لوگ بھی اس سے تنگ آ گئے اور چاہتے تھے کہ وہ کہیں اور چلا جائے۔ جب وہ کسی طرح نہ ٹلا، تو اس لڑکی کو دوسری جگہ بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا؛ اور ایک چالاک دلالہ اس کے ساتھ کر دی گئی۔

محتاط زنی رفیق راہش در فتنہ چو نرگسِ سیاہش

جب روانگی کا وقت آیا تو وہ لڑکی گھر چھوٹنے کے بہانے سے عاشق سے جدائی پر رونے لگی:

گر نالۂ عاشقانہ می کرد از یادِ وطن بہانہ می کرد

جب اس کی پالکی کشتی میں رکھی گئی، تو کود کر اس میں وہ عاشق بھی بیٹھ گیا۔ اس پر اس حرافہ عورت نے عمداً معشوق کی زری کی جوتی دریا میں پھینک کر اس سے فرمائش کی کہ کود کر اسے نکال لا۔ اشارہ پاتے ہی وہ سادہ لوح جوان فوراً کود پڑا اور ڈوب کر مر گیا۔ اب اس کی دایہ نے خیال کیا کہ چلو قصہ پاک ہو گیا۔ مگر وہ لڑکی کہاں بھولنے والی تھی۔ اس کے بعد اسی دریا کے راستے سے واپسی ہوئی، تو جہاں عاشق ڈوبا تھا، خود بھی ڈوب کر مر گئی۔

## ساحر کاکوروی

گلزیب کنارِ آں جواں شد ‏ ‏ خلوت گہِ آبِ گلستاں شد

ہادی علی علوی نے جمادی الثانی کے مہینہ میں اس مثنوی کی کتابت کی تھی۔ یہاں بھی سالِ ۱۲۰۹ ہجری ہی پڑھا جاتا ہے جو صحیح نہیں ہے، یہ بھی غالباً ۱۲۵۹ ہجری ہوگا اس کے بعد غزلوں کا حصہ ہے۔ اس میں تقریباً ۱۶۴۵ اشعار ہیں پہلی غزل کا اس شعر سے آغاز ہوتا۔

بجلوت گاہِ دل جائی مدہ شکلِ خیالی را ‏ ‏ تجلی گاہِ شمعِ طور کن ایں بزم خالی را

یوں معلوم ہوتا ہے کہ دیوان کے اس نسخے میں ساحر کی تمام غزلیں نہیں ہیں۔ مثلاً حسبِ ذیل اشعار جو تذکرہ ۔ وزیرِ روشن میں ہیں اس نسخے میں نہیں پائے جاتے ہیں:

جدا از کوییت بخاکِ بر جا فلک سپارد من حزیں را ‏ ‏ ز اشک و آہِ شرار افشاں دد آب و آتش کشیم زمیں۔

نوشتہ کلکِ قضا بنامم براتِ سوز و گدازِ عشقت ‏ ‏ چگونہ اکنوں توان ستردن بسعیِ کزلک خطِ جبین را

امید یک دو سہ زخمی ز خنجرت تا چند ‏ ‏ دلِ گرفتۂ ما را شگفتہ کن گاہے

اسی طرح تذکرۂ مشاہیرِ کاکوری اور دیوان ساحر کی مشترک غزلوں کے حسب ذیل دو شعر تذکرہ میں موجود ہیں، لیکن دیوان کے اس قلمی نسخہ میں نہیں ملتے:

از نگاہِ میگسارت بادۂ گلگوں زدم ‏ ‏ گردشِ چشمِ تو دیدم، دورِ ساغر یافتم

بجہ تقصیر ز ما راست نمی گردد چرخ ‏ ‏ کج نکردیم دریں عرصہ کلاہی گاہی

اسی طرح تذکرۂ مشاہیرِ کاکوری کے مندرجہ ذیل اشعار بھی اس قلمی نسخہ میں نہیں ہیں:

دریں بہار کہ ہر گل بلای جانِ من است ‏ ‏ نثارِ برقِ بلا خارِ آستانِ من است

دلِ شب سرم نہ بالش آرام دور بود ‏ ‏ ای خوابِ مرگ! چارۂ دردم ضرور بود

بے حجابانہ بروی تو نگاہی می کرد ‏ ‏ می تواں گفت کہ آئینہ گناہی می کرد

ساحر نے فغانی، صائب، کلیم، حزیں، واقف، مظہر جانِ جاناں کی زمینوں میں غزلیں کہی ہیں۔ مثلاً فغانی کا مشہور مطلع ہے:

بہ بوییت صبح دم گریاں بگلگشتِ چمن رفتم ‏ ‏ نہادم روی بر روی گل و از خویشتن رفتم

اب اسی زمین میں ساحر کی غزل ملاحظہ ہو:

سحر دور از رخِ آن شاخِ گل سوی چمن رفتم　　شنیدم بوی گل شبنم صفت از خویشتن رفتم
شبِ دو شنبہ در بزمِ تو صد بار آمدم لیکن　　ز رشکِ دیگراں نادیدہ روی انجمن رفتم
رگِ گل در چمن دیدم خیالِ آن کمر بستم　　نظر بر غنچہ وا کردم بفکرِ آن دہن رفتم
لبِ اغیار دیدن بر لبت از من نمی آید　　تو در خلوت سرای دیگراں بنشین کہ من رفتم
تنِ زار از گرفتاری نشد فارغ پس از مردن　　اگر از پیرہن رفتم، بزندانِ کفن رفتم
بکوی عشق پیمانِ غریبی بستہ ام آری　　ز یارانِ وطن دامن کشیدم، از وطن رفتم
بگلشن یاد کردم نظمِ رنگین فغانی را　　"نہادم روی خود بر روی گل، از خویشتن رفتم"

صائب کی ایک غزل کا مطلع ہے:

می حرام است دراں بزم کہ ہشیاری ہست　　خواب تلخ است در آن خانہ کہ بیماری ہست

اب سنیے ساحر کی غزل جو انھوں نے صائب کے تتبع میں کہی ہے:

چند گویم کہ بہ پہلوی دل افگاری ہست　　نالۂ درد گواہ است کہ بیماری ہست
زندگی در غمِ ہجرِ تو کم از مردن نیست　　مرگ را با منِ بیمار سرِ کاری ہست
می رسد زمزمۂ درد بگوشم شاید　　در شکنجِ قفسی مرغِ گرفتاری ہست
با پریشاں نظری کار دل افتادہ، بلی　　دیدۂ حیرت زدۂ آئینہ رخساری ہست
می برد دل ز کفم این مصرعِ صائب ساحر　　"خواب سخت است دراں خانہ کہ بیماری ہست"

کلیم کاشانی کی ایک مشہور غزل کا مطلع اور شعر ہے:

چشمت بہ فسون بستہ غزالانِ ختن را　　آموختہ طوطی نگہ لتو سخن را
آبِ دمِ تیغت چو بخاطر گذرانم　　خمیازہ کشد باز لبِ زخمِ کہن را

ساحر نے اس کے جواب میں مندرجہ ذیل غزل کہی ہے:

زلفِ تو بخون غوطہ دہد مشکِ ختن را　　سروِ تو دمیدن ندہد نخلِ چمن را
این است اگر جوشِ جنونم پسِ مردن　　صد پارہ کند دست گریبانِ کفن را
ہر نالۂ حسرت کہ تہِ دام کشیدم　　برہم زدہ ہنگامۂ مرغانِ چمن را
شامی کہ غریبانِ سرِ کوی تو دارند　　از یاد فراموش کند صبحِ وطن را

دیدِ سخن عشق میسحائی دلِ ماست      ہر شب زخدا می طلبم دردِ سخن را
این غالیہ ساخط کہ دمید از رخِ جاناں      در نامہ مجنوں غوطہ دہد مشکِ ختن را
این آن غزلِ شوخِ کلیم است کہ فرمود      خمیازہ کشد باز لبِ زخمِ کہن را[۱]

ساحر کی غزل ہے:

ہوای شعلۂ رخاں کرد بے قرار مرا      سپند وار بآتش فتادہ کار مرا
ازیں گنہ کہ بمشکین خطاں سری دارم      بروزِ تیرہ نشانہ است روزگار مرا
زبسکہ با دلِ افسردہ از جہان رفتم      فسردہ ماند چراغ سرِ مزار مرا
غبارِ دشت شدم گرد کوچہ گردیدم      خطِ جبین شدہ گویا خطِ غبار مرا
بروں نرفت ز تن جان ناتوان شبِ ہجر      ز روی نیک اجل کرد شرمسار مرا
ز کوی لالہ رخاں یاد می کنم ورنہ      چہ کار بود بگلگشتِ لالہ زار مرا
بجان فگند شرارہ از جگر کشید آتش      فروغِ چہرہ و آن آتشین عذار مرا
ز دل بروں نہ برد دار روی داغ دگر؟      ہزار بارہ شود گر دلِ فگار مرا
گلِ عذارِ تو بر جان فگند برقِ بلا      خطت بہ پیرہنِ دل شکستہ خار مرا
سمندِ شوخ بدنبالِ صیدِ بسمل تاخت      بلای جان شدہ آن نازنین سوار مرا
ز ہوش برد مرا مصرعِ حزیں ساحر      "سوادِ سنبلِ خط شد بہار مرا"

یہاں حزیں کے جس مصرع کی تضمین ہے یہ ان کی ایک غزل کے مطلع کا مصرعِ ثانی ہے۔ پورا مطلع ہے:

ز عشق شورِ جنوں شد یکے ہزار مرا      سوادِ سنبلِ خط شد سہ بہار مرا

ساحر نے ایک اور غزل بھی حزیں کی زمین میں کہی ہے اور اس میں ان کے اس مقطع کے مصرعِ ثانی کی تضمین کی ہے:

نشئہ یاد اشت حزیں سجدۂ مستانۂ تو      دُردِ میخانہ مگر خاکِ مصلای تو بود

ساحر کی غزل ہے:

شب آرایشِ محفل رخِ زیبای تو بود      شمع تا وقتِ سحر محوِ تماشای تو بود
وقتِ جولانِ تو آشوبِ قیامت برخاست      فتنۂ روزِ جزا قامتِ رعنای تو بود
روشن از شمعِ رخت محفلِ غیر است اکنوں      یاد آں روز کہ در کلبۂ من جای تو بود

## ساحر کاکوروی

رشکِ دیر آمدنِ نامہ سرم می سوزد — میتوان یافت کہ حیرانِ تماشای تو بود
سر خوشم کرد بایں مصرعۂ رندانہ حزیں — "دُردِ میخانہ مگر خاکِ مصلای تو بود"

اسی طرح دیوان میں مصحفی اور واقف اور مظہر جانجاناں کے تتبع میں غزلیں ملتی ہیں۔ کسی نوری تخلص شاعر کی غزلوں سے متاثر ہوکر بھی دو غزلیں کہی ہیں۔ معلوم نہیں ہوسکا کہ یہ کون نوری ہیں۔ اس تخلص کے کئی شاعر گذرے ہیں، ایک نوری دنبلانی ہیں جو ملا حسین شاہ کے پوتے اور نزاکی مشہدی کے معاصر تھے؛ دوسرے نوری اصفہانی تھے جو خواجہ افضل ترک اصفہانی کے شاگرد اور تقی اوحدی کے معاصر رہے ہیں۔ نوری اصفہانی کے دیوان کا قلمی نسخہ کتاب خانۂ آصفیہ، حیدرآباد میں موجود ہے (نمبر ۶۲۱) جسے دیکھنے کا موقع نہ مل سکا۔ بہرحال معلوم نہیں ہوسکا کہ ساحر نے کس نوری کی غزلوں پر غزلیں کہی ہیں۔

ساحر کاکوروی اس زمانے اور ماحول کی پیداوار ہیں، جب روایتی کلاسیکی ادب کا غلبہ اور دور دورہ تھا۔ نثر و نظم میں صرف بزرگوں کی تقلید کی جاتی تھی، کسی میں نئے راستے کی تلاش کی جرأت نہیں تھی۔ ساحر کے یہاں بھی نثر میں ظہوری وغیرہ اور نظم میں علی حزیں وغیرہ کی تقلید کی کوشش نظر آتی ہے، اور تقلید کی حد تک ان کا کلام کافی بلند پایہ ہے۔ مگر کوئی خاص مابہ الامتیاز چیز ان کے یہاں دکھائی نہیں دیتی، اگرچہ ساحر کو بھی اپنی شاعری پر بڑا فخر ہے۔

بلندیہای فکرِ من زِ نظمِ من تماشا کن — زمین ہر غزل در پردہ دارد آسمانی را

مگر ان کے کلام میں کسی غیر معمولی زندگی اور حیات کا پتہ نہیں چلتا، زیادہ تر اس عہد کے متعدد دوسرے شعرا کی طرح مضمون آفرینی اور آورد پر زور نظر آتا ہے۔ پھر بھی ان کے یہاں اچھے، رواں، سلیس، اور پُر ذوق اشعار کی کمی نہیں جیسا کہ اوپر کی غزلوں سے ثابت ہوگا۔ چند اور لطیف اشعار ملاحظہ ہوں؛

بمنزل می رسد ایں تیرہ منزل کاروان آخر — ز شہری ہر کہ گم شد در دیاری می شود پیدا
زبس حیرانیِ رُوی تو از خود می برد مارا — صباحِ وصل شامِ انتظاری می شود پیدا
خراش ہر قدم صد فتنہ را بیدار می سازد — قیامت بوسہ زد بر خاکِ پاسروِ روانی را

## ساحر کاکوروی

این است درایامِ اسیری ہوسِ ما — صیاد گذارد بگلستان قفسِ ما
گرم ست خلوتِ توز شب تا سحر بغیر — ساحر چہ جرم کرد کہ در محفلِ تو نیست

دیوان ساحر کے اس قلمی نسخہ کے آخر میں کچھ اور چیزیں بھی ہیں جو غالباً ساحر کی نہیں ہیں۔ کتابت کے دھندلے اور خراب ہو جانے سے یہ حصے ٹھیک سے پڑھے نہیں جاتے شروع میں اہلی شیرازی کی تین صفحے کی ایک نثر ہے۔ اس کے بعد ایک مثنوی ہے۔ اس میں تمہید، توحید، مناجات، نعت وغیرہ کے بعد "گل" نام ایک لڑکی اور ایک ملک زادہ کے عشق کی داستان ہے جس کا نام "جم" ہے۔ قصے کا خاتمہ یہ ہے کہ جب جم گھوڑے سے گر کر مرتا ہے تو "گل" بھی اس کے ساتھ اپنے آپ کو جلا کر خاک کر دیتی ہے۔ یہ مثنوی بھی ساحر کی معلوم نہیں ہوتی۔

سب سے آخر میں اٹھارہ ورق کا ایک رسالہ ہے، جس میں عربی، فارسی، نثر و نظم مخلوط ہے۔ یہ رسالہ بھی ساحر کا معلوم نہیں ہوتا۔

# کتابیات


۱۔ دیوان ساحر کاکوروی، نسخۂ خطی، دلی یونیورسٹی، دہلی۔

۲۔ نواب صدیق حسن خان: "شمع انجمن"، مطبع شاہجہانی، بھوپال، ۱۲۹۳ھ

۳۔ مولوی حافظ محمد حیدر علی کاکوروی: "تذکرۂ مشاہیر کاکوری"، اصح المطابع، لکھنؤ، ۱۹۲۷ء

۴۔ مولوی محمد مظفر حسین صبا: "روز روشن"، مطبع شاہجہانی، بھوپال، ۱۲۹۷ھ

۵۔ نواب نور الحسن خاں: "نگارستان سخن"، مطبع شاہجہانی، بھوپال، ۱۲۹۳ھ

۶۔ محمد قدرت اللہ گوپاموی: "نتائج الافکار"، چاپخانۂ سلطانی، بمبئی، ۱۳۱۶ شمسی

۷۔ دیوان بابا فغانی شیرازی: چاپخانہ گودرزی ۱۳۱۶ شمسی

۸۔ کلیات صائب تبریزی: چاپخانۂ عالی، تہران ۱۳۳۴ شمسی

۹۔ دیوان ابو طالب کلیم کاشانی: چاپخانۂ حیدری، ۱۳۳۶ شمسی

۱۰۔ کلیات حزیں: نولکشور، ۱۸۹۳ء

۱۱۔ دیوان واقف لاہوری: لاہور، ۱۳۳۹ھ

۱۲۔ دیوان مظہر جان جاناں: "خریطۂ جواہر"، مطبع مصطفائی دہلی، ۱۲۷۱ھ

۱۳۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب: "کلیات غالب" (نظم فارسی)، نولکشور، لکھنؤ، ۱۹۲۵ء

۱۴۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب: "کلیات نثر غالب" (فارسی)، نولکشور، کانپور، ۱۸۷۵ء

۱۵۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب: "مآثر غالب" (مرتبہ قاضی عبد الودود)، مسلم یونیورسٹی پریس، علی گڑھ، ۱۹۴۹ء

تنویر علوی

# کلامِ نصیر کے مآخذ

شاہ نصیر بڑے پرگو شاعر تھے؛ شعرگوئی و شعرسازی ان کے لیے مشغلۂ حیات بن گئے تھے۔ ان کے سینکڑوں شاگرد تھے، جن کے کلام پر وہ بہت جلد اور برجستہ اصلاح ہی نہیں دیتے تھے، بلکہ انھیں غزلیں کہہ کر بھی دیتے تھے اور مشاعروں میں پڑھواتے تھے۔ اب کون کہہ سکتا ہے کہ کون سے شاگرد کے دیوان میں استاد کا کتنا کلام شامل ہے۔ تاہم جو کچھ شاہ نصیر نے اپنے لیے اور اپنے نام سے کہا اور اس کا جتنا حصّہ محفوظ رہ گیا، وہ بھی اپنی قیمت و قامت کے اعتبار سے بہت کچھ ہے۔

بقول مولانا آزاد شعر کہنے سے کبھی نہ تھکتے تھے۔ "طبعِ موزوں گویا ایک درخت تھا کہ جب اس کی ٹہنی ہلا دو، فوراً پھل جھڑ پڑیں گے"۔ مگر اس شجرِ پُر بہار کے یہ پھل پھول جو زندگی بھر بکھرے رہے، کبھی انھیں اکٹھا کرنے کی کوئی سنجیدہ کوشش ان کی زندگی میں بھی کی گئی یا نہیں، تذکروں سے اس کا پتا نہیں چلتا۔ مصحفی نے ریاض الفصحا میں ان کے حالات میں ان کے صاحبِ دیوان ہونے کا ذکر کیا ہے: "صاحبِ دیوان است"۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ اس تذکرہ کی ترتیب (۱۲۲۱-۱۲۳۶) کے وقت تک نصیر کا دیوان

مرتب ہو چکا تھا مگر اس سلسلے میں سید کا بیان ہے[1]:

"اشعارِ ابدار اس پیشروِ سخنورانِ روزگار کے دو لاکھ سے زائد ہیں، اور یہ بے مبالغہ و اغراق ہے۔ صدہا آدمی جو کچھ نہ جانتے تھے اور بتقریبِ مشاعرہ صرف انھی سے غزل کہوا لیتے تھے، ہر ایک دیوان اپنے اپنے نام کا مرتب رکھتا ہے۔ اپنی زندگی میں ترتیبِ دیوان کی طرف توجہ نہ کی۔ ان کی وفات کے بعد مہاراج سنگھ نامی ایک شخص نے کہ ان کا شاگرد ہے، جس قدر ہاتھ لگا، جمع کر کے ایک دیوان ترتیب دیا ہے۔ اس کی ضخامت پچاس ساٹھ جزو سے کم نہیں۔"

اس بیان سے اور بالتواتر کے علاوہ معلوم ہوا کہ نصیر کا دیوان جو ان کی زندگی میں مرتب نہ ہو سکا تھا۔ ان کی وفات کے بعد ان کے شاگرد مہاراج سنگھ نے ترتیب دیا جس کی ضخامت پچاس ساٹھ جزو کے قریب تھی۔ شاہ نصیر کی وفات اور آثار الصنادید (طبع اول) کے زمانے میں سات برس کا فاصلہ ہے۔ اس اثنا میں شاہ نصیر کا دیوان مرتب ہو چکا تھا۔ مولانا آزاد کے بیان سے بھی سرسید کی تائید ہوتی ہے۔ لکھتے ہیں[2]:

"اپنا دیوان مرتب نہیں کیا۔ جو غزلیں کہتے تھے، ایک جگہ رکھتے تھے۔ جب بہت سی جمع ہو جاتی تھیں، تو تکیے کی طرح ایک لمبے سے تھیلے میں بھرتے تھے۔ گھر میں دے دیتے اور کہتے تھے، احتیاط سے رکھ چھوڑو۔ متفرق غزلیں ایک دو جلدوں میں تھیں، اور بہت سا سرمایہ دکن ہی میں رہا۔"

درگا پرشاد نادر نے شاہ نصیر کے نبیرہ شاہ بہاء الدین عرف عبداللہ شاہ کی زبانی یہ روایت کی ہے[3]:

"یہ شاعرِ بے بدل سات دیوان تیار کر گیا ہے۔ ازاں جملہ ایک دیوان فارسی زبان میں ہے۔ دیگر یہ کل کتابیں حیدرآباد ہی میں رہیں۔ ہمارے یہاں سے ایامِ غدر میں تلف ہو گئیں۔ یہاں صرف دو دیوان موجود ہیں۔"

---

۱۔ آثار الصنادید: ۶۷۰۔۶۷۱ ۲۔ آبِ حیات: ۴۲۰

۳۔ خزینۃ العلوم: ۲۰۹

# کلام نصیر کے ماخذ

نصیر کے دواوین و ذخیرۂ کلام سے متعلق انتخابِ کلیاتِ شاہ نصیر کے مرتب و ناشر محمد اکبر میرٹھی کا بیان ہے:[۴]

"۔ ۔ ۔ ۔ ایک نسخۂ قلمی سے جو میرے کتب خانے میں موجود تھا، انتخاب کر کے انطباع اس کا شروع کر دیا۔ اس اثنا میں شاہ بہاء الدین صاحب تخلص بشیر نبیرۂ شاہ نصیر مرحوم سے جو ایک جوانِ خوش اخلاق و عالی ذہن، نیک نہاد، سجادہ نشینِ درگاہِ شاہ صدر جہاں ہیں، اتفاقِ ملاقات ہوا۔ ان کی عنایت سے ایک صحیح نسخہ کلیاتِ شاہ نصیر صاحب کا ملا اور معلوم ہوا کہ علاوہ اس کے اور دیوان بھی شاہ صاحب کی تصنیفات سے ہیں۔ ان تمام دواوین و قصائد کو دیکھنے سے یہ بات ثابت ہوئی کہ از روئے ضخامت کے تصنیفات شاہ نصیر کی میر تقی میر صاحب کے کلیات سے کسی طرح کم نہیں ہے، اور اگر میرا یہ قیاس غلط نہ ہو، تو اس سے بھی کسی قدر زیادہ نکلیگی۔"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ترتیبِ انتخاب کے وقت (سنہ ۱۲۹۴ھ) دیوانِ نصیر کا ایک قلمی نسخہ خود مرتب کے پاس تھا اور ایک سے زیادہ نسخے انھوں نے شاہ بہاء الدین کی معرفت دیکھے تھے۔

حاصل اس گفتگو کا یہ ہے کہ شاہ نصیر کی وفات کے بعد ان کے دیوان کے کئی قلمی نسخے تیار ہوئے اور یہ بھی ممکن ہے کہ جن نسخوں کی طرف ان بیانات میں اشارے موجود ہیں، ان میں سے بعض شاہ نصیر کی زندگی ہی میں تیار ہو گئے ہوں، اور سرسید کو ان کا علم نہ ہو۔

شاہ نصیر کے جو قلمی نسخے اس وقت موجود ہیں وہ سب کے سب ترقیموں سے عاری ہیں۔ لہٰذا ان سے پتا نہیں چل سکتا کہ انھیں کب ترتیب دیا گیا اور ان کا مرتب کون تھا۔ البتہ ایک نسخۂ رام پور کے بارے میں بھی مرتب کا نام دوسری خارجی شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے، خود اس نسخے سے اس امر کا کوئی ثبوت فراہم نہیں ہوتا کہ یہ کس کا مرتب کردہ ہے۔

۴۔ دیباچہ انتخاب

# کلام نصیر کے ماخذ

## (۲)

قلمی نسخوں میں غالباً سب سے قدیم آصفیہ اسٹیٹ لائبریری، حیدرآباد کا نسخہ ہے۔ اس کے بارے میں یہاں کے اردو مخطوطات کی فہرست (جلد اول) کے مرتب مرحوم نصیر الدین ہاشمی لکھتے ہیں[5]۔

"۶۶۔ دیوان نمبر: دواوین: ۴۰۲، سائز: ۱×۶، صفحہ ۲۷۰، سطر ۱۳؛ خط نستعلیق، مصنف شاہ نصیر دہلوی، تاریخ تصنیف مابعد ۱۲۵۰ھ

"شاہ نصیر الدین، نصیر تخلص، سیاہ فام ہونے سے میاں کلو سے موسوم تھے۔ دہلی وطن تھا۔ مہاراجہ چندولال نے حیدرآباد طلب فرمایا کچھ عرصہ قیام کر کے واپس ہوئے۔ دوبارہ ایسے آئے کہ دہلی واپس جانا نصیب نہ ہوا۔ حیدرآباد میں ۱۲۵۴ھ میں انتقال ہوا۔ درگاہ شاہ موسیٰ قادری میں مدفون ہیں۔ حیدرآباد میں حکومت آصفیہ سے پچیس روپیہ یومیہ یعنی سات سو پچاس روپیہ تنخواہ ملتی تھی۔ ان کے فرزند عبدالرحمٰن نے نصیر کا دیوان مرتب کیا۔ نصیر کے شاگردوں میں ذوق، نے جو نام آوری حاصل کی وہ پوشیدہ نہیں۔

آغاز: ہم نے وصفِ گوہرِ عرفاں کو جب لکھا کیا
موج مسطر سے کشیدہ صفحۂ دریا کیا

اس دیوان میں ردیف وار غزلیات ہیں۔ ہر ردیف کے بعد سادہ صفحہ چھوڑا گیا ہے۔ آخری پندرہ صفحے دوسرے کاغذ اور دوسرے خط سے شامل کیے گئے ہیں۔ بعض صفحوں میں حاشیہ پر بھی غزلیات کا اضافہ کیا گیا ہے۔

اختتام: مانندِ گرز و نیزہ و خنجر بتائیدِ خدا
بن جائے بہرِ دشمناں شمس و ہلال و کہکشاں

شاہ نصیر کا دیوان حیدرآباد میں طبع ہوا تھا، مگر اب نایاب ہوگیا ہے۔ ایک قلمی نسخہ سالار جنگ کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ بقول بعض دیوان نصیر کا یہ نسخہ بہت اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اس میں نصیر کے استاد سائل (مائل) کی قلمی اصلاحیں شامل ہیں۔"

---

۵ فہرست مخطوطات کتب خانہ سالار جنگ، ۱۰:

## کلام نصیر کے ماخذ

نصیر اور دیوان نصیر سے متعلق یہ تفصیلات بڑی روا روی میں درج کر دی گئی ہیں۔ شاہ صاحب کی تنخواہ سے متعلق روایت بطالب گلزار آصفیہ سے لی گئی ہے، تاہم یہ صحیح نہیں ہے کہ انھیں یہ تنخواہ سرکار آصفیہ سے ملتی تھی۔ ان کا تعلق مہاراجہ چندو لال نے دربار سے تھا اور یہ تنخواہ بھی انھیں سے ملتی تھی۔ ترتیب دیوان کے سلسلے میں یہ کہنا کہ اسے ان کے بیٹے عبدالرحمن نے مرتب کیا، غلط فہمی پر مبنی ہے۔ عبدالرحمن شاہ نصیر کے نہیں، تسکین کے بیٹے تھے، اور ان کا مرتب کردہ نسخہ کتاب خانۂ عالیہ رضا لائبریری، رام پور میں موجود ہے۔ نیز نسخۂ سالار جنگ پر مائل کی (جنھیں غلطی سے سائل لکھا گیا ہے) اصلاحات کا ہونا بہت مشکوک ہے۔ مائل تو تیرھویں صدی ہجری کے آغاز ہی میں فوت ہو چکے تھے۔ اس وقت تک نصیر کا دیوان مرتب ہو چکا ہو، اس کا امکان بہت کم ہے، کم از کم اس کا کوئی ثبوت موجود نہیں۔

دیوان نصیر کا نسخۂ آصفیہ ۲۷۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ نمایاں طور پر دو حصوں میں تقسیم ہے: ایک حصے کا کاغذ نسبتاً زیادہ قدیم، سرمئی مائل زرد رنگ کا، اور باریک ہونے کے باوصف بہت مضبوط ہے۔ بعض صفحات کو چھوڑ کر جو نم خوردہ ہیں، اس کا سواد خط روشن اور بہت صاف ہے اور خط کی روش و کشش میں بڑی پختگی اور تناسب و توازن موجود ہے۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ اس کا مرتب یا تو شاہ نصیر کا شاگرد رہا ہے، یا ان کے کلام سے خوب واقف، جس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اس نے بعض غزلوں کی تحریر کے وقت مقطع سے پہلے ایک دو شعر کے لیے جگہ چھوڑ دی ہے۔ بعض مقامات پر "غور یافت طلب" اور "غور طلب" لکھا گیا ہے۔ اس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ شاید ان غزلیات کی ترتیب شاہ صاحب کی زندگی میں ہوئی ہے۔

اس نسخے میں بعض غزلیں، اور اشعار حاشیہ پر بھی لکھے ملتے ہیں، اگرچہ ان کی تعداد کچھ زیادہ نہیں۔ مثلاً ۱۵ شعر کی غزل "نکلتا ہے ولا تیسرے دن الم" جو صرف اسی نسخہ (آصفیہ) میں ہے حاشیے پر لکھی ملتی ہے۔ اسی طرح تا قیامت نہ مرینگے لب جاناں ہم تو حاشیے پر لکھی ہے۔ اس کے اشعار جلد بندی میں کٹ گئے ہیں۔ مگر تعداد ترتیب اشعار

مطبوعہ نسخہ کے مطابق ہی ہے۔ اس غزل کا تمغۂ عنوان "یا علی مدد" ہے۔
اسی طرح شاہ نصیر کی مشہور غزل "عسل کی مکھی" کا یہ شعر حاشیے پر درج ہے؛

دلربا قہر فسوں ساز ہیں بنگالے کے
آدمی کو وہ بناتے ہیں عسل کی مکھی

حواشی پر مندرج بعض نشانات اور سوادِ خط سے پتا چلتا ہے کہ یہ نسخہ کئی اشخاص کے مطالعے میں رہ چکا ہے۔ ایک قاری نے بعض اشعار کے سامنے صاد کے نشان دے کر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا ہے؛ کہیں کہیں "سبحان اللہ" لکھا ہے۔
کسی دوسرے قاری نے جگہ جگہ کلام پر تنقید کی ہے، بلکہ کہیں کہیں اصلاح دینے کی کوشش بھی ملتی ہے۔ مثلاً "خال پردے میں" والی غزل کے مصرع "رکھے ہے آپ کو تو چھیل چھال پردے میں" پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے "بھلا ایسے شعر شاہ صاحب کو زیب دیتے ہیں، جن کو . . . . (بعد کی عبارت کٹ گئی ہے) اسی غزل میں پانچویں شعر کے بارے میں لکھا ہے: "پانچواں شعر ہماری سمجھ میں نہیں آیا، برا بھلا کیا لکھیں"۔ غزل "آب خم ذوالفقار ہیں" ذوالفقار کے ضمن میں حاشیہ نگار نے بحث کی ہے اور شاہ نصیر پر اعتراضات وارد کیے ہیں، جو حاشیہ کٹ جانے اور جزبندی میں آجانے کی وجہ سے پورے پڑھے نہیں جاتے؛ البتہ یہ فقرے جو "نا نجد بار" سے متعلق ہیں سمجھ میں آجاتے ہیں! "قطع نظر اس تقریر کے "نا نجد عار" بظاہر محاورہ ایسا نہیں، لیکن کچھ ہو، مضمون برا نہیں"۔ اسی غزل میں نویں شعر سے متعلق لکھا ہے "کہاں بید، کہاں تاک بید جنگلی اور تاک . . . .
بید کی جائے کچھ اور لفظ رکھتے، تو دوسرا مصرع کتنا خوب تھا" وغیرہ۔
یہ حواشی بہت ہی رذال اور خراب خط میں ہیں جو اسلوب کی پختگی اور نفاست سے بالکل عاری ہے۔ بعض مقامات پر لکھا ہوا حاشیہ قلمزد بھی کر دیا ہے۔ حاشیہ لکھنے کہیں اپنے نام یا تخلص کی کوئی نشاندہی نہیں کی۔
اس میں کتابت کی گوناگوں غلطیاں موجود ہیں۔ حروف ربط، حروف اشارات، اور بعض جگہوں پر ضروری کلمے اور بعض مصرعے کتابت سے رہ گئے ہیں۔ کتابت کی غلطیاں،

اور بعض کتابت سے رہ جانے والے مصرعے ایسے بھی ہیں جن سے متعلق رضا لائبریری کے اور مطبوعہ نسخوں میں یہی صورت موجود ہے۔ اس سے گمان ہوتا ہے کہ شاید ان غلطیوں اور فروگذاشتوں کا تعلق ان سب نسخوں کے اصلی ماخذ سے ہے۔ املا میں بھی قدیم انداز موجود ہے۔

"مجنوں ہے نہ یاں فریاد ہے" ص ۱۵۳ پر آنے والی اس غزل کے بعد قدیم دیوان اچانک ختم ہو گیا۔ غالباً اس نسخہ کا آخری ورق یا اوراق غائب ہو گئے۔ بہت ممکن ہے ان کے ساتھ کوئی ترقیمہ بھی ہو جس سے اب یہ دیوان محروم ہے۔ اس کے بعض اوراق جن کا خط اور کاغذ نسبتاً معمولی اور جدید ہے، اس عبارت کے ساتھ بڑھائے گئے ہیں:
"کلام باقی ماندۂ استادِ گرامی حضرت شاہ نصیر دہلوی غفر اللہ لہ و نور اللہ مرقدہ۔"
ظاہر ہے کہ یہ اوراق شاہ نصیر کی وفات کے بعد بڑھائے گئے ہیں

آصفیہ اسٹیٹ لائبریری کے نسخے کے علاوہ حیدرآباد ہی میں دیوانِ نصیر کے دو اور قلمی نسخے ہیں، مگر یہ دونوں مختصر انتخاب کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان میں سے پہلا یعنی سالار جنگ میوزیم کے کتاب خانے کا نسخہ (نمبر ۵۷۶) نسبتاً زیادہ قدیم، اہم اور سب ردیفوں پر حاوی ہے۔ اس نسخہ سے متعلق کتاب خانے کی فہرستِ مخطوطات کے اندراج میں متعدد اغلاط ہیں۔ مثلاً نصیر کے انتقال کی تاریخ ۱۲۵۴ھ کے بجائے ۱۲۵۳ھ لکھ دی ہے ("چراغ گل" مادۂ تاریخ وفات ہے)۔ نصیر کی تنخواہ ساڑھے چار سو ماہانہ لکھی ہے لیکن اس کے ماخذ کی طرف کوئی اشارہ نہیں، حالانکہ آج تک سب پچیس روپیہ یومیہ یعنی ساڑھے سات سو ماہانہ لکھتے آئے ہیں۔ اس دیوان کا کاغذ قدیم اور قدرے سیاہی مائل ہے۔ خط نستعلیق شکستہ ترین ہے۔ رسم خط میں پختگی ہے، مگر دیدہ زیبی نہیں۔ روشنائی کہیں کہیں پھیل گئی ہے۔ بعض اشعار حاشیے پر لکھے گئے ہیں۔
اس میں کل ۳۰ اوراق ہیں۔ جن میں پہلا اور آخری صفحہ سادہ ہے۔ بعض صفحات

---

۶۔ فہرست کتاب خانہ سالار جنگ، ۲۵۲۔۲۵۳۔

## کلام نصیر کے ماخذ

پر کرم خوردگی کے آثار موجود ہیں، جس کی وجہ سے بعض حروف اور نقطے غائب ہو گئے ہیں۔ بعض جگہوں پر مرکزی بھی تحریر کی کہنگی اور کرم خوردگی کی نذر ہو گئے ہیں۔ کتابت کی غلطیاں اور مغالطے بھی موجود ہیں جو کہیں کہیں رسم کتابت کی قدیمانہ روش کے پیدا کردہ ہیں۔ مثلاً ع "دن ڈھلے اب تک نہیں ہوتے سنا ہے رت جگا" کچھ اس طرح پڑھا جاتا ہے: ع "دن دیئے اب تک نہیں ہوے سنائے رت جگا"۔ یا ع "شبنم ہے برگ گل کی بیولا زبان پر" مصرع کچھ یوں لکھا ہوا ہے: "شبنم برگ گل کی پھپولا زبان پر۔ ایسی ایک دو نہیں، بہت سی مثالیں ہیں۔ کہیں کہیں یہ صورت باریک کاغذ کے چپک جانے کی وجہ سے بھی پیدا ہوئی ہے۔ بعض دوسرے مخطوطوں کی طرح اس میں بھی کہیں کہیں بعض حروف وحرکات، الفاظ اور کلمے کتابت ہونے سے رہ گئے ہیں۔

انتخاب کا دوسرا مخطوطہ ادارۂ ادبیات اردو میں محفوظ ہے۔ اگرچہ اس میں تعداد و ترتیب اشعار قریب قریب سالار جنگ والے نسخے کی طرح ہے، لیکن یہ نسخہ مذکورہ نسخے کے مقابلہ میں جیسا کہ کہہ چکا ہوں، نا مکمل ہے۔ یہ ردیف میم کی چند غزلوں کے بعد اچانک ختم ہو جاتا ہے۔ بقیہ اوراق ضائع ہو گئے ہیں۔ اس قلمی نسخہ سے متعلق ڈاکٹر محی الدین قادری زور مرحوم نے یہ تفصیلات مہیا کی ہیں۔[۴۷]

> اوراق ۲۸، سطور ۱۴ فی صفحہ۔ تقطیع ½ ۵" + ۹" خط نستعلیق، عنوان اور تخلص سرخی میں، مصنف شاہ نصیر الدین نصیر دہلوی، زمانۂ تصنیف قبل ۱۲۵۰ھ۔ شاہ نصیر دہلی کے آخری مشاہیر شعرا میں سے تھے۔ ابوظفر بہادر شاہ اور ذوق کے استاد تھے۔ آخری زمانہ میں لکھنؤ اور حیدرآباد کے کئی سفر کیے اور آخر کار حیدرآباد ہی میں ۱۲۵۴ھ میں وفات پائی۔ ان کی قبر واقع درگاہ سید موسیٰ شاہ قادری پر ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے سنگ مرمر کا کتبہ لگا دیا گیا ہے۔

"شاہ نصیر نہایت ہی پُرگو اور مشاق شاعر تھے۔ انھوں نے سنگلاخ زمینوں

---

۴۷۔ تذکرۂ اردو مخطوطات (جلد اول)، ؟

میں غزلیں اور قصیدے لکھے تھے۔ مہاراجہ چندو لال نے حیدرآباد میں ان کی بڑی قدر و منزلت کی کہ آخر وہ یہیں کے ہو رہے۔ ان کا یہ منتخب دیوان بھی مہاراجہ ہی کے حکم سے، یا انھیں کے کسی درباری نے نقل کرایا ہے، کیونکہ کتاب کے آغاز میں مختلف شعرا کے اشعار کے ساتھ مہاراجہ کا ایک مطلع بھی کاتب نے نقل کیا ہے، جو یہ ہے:

مطلع مہاراجہ بہادر:

شب نہ گشتے روز گر جلوہ نہ کردے رُوئے تو آب
گے شدے روشن ز مشرق تا بہ مغرب آفتاب

اس نسخہ میں شاہ نصیر کی غزلوں کے تقریباً آٹھ سو اشعار منتخب کیے گئے ہیں۔

آغاز: دیکھنے جب اپنی صورت وہ پری پیکر لگا
بن گیا آئینہ جوگی منہ کو خاکستر لگا

چشمِ نقشِ پا سے ہیں پامال حسرت دیکھیے
گوشۂ داماں کو اپنے اور بھی ٹھوکر لگا

اختتام: نہ کیونکہ شب مہِ ہالہ نشیں ہو حلقہ بگوش
بلا یہ کان کے بُندے تمھارے ہلتے ہیں

غزل اک اور بھی کہہ اس زمیں میں کہ نصیر!
زباں سے شعر تری خوب تر نکلتے ہیں"

اس بیان کے بعض حصے تسامحات کا درجہ رکھتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ شاہ نصیر مہاراجہ کی قدردانیوں کی بدولت وہیں کے ہو رہے۔ مہاراجہ کی قدردانیاں اپنی جگہ پر لیکن شاہ نصیر کا قیام حیدرآباد ان کی طویل زندگی میں ایک مختصر زمانے سے زیادہ نہیں ہو سکتا اور حیدرآباد کا آخری سفر تو انھوں نے اپنے آخری ایّام حیات ہی میں کیا تھا۔ علاوہ بریں اس نسخہ کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ یہ ایک بہت معمولی قلمی نسخہ ہے، جو اغلاطِ کتابت سے بھی پاک نہیں۔ اس کے کاغذ، طرزِ کتابت اور آرائش میں کوئی اہتمام نہیں برتا گیا۔ اگر یہ مہاراجہ کے

حکم سے یا ان کے لیے نقل کیا گیا ہوتا، تو یہ اپنے ظاہر اور باطن کے اعتبار سے معمولی نسخہ نہ ہوتا۔ اس کا کاغذ ہلکا زردی مائل ہے۔ سوادِ خط روشن ہے مگر کسی خاص اہمیت کا حامل نہیں۔ حاشیوں پر کوئی جدولیں وغیرہ نہیں ہے۔ شروع میں بسم اللہ سرخ روشنائی سے لکھی ہوئی ہے۔ بعض غزلوں میں تخلص بھی سرخی سے لکھا گیا ہے۔ حاشیے خالی ہیں۔ کہیں کوئی مہر۔ وغیرہ بھی نہیں ملتی۔ ایسی صورت میں مہاراجہ کے صرف ایک مطلع کی اس میں موجودگی اس کا معقول ثبوت نہیں ہو سکتی کہ یہ نسخہ مہاراجہ کے لیے لکھا گیا یا ان کے حکم سے نقل ہوا۔

اس مجموعۂ اشعار کے ساتھ اسی تقطیع، اسی کاغذ اور اسی خط میں سودا کا بھی ایک انتخاب ملتا ہے۔ جو اس امر کا ایک اور ثبوت ہے کہ کسی شخص نے اپنی ذاتی دلچسپی سے ان اشعار و غزلیات کا انتخاب کیا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس انتخاب کا ماخذ سالار جنگ میوزیم والا نسخہ ہو جس کا کاغذ اور کتابت دونوں اس سے زیادہ قدیم معلوم ہوتے ہیں۔

ان دونوں انتخابات کے مقابلہ میں نسخۂ آصفیہ زیادہ ضخیم بھی ہے اور زیادہ قدیم بھی۔ اگرچہ بعض دوسرے نسخوں کے مقابلے میں ہم اسے مکمل نہیں کہہ سکتے۔

**نسخۂ پٹیالہ۔** یہ نصیر کے تین بڑے قلمی نسخوں میں سے ہے۔ اس کا سائز ۱۲+ ۷ اور پہلے صفحہ کے سوا، جہاں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بعد نو شعر کی غزل "صفحۂ دریا کیا" نقل ہوئی ہے، باقی کتاب میں ۱۳۔۱۴ شعر فی صفحہ درج کیے گئے ہیں۔ کہیں کہیں جگہ خالی بھی چھوڑی گئی ہے، مگر ایسا ایک دو صفحات سے زیادہ میں نہیں ہوا۔

کاغذ اور خط سے یہ نسخہ پچھلی صدی عیسوی کے نصف آخر کا مرتبہ معلوم ہوتا ہے اس کا نمبر ۱۵۹۶ ہے۔ اس کی جلد کسی چراغ دین نے باندھی تھی، جو لاہور میں کام کرتا تھا۔ یہ نسخہ ریاست کپورتھلہ کی لائبریری کی زینت بن چکا ہے۔ مگر اس پر اس ریاست کا خاص نشان نہیں ہے۔

اس مخطوطے میں صرف غزلیں ہیں۔ قصائد اور مدحیہ اشعار سے حیدرآبادی نسخوں کی طرح

## کلام نصیر کے ماخذ

اس کا دامن بھی خالی ہے۔ خط صاف ہے۔ کاغذ باریک اور کافی مضبوط قطعہ۔ رباعی۔ تاریخ اور کہیں کہیں غزل اور غزل کے درمیان میں آنے والے قطعہ کو سرخ روشنائی سے لکھا ہے۔

ایک جگہ (عشق پیچے کی پیچ کھا کر بیل) قطعے کو رباعی لکھا ہے، جس کے صرف آخری دو مصرعوں میں قافیہ آیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ غلطی کاتب نے لاعلمی کے سبب کی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ صرف اس کی نقل کا ذمہ دار ہو۔

یہاں بھی بعض اشعار حاشیہ پر لکھے ہیں، لیکن ان میں اختلافِ نسخ کی بھی صورت موجود ہے۔ کچھ غزلیں ایسی بھی ہیں جو دو دو جگہ نقل ہو گئیں ہیں۔ ان میں اختلافِ نسخ کے علاوہ ایسا بھی ہوا ہے کہ کچھ شعر یہاں اور کچھ وہاں زائد ہیں۔ اس صورتِ حال سے ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ شاید یہ مختلف نسخوں کی غزلیں ہیں اور شاہ نصیر نے ان غزلوں پر مختلف وقتوں میں فکر کی ہے۔ دود سا لپٹا۔ بشب تار ہوا۔ دل افگار نہ پایا۔ دیدۂ تر سے بچنا۔ ہمدوشِ خاکستر رہا۔ راہ تیرے ہات۔ سیم تن چمکے۔ زمینوں کی غزلیں دوبارہ نقل ہو گئی ہیں۔ ان میں کسی کسی جگہ اشعار کی تعداد کا اختلاف بھی غیر معمولی ہے۔

اس نسخے میں ردیف 'ب' اور 'ت' کی غزلیات کے بعض اوراق جلد ساز کی سہل انگاری کے باعث آگے پیچھے ہو گئے ہیں۔ سوءِ اتفاق سے یہ نسخہ بھی ترقیمہ سے خالی ہے کاتب کا نام تک درج نہیں، نہ زمانہ ترتیب یا سالِ تحریر پر کسی طرح سے کوئی روشنی پڑتی ہے۔ کتاب خانہ (سینٹرل پبلک لائبریری، پٹیالہ) کی فہرست میں بھی ان کے بارے میں کوئی وضاحت نہیں کی گئی۔ رسمِ خط سے ضرور اتنا پتا چلتا ہے کہ کاتب شاید پنجاب کا رہنے والا ہے اور بعض الفاظ کا تلفظ اس کے یہاں وہی ہے جو پنجاب میں ہے مثلاً وہ ابر کو تشدید کے ساتھ لکھتا ہے (اَبّر گہربار نہ پایا) رووں کو رواون یعنی بجائے ہمزہ کے الف کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ اسی طرح گاؤں کو گاداون لکھا ہے وغیرہ۔ پرانی روش کے مطابق الفاظ عام طور پر ملا کر لکھے گئے ہیں مثلاً "باغیں" "گلشنیں"

"صبحدم"، "نکی"، "مجلکیے"، "غارتدل" وغیرہ تائے ہندی (ٹ) کا املا اس طرح کیا ہے:
ٹکرا۔ اس سے گمان ہوتا ہے کہ کاتب یا تو کسی پرانے نسخہ سے نقل کر رہا ہے، یا خود اسے املا میں قدیم روش سے زیادہ مزاولت ہے۔

اس نسخے میں بہت سی وہ غزلیں اور اشعار مل جاتے ہیں جو رامپوری نسخہ (رضا لائبریری) کے علاوہ کسی اور ماخذ میں دستیاب نہیں ہوتے۔ سہوِ کتابت کے گوناگوں نمونے اس نسخہ میں بھی مل جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض نسخۂ رامپور اور خال خال نسخۂ آصفیہ سے مشابہ ہیں۔ ان میں سے بعض غلطیاں بہت نمایاں ہیں مثلاً عار ایک موقع پر "عاز" لکھا ہے ممکن ہے یہ کسی قدیم نسخہ سے اپنائی ہوئی غلطی ہو۔ ایسی غلط نگاری یا تحریر کے مغالطوں کی چند در چند مثالیں آصفیہ، پٹیالہ اور نسخۂ رامپور میں ملتی ہیں۔

نسخۂ رامپور: کلام نصیر کا سب سے مکمل مجموعہ ہے جو رضا لائبریری، رامپور میں موجود ہے۔ (۷) ۹۶ / ۳۸۱ م ۳ دیوان شاہ نصیر نصیر دہلوی اردو، قلمی) فہرست کتب خانہ کے مختلف اندراجات میں خانۂ کیفیت میں لکھا ہے:

"دیوان نصیر۔ شاہ نصیر الدین بن شاہ غریب دہلوی متخلص بہ نصیر متوفی ۱۲۵۴ھ، عہدِ خلد آشیاں، بہ خطِ تسکین غالباً، تعداد اوراق ۲۸۲"

اس ضمن میں مولانا محمد حسین کا بیان ہے:

"دلی میں میر حسین تسکین ایک طباع اور نازک خیال شاعر تھے۔ ان کے بیٹے سید عبد الرحمٰن بھی صاحبِ مذاق اور سخن فہم شخص تھے۔ انھوں نے بڑی محنت سے ایک مجموعہ ایسا جمع کیا کہ غالباً اس سے زیادہ ایک جگہ شاہ صاحب کا کلام جمع نہ ہوگا۔ نواب صاحب رام پور نے کہ نہایت قدردانِ سخن ہیں، ایک رقم معقول دے کر وہ نسخہ منگالیا۔ غزلیں اکثر جگہ بکثرت پائی جاتی ہیں، مگر قصیدے نہیں ملتے کہ وہ بھی بہت تھے۔"[1]

اس سے واضح ہوتا ہے کہ اس نسخہ کے کاتب یا مرتب تسکین نہیں عبد الرحمٰن ہیں جن کو

[1] آبِ حیات

نصیر الدین ہاشمی نے غلطی سے شاہ نصیر کا بیٹا قرار دیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شاہ صاحب کا جتنا کلام اس نسخے میں شامل ہے، اتنا کسی اور نسخے میں نہیں ملتا۔ مرحوم نواب کلب علی خاں خلد آشیاں کے عہد میں یہ نسخہ کتاب خانۂ عالیہ ریاست کی زینت بنا، مگر اس کے صلے میں جو "رقم معقول" مرتب کو دی گئی ، وہ صرف چار روپیہ تھی۔ ہاں، نواب صاحب نے مرتب کو دوسری طرح سے موردِ عنایات فرمایا ہو، یہ الگ بات ہے۔ اس نسخے کے مندرجات سے مولانا آزاد واقف نہ ہوں گے، ورنہ آخری فقرہ ان کے قلم سے نہ نکلتا، اس لیے کہ اس نسخے میں مدحیہ قصائد بھی اچھی خاصی تعداد میں ہیں اور مخمسات و مسدسات کی صورت میں جو مدحیہ نظمیں ملتی ہیں، وہ الگ ہیں۔

غزلوں کی تعداد بھی اس نسخہ میں تمام معلومہ قلمی نسخوں کی تعداد سے کہیں زیادہ ہے۔ ان میں سے اکثر غزلیں ایسی بھی ہیں، جو اس نسخے اور نسخۂ پٹیالہ میں متن اور تعداد اشعار کے لحاظ سے یکساں ہیں، مگر قابلِ لحاظ وہ غزلیں ہیں، جو صرف اسی نسخہ میں ملتی ہیں اور قصیدے اور دیگر اصناف سے تو دوسرے مخطوطات کا دامن تقریباً خالی ہی ہے۔ کتابت کی غلطیوں کا ایک طویل سلسلہ ہے، جو اس میں شروع سے آخر تک چلا گیا ہے۔ معلوم نہیں اس نسخہ کے ماخذ کیا تھے۔ انھوں نے یہ تمام کلام اپنے طور پر جمع کیا، یا یہ پہلے سے جمع کیے ہوئے کسی مجموعۂ کلام کی نقل ہے۔ مولانا محمد حسین کے بیان سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے خود محنت کر کے اسے مرتب کیا تھا، لیکن نسخۂ پٹیالہ اور اس کی غزلوں کے باہمی تقابل سے پتا چلتا ہے کہ ان غزلوں کی حد تک جو دونوں نسخوں میں موجود ہیں اور ان کی تعداد بہت بڑی ہے، دونوں کا ماخذ ایک ہے۔ اس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ انھیں بعض مرتب نسخوں سے بھی مدد ملی ہے اور بہت ممکن ہے کہ یہ وہ نسخے ہوں جو خاندانِ نصیر کے پاس محفوظ تھے۔ کتابت کی غلطیاں اگر محض مرتب کی فروگذاشتوں کا نتیجہ نہیں تو یہ اصل مسودات سے تعلق رکھتی ہیں اور ان مسودات کی قرأت میں جو دشواریاں پیش آئی ہوں گی، ان کی مظہر ہیں۔ بعض غزلوں میں اشعار کی نقل کا اسلوب بھی اس امر کی طرف ایک واضح اشارہ کی حیثیت

رکھتا ہے۔ مثلاً "پئے زیب پاں سے ملکر آگ" غزل کے مقطع کا صرف دوسرا مصرع یوں لکھا ہوا ہے:

. . . . . . . . . . .

کہ یہ شیشہ اور طاق ہے۔ نو نصیر اجا کے اسے دھرآؤ

اور پہلے مصرع کی جگہ خالی چھوٹی ہوئی ہے اسی طرح وہ غزل "دلدار کی طرف" کا ایک شعر اس طرح لکھا ہوا ملتا ہے:

. . . رکھتی خبر ضرور ہے شرک خفی کھینچونگا . . . . . . . طرف

"شب وصل" غزل کا ایک شعر اس طرح لکھا ہے:

میری تقدیر میں ہے خون سے نہانا شب وصل . . . . . . . . . . . فصل

اسی طرح کہیں جگہ آدھا مصرع ہے، بعض اوقات مصرع کے بیچ کے لفظ نہیں لکھے ہیں، کتابت کی غلطیاں اس کے علاوہ۔ غزلوں کے ساتھ تخلص اکثر ہلکی سرخ روشنائی سے لکھا گیا ہے۔ ایسے ہی بہت سے مقطع ہیں جہاں تخلص کی جگہ خالی چھوٹی ہوئی ہے۔ کاتب غالباً یہاں بھی سرخ روشنائی سے لکھنا چاہتا تھا اور بعد کو اسے وقت نہ ملا یا بھول گیا۔ اس نسخے کا کاغذ باریک اور مضبوط ہے، جس کا رنگ ہلکا زردی مائل ہے۔ سواد خط روشن اور صاف ہے۔ بعض غزلیں حاشیہ پر بھی لکھی ہوئی ہیں۔ یہ معلوم نہیں کہ یہ کب نواب صاحب رام پور کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا۔ دفتر اندراج کتب خانہ سرکار عالیہ سے صرف اتنا پتا چلتا ہے کہ یہ چار روپے سکہ رائج الوقت میں خریدا گیا تھا۔

(۳)

ان قلمی نسخوں کے علاوہ کلام نصیر کے ماخذ میں بعض مطبوعہ نسخے بھی ہیں، ان میں سب سے پہلے انتخاب کلیات شاہ نصیر ہے۔ یہ مختصر انتخاب ۱۲۹۴ھ میں شائع ہوا تھا۔ یہ اعلیٰ پریس، میرٹھ میں چھپا اور اس کے مرتب حافظ محمد اکبر میرٹھی تھے۔ اس سے پہلے نصیر کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ مرتب اپنے دیباچہ میں اس پر اظہار افسوس کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

## کلام نصیر کے ماخذ

یہ بات نہایت افسوس کے قابل ہے کہ شاہ ممدوح کا کلام ابھی طبع نہیں ہوا اور جو آئندہ منگی شعر و شاعری کے مشتاق لوگوں کو ان کی شہرت و نام آوری کے اعتبار سے ہوتی ہے وہ پوری نہیں ہو سکتی اور جو فوائد کہ ایک استادِ فن کے کلام سے اہلِ سخن کو پہنچنے ممکن ہیں، ان کے پہنچنے کا کوئی آسان ذریعہ نہیں ہے اور یہ خیال بھی حسرت و افسوس سے خالی نہیں کہ ایک ایسے برگزیدہ شاعر کا کمالِ شاعری جو ساٹھ برس کی مشاقی و سخن سنجی کے بعد مسلمۂ روزگار ہوا ہو وہ اس فن کے قدر شناسوں کی نظر سے پوشیدہ ہو کر محض ناشناسی و گمنامی کے حجاب میں پڑا ہوا ہے۔" (ص ا انتخاب)

نیز انھوں نے مقدمے میں لکھا ہے کہ اس انتخاب اور اس کی اشاعت کی طرف ان کو توجہ مرزا احمد حسین بیگ ـــــ سررشتہ دار کلکٹری ضلع میرٹھ و رئیس قصبہ سوروں (ضلع ایٹہ) نے دلائی۔ ان کے اپنے پاس ایک قلمی نسخہ تھا نیز شاہ بہاء الدین بشیر نے اپنے نسخے بھی ان کے حوالے کر دیے تھے ان کی مدد سے انھوں نے یہ انتخاب کیا، یہ بہت مختصر ہے، صرف ۱۰۸ صفحات۔ مقدمے کے بعد یہ دو حصوں میں منقسم ہے:

پہلا حصہ اس دیوان پر مبنی ہے جو مرتّب کی اپنی ملکیت تھا۔ یہ ص ۸۴ پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد حصۂ دوم کا کلام اس دیوان سے لیا گیا ہے جو شاہ بہاء الدین نبیرۂ شاہ نصیر الدین صاحب نصیر نے انھیں دیا تھا۔ خاتمہ کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ طباعت ۱۰ نومبر ۱۸۷۷ء کو مکمل ہوئی تھی۔

اس کے ساتھ تین قطعاتِ تاریخِ طباعت ہیں۔ پہلا "بشیر نبیرۂ شاہ نصیر" کا ہے اس میں مصرع تاریخ ہے:

"طلسمِ دفترِ عشاق" پیرِ عقل بگفت
۱۲۹۴

تیسرا قطعہ خود مرتّب کا ہے۔ لکھتے ہیں:

| | |
|---|---|
| اکبر نے یہ انتخاب پایا | عنوانِ مثالِ بے مثالی |
| تاریخ اگر اس کی پوچھو | ہے "منتخب کلام عالی" |

۱۲۹۴

چمنستانِ سخن۔ انتخابِ اول کی اشاعت کے پورے بیس برس بعد شاہ نصیر کے

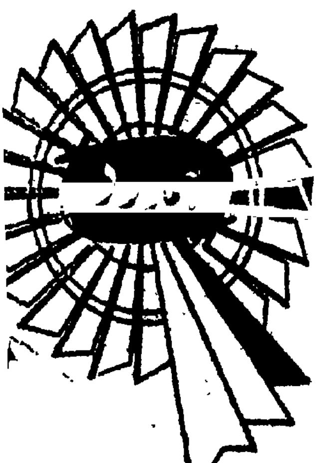
# کلام نصیر کے ماخذ

دیوانِ غزلیات کا نسبتاً زیادہ مکمل دوسرا مجموعہ چمنستانِ سخن کے نام سے حیدرآباد سے شائع ہوا۔ یہ حکیم نادر علی رعنا نبیرۂ میر احمد علی خاں شہید دہلوی کے ذاتی کتاب کے نسخے کی نقل تھی، اور مطبع فخر نظامی، چھتہ بازار، حیدرآباد نے اسے شائع کیا۔ اس میں ۲۴۸ صفحات ہیں۔ سرورق کا کاغذ حنائی ہے۔ باقی دیوان میں دو رنگ کا کاغذ استعمال ہوا ہے، ایک تو گہرے زرد رنگ کا بہت معمولی کاغذ ہے۔ مرور اس کی تاب دتواں ختم ہو چکی ہے، لیکن دوسرے ہلکے زرد رنگ کے کاغذ میں ہنوز جان باقی ہے۔ اشعار حوض اور حواشی دونوں جگہ درج ہیں۔ کتابت کی اغلاط ہیں۔ نہیں کہا جا سکتا کہ اصلی نسخہ ہی ایسا تھا، یا یہ اس نسخے کے کاتب کی کارگزاری۔ بعض اشعار دو مرتبہ چھپ گئے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اصل مسودہ میں بھی اسی طرح ہو۔ یہ نسخہ ۱۳۱۴ھ میں چھپا تھا۔ داغ کا قطعۂ تاریخ پیش کیا جاتا ہے:

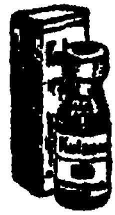
چھپا ہے آج یہ دیوان اس سخنور کا  —  کہ جس کی طبع سے برآئے مرادِ اہلِ ہند
یہ وہ کلام متیں ہے یہ وہ کلام فصیح  —  کہ کیونکہ اس پہ ہے اعتقادِ اہلِ ہند
یہ باغ وہ ہے کہ اس کی بہار گُل بن  —  ہمیشہ سے ہیں دل شاد شادِ اہلِ ہند
سخنورانِ زمانہ ہیں متفق قائل  —  باتفاق اسی پر ہے صادِ اہلِ ہند
ہر ایک شعر اسی کا ہے داد کے قابل  —  اسی کے واسطے زیبا ہے دادِ اہلِ ہند
نہ کیوں ہو شہرہ مصنف کا غیر ملکوں میں  —  کہ یادگار ہے یہ وجہ دادِ اہلِ ہند
فصاحت اور بلاغت پہ جدّتِ مضموں  —  ازل کے روز سے ہیں خانہ زادِ اہلِ ہند
جو اہلِ فارس و اہلِ عرب اسے دیکھیں  —  تو یہ کہیں کہ ہے یکتا سوادِ اہلِ ہند
یہ سال طبع کہا داغ دہلوی نے بھی  —  کلام شاہ نصیر اوستادِ اہلِ ہند
۱۳۱۴

Printed by Z. A. Abbasi at Kohinoor Printing Press, Lal Kuan,
and Publihsed from ILMI MAJLIS OFFICE,
1429, Chhatta Nawab Saheb, Farrash Khana, DELHI-5.

# طویل تحقیق
# اور
# طویل تجربات ـ
# کامیاب

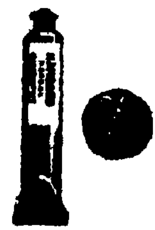


ہمدرد دواخانہ (وقف)
دہلی ـــ سہارنپور



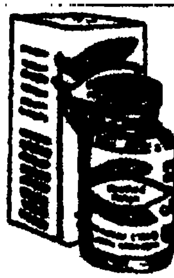
## مقلوم

...تکلیف، جیسے اپھارہ...
...
ماتوروں کاٹے کا فوری علاج
مقلوم ہمیشہ پاس رکھیے



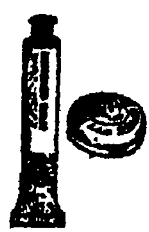
## ہمدرد مرہم

ہر طرح کی جلدی تکلیف جیسے پھوڑے پھنسی
گرمی دانے، داد، چھائیاں، آگ یا گرم پانی سے
جل جانے اور چاقو چھری کے زخم میں کام میں آتا ہے
اسے ہمیشہ گھر میں رکھیے



## ہمدرد منجن

دانت اور مسوڑھوں کو صاف اور بیماریوں سے
محفوظ رکھنے اور دانتوں میں موتیوں کی سی
چمک کے لیے ہمیشہ پابندی سے
ہمدرد منجن استعمال کیجئے۔



## ہمدرد بام

سر کے درد، نزلہ زکام، سینہ کی جکڑن اور
روزمرہ کی بہت سی تکلیفوں میں کارآمد ہے
ہمیشہ ساتھ رکھیے



## صدوری

صدوری کھانسی اور پھیپھڑوں میں بلغم
جمع ہو جانے کی تکلیف کو دور کرتی ہے بچوں
کی کالی کھانسی اور انفلوئنزا کے بعد کی کھانسی
کے لیے شفا بخش ہے۔

# تحریر

علمی مجلس دلی کا تماہی رسالہ

۲

مرتبہ:
مالک رام

# علمی مجلس دلی

## مقاصد

۱۔ اردو میں علمی، ادبی، لسانی و تہذیبی موضوعات سے متعلق تحقیق

۲۔ غیر مطبوعہ متون کی تلاش اور طباعت کا انتظام

۳۔ علمی اور تحقیقی کتابوں کی اشاعت

۴۔ ایک سہ ماہی علمی اور تحقیقی رسالے کا اجراء

۵۔ ایک بنیادی کتاب خانے کا قیام

۶۔ دوسرے تحقیقی کام کرنے والے اداروں اور افراد سے رابطہ اور تعاون۔


علمی مجلس

۱۴۲۹، چھتہ نواب صاحب

فراشخانہ۔ دہلی

# تحریر

## علمی مجلس دلی کا سہ ماہی رسالہ


سالانہ ۱۲ روپے — مرتب

اس شمارہ کی قیمت ۵۰ء۳ روپے — مالک رام

جلد ۱ — ۱۹۶۷ء — شمارہ ۲


فہرست

# ملاحظات

ملک کے اہلِ نظر طبقے نے جس تپاک سے تحریر کے پہلے شمارے کا خیر مقدم کیا ہے اور اس سلسلے میں جو تعریفی خطوط ہمیں لکھے ہیں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس طرح کے ایک مجلّے کی کتنی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔ ہم ان سب اصحاب کے شکرگزار ہیں۔ ہم کوشش کریں گے کہ تحریر کا معیار بلند سے بلند تر ہوتا جائے، تاکہ جو اعتماد اسے حاصل ہوا ہے، وہ قائم رہے۔

چونکہ پہلا پرچہ اپریل میں شائع ہوا تھا، اس لیے سال رواں میں چار شمارے شائع کرنا محال ہے۔ اس لیے فیصلہ کیا گیا ہے کہ اگلے شمارے کی ضخامت دگنی کر دی جائے، تاکہ خریداروں کو نقصان نہ رہے۔ آئندہ سال بسال چار شمارے جنوری، اپریل، جولائی، اکتوبر میں باقاعدگی سے شائع ہوتے رہیں گے۔ سال میں کم و بیش ۶۰۰ صفحات پیش کرنے کا ارادہ ہے۔

وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيْم

مالک رام

علی جواد زیدی

# نعت نگاری اترپردیش میں

نعت کے لغوی معنی تعریف و توصیف کے ہیں، لیکن اصطلاح میں اس کا استعمال حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح کے لیے مخصوص ہو گیا ہے۔ کچھ یہی صورت لفظِ منقبت کی بھی ہے۔ اگرچہ لغت میں اس کے معنی بھی "ہنر" اور "ستودگی" کے درج ہیں، لیکن اصطلاحی طور پر یہ لفظ اہلِ بیتِ رسول علیہم السّلام اور صحابۂ کبار رضوان اللہ علیہم کے محامد و ثنا کے لیے وقف ہو گیا ہے۔ بالکل ہی ابتدا میں فضائل، مناقب اور نعت کے الفاظ مترادفات کے طور پر استعمال ہوتے رہے ہیں۔ چنانچہ احادیث کی اکثر کتابوں میں بلکہ 'صحاح' تک میں فضائلِ رسولؐ "کتاب الفضائل" (صحیح مسلم) اور "کتاب المناقب القریش" (صحیح بخاری) کے تحت درج ہوئے ہیں۔ عربی میں 'نعت' عام تعریف کے معنوں میں بعد کو مستعمل ہوتا رہا ہے اور اس کا استعمال کئی طرح سے کیا جاتا رہا ہے۔ اردو اور فارسی میں بھی کئی قصائد کے عنوانوں پر "قصیدہ در منقبتِ رسولؐ" کی طرح کی عبارت بھی پائی جاتی ہے۔ یہ صورت ماضیِ قریب تک قائم تھی۔ چنانچہ مفتی غلام حسین علوی رام پوری نے لفظِ نعت کو اہلِ بیت اور صحابہ کی مدح کے لیے بھی استعمال کیا ہے:

حمد ایزد واجب است و ہم درود مصطفیٰ
نعت آل پاک و ہم یاران آں خیر الوریٰ

لیکن آجکل ایسا استعمال مستثنیات کی حیثیت رکھتا ہے۔ علی العموم نعت سے پیغمبر کی اور منقبت سے ائمہ و صحابہ کی مدح مراد لی جاتی ہے۔ بعض شعرا کی بے احتیاطیوں سے قطع نظر نعت اب بالاتفاق آنحضرتؐ کی مدح کے لیے مخصوص ہے۔

نعت نگاری کی روایت آغازِ اسلام ہی سے شروع ہوتی ہے، لیکن عروضیوں نے نعت کو مستقل صنفِ سخن تسلیم نہیں کیا۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی ابتدا عربی شاعری کی مشہور اور مسلّم صنف قصیدے کی شکل میں ہوئی۔

یہاں ہم قرآن کریم کو اس لیے بحث میں نہیں لاتے کہ ہماری گفتگو شاعری تک محدود ہے۔ ورنہ کلام پاک میں متعدد ایسی آیتیں موجود ہیں جن پر نعتِ رسولؐ کا اطلاق ہو سکتا ہے مثلاً

(۱) اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا[۱]

(۲) وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ[۲]

(۳) يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ[۳]

یوں تو نعت، نثر اور نظم دونوں ہی میں موجود ہے لیکن نثر میں جو محامدِ رسولؐ لکھے گئے ہیں اُن پر نعت کا اطلاق کبھی نہیں ہوا۔ اگر ایسا ہوتا تو سیرت اور تاریخ اسلام کا ایک اہم حصّہ نعت ہی شمار ہوتا۔ اس لیے، رواجاً نعتیہ ادب کی گفتگو نظم ہی تک محدود رہی ہے۔ اس مضمون میں بھی اسی پابندی کا خیال رکھا گیا ہے۔

یہ یقینی ہے کہ نعت سب سے پہلے عربی میں کہی گئی اور اس کی نوعیت قصیدے کی تھی۔ ابتدائی نعت گویوں میں تین افراد تو خانوادۂ ہاشمی ہی سے تعلق رکھتے تھے۔ حضرت حمزہ بن عبدالمطلب، حضرت ابوطالب، حضرت علی مرتضیٰ۔ ان حضرات کے کچھ نعتیہ اشعار سیرتِ رسولؐ قدیم کتابوں مثلاً ابنِ ہشام اور طبقاتِ ابن سعد میں درج ہیں لیکن ان میں سے اکثر کا انتساب شک و شبہے بالا نہیں ہے۔ ابتدائے اسلام کے شعرا میں حسان بن ثابت، عبداللہ بن رواحہ اور کعب ابن زہیر کے

---

۱۔ الاحزاب، ۳۳: ۴۵۔ ۴۶۔ ۲۔ الانبیاء، ۲۱: ۱۰۷
۳۔ المزمل، ۷۳: ۱

نام نمایاں ہیں۔ بالخصوص کعب ابن زہیر (م ۲۴ھ) کا قصیدہ "بانت سعاد" کو الگ اہمیت کا حاصل ہے۔ جب اس نے مخالفت سے توبہ کی تو یہ قصیدہ نذرانۂ عقیدت کے طور پر پیش کر کے حضرت رسولؐ میں حاضر ہوا، اس پر خوش ہو کر آنحضرتؐ نے کعب کو چادر مبارک عطا فرمائی۔

اس نعت کو تاریخ ادب میں 'نعت' نہیں بلکہ قصیدہ کا نام دیا گیا۔ نعت کی روایت عربی سے فارسی میں منتقل ہوئی۔ فارسی میں بھی سعدی، حافظ، جامی، نظامی، قاآنی، خاقانی اور عرفی جیسے اہم شاعر نعت گویوں کی صف میں نظر آتے ہیں۔ لیکن ان کے نعتیہ کلام کا بھی بیشتر حصہ قصائد ہی کی شکل میں ملتا ہے۔ نعت نگاری کو ایک مستقل ادبی صنف کا مرتبہ دلانے میں جامی کی متغزلانہ نعتوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ اُن کی نعتوں میں عشق و وارفتگی کا سوز و گداز بھی ہے اور معنوی اور فنی جمال و جلال بھی۔

عربی اور فارسی میں بیشتر نعتیں قصیدوں کے سانچے میں ملتی ہیں۔ باعتبارِ مضامین قصائد کی کئی قسمیں کی جا سکتی ہیں، عشقیہ، فخریہ، نعتیہ، مدحیہ، فلسفیہ، فقہیہ، رثائیہ، ہجویہ وغیرہ۔ بعد کو جن چند اقسام نے علیحدہ اصنافِ سخن کی شکل اختیار کی انھیں میں نعتیہ قصائد بھی ہیں، اس لیے فارسی ہو یا اردو، نعت کے ذخائر کی تلاش میں قصائد سے قطع نظر کرنا ممکن نہیں ہے۔

قصائد کے علاوہ منظوم کتابوں اور مثنویوں کے خطبات کے جزوِ لازم کی حیثیت سے بھی نعت امتیاز رکھتی ہے۔ اردو میں یہ روایت بھی فارسی سے آئی ہے۔ اگر فارسی میں دقیقی جیسے غیر مسلم شاعر سے نعت کا شعر منسوب ہے تو اردو میں بھی دیا شنکر نسیم لکھنوی کی مثال موجود ہے۔

اس روایتی نعت میں جذباتی گہرائی علی العموم مفقود ہے۔

نعت ہی کی ایک شکل 'معراج نامہ' بھی ہے۔ اردو میں کئی 'معراج نامے' نظم اور نثر میں لکھے گئے ہیں۔ انھیں فی الحقیقت نعت ہی سمجھنا چاہیے۔ دکن میں بلاقی، مختار، نصرتی اور ولی ویلوری وغیرہ کے معراج ناموں، دلّی میں میر قدرت اللہ قاسم کی "حقائق معراج" (جو پانچ سو اشعار پر مشتمل ہے) اور اتر پردیش میں میر مظفر حسین ضمیر لکھنوی کی "ریحانِ معراج"، اور سید معشوق حسین اطہر ہاپوڑی کی مثنوی "لیلۃ الاسریٰ" کو مثالاً پیش کیا جا سکتا ہے۔

نعت ہی کے ضمن میں معجزات و غزوات نبیؐ بھی آتے ہیں۔ مثلاً مولوی سعید الدین سعید مشتاق

بنارسی کی سیرت پاک منظوم، غلام امام شہید کی نعتیہ مثنوی، میر احمد علی رسا کی کتاب "معجزۂ نبوی"، عبدالصمد تپش کی "شمائل النبی"، ولی دہلوری کی "روضۃ الانوار" اور یعقوب علی نصرت کی غزوات نبوی سے متعلق مثنوی۔ مناجات اور میلاد وغیرہ کو بھی نعت کے احاطے سے باہر نہیں سمجھا جا سکتا۔ مولوی حفیظ اللہ بندہ بدایونی (م ۱۲۷۷ھ) نے ایک مثنوی میلادِ رسول میں نظم کی تھی۔[۴]

اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے، تو ہمارے ادب میں نعت کا ایک اتھاہ خزانہ ہے، لیکن نہ عروضیوں نے اسے مخصوص صنف کا درجہ دیا نہ تذکرہ نگاروں نے اس کا علیحدہ ذکر ضروری سمجھا۔ غالباً میر حسن اور میر قدرت قاسم نے پہلی بار کسی شاعر کی نعت نگاری کا ضمنی تذکرہ کیا ہے وہ بھی اس طرح کہ قاسم نے ہدایت کا ذکر کرتے ہوئے اُن کے اس نعتیہ شعر کا حوالہ دیا ہے:[۵]

اے عالمِ امکاں کو شرف ذات سے تیری
اے تیرے سوا کون مکیں کون و مکاں کا

میر حسن نے عہدِ محمد شاہی کے امیر جعفر علی خاں کی ایک مثنوی سے 'نعتِ رسولؐ' اور منقبت علیؓ کے بھی کچھ اقتباسات پیش کیے ہیں[۶]

تذکروں میں نعت کی بہ نسبت منقبت کا ذکر زیادہ آیا ہے۔ میر حسن نے میر سعادت علی سعادت امروہوی، میاں نذر علی گمان دہلوی ثم فیض آبادی، میاں میرن سبزواری دہلوی ثم لکھنوی، اعلیٰ علی اعلا، اور میر عزت اللہ بیدل کی منقبت گوئی کا ذکر کیا ہے۔ اعظم الدولہ سرور، اشک رامپوری کی منقبت نگاری کا ذکر کرتے ہیں۔ میر حسن نے منقبت و مدح کے الفاظ مترادفات کے طور پر استعمال کیے ہیں۔[۷] اعلیٰ علی کے ذکر میں منقبت و معجزہ کا ذکر الگ کیا ہے۔ لکھتے ہیں:[۸]

"منقبت و مرثیہ نیز می گوید و معجزات ہم از فکر او در منقبت مشہور است۔ چنانچہ

---

۴۔ انتخاب یادگار: ۴۷

۵۔ مجموعہ نغز ۲: ۸۱ ۳

۶۔ تذکرۂ شعرائے اردو: ۴۰ ۔ ۴۱ ۔ ۴۱

۷۔ ایضاً: ۲۰۰

۸۔ تذکرۂ شعرائے اردو: ۲۰

# نعت نگاری اتر پردیش میں

"اکثر گدایان و نقشبندان می خوانند"

قاسم نے حیدری مسبز داشتہ کی منقبت کے علاوہ مولوی محمد احمد مختار دہلوی کی منقبت کا بھی ذکر کیا ہے۔ تجزیہ یہی بتاتا ہے کہ منقبت نگار علی العموم نعت بھی ضرور لکھتے ہیں۔ چھان بین کی جائے تو پتا چلے گا کہ منقبت نگار نعت نگاری بھی تھے۔

پرانے تذکرہ نویسوں میں اعظم الدولہ سرور کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ انھوں نے غزل اور مثنوی کے علاوہ دوسرے اصناف کا ذکر بھی اکثر و بیشتر کیا ہے۔ فطری طور سے جا بجا 'نعت' کا بھی ذکر آیا ہے، لیکن منقبت کے مقابلے میں کم۔ اگر میرے اس اندازے کو نظر میں رکھا جائے کہ اکثر صورتوں میں منقبت میں نعت بھی شامل رہی ہے، تو سرور کے وقت تک بنیادی مواد کے اشارے ملنے لگینگے۔ لیکن یہ بات خود تحقیق طلب ہے، اس لیے اس پر زیادہ گفتگو بھی مناسب نہیں ہے۔ 'نعت' کا علیحدہ ذکر اور زرا زیادہ تواتر کے ساتھ ہمیں "تذکرہ فضیحم" ہی میں ملتا ہے۔

تذکروں میں نعت نویسوں کا ذکر نہ ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ شروع میں نعتیں لکھی ہی نہیں گئیں۔ اردو ادب کا ایسا کوئی دور نہیں ہے جب نعتیں نہ لکھی گئی ہوں۔ تذکروں کے صفحات اس ذکر سے اس لیے خالی رہ گئے ہونگے کہ ابتدا میں نعت کو الگ صنفِ ادب کا مرتبہ نہیں ملا تھا۔ اگر دواوین وغیرہ کی ورق گردانی کی جائے تو واضح ہوگا کہ جب دکن میں دوسرے اصنافِ سخن نے ادبی مرتبہ حاصل کیا، تو نعت بھی لکھی جا رہی تھی۔ وہاں سید محمد فراقی بیجاپوری، خواجہ بندہ نواز گیسو دراز، محمد قلی قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ، قاضی محمود بحری، سراج اورنگ آبادی اور ولی دکنی وغیرہ کی نعتیں مل جاتی ہیں۔ دلی میں حاتم، سودا، میر محمدی بیدار وغیرہ کا نعتیہ کلام موجود ہے اور لکھنؤ اور اتر پردیش کے دوسرے اضلاع میں تو جب سے اودھ کی بساط جمنے لگی، مثلاً مصحفی، اور حسرت وغیرہ کی رہنمائی میں تقریباً سبھوں نے نعتیں لکھی ہیں۔ ایسا مثنوی نگار، قصیدہ نگار، غزل گو یا مرثیہ گو شاذ ہی ملیگا جس کے قلم نے دربار رسالت پر جبیں سائی نہ کی ہو۔

ان معلومات کی روشنی میں یہ بات واضح طور سے ابھرتی ہے کہ ہمارا ذخیرۂ نعت بہت وسیع ہے۔ لیکن اس سارے مجموعے کو ایک مخصوص صنفِ سخن کا رتبہ دے دینا آسان نہیں ہے۔ ایک

۱۔ مجموعۂ نغز، ۲: ۱۲۵ ؛ یادگارِ شعرا: ۲۰۱ ۔ ۱۔ ایضاً، ۲: ۱۱۶

طرف قصیدہ نگاری کی مشاعیاں اور شکوہِ بیان ہے، دوسری طرف مثنوی نگاروں کا رسمی بیانیہ انداز، اور تیسری طرف خلوص و عقیدت کا وہ رعب ہے جسے صرف والہانہ عشق سے تعبیر کیا جاسکتا ہے اور جو ادب میں غزل کا لباس اختیار کرکے شانِ نبوت کا پر تو بشر محبوبیت کے آئینے میں دیکھتا ہے۔ اس پھیلے ہوئے سمندر کو کسی رسمی پیمانے سے ناپنا ممکن نہیں ہے، تمام نعت کا موضوع ایک سہی، لیکن بنیادی معیار پر تیار کی ہوئی، نعتیہ عمارتوں کے نقشے ایک دوسرے سے اتنے مختلف ہیں کہ ادبی تنقید کسی ایک نقطے پر جم نہیں سکتی۔

اگر مزید تفتیش کی جائے تو پتا چلیگا کہ خاص خاص ادوار میں اور ہندستان کے خاص خاص خطوں میں نعتیہ ادب کی تخلیق زیادہ ہوئی ہے۔ اس میں غالباً مقامی یا جماعتی معتقدات کا بھی خاصا اثر ہے، بالخصوص محافلِ سماع و میلاد خوانی سے نعتیہ ادب کو بہت سہارا ملا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں سماع پر روک ٹوک نہیں تھی وہاں نعتیہ ادب خوب پھلا پھولا۔

ظاہر ہے کہ قصیدہ، مثنوی اور غزل میں جو نعتیں لکھی گئی ہیں انھیں کسی ایک ادبی صنف کے رشتے میں پرویا نہیں جاسکتا۔ غالباً قدیم تذکرہ نگار اس وجہ سے بھی نعت کا علیحدہ ذکر نہ کر سکے۔

جب شعرا نے نعتیہ طرز کی غزلیں یا مولود شریف وغیرہ کے لیے مستقل نعتیں لکھنا شروع کیں، تو رفتہ رفتہ نعت ایک ادبی صنفِ سخن کا مرتبہ بھی پا گئی، کیونکہ نعتیہ غزلیں نہ تو قصیدہ تھیں نہ مثنوی، نہ غزل۔ وہ صرف نعتیہ غزلیں تھیں اور ان کو نعت کے علاوہ کسی اور صنفِ سخن کا نام نہیں دیا جاسکتا تھا۔ ان نعتیہ غزلوں اور دوسرے نعتیہ ادب کے مابین کوئی مستحکم خطِ فاصل نہ تھا، نہ اب ہے۔ قصیدوں وغیرہ میں جو نعتیں لکھی جارہی تھیں، وہ بھی اسی عام اصطلاح کے تحت آتی تھیں۔ اس لیے دوسرے اصناف کا نعتیہ کلام بھی نعت کہا جاتا رہا ہے۔ غرض کہ دوسرے اصناف کو نظر میں رکھے بغیر نعت پر سیر حاصل گفتگو نہیں ہو سکتی۔

اردو میں نعتیں رباعی بھی گئی ہیں بلکہ بہت سے شاعروں نے تو پورے کے پورے دیوان مرتب کیے ہیں۔ اگر مثنویوں اور معراج ناموں کو چھوڑ بھی دیا جائے، تو نعتیہ غزلوں اور قصیدوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ بدقسمتی سے ہماری تنقید اور ادب کی تاریخ ابھی تک بیشتر غزل ہی کے محور پر گردش کرتی رہی ہے۔ ادھر کچھ دنوں سے مرثیہ، قصیدہ، رباعی اور مثنوی پر تو پھر بھی کچھ

کام ہوا ہے، لیکن نعت و منقبت کا میدان اب بھی ایک صحرائے بے آب و گیاہ کا منظر پیش کرتا ہے۔ محققین کو اس پر بھی توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

نعت کی بنیاد مذہبی عقیدت اور روحانی خلوص پر ہے، اس لیے نعت کہنے والوں کی صف میں شاعر اور متشاعر سبھی طرح کے لوگ مل جاتے ہیں۔ ہر نعت کا ادبی مرتبہ لازمی طور سے بلند نہیں ہے۔ بعض نعت گو شعرا تو فنی اور معنوی معائب کی پرواہی نہیں کرتے۔ اس سلسلے میں پرکھ اور چھان بین کی ضرورت ہے۔ یہ کوشش بے سود نہیں ہوگی بلکہ نعتیہ ادب کا قیمتی سرمایہ ضائع ہونے سے بچ جائیگا۔

میں آج کل اتر پردیش کے ادیبوں اور شاعروں کی ایک فہرست مرتب کر رہا ہوں، یہ سلسلہ کئی برس سے جاری ہے۔ میں نے اس ضمن میں نثر نگاروں، قصیدہ نگاروں، مثنوی نویسوں اور نعت گویوں وغیرہ کی فہرستیں بھی الگ الگ مرتب کرلی ہیں۔ ان میں سے، نعتیہ شعراء کی فہرست پر اس مضمون کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ یہ دعویٰ تو نہیں کیا جاسکتا کہ یہ فہرست جامع و مانع ہے۔ تاہم وہ معلومات جو تذکروں، تاریخ کی کتابوں، دیوانوں، شعری مجموعوں اور رسالوں میں بکھرے پڑے تھے، انھیں یکجا کرنے کی کوشش ضروری کی گئی ہے۔ ان میں کچھ معلومات ذاتی بھی ہیں، کچھ دوستوں کا عطیہ ہیں۔ گمان نہیں بلکہ یقین ہے کہ اگر مزید تحقیق و تفتیش کی جائے تو ابھی اور کئی نام مل جائینگے۔

اس فہرست میں کچھ نعت نگار ایسے بھی ہیں جن کا ذکر قصیدہ نگاری کی فہرست میں بھی آیا ہے کہ انھوں نے قصائد کے علاوہ نعتیں بھی کہی ہیں، اس لیے اُن کا ذکر دونوں جگہ آنا ناگزیر تھا۔ لیکن جن شعرا کی نعتیں صرف قصائد تک محدود ہیں اُن کا ذکر قصیدہ نگاروں ہی کے ضمن میں کیا گیا ہے۔ ان قصیدہ نگاروں میں ایسے شعرا بھی شامل ہیں جنھوں نے کئی نعتیہ قصیدے لکھے ہیں۔ مثال کے طور پر منیر شکوہ آبادی، صفی لکھنوی، عزیز لکھنوی، محشر لکھنوی، آرزو لکھنوی، بیدل الہ آبادی، ضامن الہ آبادی، سہیل اعظم گڑھی، قیس زنگی پوری وغیرہ کے نام پیش کیے جاسکتے ہیں۔ صرف عزیز لکھنوی ہی کو لیجیے، اُن کے دیوانِ قصائد "صحیفۂ ولا" میں حسب ذیل عنوانات کے نعتیہ قصائد موجود ہیں:

(۱) قصیدۂ بہاریہ نور رندر در مکالمہ حسن وعشق و تخلص بہ نعت سرور کائنات بہ پیرایہ تغزل موسومہ "حسن و عشق"

(۲) قصیدہ در جوشِ موسمِ آمدی دبستے از حالاتِ ولادتِ انسانِ کمل عین العالم حقیقت الحقائق مرآۃ الصفا، محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ موسومہ "بہارِ ربیع"

(۳) قصیدۂ معراجیہ در نعت

(۴) قصیدۂ نوید بعثت

(۵) قصیدۂ مرحبا شب جرا

(۶) قصیدۂ نور ہدایت

(۷) قصیدۂ شمع رسالت

(۸) قصیدۂ مرآۃ الصفا

(۹) قصیدۂ شارع الاسلام

اگر ایسے قصیدہ نگاروں کا شمار بھی نعت گویوں کے ضمن میں کر لیا جائے ــــ اور کوئی وجہ نہیں ہے کہ کیوں نہ کیا جائے ــــ تو نعت گویوں کی تعداد یقیناً بہت زیادہ ہو جائیگی۔ بہر حال میں نے ایسے قصیدہ نگاروں کا ذکر نعت گویوں میں نہیں کیا، جنھوں نے صرف قصیدوں میں نعتیں کہی ہیں۔

وہ مثنویاں بھی اس گفتگو کے دائرے سے باہر ہیں جن کے آغاز میں حمد و منقبت و مدح کے ساتھ ساتھ رسماً اور رواجاً نعت بھی شامل کر لی گئی ہے۔ اتر پردیش کے مثنوی نگاروں کی فہرست بہت طویل ہے۔ ساڑھے تین سو کے قریب مثنوی نگار ہوں گے اور مثنویوں کی تعداد تو یقیناً کوئی پانچ سو کے قریب ہو گی۔ ان میں سے بیشتر ایسی ہیں جن کی ابتدا رواجِ عام کے مطابق حمد و نعت سے کی گئی ہے۔ اسی طرح اکثر مدحیہ قصائد میں بھی مثنوی کی طرز پر حمد و نعت کا بیان ہوتا تھا شعرائے رام پور میں کچھ شاعروں نے والی ریاست کی مدح میں جو قصیدے لکھے ہیں، ان میں حمد و نعت کا بھی التزام رکھا ہے۔

اتر پردیش کے نعت نگاروں کی اس فہرست میں ان شعراء کو شامل کیا گیا ہے جو یا تو اتر پردیش میں پلے اور بڑھے ہیں، یا دوسرے مقامات سے آکر اتر پردیش کے دو یا دوں سرکاروں سے

وابستہ رہے ہیں، یا پیدائش اور پرورش تو باہر کی ہے، لیکن اتر پردیش میں آباد ہو گئے ہیں۔ میں نے حتی الوسع ماخذ کی نشاندہی کر دی ہے۔ کچھ باتیں ذاتی معلومات پر بھی مبنی ہیں، مثلاً امروہہ کے کئی لغت نویسوں سے متعلق جناب ظل عباس عباسی نے بتایا۔ کچھ نام میرے ذاتی علم میں تھے۔
جہاں تک ممکن ہوا ہے سالِ ولادت یا سالِ وفات یا دونوں سنین دے دیے ہیں، جہاں یہ نہیں مل سکے، وہاں کوئی ایسا اشارہ کر دیا ہے جس سے تعین زمانہ میں آسانی ہو۔ پھر بھی کچھ نام ایسے رہ گئے ہیں جن کے بارے میں ناموں کے علاوہ کچھ بھی معلوم نہیں۔ یہ کمی محققین پوری کر لینگے۔

یہاں آپ کو ۲۲۷ لغت نگاروں کے نام ملینگے۔ اگر اس فہرست میں عام مثنوی نگاروں یا تبرکاً دو ایک نعتیہ غزلیں لکھنے والوں اور خالص قصیدہ گویوں کو بھی شامل کر لیا جائے تو تعداد پانچ سو کے قریب پہنچ جائیگی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر صرف اتر پردیش ہی میں اتنے لغت نگار ہوئے ہیں، تو پورے ہندستان میں کتنے ہونگے۔ یہ نہ بھولنا چاہیے کہ اتر پردیش کے علاوہ، دلّی، دکن اور پنجاب بھی لغت کے تین بڑے مرکز رہے ہیں اور تذکروں کے صفحات اُن کے ذکر سے خالی نہیں ہیں۔

جن ۲۲۷ لغت نگاروں کا نام میری مرتب کی ہوئی فہرست میں آیا ہے، اُن کا تعلق لکھنؤ، رام پور، بریلی، بدایوں، اکبر آباد، پلاس پور، میرٹھ، ہاپوڑ، شاہجہاں پور، امروہہ، کاکوری، پیلی بھیت، مراد آباد، خیر آباد، کڑا مانک پور، الہ آباد، بلیا، کالپی، متھرا، اناؤ، کنتور، فرخ آباد، اعظم گڑھ، جونپور، کچھ ایوں، سہارن پور، گڑھ مکتیشر، مبارکپور، مارہرہ، غازی پور، بنارس، اُدن، گونڈہ، موہان، مظفر نگر، سلون، (رائے بریلی) ملیح آباد، دلکھنئو، بارہ بنکی، محمد آباد (اعظم گڑھ) جوالا پور، رائے بریلی، چریا کوٹ (اعظم گڑھ) نگینہ (بجنور) سندیلہ، (ہردوئی) صفی پور (اناؤ)، کیسر بھون (بلند شہر)۔ پرتاب گڑھ، گلاوٹھی، اٹاوہ، نارہ، کانپور، سیہورا اور بستی وغیرہ شہروں اور قصبوں سے ہے۔ یہ گمان ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ تلاش سے اتر پردیش کے دوسرے شہروں اور قصبوں میں، بلکہ بہت سے گاؤں میں بھی لغت نگار مل جائیں گے۔

# نعت نگاری اتر پردیش میں

اتر پردیش میں نعت گویوں کے سب سے بڑے مراکز علی الترتیب لکھنؤ، امروہہ، رام پور، بریلی، اور بدایوں ہیں، اکبرآباد، سہارن پور، میرٹھ، اعظم گڑھ، الہ آباد، مرادآباد اور بنارس کے نام ان کے بعد آتے ہیں۔

نعت کے میدان میں مسلمان ہی نہیں، بلکہ ہندو شعراء نے بھی جولانیِ طبع دکھائی ہے، اس سلسلے درگا سہائے سرور جہان آبادی، منشی راج بہادر سریواستو زخمی، منشی سالک رام سالک، سکھدیو پرشاد بسمل، ہربھودیال عاشق، منشی روپ کشور جلیبی ناتمی، راجیندر بہادر موج، شو پرشاد وہبی اور رام کرشن مضطر لکھوڑوی کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ دتو رام کوثری نے بہت سی نعتیں لکھی ہیں، لیکن ان کے بارے میں روایت یہ ہے کہ انھوں نے بعد کو مذہب تبدیل کر لیا تھا، بہرحال یہ یقینی ہے کہ انھوں نے نعتیں تبدیل مذہب سے پہلے بھی لکھیں تھیں۔ ناتمی ہر غزل میں ایک نعتیہ مطلع ضرور لکھتے تھے۔

اتر پردیش کے نعت گو شعراء کی صف میں کئی طبقہ خیال کے لوگ ہیں۔ وہ بھی جو نعت کو والہانہ محبت اور مجذوبانہ عقیدت کے اظہار کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور وہ بھی جو حدیث و قرآن کی روشنی میں شاعری کرتے ہیں۔ ایسے نعت گو بھی ہیں جو نعت گوئی میں صنائع و بدائع کا استعمال اور اپنی فنی صلاحیتوں کا اظہار کرتے ہیں اور ایسے بھی، جو عقیدت کے جوش میں فن کا خیال نہیں رکھتے۔ ان میں عالم و فاضل، زاہد و صوفی کے دوش بدوش آپ کو کم علم اور آزاد منش حضرات بھی ملیں گے۔ جیسی شاعر کی ہمت ہوتی ہے ویسی ہی اس کی فکر، اس لیے دوسرے اصنافِ سخن کی طرح نعت میں بھی پست و بلند بہت ہے۔

(۲)

نعتیہ ادب پر تفصیلی تنقید کا یہ محل نہیں ہے لیکن اس طرف دھیان دینے کی ضرورت ہے کہ اس شعبۂ ادب میں آہنگوں کا اختلاف خصوصیت سے نمایاں ہے۔ ایک طرف محسن کاکوروی کی نعتیں ہیں جن میں علم کا طنطنہ اور لفظوں کا شکوہ ہے مثلاً

دنیا میں ایسی بنا کر صورتیں آدم سے تا عیسیٰ  
تب آیا راست نقشہ کلکِ قدرت سے ترے قد کا

کھینچی پہلے تری تصویر ازل میں دستِ قدرت نے  
ہُوا نقاش خود سے اشتیاق اوّل ترے خد کا

باغِ تنزیہ میں سرسبز نہالِ تشبیہ | انبیا جس کی ہیں شاخیں، عرفا ہیں کوپل
گلِ خوشرنگ، رسولِ مدنی عربی | زیبِ دامانِ ابد، طرۂ دستارِ ازل
اوجِ رفعت کا قمر، نخلِ دو عالم کا ثمر | بحرِ وحدت کا گہر، چشمۂ کثرت کا کنول

دوسری طرف رضوان مرادآبادی کا یہ آہنگ ہے:

اترائیں نگاہیں جو پڑیں سوئے محمدؐ | دل لوٹ گیا دیکھتے ہی روئے محمد

اور لطف بریلوی کا شعر:

گیسوے احمد کا شیدائی ہے ہر فرزانہ آج | عقلِ کل کو کہتا ہے دیوانہ، ہر دیوانہ آج

آنحضرتؐ کے زلف و رخ کے یہ پرستار، جلالِ رسالت سے زیادہ جمالِ شخصیت کے پروانے ہیں، ایسے نعتیہ اشعار بکثرت ملتے ہیں۔ ان پر ہندوستان کی معاصر زبانوں کے بھگتی ادب کی چھاپ ہے اور اس پہلو پر سنجیدگی سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی سے ایک گوشہ یہ بھی نکلا کہ بعض نعت نگار عام غزلوں کے طرز کے نعتیہ شعر بھی نظم کرنے لگے، مثلاً رؤف امروہوی کا شعر ہے:

سنبل سے نہیں اُن کی زلفِ خمدار سے باتیں ہوتی ہیں
وہ پھول جہاں رکھ لیتا ہوں، رخسار سے باتیں ہوتی ہیں

شبیر امروہوی نے نعت میں مزاح کی چاشنی شامل کی اور عباس مبارک پوری نے غیر منقوط نعت کہہ ڈالی:

ملک و ملک حور کا سردار محمدؐ | واللہ دو عالم کا مددگار محمدؐ

حبیب احمد صدیقی نے ہلکے رنگ میں تازہ تصورات بھی پیش کیے ہیں:

وہ اُس کی دعوتِ حق بینی و خدا ترسی | نویدِ امن و مسرت ہے انس و جاں کے لیے
وہ اس کا عزم چٹانوں میں ڈال دے جو شگاف | ہے درسِ تیشہ زنی ہمتِ جواں کے لیے

اس تنوع پر سیر حاصل بحث کی ضرورت ہے تاکہ نعت کے فکری عناصر ہماری گرفت میں آسکیں۔ نعت نگاروں کو جہاں یہ آزادی ہے کہ وہ جو چاہیں لکھ دیں، لوگ حسنِ عقیدت سے قبول کر ہی لینگے، وہیں ان کی مجبوری ہے کہ اُن پر گروہِ علما کی طرف سے مذہبی انحرافات کے الزام بھی عاید ہو سکتے ہیں۔ حالی سے لے کر موجودہ دور کے علما تک نے نعت نگاری پر مذہبی پابندیاں لگائی ہیں۔ کوئی تو یہ

مطالبہ کرتا ہے کہ وہی تعریف کی جائے، جو از روئے قرآن و حدیث ثابت ہو، کوئی اس بات پر ٹوکتا ہے کہ دوسرے انبیا کی کسرِ شان کا پہلو نہ نکلے، تیسرا قید لگا کرتا ہے کہ الوہیت کے لیے جو صفات مخصوص ہیں، اُن کو آنحضرتؐ کی ذاتِ گرامی سے وابستہ نہ کیا جائے۔ خالص شرعی حیثیت کیا ہے، اس کا فیصلہ کرنا اس لیے مشکل ہے کہ شاعری میں "الاعمال بالنیات" کی بات سو فی صدی صحیح ہے۔ اگر نیت، رسول کو اللہ سمجھنے یا دوسرے انبیاء کی تنقیص کی نہیں ہے، تو کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا میں تو اس حد تک جانے کو تیار ہوں کہ اگر کوئی شاعر اظہارِ عقیدت میں غلو کرتا یا شاعرانہ مبالغہ سے کام لیتا ہے۔ تب بھی اس کا کلام نعت کی حدود کے اندر ہی رہتا ہے۔ میرے نزدیک شاعر کو اجازتِ عام ہونا چاہیے کہ وہ جو چاہے کہے۔ البتہ خلوصِ نیت و حسنِ عقیدت شرط ہے۔

نعت کا وہ حصہ جس پر ہندوستان کے بھگتی ادب کی چھاپ ہے، بڑی ثقافتی اور ادبی اہمیت کا حامل ہے۔ عرفانِ رسول کی جذباتی گہرائی نعت کے اسی حصے میں آئی ہے۔ چونکہ رسولؐ خدا کے حبیب اور محبوب ہیں، اس لیے خدا پرست بھی ان سے محبت کرتا ہے۔ یہ محبت ان کی ذاتِ ستودہ صفات سے ہے۔ سراپائے رسول ہی نہیں بلکہ شخصیت کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو محبتِ رسول کے احاطے سے باہر ہو۔ محبوب کی کوئی ادا اور شان ایسی نہیں ہے، جس کا حسن کمال شاعروں نے ذاتِ محبوبِ کبریا میں نہ دیکھا ہو۔ یہ واقعہ تو بہت ہی نازک منزل ہے اور شاعروں کا افراط و تفریط میں مبتلا ہو جانا پیش پا افتادگی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس پر بھی علمار نے اعتراض کیے ہیں اور ادبی ناقدروں نے دہرائے ہیں میرے خیال میں یہ پرکھ خالص ادبی معیاروں پر مبنی ہونا چاہیے۔

اگرچہ نعتیہ قصائد کا ذکر میں نے قصائد کے تحت کیا ہے، لیکن نعت پر کوئی تبصرہ نعتیہ قصائد سے صرفِ نظر کر کے نہیں کیا جا سکتا۔ جو لوگ اس موضوع پر لکھیں، انھیں نعتیہ قصائد پر بھی تفصیلی گفتگو کرنا پڑے گی۔ اور نعتیہ مثنویوں اور دوسری مثنویوں اور غزلوں کے نعتیہ اشعار پر بھی ایک جھلکتی ہوئی نظر ضرور ڈالیں گے۔ یہ اشارہ اس موضوع پر آئندہ کام کرنے والوں کے لیے کر رہا ہوں۔

(۴)

ذیل میں حروفِ تہجی کی ترتیب کے ساتھ میں اتر پردیش کے نعت نگاروں کی فہرست پیش کر رہا ہوں۔ ناموں کے ساتھ شاعروں کے وطن اور قوسین میں سنین کا ذکر کر دیا ہے۔ حوالے حاشیے پر مختلف قسم کے قوسین میں دے گئے ہیں۔ جہاں کوئی حوالہ درج نہیں ہے، اس سے یہ سمجھا جائے کہ یہ میرے ذاتی معلومات پر مبنی ہے۔

۱۔ آشر، میرزا حسین علی خاں لکھنوی (ولادت قبل ۱۱۸۱ھ) "کلام از قسم منقبت پسندِ خاطر بود لہذا، بعد مشقِ شعرِ نعتیہ در گفتنِ مرثیہ و سلام سعادتِ ابدی پنداشتہ خود را مصروف ایں کار ساختہ" (ریاض الفصحا: ۳۲)

۲۔ آثم، حضور احمد خان بریلوی۔ (ولادت تقریباً ۱۲۷۴ھ) "نعت اکثر کہتے ہیں" (یادگارِ ضیغم: ۳۰۱)

۳۔ آثیم،، علم گڑھی۔ ایک نعت دیکھنے میں آئی (ارمغانِ نعت: ۱۷۲)

۴۔ احسان، محمد احسان بریلوی (ولادت تقریباً ۱۲۷۹ھ) "گاہ گاہ نعت شریف مولیانہ طور کہتے تھے" (یادگارِ ضیغم: ۴۰۱)

۵۔ احسن، سید علی احسن مارہروی (م ۱۹۴۰ء/ ۱۳۵۹ھ) ارمغان نعت میں ایک نعت درج ہے۔ اور نعتیں بھی لکھی ہیں (ارمغان نعت ۱۲۸)

۶۔ احمر، بدایونی۔ حالات معلوم نہیں "گلدستہ نعت" میں ایک نعت دیکھنے میں آئی (گلدستہ نعت: ۱۲۷)

۷۔ اختر، یونس خالدی لکھنوی (حیات ہیں) کچھ نعتیں کہی ہیں۔ ایک نعت "ارمغان نعت" میں بھی درج ہے۔ (ارمغان نعت: ۲۶۹)

۸۔ اختر، علیم اختر مظفر نگری (ولادت ۱۶ر جون، ۱۹۱۴ء) مجموعۂ نعت "انوار حرم" کے نام سے مرتب ہے اور عنقریب شائع ہونے جا رہا ہے

۹۔ اختر، انصاری اکبرآبادی (حیات) نے کئی نعتیہ قطعے کہے ہیں [گلدستہ نعت ۱۱۸]

۱۰۔ ادیب سہارن پوری۔ حالات معلوم نہ ہو سکے۔ ارمغان نعت میں ایک نعت درج ہے

[ارمغان نعت: ۱۶۸]

۱۱۔ آرزو، سید انوار حسین لکھنوی (۱۸۷۳ء۔ ۱۹۵۱ء) نعتیہ قصائد کے علاوہ کئی نعتیہ غزلیں بھی لکھی ہیں۔ ایک نعت "ارمغان نعت" میں بھی درج ہے۔ [ارمغان نعت ۱۶۸]

۱۲۔ آرزو سہارن پوری۔ حالات سے آگاہی نہ ہو سکی۔ "ارمغان نعت" میں ایک نعت درج ملی (ارمغان نعت: ۱۶۸)

۱۳۔ ارحم، محمد عبدالرحمٰن اکبر آبادی (حیات در ۱۳۰۴ھ) "نعت شریف کہتے ہیں" [یادگار ضیغم: ۴۸]

۱۴۔ اسلم محمد اسمٰعیل لکھنوی۔ (حیات ہیں) متعدد نعتیہ نظمیں لکھی ہیں جو اخبارات و رسائل میں وقتاً فوقتاً شایع ہوتی ہیں

۱۵۔ اسمٰعیل، مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی (۱۸۴۴ء۔ یکم نومبر ۱۹۱۷ء) کچھ نعتیہ نظمیں بھی لکھی ہیں اور اس میدان میں بھی ان کا انفرادی رنگ نمایاں ہے۔ ایک قصیدہ نما نعت کے کچھ اشعار یہ ہیں:

وہ فخرِ آدم، امانِ عالم — امین محکم، رسولِ اکرم

محیطِ اعظم، زغیبِ ملہم — بوحیِ محرم، بشرِ مسلم

عرب کے اندر وہی معظم — عجم کے اندر وہی مکرم

لگا کے آدم سے تا بہ ایندم — ظہور اُس کا ہے بعد آدم

وجود اُس کا مگر مقدم — وہ نورِ حق تھا لئے مجسم

کیا مدینے کو سبز و خرم — درودِ محمود بھیج پیہم

صلوٰۃ اس پر سلام اس پر

اور اُس کی سب آلِ باصفا پر

اور اُس کے اصحاب باوفا پر

اور اُس کے احبابِ اتقیا پر

۱۶۔ آسی، مولانا عبدالعلیم غازی پوری۔ (ولادت تقریباً ۱۲۵۴ھ) اُن کی نعتیں والہانہ عقیدت و عقیدت کا آئینہ ہیں۔ ان کا یہ شعر بہت مشہور ہے:

وہاں پہنچ کے یہ کہنا صبا سلام کے بعد — تمھارے نام کی رٹ ہے خدا کے نام کے بعد

[ارمغان نعت: ۱۱۴]

۱۷۔ آسی، عبدالباری الدّنی ثم لکھنوی (وفات ۱۹۴۶ء) اِن کا کچھ نعتیہ کلام موجود ہے۔ ایک نعت "ارمغان نعت" میں بھی شامل ہے (ارمغانِ نعت ۱۴۶)

۱۸۔ اسیر، سید مظفر علی لکھنوی (۱۲۲۹ھ۔ ۱۲۹۹ھ) اردو میں چھ دیوان ہیں۔ (۱) گلستان سخن (۲) ریاضِ مصنف (۳) دیوانِ اسیر (۴) دیوانِ حالیہ (۵) دیوانِ مناقب موسومہ "گلدستۂ امامت" (۶) دیوانِ قصائد اردو۔ چند مثنویاں جن میں "معارج الفضائل" "معجزاتِ ائمہ" میں ہے۔ انھوں نے نعتیہ کلام بھی لکھا تھا۔ فارسی نعت کا ایک شعر "انتخاب یادگار" سے نقل کیا جاتا ہے:

بشوقِ روضۂ تو چشم وقتِ نظارہ
رسید تا سر دیوار پیشتر ز نگاہ

(جلوۂ خضر: ۲۷:۱۲۷)

۱۹۔ اشفاق، حکیم محمد اشفاق خاں رام پوری (حیات در ۱۹۲۹ء) "نعتیہ نظم بھی لکھنے کا شوق ہے۔" تصانیف میں میلاد شریف رسول اللہ صلعم بھی ہے۔ (تذکرہ کاملان رام پور: ۳۴۶)

۲۰۔ اصغر، اصغر حسین گونڈوی (۱۸۸۴ء۔ ۱۹۳۶ء) انھوں نے غالباً ایک ہی نعت کہی ہے۔ (تذکرۂ کاملاں رام پور: ۳۴۶) تعداد اور قامت میں کہتر لیکن قیمت میں بہتر۔ "گلدستہ نعت" میں ان کی یہ نعت درج ہے۔ بقول پروفیسر رشید احمد صدیقی اصغر مرحوم کی شاعری میں نزہت دلنوازی کی جو فضا ہے وہ اُن کے شخصی تاثرات سے مل جل کر نعت میں جلوہ گر ہوئی ہے (گلدستہ نعت: ۲۵)

۲۱۔ اطہر، سید معشوق حسین ہاپوڑی۔ (۱۸۷۳ء۔ ۲۵ فروری ۱۹۵۷ء) نعت لکھتے تھے۔ شبِ معراج کے بیان میں ایک مثنوی "لیلۃ الاسرای" بھی لکھی ہے۔ (حاشیہ خمخانہ جاوید ۱: ۳۳۰)

۲۲۔ اطہر، قاضی اطہر مبارک پوری (حیات ہیں)۔ ارمغانِ نعت' میں ان کی بھی ایک نعت شامل ہے (ارمغانِ نعت: ۲۴۳)

۲۳۔ اظہر، محمد حفیظ اللہ شاہجہاں پوری (حیات در ۱۳۰۴ھ) "نعت اکثر کہتے ہیں" (یادگار ضیغم: ۶۴)

۲۴۔ افسر امروہوی۔ مزید معلومات فراہم نہ ہوسکیں، نعت گوئی کا ذکر ظلِّ عباس عباسی نے کیا۔

۲۵۔ افق، مولانا کاظم حسین امروہوی ــــ انھوں نے دواوینِ نعتیہ مرتب کیے ہیں (ظلّ عباس عباسی،

۲۶۔ اَفقر، موہانی مولانا ظفر وارثی (حیات ہیں)۔ کئی نعتیں لکھی ہیں۔ ایک "ارمغان نعت" میں بھی درج ہے (ارمغان نعت ۱۵۷)

۲۷۔ اکبر، خواجہ محمد اکبر وارثی میرٹھی۔ (شاگرد بیان یزدانی میرٹھی) اِن کا کلام عام طور سے میلاد کی مجلسوں میں پڑھا جاتا ہے (لکھنؤ کا دبستان شاعری: ۴۹۹) اِن کے کئی نعتیہ رسالے شائع ہو چکے ہیں۔ (قاضی عبدالودود) ایک مجموعے کا نام "میلادِ اکبر" ہے۔ ایک نعت "ارمغانِ نعت" میں بھی درج ہے۔ (ارمغان نعت: ۱۳۱) دوسری نعت "گلدستۂ نعت" میں دیکھی جا سکتی ہے (۶۷)

۲۸۔ اکمل، محمد اسحٰق مظفر نگری۔ (حیات ہیں) کئی نعتیں کہی ہیں۔ ایک نعت ارمغان نعت میں بھی ہے۔ (ارمغانِ نعت ۱۶۷)

۲۹۔ امیر، منشی امیر احمد مینائی کاکوروی ۱۶ر شعبان، ۱۲۴۴ھ۔ ۱۹ر جمادی الاخریٰ ۱۳۱۸ھ ر ۱۳ر اکتوبر، ۱۹۰۰ء) ایک دیوان موسوم بہ "محامدِ خاتم النبیین" چھپا ہے (جلوۂ خضر، ۲: ۲۷۷) آنحضرتؐ کے حالات میں "خیابانِ آفرینش" لکھی۔ دوسرا دیوان "مرآۃ الغیب" جو دراصل پہلا دیوان سمجھا جاتا ہے، نعتیہ دیوان اور مولود شریف کے ساتھ چھپا (مرآۃ الشعرا: ۲۲) "ارمغانِ نعت" اور "گلدستہ نعت" میں ایک ایک نعت منقول ہے۔ نمونۂ نعت:

سروِ خراماں، چہرہ گلستاں، جبہۂ تاباں، مہرِ درخشاں
سنبل پیچاں، زلفِ معنبر، صلی اللہ علیہ وسلم
یاد سے مملو ریشہ ریشہ، نعت امیرؔ! ہے اپنا پیشہ
وردِ ہمیشہ رہتا ہے لب پر، صلی اللہ علیہ وسلم

[ارمغان نعت ۱۰۳]

[گلدستۂ نعت ۶۱]

۳۰۔ آمین، محمد ابو مسلم آمین اعظم گڑھی۔ حالات معلوم نہیں "گلستانِ نعت" میں ایک نعت منقول ہے۔ (ص ۱۰۸)

۳۱۔ امین سلونوی (حیات ہیں) کئی نعتیں لکھی ہیں۔ کچھ بطور نظم کچھ بطرز غزل۔ لکھنؤ میں ایک نعتیہ مشاعرہ ہر سال بڑی دھوم دھام سے کرتے ہیں "ارمغانِ نعت" میں ایک نعت درج ہے۔ (ص ۱۶۵)

۳۲۔ انجم، منشی معراج النبی خاں امروہوی۔ نعت نگار ہیں۔ حالات معلوم نہیں ہوسکے (ظلِ عباس عباسی)

۳۳۔ انجم ملیح آبادی۔ ایک نعت "ارمغان نعت" میں نقل ہوئی ہے (ص: ۱۷۱)

۳۴۔ انشا، انشاء اللہ خاں دہلوی ثم لکھنوی (وفات ۱۸۱۸ء) کچھ نعتیں کہی ہیں۔ نعتیہ مخمس کا ایک بند درج ذیل ہے،

آپ خدا نے جب کہا صلِّ علیٰ محمدٍ — کیوں نہ کہیں پھر انبیا صلِّ علیٰ محمدٍ
عرش سے آتی ہے صدا: صلِّ علیٰ محمدٍ — نورِ جمالِ کبریا، صلِّ علیٰ محمدٍ
صلِّ علیٰ نبیّنا ، صلِّ علیٰ محمّدٍ (کلام انشا، ۳۷۵)

۳۵۔ انوار، مولانا انوار الحق بدایونی (۷ ۴ ۲ ۱ھ ۵ ار جمادی الاولیٰ، ۱۳۰۴ھ) نعت و منقبت لکھا کرتے تھے۔ آپ کا کلام "ماہِ تاباں" اور "اوج معرفت" وغیرہ میں بکثرت شائع ہوچکا ہے۔
[اکمل التاریخ، ۱: ۹۱]

۳۶۔ انور، مولانا انور صابری سہارن پوری (حیات ہیں) نعتیہ نظمیں اور غزلیں بکثرت لکھی ہیں۔ ایک نعت "ارمغان نعت" میں موجود ہے۔ (ص: ۱۶۴)

۳۷۔ انیق، حافظ محمد یعقوب جونپوری۔ آپ کا نعتیہ دیوان "دیوانِ انیق" چھپ چکا ہے۔
(تاریخ شیراز ہند، جونپور: ۲۷۴)

۳۸۔ اوج، مرزا محمد جعفر لکھنوی (وفات ۱۳۳۵ھ/۱۹۱۷ء) تصانیف میں "میلاد نامہ" بھی شامل ہے (دبستانِ دبیر: ۳۵۰)

۳۹۔ بدر، محمد مبین بریلوی۔ حالات معلوم نہیں۔ ایک نعت "ارمغان نعت" میں دیکھنے میں آئی۔ [ص: ۱۷۹]

۴۰۔ بدر، علامہ بدر جلالی مراد آبادی۔ حالات سے آگاہی نہیں۔ ایک نعت نظر سے گزری [گلدستۂ نعت]

۴۱۔ بدنام، عبد اللہ شاہ امروہوی۔ صاحبِ دواوین تھے۔ ان دواوین کا جزوِ اعظم حمد و نعت پر مشتمل ہے (ظلِ عباس عباسی)

۴۲۔ ترنم، مرزا عاشق حسین آفندی اکبر آبادی (۱۲۷۸ھ۔ ۲۳ مارچ ۱۹۵۳ء) ان کی تصنیف

"مولودِ معراج" کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ "مولودِ معراج" خواجہ حسن نظامی کی فرمائش پر کہی تھی اور انھیں کی فرمائش پر اسے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی درگاہ میں پڑھ کر سنایا تھا۔ خواجہ صاحب نے اس پر خوش ہو کر اِسی محفل میں انھیں "معراج الشعراء" کا خطاب دیا۔

(دبستانِ دبیر: ۶۶۴)

۴۳۔ برقی، عبداللہ خاں رام پوری۔ (حیات در ۱۲۹۰ھ) چالیس برس کی عمر سے نعت کہنے کا شوق ہے۔ . . . حضرت خواجہ ہر دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدّاحی کی بدولت مشتہر ہیں۔
نعت کے معیار کا اندازہ اس شعر سے کیا جا سکتا ہے:

خواب میں اک شب کو دکھلا دے رخِ پاکِ نبی
دیکھ لے یارب ہماری چشمِ گریاں کی طرف

[انتخاب یادگار: ۵۹]

۴۴۔ بسمل، منشی شاکر علی (غلام بسم اللہ) میرٹھی ثم بریلوی (شاگرد غالب) مذہب سے بہت دلچسپی تھی۔ دو بار حج کیا۔ حضرت شاہ عبدالرحمٰن سے بیعت تھے۔ اس لیے آخر میں نعت گوئی سے زیادہ شغف رہا۔ نعتوں کا مجموعہ "نالۂ بسمل" چھپ چکا ہے۔ (تلامذہ غالب: ۴۹)

(یادگار ضیغم: ۶۸)

۴۵۔ بسمل، منشی سکھدیو پرشاد الٰہ آبادی۔ (حیات ہیں) اِن کی نعتیں "ارمغانِ نعت" اور "گلدستۂ نعت" میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ (ارمغانِ نعت: ۱۷۶) (گلدستۂ نعت: ۱۳۱)

۴۶۔ بہزاد، لکھنوی (           ) اِن کی نعت نگاری مشہور ہے۔ نعتیہ مجموعے شایع ہو چکے ہیں۔ اِن کی چند نعتیں "گلدستۂ نعت" اور "ارمغانِ نعت" میں درج ہیں۔

[ارمغانِ نعت: ۱۷۴]

[گلدستۂ نعت: ۲۰۔۲۱ و ۵۴]

۴۷۔ بیان: (یزدانی) سید مرتضیٰ میرٹھی (ولادت ۱۸۵۰ء، ۱۹۰۸ء) آپ کی تصنیفات میں چھوٹا سا مجموعہ نعتیہ اور کچھ کلام عاشقانہ ہے (انتخاب زریں: ۱۳۹) آپ نے ایک مجموعہ نعت چھاپا تھا جب میں طالب علم تھا اس کو ایک نظر دیکھا تھا۔ خیال یہ ہے کہ اچھا مجموعہ تھا، لیکن

آج کہیں نہیں ملتا۔ مشہور یہی ہے کہ حضرت بیاں نعت خوب کہتے تھے۔ (مرآۃ الشعرا، ۲: ۱۴۱)
نعتیہ غزلیں "مرآۃ الشعرا" اور "ارمغان نعت" میں درج ہیں (ارمغان نعت: ۱۱۹)
۴۸۔ بیدار، منشی محمد فاضل خاں امروہوی۔ ان کی نعتوں کے کئی کتابچے موجود ہیں (ظل عباس عباسی)
۴۹۔ بیدل، مولوی عبدالسمیع رام پوری۔ (۱۲۷۰ھ / ۱۸۵۴ء میں طالب علم تھے) ان کا ایک نعتیہ دیوان اور ایک مختصر رسالہ "نور ایمان" کے نام سے موجود ہے۔ [تلامذہ غالب: ۵۲]
۵۰۔ بیدم، بیدم شاہ وارثی بارہ بنکوی۔ ( ) ان کی نعتیں مشہور اور قوالوں کی زبانوں پر ہیں۔ ایک نعت "ارمغان نعت" میں بھی موجود ہے۔ [ارمغان نعت: ۱۴۴]
۵۱۔ تپش، سید مدد علی اکبرآبادی۔ "ہدایت الانام" یہ منقبت چہاردہ معصومینؑ ان سے یادگار ہے۔ [تلامذہ غالب: ۶۰] چہاردہ معصومین کا سلسلہ آنحضرتؐ سے شروع ہوتا ہے۔ اس میں آنحضرتؐ اور حضرت فاطمہؓ کے علاوہ ائمہ اثنا عشر شامل ہیں۔ اس لیے اس مجموعۂ مناقب میں نعتِ مبارک کا ہونا یقینی ہے۔
۵۲۔ تسخیر، داروغہ واجد علی لکھنوی (شاگرد دبیر لکھنوی) میلاد ناموں کے موجد تھے (یہ دعویٰ محتاج ثبوت ہے)، راقم کئی میلاد نامے مسدس اور مثنوی کی شکل میں لکھے ہیں۔ (دبستان دبیر: ۳۰)
۵۳۔ تسکین، قریشی سیورو توی ثم میرٹھی (حیات ہیں) غزل گو ہیں، لیکن نعتیں بھی لکھی ہیں۔ ایک نعت "ارمغان نعت" میں بھی موجود ہے (ارمغان نعت: ۱۸۰)
۵۴۔ تمیز، میاں غلام احمد رام پوری (وفات ۳ جمادی الثانی ۱۳۱۷ھ) ایک دیوان عشقیہ اور ایک نعتیہ مرتب کیا [تذکرہ کاملان رام پور: ۸۳ ۲]
۵۵۔ ثاقب، بریلوی۔ حالات معلوم نہیں۔ نعت کا نمونہ "ارمغان نعت" میں دیکھا۔ (۱۸۳)
۵۶۔ جرأت، شیخ قلندر بخش لکھنوی (م ۱۲۲۵ھ) دیوان میں نعتیہ غزل موجود ہے ؎

محمد ہے نبی، ممدوح ذاتِ کبریائی کا ۔۔۔ کہے بندہ گر اس کی مدح، دعویٰ ہو خدائی کا

(ارمغان نعت: ۹۷)
۵۷۔ جرم، ابوالحسن خاں محمد آبادی (حیات ہیں، شاگرد آنند لکھنوی) نعتیہ قصائد کے علاوہ، نعتیہ غزلیں بھی لکھی ہیں۔ کچھ نعتیہ نظمیں بھی ہیں۔

۵۸۔ جگر، علی سکندر مرادآبادی (۱۸۹۰ء ۔ ۹ر ستمبر ۱۹۶۰ء) مشہور غزل گو ہیں، چند نعتیں بھی تیمناً کہی ہیں۔ ان میں سے کچھ "ارمغانِ نعت" اور گلدستہ نعت" میں درج ہیں۔ (گلدستہ نعت: ۱۸۔ ۱۹، ۱۰۷) (ارمغانِ نعت: ۱۴۹)

۵۹۔ جلیل، حافظ جلیل حسن مانک پوری (۱۲۸۳ھ ۔ یکم صفر ۱۳۶۵ھ)۔ نعتیہ دیوان معراج سخن شائع ہو چکا ہے۔ (حاشیہ خمخانہ جاوید، (قلمی)) "ارمغانِ نعت" میں بھی ایک نعت درج ہے جس کے دو شعر نقل کیے جاتے ہیں:

محمد نام ہے، تاج رسل ہے شاہ خوباں ہے | الٰہی عشق دے اُس کا مدینے کا جو سلطاں ہے
انیسِ بے کساں ہے، چارہ سازِ دردمنداں ہے | محمد قبلۂ ہر دو جہاں ہے، کعبۂ جاں ہے

(ارمغانِ نعت: ۱۱۲)

۶۰۔ جوش، شبیر حسن خاں ملیح آبادی (ولادت ۱۴ر دسمبر ۱۸۹۸ء) ابتدائی زمانے میں جوش نے کچھ نعتیہ نظمیں بھی کہی تھیں، لیکن یہ میدان ان کا نہیں ہے۔

۶۱۔ جوہر، مولانا محمد علی رام پوری (۱۸۷۸ء ۔ ۴ جنوری ۱۹۳۰ء) کچھ نعتیں کہی ہیں۔ اِن کے یہاں تغزل اور نعت کا بہت ہی سنبھلا ہوا امتزاج ہے۔

۶۲۔ حافظ، خلیل الدین حسن پیلی بھیتی (۵ رمضان ۱۲۹۸ھ/۲۴ر جون ۱۸۹۳ء ۔ ۶ر رجب ۱۳۴۸ھ ۹ر دسمبر ۱۹۲۶ء) "ہندوستان کے نعت گو شعرا میں آپ کا کلام بہت مشہور ہے ..... پانچ دیوان نعتیہ نظامی پریس، بدایوں سے شائع ہو چکے ہیں، چھٹا مرتب ہے۔ عاشقانہ شاعری چالیس برس سے ترک کر دی ہے۔" (انتخاب زریں: ۲۱۸)

۶۳۔ حافظ رام پوری۔ تفصیلات معلوم نہ ہو سکیں۔ ایک نعت "گلدستہ نعت" میں شامل ہے۔ (ص: ۹۷)

۶۴۔ حبیب، حبیب احمد صدیقی سیلم پاروی بجنوری (ولادت ۱۵ر جنوری ۱۹۰۸ء) کبھی کبھی تواتاً نعت کہہ لیتے ہیں، ایک نعت "ارمغانِ نعت" میں بھی نقل ہوئی ہے۔ (ص: ۱۹۱)

۶۵۔ حسرت، سید فضل الحسن موہانی (۱۸۷۵ء ۔ ۱۹۵۱ء) کچھ شگفتہ نعتیں کہی ہیں "ارمغانِ نعت" اور "گلدستۂ نعت" دونوں میں ان کی نعتیں درج ہیں (گلدستۂ نعت: ۵۲ و ۱۲۳) (ارمغانِ نعت: ۱۸۴)

۶۶۔ حسن، ابوالحسن لکھنوی (حیات در ۱۳۰۴ھ) کبھی کبھی حمد و نعت کہتے ہیں۔ (یادگارِ ضیغم: ۱۱۴)

۶۷۔ حسن، مولانا حاجی حسن رضا خاں بریلوی (۱۲۷۶ھ/۱۸۵۹ء۔ ۳ر شوال ۱۳۲۶ھ/۲۹ اکتوبر ۱۹۰۸ء) شاگرد داغ دہلوی، نعتیہ کلام اپنے برادر بزرگوار مولانا احمد رضا خاں بریلوی کو دکھاتے تھے۔ وہ اگرچہ نعتیہ کلام کے ایک پورے دیوان کے مصنف ہیں لیکن اُن کے کلام کا اصل رنگ عاشقانہ ہے (معارف اعظم گڑھ ۹۹: ۴: ۲۷۲)

۶۸۔ حلیم، شاہ عبدالحلیم عباسی ادوہوی (امروہوی ؟) ۔ کلام کا اکثر حصہ توحید و تصوف میں ہے (تذکرۃ الکلام : ۲۲۳)

۶۹۔ حمید، زائرِ حرم حمید صدیقی لکھنوی (وفات ۱۵ر فروری ۱۹۶۵ء) بہت ہی اچھی نعتیں لکھتے تھے۔ بالخصوص نعتیہ غزلیں خوب ہوتی تھیں۔ دو ایک مختصر مجموعے بھی نعتوں کے شائع ہوئے ہیں۔ ان میں "گلبانگ حرم" میری نظر سے گذرا ہے۔ "گلدستۂ نعت" اور "ارمغانِ نعت" دونوں ہی مجموعوں میں ان کی نعتیں نقل ہوئی ہیں۔ (گلدستہ نعت: ۸۰۔ ۷۴) (ارمغان نعت ۲۰۲)

۷۰۔ حیات، محمد حیات خاں رام پوری (۲ر رمضان ۱۲۸۱ھ وفات ۲۰ر رمضان ۱۳۷۹ھ) [تذکرہ کاملان رام پور] ذوق کے شاگرد تھے۔ نعت شریف کہنے کا شوق تھا۔ ان کے نعتیہ شعر کا ایک رنگ تو یہ ہے؛

دیا ہے خلعتِ نور اُس کو حق نے — نہ چھوڑا جس نے دامانِ محمدؐ

اور دوسرا رنگ سراپا متغزلانہ یہ ہے:

جو نکہت اُس گلِ رعنا کے پیرہن میں ہے — نہ نسترن میں، نہ گُل میں نہ یاسمن میں ہے

[انتخاب یادگار: ۱۲]

اکثر نعت کہتے تھے (خمخانۂ جاوید ۲: ۵۲۷) کلام نعتیہ اردو فارسی دو جلدوں میں مدوّن تھا۔ ایک مثنوی نعت میں مسمّی بہ "گلشنِ نور" لکھی تھی۔ سب کلام سرقہ میں ضائع ہوگیا۔ کلام نعتیہ لوگوں کی زبانوں پر موجود ہے۔" [تذکرۂ کاملان رام پور: ۲۵۲]

۷۱۔ حیدر، حکیم حیدر علی خاں رام پوری (ولادت ۱۲۶۵ھ۔ ۱۳۲۹ھ) ابتدا سے عمر سے شاعری کا شوق تھا لیکن نعت میں کہتے تھے۔ (تذکرہ کاملان رام پور: ۱۲۱)

امیر مینائی نے بھی ان کی نعت گوئی کے شوق کا ذکر کیا ہے اور نعتیہ اشعار کا یہ نمونہ بھی پیش کیا ہے:

بحرِ صفا ہیں، ابرِ عطا ہیں، راہ نما ہیں خلقِ خدا ہیں — سب سے جدا ہیں، آپ کے جوہر صلی اللہ علیہ وسلم

عارفِ قدرت، صاحبِ ہمت، شافعِ امت، بانیِ ملت — کانِ ولایت، مرسلِ داور، صلی اللہ علیہ وسلم

۷۲۔ حیرت گونڈوی۔ حالات کا علم نہیں۔ ان کی ایک نعت "گلدستۂ نعت" میں لکھی ہے (ص: ۱۲۶)

۷۳۔ خلیق، خلیل حسن خاں مانک پوری [شاگردِ امیر مینائی] ایک مولود شریف موسوم "گلزارِ خلیل" بھی تصنیف کیا ہے۔ (یادگارِ ضیغم، ۱۲۸)

۷۴۔ خمار، محمد حیدر خاں بارہ بنکوی (حیات ہیں) ان کی ایک نعت "ارمغانِ نعت" میں نظر آئی۔ (ص ۱۹۳) اس کے علاوہ اور بھی کچھ نعتیں کہی ہیں۔

۷۵۔ دانش، محمد مزمل عباسی تپہ تاکوٹی۔ ان کی ایک نعت "گلدستۂ نعت" میں دیکھی۔ اس کے علاوہ ان کے بارے میں کچھ اور معلوم نہیں۔ [گلدستۂ نعت: ۱۰۳]

۷۶۔ درخشاں، منشی رفیق احمد عباسی امروہوی: ظلِ عباس عباسی ان کی نعت گوئی کی روایت کرتے ہیں۔

۷۷۔ دل، [اعتبار الملک] ضمیر حسین خاں شاہجہاں پوری (وفات ۱۹۵۹ء)۔ انھوں نے بھی کچھ نعتیں کہی ہیں۔ ایک نعت "ارمغانِ نعت" میں درج ہے۔ (ص ۱۴۷)

۷۸۔ دل، عبد الرزاق خاں لکھنوی۔ [حیات ہیں] انھوں نے کئی نعتیں کہی ہیں۔ لکھنؤ کے نعتیہ مشاعروں میں شریک ہوتے اور بڑی خوش الحانی سے نعتیں پڑھتے ہیں۔ ایک نعت "ارمغانِ نعت" میں درج ہے۔ (ص ۱۹۵)

۷۹۔ دیا، نرائن داس ٹنڈن بریلوی۔ ان کی ایک نعت "ارمغانِ نعت" میں درج ہے۔

۸۰۔ [illegible] ذوالفقار علی رام پوری (وفات ۱۸۹۳ء) تخلص کا پتا نہیں۔ چند رباعیاں اور کچھ نعتیہ شعر ان کے خاندان والوں کے پاس موجود تھے [تذکرہ کاملانِ رام پور، ۱۲۹]

۸۱۔ رحمت، شیخ رحمت اللہ الہ آبادی (ولادت تقریباً ۱۸۷۱ء) صاحبِ دیوان تھے۔ غزل، سلام، نوحہ، نعت، منقبت، دادرا، ٹھمری، سبھی کچھ کہتے تھے۔ (رسالہ معارف اعظم گڑھ ۹۸: ۴: ۲۹۴)

۸۲۔ رزاق، سید محمد عبد الرزاق خاں بریلوی (وفات ۱۸۹۲ء) عزیزِ حافظ الملک رحمت خاں

"دیوان گلشن نعت یادگار ہے" [ خمخانہ جاوید: ۳: ۳۸۱ ]

۸۳۔ رضا، مولانا محمد رضا خاں بریلوی۔ ان کا نعتیہ دیوان موجود ہے [ قاضی عبدالودود صاحب ] دیوان نعت کا نام "حدائق بخشش" ہے۔ ان کی ایک نعت "ارمغان نعت" میں شامل ہے (ص ۱۱۱)

۸۴۔ رضوان، محمد رضوان علی خاں مرادآبادی (۱۳۱۱ھ میں حیات) "نعت اکثر کہتے ہیں" [ یادگار ضیغم: ۲۹۵ ] غزل کی طرف توجہ کم تھی اور نعت سے زیادہ شغف تھا۔ جب حج کے لیے گئے تو مدینہ منورہ میں روضۂ اقدس پر اپنی مشہور نظم پڑھی جس کا مطلع ہے ؎

اٹھ جائیں نگاہیں جو پڑیں سوے محمدؐ
دل لوٹ گیا دیکھتے ہی روے محمدؐ

اس پر حاکم مدینہ خالد پاشا نے "حسان الہند" کا خطاب دیا۔ یہ نعت بہت مقبول ہوئی۔ اور مدت تک طرح ہوتی رہی۔ مولوی فرید احمد وفا مرادآبادی نے اسے تضمین کیا۔ خود رضوان نے اس پر مختلف عنوانوں سے تضمینیں لکھیں۔ مثلث، مخمس اور معشروں کے طرز پر "طغرائے کمال" کے تاریخی نام سے یہ تمام تضمینیں ۱۳۱۱ھ میں شائع ہوئیں۔ یہ نعت ایسی مشہور ہوئی کہ مسیحی شاعر جارج پیش شور میرٹھی نے ردیف میں محمد کی جگہ مسیحا کر کے اس کی تضمین کی۔ [ تلامذۂ غالب: ۱۲۳، ۱۲۴ ]

۸۵۔ رفعت سروش لکھنوی (حیات ہیں) باقاعدہ نعت نگار تو نہیں ہیں، لیکن ان کی نعتیہ نظم گلدستہ نعت (۱۰۱) میں دیکھنے میں آئی۔

۸۶۔ رنج، (طبیب) حکیم محمد فصیح الدین میرٹھی۔ (وفات ۱۲۹۲ھ) نعت سے بھی شغف تھا۔ چنانچہ ایک مختصر مجموعہ "گلشن نعت" کے عنوان سے موجود ہے۔ [ تلامذۂ غالب ۱۳۵ ]

۸۷۔ رؤف، ماسٹر عبدالرؤف امروہوی ــــ "گل رنگ تخیل" اور "کوثر رحمت" وغیرہ نعتوں کے کئی مجموعے ہیں۔ نعتوں میں عام تغزل کا انداز زیادہ ہے۔ بعض اشعار تو بالکل ہی غزل کے معلوم ہوتے ہیں۔

سنبل سے نہیں، اُن کی زلفِ خمدار سے باتیں ہوتی ہیں
وہ پھول جہاں رکھ لیتا ہوں، رخسار سے باتیں ہوتی ہیں

مرا غم بھرا فسانہ مری دکھ بھری کہانی　　جو سنو تو مہربانی نہ سنو تو مہربانی
[اشعار عطیۂ خلیل عباس عباسی]

۸۸۔ رزش، شاہد عزیز صدیقی جالاپوری (ولادت ۱۹۱۱ء) نعتیں کم کہی ہیں، لیکن اندازِ اظہار متوازن ہے۔ ایک غزل "ارمغانِ نعت" میں شامل ہے۔ (ص ۱۹۷)

۸۹۔ رئیس امروہوی۔ اب غالباً کراچی میں مقیم ہیں۔ لیکن ان کے شعری شعور نے نشوونما کی تمام منزلیں اتر پردیش ہی میں طے کی ہیں۔ ان کی بھی ایک ایک نعت "ارمغانِ نعت" اور "گلدستہ نعت" میں شامل ہے۔ [ارمغانِ نعت: ۱۹۸] [گلدستہ نعت: ۱۱۱۔ ۱۱۲]

۹۰۔ ریاض، سید ریاض احمد خیرآبادی [۱۸۵۲ء۔ ۱۹۳۴ء] انھوں نے بھی کچھ نعتیں لکھی ہیں۔ ایک نعت "ارمغانِ نعت" میں درج ہے:

نام کے نقش سے روشن یہ نگینہ ہو جائے　　کعبۂ دل مرے اللہ مدینہ ہو جائے
آنکھ میں برقِ سرِ طور ہو گنبد کا کلس　　شرفِ اندوزِ زیارت یہ کمینہ ہو جائے
جان کی طرح تمنا ہے یہی دل میں ریاض　　مروں کعبہ میں تو منہ سوئے مدینہ ہو جائے

[ارمغانِ نعت: ۱۱۱]

۹۱۔ زخمی، منشی راج بہادر سریواستو کاکوروی۔ (حیات در ۱۸۸۶ء) "نعتیہ کلام بھی اکثر کہتے رہتے تھے۔" [خمخانۂ جاوید ۳: ۶۲۲]

۹۲۔ زکی، حکیم محمد اشفاق حسین مارہروی (۱۸۴۷ء۔ ۱۹۲۰ء) مذہب سے شغف تھا۔ تلامذۂ غالب میں نعت کے تین شعر بھی دیے ہیں (تلامذۂ غالب: ۳۰۶)

۹۳۔ زلالی، مولوی انصار حسین بدایونی (۱۸۵۷ء۔ ۱۹۲۵ء) نعت گوئی میں خاص ملکہ ہے۔ غالباً کلام چھپ چکا ہے (خمخانۂ جاوید ۳: ۶۳۸)

۹۴۔ زوار، شیخ محمد ماہ غازی پوری (۱۱۹۴ھ میں حیات) تذکرۂ "مسرت افزا" میں ان کا ایک ہی شعر درج ہے اور وہ نعتیہ ہے۔ فکرِ شعر کبھی کبھی کرتے تھے، پاک خیال اور فقر دوست تھے۔ منقولہ شعر یہ ہے:

معرکۂ حشر میں زوار کو　　مہرِ نبوت کی سپر چاہیے
[مسرت افزا: ۹۶]

ممکن ہے کہ زیادہ تر نعت ہی کہتے ہوں۔

۹۵۔ ساجد، صدیقی لکھنوی (حیات ہیں)۔ انھوں نے والی آسی کی معیت میں نعتوں کا ایک مجموعہ "ارمغانِ نعت" کے نام سے مرتب کیا ہے۔ اس میں نعت نگاروں کے حالات تو درج نہیں ہیں، لیکن ایک ایک نعت ضرور درج کردی ہے۔ مجموعہ جامع و مانع تو نہیں ہے لیکن بہت سے نعت نگاروں کے بارے میں اسی مجموعہ سے آگاہی ہوتی ہے۔ ساجد صدیقی نے خود اپنی بھی نعت اس مجموعہ میں شامل کی ہے۔ [ارمغان نعت: ۲۱۰]

۹۶۔ ساحر، عباسی امروہوی۔ حالات معلوم نہیں۔ ظلِّ عباس عباسی نے اِن کی نعت گوئی کا مجھ سے ذکر کیا۔

۹۷۔ ساکت، مولانا ساکت امروہوی۔ اب کراچی پاکستان میں جا بسے ہیں۔ لیکن نعت نگاری کا ذوق وسلیقہ امروہہ ہی سے لے گئے ہیں۔ (ظلِّ عباس عباسی)

۹۸۔ سالک، اسمٰعیل شاہ خاں بریلوی۔ شاگرد منیر۔ (ولادت ۱۲۶۸ھ) سوا نعت کے کچھ اور نہیں کہتے (انتخاب یادگار: ۱۶۷]

۹۹۔ سالک، منشی سالک رام گڑوی بلیاوی (ولادت ۱۸۶۱ء) کلامِ نعت شایع ہو چکا ہے۔" [خمخانۂ جاوید ۴: ۵۰]

۱۰۰۔ سحر، منشی عبدالمجید کاکوروی (وفات ۱۱ محرم، ۱۳۱۷ھ ر ۲۳ مئی ۱۸۹۹ء) آخر عمر میں نعت گوئی کا شوق پیدا ہوا تھا۔ مولوی محمد محسن کاکوروی کے قصیدہ "مدیح خیر المرسلین" کی تخمیس کی تھی، جو "مدحِ پیغمبر" کے نام سے کلیاتِ محمد محسن میں طبع ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ ایک مثنوی ذکرِ ولادت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں بطرزِ مثنویِ "صبحِ تجلّی" لکھی۔ نعت کا ایک شعر ہے:

کیوں دل کو ہو یاس مغفرت سے　　　کیا دامنِ مصطفےٰ نہیں ہے؟

[تذکرہ مشاہیر کاکوری: ۲۶۶]

۱۰۱۔ سراج، سراج الحسن لکھنوی (حیات ہیں) بہت کم نعتیہ کلام دیکھنے میں آیا۔ ایک نعت "ارمغانِ نعت" میں درج ہے۔ یہ مسدس ہے جس کا انداز بیانیہ اور خطابیہ کے درمیان کا ہے۔

اس نعت میں بھی لکھنوی مرثیوں کے آہنگ کا احساس ہوتا ہے۔ ایک بند ملاحظہ ہو:

ظہورِ جلوۂ حق کا بیان ہوتا ہے　　ہیں جمع اہلِ نظر، امتحان ہوتا ہے
عرب میں ختمِ رُسل میہمان ہوتا ہے　　زمیں پہ عرشِ بریں کا گمان ہوتا ہے
نئے ستارے لیے نسیمِ سحر جو لاتی ہے
تو جنبشِ پرِ جبریل یاد آتی ہے

۱۰۲۔ سرور، منشی درگا سہائے جہان آبادی (ولادت ۱۸۷۳ء وفات ۲۰ دسمبر ۱۹۱۰ء) ان کی بھی ایک نعتیہ مخمس دیکھنے میں آئی ہے۔ ایک بند یہاں نقل کیا جاتا ہے:

دل ہی دل میں مرے ارمان گھُلے جاتے ہیں　　خاک پر گر کے دُرِ اشک رُلے جاتے ہیں
میری رسوائی پہ کم بخت تُلے جاتے ہیں　　ہوں سیہ کار مرے عیب کھلے جاتے ہیں
کملی والے مجھے کملی میں چھپالے آ جا

[ارمغانِ نعت: ۱۵۲]

۱۰۳۔ سرور، چودھری عبدالغفور مارہروی (شاگردِ غالب) ان کا کلام نہیں ملتا۔۔ حسنِ اتفاق سے ان کے چند قطعات محفوظ رہ گئے ہیں۔۔۔۔ اس کے علاوہ قصیدہ نعتیہ ملا ہے۔ [تلامذہ غالب ۱۰۱]

۱۰۴۔ سعید، محمد سعید خاں مرادآبادی (حیات در ۱۳۰۴ھ) "نعت اکثر کہتے ہیں" (یادگارِ ضیغم: ۱۷۰)

۱۰۵۔ سعید، چودھری محمد سعیدالدین کھیڑوی بدایونی۔ "دیوان نعتیہ تصنیف کیا ہے" [خمخانۂ جاوید ۴: ۲۰۰]

۱۰۶۔ سلام، سندیلوی (حیات ہیں) ایک نعت ان کی بھی شاملِ "ارمغانِ نعت" ہے (ص: ۲۰۷)

۱۰۷۔ سلیم، مولوی سلیم اللہ بدایونی (وفات ۱۹۲۳ء) ان سے "موجِ کوثر"، "چشمۂ کوثر"، "سلسبیل کوثر" یادگار ہیں۔ ان میں نعت و منقبت درج ہیں۔ انھیں سلام و رباعیات لکھنے کا بھی شوق تھا۔ [خمخانۂ جاوید ۴: ۲۴۵]

۱۰۸۔ سہیل، اقبال احمد خاں اعظم گڈھی (ولادت ۱۱ ربیع الثانی ۱۳۰۴ھ) انھوں نے نعتیہ قصاید بہت کہے ہیں۔ قصائد کے علاوہ نعتیہ نظمیں بھی کہی ہیں۔ ان کے نعتیہ کلام کے نمونے "گلدستۂ نعت"، "ارمغانِ حرم" اور "ارمغانِ نعت" سب میں ملتے ہیں۔ [گلدستۂ نعت: ۴۲۔ ۴۷]

[ارمغانِ نعت: ۱۴۸]

۱۰۹۔ سہیلؔ، مولانا سہیل عباسی امروہوی۔ اِن کی نعت گوئی کا ذکر بھی ظلِ عباس عباسی نے کیا۔
۱۱۰۔ سیفیؔ، حکیم احمد حسین امروہوی۔ ان کی نعت گوئی کی اطلاع بھی ظلِ عباس عباسی صاحب سے ملی۔
۱۱۱۔ سیمابؔ، عاشق حسین اکبر آبادی۔ (۱۸۸۰ء۔ ۱۹۵۱ء) کچھ نعتیں انھوں نے بھی لکھی ہیں ایک ایک نعت "گلدستۂ نعت" اور "ارمغانِ نعت" میں شایع ہوئی ہے۔ کلام کی نوعیت یہ ہے:

پیام لائی ہے بادِ صبا مدینے سے ـــ کہ رحمتوں کی اٹھی ہے گھٹا مدینے سے
تڑپ بھی آ کے مزارِ حسین پر سیمابؔ ـــ کچھ ایسی دور نہیں کربلا مدینے سے

[ارمغانِ نعت: ۱۴۵]

ایک ترا وجود ہے آئینہ کائنات کا ـــ ذوق دیا نگاہ کو تو نے تجلیات کا
دَیرِ خودی د کبر میں تو نے اذانِ صبح دی ـــ تیرا جمالِ سرمدی، چاند ہے پچھلی رات کا

[گلدستۂ نعت، ۸۴]

ایک ہی شاعر کے یہاں ایک موضوع پر، ایک ہی شخصیت کے بارے میں آہنگوں کا یہ اختلاف قابلِ غور ہے۔
۱۱۲۔ شاہدؔ، مولانا سید محمد شاہد فاخری الٰہ آبادی (حیات ہیں) متصوفانہ غزلیں بھی لکھتے ہیں اور نعتیہ غزلیں بھی۔ ایک شعر سے اُن کی نعتیہ غزل کے آہنگ کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے:

نگاہِ شوق کے موتی قبول فرمائیے
مرے حبیبؐ، مرے غمگسار کیا کہنا

[ارمغانِ نعت: ۲۲۰]

۱۱۳۔ شاہدؔ، حکیم کلب علی امروہوی۔ ان کی نعت گوئی کی روایت بھی ظلِ عباس عباسی نے کی ہے۔
۱۱۴۔ شایاںؔ، رام پوری۔ "ارمغانِ نعت" میں اِن کی ایک نعت نظر سے گزری اور حال معلوم نہیں۔ (ص: ۲۲۳)

اس نعت میں بھی لکھنوی مرثیوں کے آہنگ کا احساس ہوتا ہے۔ ایک بند ملاحظہ ہو:

ظہورِ جلوۂ حق کا بیان ہوتا ہے — ہیں جمع اہلِ نظر، امتحان ہوتا ہے
عرب میں ختمِ رُسل میہمان ہوتا ہے — زمیں پہ عرشِ بریں کا گمان ہوتا ہے
سنئے سنا۔ یسے نسیمِ سحر جو لاتی ہے
تو جنبش پرِ جبریل یاد آتی ہے

۱۰۲۔ سرور، منشی درگا سہائے جہان آبادی (ولادت ۱۸۷۳ء وفات ۲۰ دسمبر ۱۹۱۰ء)
ان کی بھی ایک نعتیہ تخمیس دیکھنے میں آئی ہے۔ ایک بند یہاں نقل کیا جاتا ہے:

دل ہی دل میں مرے ارمان گھُلے جاتے ہیں — خاک پر گر کے دُرِ اشک رُلے جاتے ہیں
میری رسوائی پہ کم بخت تُلے جاتے ہیں — "ہوں سیہ کار مرے عیب کھلے جاتے ہیں
کملی والے مجھے کملی میں چھپا لے آجا

[ارمغانِ نعت: ۱۵۲]

۱۰۳۔ سرور، چودھری عبد الغفور مارہروی (شاگردِ غالب) ان کا کلام نہیں ملتا۔۔ حسنِ اتفاق سے ان کے چند قطعات محفوظ رہ گئے ہیں۔۔۔۔ اس کے علاوہ قصیدہ نعتیہ ملا ہے۔ [تلامذۂ غالب ۱۰۱]

۱۰۴۔ سعید، محمد سعید خاں مرادآبادی (حیات در ۱۳۰۴ھ) "نعت اکثر کہتے ہیں۔" (یادگارِ ضیغم: ۱۷۰)

۱۰۵۔ سعید، چودھری محمد سعید الدین کھیڑوی بدایونی۔ "دیوان نعتیہ تصنیف کیا ہے" (خمخانۂ جاوید: ۲۰)

۱۰۶۔ سلام، ستار بلیوی (حیات ہیں) ایک نعت اِن کی بھی شاملِ "ارمغانِ نعت" ہے (ص: ۲۰۷)

۱۰۷۔ سلیم، مولوی سلیم اللہ بدایونی (وفات ۱۹۲۳ء) ان سے "موجِ کوثر"، "چشمۂ کوثر"، "سلسبیلِ کوثر" یادگار ہیں۔ ان میں نعت و منقبت درج ہیں۔ انھیں سلام و رباعیات لکھنے کا بھی شوق تھا۔ [خمخانۂ جاوید ۴: ۲۴۵]

۱۰۸۔ سہیل، اقبال احمد خاں اعظم گڑھی (ولادت ۱۱ ربیع الثانی ۱۳۰۴ھ) انھوں نے نعتیہ قصاید بہت کہے ہیں۔ قصائد کے علاوہ نعتیہ نظمیں بھی کہی ہیں۔ اِن کے نعتیہ کلام کے نمونے "گلدستۂ نعت"، "ارمغانِ حرم" اور "ارمغانِ نعت" سب میں ملتے ہیں۔ [گلدستۂ نعت، ۴۲۔ ۴۷]

[ارمغانِ نعت: ۱۴۸]

۱۰۹۔ سہیل، مولانا سہیل عباسی امروہوی۔ ان کی نعت گوئی کا ذکر بھی ظلِ عباس عباسی نے کیا۔

۱۱۰۔ سیفی، حکیم احمد حسین امروہوی۔ ان کی نعت گوئی کی اطلاع بھی ظلِ عباس عباسی صاحب سے ملی۔

۱۱۱۔ سیماب، عاشق حسین اکبرآبادی۔ (۱۸۸۰ء۔۱۹۵۱ء) کچھ نعتیں انھوں نے بھی لکھی ہیں ایک ایک نعت "گلدستۂ نعت" اور "ارمغانِ نعت" میں شایع ہوئی ہے۔ کلام کی نوعیت یہ ہے:

پیام لائی ہے بادِ صبا مدینے سے — کہ رحمتوں کی اٹھی ہے گھٹا مدینے سے
تڑپ بھی آ کہ مزارِ حسین پر سیماب — کچھ ایسی دور نہیں کربلا مدینے سے

[ارمغانِ نعت: ۱۴۵]

ایک ترا وجود ہے آئنہ کائنات کا — ذوق دیا نگاہ کو تو نے تجلیات کا
دُیرِ خودی دکبر میں تو نے اذانِ صبح دی — تیرا جمالِ سرمدی، چاند ہے پچھلی رات کا

[گلدستۂ نعت: ۸۴]

ایک ہی شاعر کے یہاں ایک موضوع پر، ایک ہی شخصیت کے بارے میں آہنگوں کا یہ اختلاف قابلِ غور ہے۔

۱۱۲۔ شاہد، مولانا سید محمد شاہد فاخری الہ آبادی (حیات ہیں) متصوفانہ غزلیں بھی لکھتے ہیں اور نعتیہ غزلیں بھی۔ ایک شعر سے ان کی نعتیہ غزل کے آہنگ کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے:

نگاہِ شوق کے موتی قبول فرمائے
مرے حبیبؐ، مرے غمگسار کیا کہنا

[ارمغانِ نعت: ۲۲۰]

۱۱۳۔ شاہد، حکیم کلب علی امروہوی۔ ان کی نعت گوئی کی روایت بھی ظلِ عباس عباسی نے کی ہے۔

۱۱۴۔ شاہاں، رام پوری۔ "ارمغانِ نعت" میں ان کی ایک نعت نظر سے گزری اور حال معلوم نہیں۔ (ص: ۲۲۳)

۱۱۵۔ شائق، احمد علی باپوڑی۔ "اکثر نعت کہتے ہیں" [یادگار ضیغم: ۱۹۹]

۱۱۶۔ شبیر، شبیر حسن خاں امروہوی (حیات ہیں) صاحب دیوان ہیں۔ نعت میں بھی مزاح کی چاشنی پائی جاتی ہے۔ لیکن سطحیت بھی ہے:

وہ جنت کی نہروں کا کیا دودھ پیتی حلیمہ اگر ان کی دائی نہ ہوتی

(ظلِ عباس عباسی)

۱۱۷۔ شرر، مولوی علی بخش خاں بدایونی (وفات ۱۷ رجب ۱۳۰۲ھ) "نعت شریف حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے لکھنے اور سننے کا بیحد شوق ہے۔ روزمرہ جو تازہ غزل تصنیف فرماتے اُس کو اپنے مقررہ نعت خوانوں کی زبان سے سنا کرتے تھے"۔ (اکمل التاریخ ۱:۶۶)

۱۱۸۔ شرر امروہوی۔ "گلدستہ نعت" [ص ۹۱] میں ایک نعت درج ہے۔

۱۱۹۔ شعور بریلوی۔ "ارمغانِ نعت" [ص ۲۲۲] پر نعت کا نمونہ درج ہے۔

۱۲۰۔ شفق، انوار الدولہ، سعید الملک نواب محمد سعید الدین خاں کالپوی (وفات ۱۲۹۸ھ) "حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں ایک مولود منظوم بھی "مخزنِ سعادت" کے نام سے ۱۸۵۳ء میں شائع کیا تھا"۔ [تلامذہ غالب: ۱۷۰]

۱۲۱۔ شفیق، مولوی محمد ولی الدین جونپوری (وفات ۵ مارچ ۱۹۶۳ء)۔ نعتیہ قصائد بھی کافی کہے ہیں اور نعتیہ غزلیں بھی۔ [ارمغان نعت: ۲۱۲] [گلدستۂ نعت: ۱۲۹]

۱۲۲۔ شکیل۔ بدایونی۔ انھوں نے نعتیں کہی ہیں۔ نمونے "گلدستہ نعت" (ص ۵۔۵۵) ارمغانِ نعت (ص ۲۱۴) میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

۱۲۳۔ شمس، خواجہ احمد بریلوی۔ (حیات در ۱۳۰۴ھ) "نعت شریف کہتے ہیں"۔ [یادگار ضیغم: ۲۱۵]

۱۲۴۔ شمس، ابوالفضل لکھنوی (حیات ہیں) "ارمغانِ نعت" میں مندرج نعت کے علاوہ بھی نعتیں لکھی ہیں۔ (ص ۲۱۲)

۱۲۵۔ شمسی، ریاض الحسن بریلوی۔ (حیات) کچھ نعتیہ غزلیں لکھی ہیں، لیکن ابھی انداز بیان میں توازن نہیں ہے۔ ایک مطلع دیکھیے اور لفظ 'سی' پر غور کیجیے:

مدینے کے غموں میں بھی خوشی معلوم ہوتی ہے یہاں آکر مجھے تسکین سی معلوم ہوتی ہے

[ارمغانِ نعت: ۲۰۱]

۱۲۶۔ شمیم، بریلوی۔ حال معلوم نہیں۔ ایک نعت "گلدستہ نعت" (ص ۱۲۶) پر درج ہے۔

۱۲۷۔ شمیم، مولوی سید سجاد حسین امروہوی (۱۸۷۴ء۔ ۱۹۱۴ء/ ۱۳۳۴ھ) نعت و مراثی لکھتے تھے۔ (ظلِّ عباس عباسی) (تذکرہ ماہ و سالِ قلمی)

۱۲۸۔ شور، منشی سید اسناد علی متھراوی (ولادت ۱۸۵۹ء) ایک دیوان نعتیہ ہے۔

(خمخانہ جاوید، ۵: ۶۸)

۱۲۹۔ شوق، خادم حسین بالوڑی (حیات در ۱۳۰۴ھ) "اکثر نعت وغیرہ میں اُن کا کلام زیادہ ہے۔ بڑے خوش گو ہیں۔ مولود شریف میں اپنا کلام آپ پڑھتے ہیں" [یادگار ضیغم: ۱۹۰]

۱۳۰۔ شوکت، محمد عمر تھانوی ثم لکھنوی ثم لاہوری (۶ جنوری، ۱۹۰۷ء/ ۴ مئی ۱۹۶۳ء) انھوں نے بھی کچھ نعتیں لکھی ہیں۔ [ارمغانِ نعت، ۲۱۷]

۱۳۱۔ شہباز، (مسلم) مولانا سلطان احمد امروہوی۔ مزاحیہ کلام بھی کہتے ہیں۔ مزاح میں شہباز اور نعت میں مسلم تخلص کرتے ہیں۔ [ظلِّ عباس عباسی]

۱۳۲۔ شہید، غلام امام لکھنوی (وفات ۴ صفر، ۱۲۵۶ھ) اپنے گھر پر برابر مجلس میلاد کرتے اور تازہ نعتیہ کلام نہایت خوش الحانی سے پڑھتے۔ نواب محی الدولہ نے اُن کے کلام کی شہرت سنی تو ایک ہزار روپیہ زادِ راہ بھیج کر حیدرآباد دکن بلایا۔ کلام جمع نہیں کرتے تھے لیکن زمانے کی دستبرد سے جو کچھ بچ رہا، اس میں مجموعہ میلاد شریف بھی ہے۔ (خمخانہ جاوید ۵: ۲۱۱] [مختصر تاریخ ادب اردو: ۳۶۷]

۱۳۳۔ شہیدی، منشی کرامت علی خاں اناوی بدایونی (وفات ۴ صفر، ۱۲۵۶ھ/ ۱۸۴۰ء) ان کا نعتیہ و عاشقانہ کلام مستانہ رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ دیوان طبع ہو چکا ہے۔ [انتخاب ندیم، ۳۶۱] یہ اناؤ یا اونام نواحِ لکھنؤ کے باشندے تھے۔ لیکن زندگی کا کافی حصہ بریلی اور رام پور میں گزرا [معارف اعظم گڑھ ۹۹: ۳: ۲۰۴] ہڑپور ضلع اونام کے ساکن تھے اور بانس بریلی میں رہتے تھے۔ "قصیدہ نعتیہ اُن کا بے مثال ہے۔ کلام بھی بُرا نہیں ہے"۔ (جلوۂ خضر ۲: ۱۳۰]۔
شہیدی کا ایک شعر تھا ـــ

تمنا ہے درختوں پر ترے روضے کے جا بیٹھوں      قفس جس وقت ٹوٹے طائر روحِ مقید کا

چنانچہ شہیدی جس وقت مدینے پہنچے تو روضۂ مبارکہ کو دیکھ کر جوشِ اشتیاق میں ان کی جان نکل گئی [جلوۂ خضر ۲: ۱: ۱۳۱] امیر الدین آزاد بریلوی نے ایک کے تخرجے سے تاریخ وفات کہی

ع کھوجان نثارِ مزارِ مقدس

۱۳۴۔ شیدا، مولوی محمد مہدی کاکوروی (۱۲۶۴ھ - ۲۶ ذی الحجہ ۱۲۹۴ھ)۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے زیادہ تر نعتیہ قصائد کہے، دوسرے اقسامِ نظم کی طرف کم مائل تھے۔ [تذکرہ مشاہیر کاکوری: ۱/۳۰۱] [تذکرہ صبح گلشن: ۲۳۹]

۱۳۵۔ شیفتہ، محمد کاظم حسین کنتوری ثم حیدر آبادی (ولادت تقریباً ۱۲۶۰ھ وفات قبل ۱۳۰۵ھ) "ایک دیوان نعتیہ اُن کی تصنیف سے تمام ہو چکا ہے" [یادگارِ ضیغم ۲۰۳]

۱۳۶۔ صبر، منشی محمد رضا کاکوروی [وفات ۹ شعبان، ۱۲۹۷ھ دوشنبہ] تین عمومی دیوان اور دو نعتیہ دیوان چھوڑے ہیں۔ نعتیہ دیوان میں ایک گلدستہ نعتِ محمدؐ ہے اور دوسرا رباعیات نعت۔
[تذکرہ مشاہیر کاکوری: ۳۴۶]

۱۳۷۔ صفا، مولوی عبد الحق رام پوری (ولادت ۱۲۰۷ھ) نعتیہ اشعار خوب کہتے تھے۔ اپنا کل کلام سات بیاضوں میں جمع کیا ہے۔ [خمخانۂ جاوید ۵: ۱۰۳] اردو میں دو دیوان نعتیہ مرتب کیے تھے (تذکرہ کاملانِ رام پور: ۱۹۸)

۱۳۸۔ ضبط، ربانی رام پوری۔ عرفیت چندا میاں تھی۔ عابد رضا بیدار ناقل ہیں کہ صرف نعتیں لکھتے تھے۔ [عابد رضا بیدار:

۱۳۹۔ ضمیر، بریلوی۔ اِن کی ایک نعت ارمغانِ نعت میں ہے [ارمغانِ نعت: ۲۲۷]

۱۴۰۔ ضیا، لکھنوی۔ ایک نعتیہ غزل دیکھنے میں آئی [ارمغانِ نعت: ۲۲۸]

۱۴۱۔ طالب، مولوی الہ داد عرف شبراتی رام پوری (وفات ۲۹ شوال ۱۲۷۵ھ)۔ آپ کا اردو کلام جس میں نعتیہ قصائد وغیرہ بھی موجود ہیں رضا لائبریری رام پور میں موجود ہے۔
[تذکرہ کاملانِ رام پور: ۵۲]

۱۴۲۔ طاہر، میر طاہر علی فرخ آبادی (۱۸۴۰ء۔ ۲ جولائی ۱۹۱۱ء) ان کا ایک نعتیہ دیوان غیر مطبوعہ ہے۔ [بیاضِ سخن: ۱۴۷]

۱۴۳۔ طرب، یوسف بیلی بھیتی۔ "ارمغانِ نعت" (ص ۲۷۰) میں ایک نعت نقل ہوئی ہے۔
۱۴۴۔ عارف، ابوالوفا شاہجہاں پوری۔ "عرفان عارف" کے نام سے اِن کے عرفانی کلام کا مجموعہ شایع ہوا ہے۔ "ارمغانِ نعت" میں بھی ایک نعت درج ہے۔ (ارمغان نعت: ۱۵۵)
۱۴۵۔ عارف، بدایونی۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں نعت کہتے تھے اور عزیز لکھنوی کے تلامذہ میں تھے۔ (ظلِّ عبّاس عبّاسی)
۱۴۶۔ عاشق، پرسیودیال لکھنوی۔ اِن کی ایک نعت "گلدستۂ نعت" (ص ۶۵) میں نظر سے گزری۔
۱۴۷۔ عبّاس، مولوی غلام عباس مبارک پوری اعظم گڑھی۔ ان کی ایک غیر منقوط نعت نظر سے گزری:

ملک و ملک وحور کا سردار محمد — واللہ دو عالم کا مددگار محمد
ممدوح ہوا مہر و مہ و لوح و سما کا — اللہ کا وہ محرمِ اسرار محمد
معصوم، وہ محمود، وہ طاہر، وہ مطہر — عالم کا ممدّ اور مددگار محمد
واللہ مرا ہوگا مددگار، علمدار — وہ دادرسِ عام، مددگار محمد

غیر منقوط کی قید کی وجہ سے عبّاس نے اس نعت میں اپنا تخلّص بدل کر علمدار کر لیا۔
(نعمخانہ جاوید ۵: ۷)
۱۴۸۔ عبّاس، سید عباس علی مرادآبادی (وفات ۱۹ رجمادی الاولیٰ ۱۲۸۴ھ) "مولود شریف پڑھنے کے مشتاق، ایسی محافلِ متبرکہ کے بہت مشتاق۔ اسی ذوق میں کبھی کبھی نعتیہ شعر کہتے تھے"۔ [انتخاب یادگار: ۲۰۔ ۲۱۹]
۱۴۹۔ عزیز، مولانا محمد ولایت علی خاں صفی پوری (شاگرد غالب) "حسرت دل" اور "طور تجلی" نامی مجموعوں میں ان کا کلام ملتا ہے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں کہتے تھے۔ ایک شعر ہے:

مصحفِ پاک ہے کونین میں جحّت تیری
حق تعالیٰ کی اطاعت ہے اطاعت تیری

[تلامذہ غالب: ۲۳۵]
[ارمغانِ نعت: ۸۸]

۱۵۰۔ عشرت، احمد لیقی امروہوی۔ نعت گو ہیں۔ [ظلّ عباس عباسی]

۱۵۱۔ عزیز، عزیز احمد وارثی بچھرایونی (ولادت ستمبر ۱۹۲۴ء) نعتیہ نظمیں اور غزلیں لکھی ہیں۔ اِن کے مجموعۂ کلام "سفینہ و ساحل" میں بھی نعتیں درج ہیں۔

۱۵۲۔ عمر، انصاری لکھنوی۔ اِن کا ایک نعتیہ مخمس ترجیع بند نظر سے گزرا [ارمغانِ نعت: ۳۲]

۱۵۳۔ عنایت، عنایت علی بیگ لکھنوی۔ "مولود شریف موسوم بہ "ابرِ رحمت" تصنیفات سے ہے" (یادگارِ ضیغم: ۲۵۸)

۱۵۴۔ غریب، محمد خاں سہارن پوری۔ ایک رسالہ نعتیہ موسومہ "نالۂ غریب" چھپ چکا ہے نعت اکثر کہتے ہیں (یادگارِ ضیغم: ۳۹۲)

۱۵۵۔ غفلت، خوندزادہ احمد خاں رام پوری (وفات یکم ذی الحجہ ۱۲۶۱ھ) "انتخابِ یادگار" میں دو نعتیں درج ہیں۔ ایک میں پانچ شعر ہیں اور دوسری میں تین۔ بظاہر قصیدوں کا حصہ معلوم ہوتی ہیں:

(۱) زہے دیارِ مدینہ کہ جس میں آکر حور — نکالتی ہے بہشتِ بریں میں الٰہ قصور

غبارِ دشت کا اس کے بیاں ہو کیا عالم — مشام مشک سمجھتا ہے اور نگہ کافور

(۲)
اگر یہ جانتا شیطاں کہ ہے آدم میں نور اس کا
جھکاتا بہرِ سجدہ سب سے اوّل اپنی پیشانی
تو اکیا عظمِ شاں تیرے بیاں، جب تیری اُمّت سے
کہے کوئی انا الحق اور بولے کوئی سبحانی

[انتخابِ یادگار: ۱، ۲، ۲۶۶]

۱۵۶۔ فائق، مولانا حشمت علی خاں بریلوی۔ اِن کی نعتیں "گلدستۂ نعت" میں شامل ہیں اِن میں ایک نعتیہ سہرا بھی ہے۔ [گلدستۂ نعت: ۳۲۴]

۱۵۷۔ فائق، محمد میرزا الٰہ آبادی۔ (ولادت ۱۲۶۶ھ) "انتخابِ یادگار" میں چار نعتیہ شعر ہیں غالباً قصیدے کے ہیں۔ مثلاً

مرحبا مرتبۂ احمدِ عالی مقدار — درّۃ التاجِ رسل، شاہدِ بزمِ اسرار

[ص ۱۸۱]

۱۵۸۔ فرحت، میر محمد حسن بریلوی (حیات در ۱۲۹۰ھ) حمد و نعت میں ایک قصیدۂ لامیہ کے کچھ شعر یا ستھ آئے ہیں۔ ان میں نعت کے سات شعر ہیں۔ نمونہ یہ ہے:

مقصد کن فیکون، ناسخِ ادیان و ملل — ادب آموزِ جہاں، جوہرِ عقلِ اوّل

[انتخاب یادگار: ۲۸۴۔۲۸۵]

۱۵۹۔ فرحتی، محمد عبداللہ عباسی امروہوی۔ (ولادت ۱۸۰۸ء) "حقائق تاریخی" کے عنوان کے تحت ایک نعت "تذکرۃ الکرم" میں درج ہے۔ (تذکرۃ الکرم: ۲۳۱)

۱۶۰۔ فریاد، مصطفیٰ حسن علوی کاکوروی عالم متبحر تھے۔ اردو میں کبھی کبھی نعتیہ شاعری کر لیتے تھے۔ ایک نعت "ارمغانِ نعت" میں بھی درج ہے (ص ۲۴۹)

۱۶۱۔ فضا ابن فیضی مئوی اعظم گڑھی (حیات) ان کی ایک نعت "ارمغانِ لذت" کے صفحہ ۲۴۱ پر درج ہے۔

۱۶۲۔ فضل، حکیم سید فضل احمد امیٹھوی سہارنپوری۔ نعتیہ کلام "رضوان نعت" کے نام سے مدوّن ہے۔ (لکھنؤ کا دبستان شاعری: ۴۹۹)

۱۶۳۔ فضلی، قاضی خادم حسین کاکوروی۔ (حیات در ۱۹۲۷ء) مولفِ تاریخِ قصبۂ کاکوری و "ریاض عثمانی" و "صبح بہار" وغیرہ نعتیہ اشعار کہتے تھے۔ (تذکرہ مشاہیر کاکوری: ۲۲۵)

۱۶۴۔ فقیر، محمد حسین [غالب بنارسی] نعتیہ کلام "تحفۂ فقیر" کے نام سے مطبع "زیب کاشی" میں ۱۸۸۵ء ۱۸۸۵ء میں طبع ہوا۔ (لکھنؤ کا دبستان شاعری: ۴۹۹)

۱۶۵۔ قاسم، قاسم علی خاں رام پوری (ولادت ۱۲۵۰ھ) "نعت شریف کہنے کا بہت ذوق ہے" ؎

شہیدِ عشق ہوں میں، غازۂ روئے شفق ہوگا
بگولا آسماں پر جا کے میری خاکِ تربت کا

[انتخاب یادگار: ۲۹۸]

۱۶۶۔ قومی، منشی لائق حسین امروہوی۔ ان کا نعتیہ کلام مختلف گلدستوں میں بکثرت شائع ہوتا رہا ہے۔ [ظلِ عباس عباسی]

۱۶۷۔ قیصر، شاہ امین الدین الہ آبادی۔ (۱۲۵۳ھ / ۱۸۳۷ء۔ ۱۳۳۴ھ / ۱۹۱۵ء) غزل کے علاوہ مرثیہ، سلام، نعت اور منقبت وغیرہ مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کرتے تھے اور الہ آباد کے سربرآوردہ شعرا میں شمار ہوتے تھے۔ [معارف اعظم گڑھ ۹۸: ۴: ۲۸۱]

۱۶۸۔ کافی، مولوی کفایت علی مرادآبادی "عالم صالح و دیندار تھے۔ مدّاحی جناب التماب صلی اللہ علیہ وسلم میں اپنے اوقات گزارتے تھے۔ "بہارِ خلد"، "حلیہ مبارک"، اور اکثر کتب نظم و نثر اُن کی صنفانے دیکھیں، نہیں عزیز، بیشتر اشعار اُن کے حمد و نعت میں ہوتے ہیں۔" [شمیمِ سخن: ۱۹۱] [سخن شعرا: ۳۹۵] [گلستانِ بے خزاں: ۲۰۱]

۱۶۹۔ کلیم، مولانا سید محمد عبارت امروہوی۔ ان کی نعت نگاری کے ناقل ظلِّ عباس عباسی ہیں۔

۱۷۰۔ کوثر، ڈاکٹر عبدالودود امروہوی۔ اکثر نعتیں لکھتے ہیں۔ نمونہ یہ ہے:

جو قسمت سے پہنچوں گا بابِ حرم تک ۔۔۔ پکڑ کر کہوں گا یہ روضے کی جالی

گدائے جگ کے داتا یتیموں کے والی ۔۔۔ مجھے بھیک دو، میری جھولی ہے خالی

[ظلِّ عباس عباسی]

۱۷۱۔ کوثری، دلّو رام (بدایونی) ان کا "نعتیہ کلام مشہور ہے۔" (لکھنؤ کا دبستانِ شاعری: ۴۹۹) "نعتِ رسول میں تمام عمر صرف کردی۔ ۔ ۔ "صوفی" میں آپ کی بہت سی نظمیں شائع ہوا کرتی ہیں۔ کلام میں درد ہوتا ہے اور اثر بھی۔" (اردو کے ہندو ادیب: ۱۱۲)

۱۷۲۔ کیف، مولوی ابرارالحق قادری بدایونی (۱۲۷۲ھ۔ ۱۳۲۱ھ)۔ شاگردِ داغ۔ "آخر میں نعت و مناقب کی طرف متوجہ ہوئے۔ حدودِ شرع کے اندر نعت شریف میں وہ وہ گلکاریاں اور گلفشانیاں کیں کہ عروسِ سخن کو صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً کا رنگین جوڑا پہنا دیا۔" کلام میں جدت طرازی، رنگینی، شوخی، مضمون آفرینی کے ساتھ زبان کی صفائی نور آ فوق نور کی مصداق تھی۔ مطلع سے مقطع تک تخلص کی رعایت سے اشعار بھی کیفِ مضامین سے سرشار نظر آتے تھے۔ عرسِ قادری کے مناقب خوانوں میں آپ کے دم سے ایک عجیب ذوقِ سخن رہتا تھا۔ [اکمل التاریخ ۱: ۹۲]

۱۷۳۔ کیفی، محمد مبین حیرت کوٹی۔ (وفات ۲۴ اکتوبر ۱۹۷۵ء) انھوں نے نعتیہ قصائد اور نعتیں

لکھی ہیں۔ ایک نعتیہ نظم "ارمغانِ نعت" میں بھی ہے۔ (ارمغانِ نعت: ۱۲۳)

۱۷۴۔ کیفی، نورالدین احمد کاکوروی (ولادت محرم ۱۲۶۹ھ ; حیات در ۱۹۲۷ء)۔ "دو ضخیم دیوان کا ذخیرہ موجود ہے . . . . اس کے علاوہ ایک گلدستۂ نعت غیر مطبوعہ ہے، جس میں بزرگانِ دین کی شان میں اردو فارسی کلام بھی شامل ہے تین رسالے نظم کے طبع ہو چکے ہیں جن میں سے ایک نظم میلاد شریف ہے جو اپنی خوبیوں میں آپ ہی نظیر ہے۔" [تذکرہ مشاہیر کاکوری: ۴۶۴]

۱۷۵۔ لطف، لطف علی خاں بریلوی۔ "ان کا دیوان حضرت سرورِ انبیا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت میں (نظر سے) گزرا۔" [سخن شعرا: ۴۰۶] انتخابِ یادگار میں دو نعتوں کے نمونے درج ہیں:

(۱) اچھا نہ ہو یارب کبھی بیمارِ محمدؐ   کم ہو نہ کبھی خواہشِ دیدارِ محمدؐ

(۲) ہے سر میں ازل سے سرِ سودائے محمدؐ   ہے دل میں خیالِ رخِ زیبائے محمدؐ

[انتخاب یادگار: ۲۸۴]

ایک نعت "ارمغان نعت" میں بھی ہے۔

(۳) دل میں ہے کیفیتِ چشمِ جنابِ مصطفیٰؐ   کیا شرابِ عشق سے لبریز ہے پیمانہ آج

[ارمغانِ نعت: ۹۱]

۱۷۶۔ ماہر، مولانا منظور حسن ماہر القادری کیسر کلانی بلند شہری۔ (حیات ہیں) ان کی کچھ نعتیہ نظمیں "گلدستہ نعت" میں نقل کی گئی ہیں۔ [گلدستہ نعت: ۱۷، ۵۰، ۷۰]

۱۷۷۔ مبین، محمد مبین الدین احمد لکھنوی (حیات ہیں) ان کی ایک نعت "ارمغانِ نعت" میں شامل ہے۔ (ارمغانِ نعت: ۲۵۴)

۱۷۸۔ مجاز، لودھی اکبرآبادی۔ حالات معلوم نہیں۔ "گلدستہ نعت" میں ایک نعت شامل ہے (ص ۱۰۹۔ ۱۱۰)

۱۷۹۔ مجذوب، خواجہ عزیز الحسن غوری اوری (ولادت ۱۲ جون ۱۸۸۴ء، ۱۶ شعبان ۱۳۰۱ھ، وفات ۱۷ اگست ۱۹۴۴ء، ۲۷ شعبان ۱۳۶۳ھ۔) بہت ہی باکیف اور متوازن نعتیں لکھی ہیں۔ ارمغان نعت میں بھی ایک درج ہے۔ [ارمغان نعت: ۱۵۳]

۱۸۰۔ محسنؔ محمد محسن علوی کاکوروی (ولادت ۱۲۴۲ھ وفات ۲۸ر صفر ۱۳۲۳ھ ر ۲۴ر اپریل ۱۹۰۵ء) ان کے نعتیہ قصائد کی بڑی دھوم ہے۔ قصائد کے علاوہ بھی نعتیں کہی ہیں۔ مثنوی "صبح تجلی" و "چراغ کعبہ" نعت میں ہیں (مرآۃ الشعرا ۲: ۱۴۴) نعت گوئی میں طرز خاص کے موجد تھے [انتخاب زریں: ۱۵۷] "نعت گو مشہور ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ انھوں نے نعت کے سوا کچھ اور لکھا بھی نہیں ہے اور کچھ لکھا بھی ہے تو وہ بھی نہ لکھنے کے برابر ہے۔" [مرآۃ الشعرا: ۳۲] خاص کر اُن کے اِس لامیہ قصیدہ کی بڑی شہرت ہے ؎ سمت کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل۔

انھوں نے جب سے قصیدۂ "مدیح خیر المرسلین" لکھا تو عہد کیا ؎

ہے تمنا نہ رہے نعت سے تیری خالی
نہ مرا شعر، نہ قطعہ، نہ قصیدہ، نہ غزل

اس کے بعد سے نعت کے سوا تمام اصنافِ سخن ترک کر دیے۔ مستقل تالیفات سے "سراپائے رسول"، "مثنوی صبح تجلی"، "مدیح خیر المرسلین"، "چراغ کعبہ"، "مخمس نعتیہ"، مثنوی شفاعت و نجات" ہیں۔ ان کے علاوہ قصائد، مثنویاں، رباعیاں، غزلیں، مخمس، نثر، معمّا اور تاریخ وغیرہ بھی ہیں۔ اُن کی نعتوں کا مجموعہ "نور اللغات" کے مولّف یعنی اُن کے بڑے بیٹے، مولوی نور الحسن نیّر نے "کلیات نعت مولوی محمد محسن" کے نام سے شائع کرایا تھا۔ پہلی بار یہ مطبع نامی کان پور میں چھپا، اُس کے بعد کئی اور اڈیشن بھی طبع ہوئے۔ اس سے قبل محسنؔ کی حیات میں اُن کا کلام "سنبلستانِ نسمت" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ [تذکرہ مشاہیر کاکوری: ۳۶۸]

۱۸۱۔ محشرؔ، امروہوی۔ نعت گو ہیں۔ حالات معلوم نہیں [ظلّ عباس عباسی]

۱۸۲۔ محشرؔ، عباسی امروہوی (مقیم بمبئی) نعتیں لکھتے ہیں۔ مزید حالات معلوم نہیں [ظلِ عباس عباسی]

۱۸۳۔ محشرؔ، محمد اکرام اللہ بدایونی۔ نعت و منقبت زیادہ لکھتے تھے۔ صاحب دیوان تھے (شمیم سخن: ۱۰۵)

۱۸۴۔ محویؔ، مہدی تقی لکھنوی (حیات ہیں) کئی نعتیں لکھی ہیں۔ ایک نعت "ارمغان نعت" [ص ۲۴۵] میں شامل ہے۔

۱۸۵۔ مدّاحؔ، شیخ محمد صادق علی گولہ گنگیشر۔ سوزاں بھی تخلص کرتے تھے۔ نعت کہنے کا بھی شوق تھا

اور التزام یہ تھا کہ عام عاشقانہ کلام میں تخلص سوزاں تھا اور نعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں مدّاح۔ چنانچہ نعتیہ دیوان جو ۱۲۸۴ھ ر ۱۸۶۸ء میں چھپا تھا، تخلص شروع سے آخر تک مدّاح ہی استعمال کیا ہے۔" [تلامذہ غالب: ۱۵۴]

۱۸۶۔ مذاق، سید دلدار علی بدایونی (۱۲ ربیع الاول، ۱۲۴۵ھ۔ ۱۱ ربیع الثانی، ۱۳۱۲ھ) عوام آپ کو "مذاق میاں" کہتے اور آپ کا نعتیہ کلام بڑے ذوق و شوق سے سنتے تھے (لکھنؤ کا دبستانِ شاعری: ۴۹۹) انتقال سے تیس سال قبل عاشقانہ کلام کہنا چھوڑ دیا تھا، صرف نعت و منقبت لکھا کرتے تھے۔ انتقال کے بعد جو کلام دستیاب ہو سکا وہ "کلام دلدار علی مذاق" کے نام سے بدایوں سے شائع ہوا۔ (انتخاب رریں: ۱۳۶)

۱۸۷۔ مرتضیٰ، مولوی حکیم مرتضیٰ رام پوری (وفات جولائی ۱۹۰۶ء) "نظم المعجزات النبوی" لکھی۔ (تذکرہ کاملان رام پور: ۳۰۵)

۱۸۸۔ مرتضیٰ، مرتضیٰ خاں رام پوری (ولادت ۱۲۶۶ھ) "نعت شریف کہنے کا شوق ہے، یہی مشغلہ یہی ذوق ہے" اردو کے علاوہ فارسی میں بھی نعتیں کہی ہیں، نمونہ!

نام پیمبر نقش ہے دل پر، وصفِ نبی ہے سب کی زباں پر
وردِ یہی ہے سب کا برابر، صلی اللہ علیہ وسلم

(انتخاب یادگار: ۳۳۹)

۱۸۹۔ مست، شاہ معین، فضل رسول قادری بدایونی [صفر ۱۲۱۳ھ۔ ۲ جمادی الثانی ۱۲۸۹ھ] عربی، فارسی اور اردو سب زبانوں میں آپ کا کلام برکت التیام موجود ہے، مگر چونکہ قصد جمع کرنے کا نہ ہوا، لہٰذا وہ آپ کے معتقدین کے پاس متفرق رہا۔ اکثر کلام حضرتِ اقدس کا رنگِ تصوف و نعت شریف حضور سید انام و مدحِ اصحابِ کرام اہلِ بیتِ عظام و اولیائے عظام میں ہے" (اکمل التاریخ ۲: ۱۶۹)

۱۹۰۔ مسعود اختر جمال بریلوی [حیات ہیں] "ارمغانِ نعت" میں ایک نعت شامل ہے (ص ۲۴۴)

۱۹۱۔ مسلم الحریری بنارسی [حیات ہیں] "ارمغان نعت" میں ان کی بھی ایک نعت شامل ہے۔ [ص ۲۴۸]

۱۹۲۔ مسلم، محمد مسلم اعظم گڑھی۔ حالات معلوم نہیں۔ ان کی ایک نعت "گلدستہ نعت" میں نظر سے گزری۔ (ص ۹۰)

۱۹۳۔ مضطر، سید محمد افتخار حسین خیرآبادی (وفات ۲۹ مارچ، ۱۹۲۷ء) [جہاں تک نعت نگاری کا تعلق ہے] دبستانِ لکھنؤ میں محسن کاکوروی کے بعد مضطر ہی کا نام سب سے نمایاں نظر آتا ہے۔ ایک مطبوعہ دیوان "نذرِ خدا" کے عنوان سے شائع ہوا تھا لیکن عام طور پر نہیں ملتا۔ نعتیہ کلام میں بعض چیزیں بہت مشہور ہیں۔ مثلاً وہ نعتیہ مسدس جس کا مشہور مصرع ہے ع سبز گنبد کے مکیں، میری مدد فرمائیے

یا وہ نعتیہ غزل جس کا مطلع ہے ؎

ملنا تھا تو مل جاتے اُس نورِ مجرّد سے      کیوں جا کے چلے آئے دربارِ محمدؐ سے

(لکھنؤ کا دبستان شاعری: ۴۳۹)

۱۹۴۔ مضطر، رام کشن گکھڑوی (حیات ہیں) انھوں نے چند نعتیں کہی ہیں۔ (جگن ناتھ آزاد)

۱۹۵۔ مظہر، محمد مظہر الحق شاہجہاں پوری "اکثر نعت شریف کہتے ہیں" [یادگار ضیغم: ۳۱۰]

۱۹۶۔ مظہر (تاج الفحول) شاہ مظہر حق عبدالقادر محب الرسول بدایونی "شاعرانہ دماغ کے ثمرات چار دیوان ہیں جو نعت و مناقب میں ہیں۔ ایک عربی کا دیوان ہے، ایک فارسی کا، دو اردو کے" (اکمل التاریخ ۲: ۲۱۸)

۱۹۷۔ مقبول، مقبول احمد رام پوری "نعت شریف اکثر کہتے ہیں" (یادگار ضیغم: ۳۲۲)

۱۹۸۔ منظور، محمد منظور احمد بدایونی "اکثر نعت شریف کہتے ہیں" (یادگار ضیغم: ۳۱۴)

۱۹۹۔ نتج، راجیندر بہادر فتح گڑھی۔ (حیات ہیں) ان کی ایک نعت "ارمغان نعت" میں نظر سے گزری ؎

مذہب و قوم سے محدود نہیں فیضِ رسولؐ      جھک گئی سارے زمانے کی جبیں آج کی رات

(ارمغان نعت: ۱۹۹)

۲۰۰۔ مہر، سید مہربان علی بریلوی (حیات در ۱۲۹۰ھ) "بادۂ عشقِ خواجۂ ہر دوسرا جنابِ رسالت مآب محبوبِ خدا علیہم الصلوٰۃ والسلام والتحیۃ والثنا سے مست رہتے ہیں۔ کسی کے شاگرد نہیں،

محسن اپنے ذوق سے نعت میں شعر کہتے ہیں ؎

خاک کوچے کی ترے، ہاتھ گر آئی ہوتی ۔۔۔ سرمے کی طرح سے آنکھوں میں لگائی ہوتی

گل جس کو لوگ کہتے ہیں ہے آپ کا عرق ۔۔۔ کہتے ہیں جس کو عطر وہ بو مصطفیٰ کی ہے

[انتخاب یادگار: ۳۷۰]

۲۰۱۔ نادرؔ، نواب کلب حسین خان بنارسی۔ "نظم نادر" کے نام سے حمد و نعت و منقبت کا مجموعہ ۱۸۵۱ء میں طبع ہوا۔

۲۰۲۔ نازشؔ، پرتاب گڑھی (حیات ہیں) "ارمغانِ نعت" میں ان کی ایک نعت شامل ہے۔

[ارمغان نعت: ۲۶۲]

۲۰۳۔ ناسخؔ، شیخ امام بخش لکھنوی (وفات ۱۲۵۴ھ) کلیات ناسخ کی ایک نعتیہ غزل کا شعر ہے ؎

دکھا اس کو جہاں میں غل ہے جس کی آمد آمد کا

الٰہی ہوں بہت مشتاق دیدارِ محمدؐ کا

۲۰۴۔ ناطقؔ، ابوالحسن گلاوٹھوی (حیات) ان کی ایک نعت "ارمغانِ نعت" [ص ۲۶۰] میں نظر سے گزری۔

۲۰۵۔ ناظرؔ، محمد ناظر حسین بلاس پوری ثم رام پوری۔ دیوانِ عاشقانہ و نعتیہ قریب اختتام ہے۔

[یادگارِ ضیغم: ۳۴۲]

۲۰۶۔ ناظمؔ، حکیم قمر الدین اکبر آبادی ثم بھوپالی "نعت اکثر کہتے ہیں"۔ [یادگار ضیغم: ۳۳۸]

۲۰۷۔ نامیؔ، منشی نعیب کشور جینی سہارن پوری (ولادت ۱۸۷۴ء، حیات در ۱۹۳۲ء) آپ کی ہر غزل میں ایک مطلع نعتیہ ضرور ہوتا ہے ؎

آیا جو نام پاک محمدؐ زبان پر ۔۔۔ صلِّ علیٰ کا شور اٹھا آسمان پر

[بہار سخن: ۳۶۴]

۲۰۸۔ نثارؔ اٹاوی۔ "ارمغان نعت" میں، ص ۲۶۱ پر ان کی ایک نعت درج ہے۔

۲۰۹۔ ندرتؔ کانپوری۔ ان کی منفرد ایک نعت نظر سے گزری۔ [ارمغانِ نعت: ۲۶۲]

۲۱۰۔ نذیرؔ، حکیم نذیر احمد بنارسی۔ انھوں نے نعتیہ قصائد کے علاوہ نعتیہ غزلیں بھی کہی ہیں۔

* "ارمغانِ نعت" میں بھی ایک نعت نقل ہوئی ہے۔ [ص ۲۴۶]

۲۱۱۔ نسیم، مولانا نسیم احمد فریدی امروہوی۔ بڑی والہانہ نعتیں کہتے ہیں ؎

متاعِ عشقِ نبی سے بڑھ کر کوئی بھی شے دائمی نہیں ہے
متاعِ دنیا کا کیا بھروسا، ابھی تو ہے اور ابھی نہیں ہے

۲۱۲۔ نسیم، نسیم احمد عباسی امروہوی۔ اِن کی نعتوں کا ایک غیر مطبوعہ مجموعہ ہے (ظلّ عباس عباسی)

۲۱۳۔ نشور، واحدی کانپوری، (حیات ہیں) ایک نعت دیکھنے میں آئی [ارمغانِ نعت: ۲۵۷]

۲۱۴۔ نظام، نواب محمد مردان علی خاں مرادآبادی (وفات ۱۸۷۹ء) "مہرِ نبوت" میں نعت، منقبت، سلام وغیرہ شامل ہیں اور یہ "کلیاتِ نظام" (مطبوعہ نول کشور پریس، دسمبر ۱۸۷۵ء) کا ایک حصّہ ہے۔ [تلامذۂ غالب: ۲۸۴]

۲۱۵۔ نظر، سیہوروی۔ نام معلوم نہیں "گلدستۂ نعت" میں صفحہ ۴۴ پر ان کی ایک نعت دیکھی۔

۲۱۶۔ نظیر، میاں ولی محمد، اکبرآبادی۔ (وفات ۱۸۳۰ء) کلیاتِ نظیر اکبرآبادی میں دو نعتیہ مخمس ہیں، جن کے مطلع حسبِ ذیل ہیں۔

(۱) تم شہِ دنیا و دیں ہو، یا محمد مصطفٰے — سرگروہِ مسلمیں ہو، یا محمد مصطفٰے
حاکمِ دینِ متیں ہو، یا محمد مصطفٰے — قبلۂ اہلِ یقیں ہو، یا محمد مصطفٰے
رحمۃٌ للعالمیں ہو یا محمد مصطفٰے

(۲) رکھا اپنے دل میں بابائے آدم کے بن کلمہ محمد کا — اور اپنی انگلیوں پر پھر بھی گن کلمہ محمد کا
پڑھے ہیں سب پری اور دیو جن کلمہ محمد کا — مسلماں ہو تو مت بھول ایک چھن کلمہ محمد کا
پڑھا کر صدقِ دل سے رات دن کلمہ محمد کا

[کلیاتِ نظیر اکبرآبادی: ۳۸۵۔۳۸۱]

۲۱۷۔ نفیس، قاری درود الحسن لکھنوی۔ "ارمغانِ نعت" میں صفحہ ۲۵۸ پر ایک نعت درج ہے۔

۲۱۸۔ نوح، محمد نوح ناروی (۱۸۷۸ء۔ ۱۹۶۲ء) کچھ نعتیں لکھی ہیں۔ ایک "ارمغانِ نعت" میں درج ہے (ص: ۱۳۸)

۲۱۹۔ نیاز، شاہ نیاز احمد بریلوی (۱۷۵۹ء۔ ۱۸۳۴ء) اِن کی بھی نعت درج "ارمغانِ نعت" ہے۔ [ارمغانِ نعت: ۱۱۵]

۲۲۰۔ والی آسی لکھنوی (بحیات ہیں) "ارمغان نعت" کے مرتبین میں ہیں۔ ایک نعت "ارمغانِ نعت" میں ہے [ص: ۲۶۶]

۲۲۱۔ وحشت، مولوی احمد حسین بدایونی۔ آپ کا کلام نعت و منقبت اکثر محافل میلاد شریف میں پڑھا جاتا ہے [اکمل التاریخ: ۴۹]

۲۲۲۔ وحید، رائے بریلوی۔ حالات اور نام معلوم نہیں۔ ایک نعت نظر سے گذری (ارمغانِ نعت: ۲۶۵)

۲۲۳۔ وہبی، شیو پرشاد لکھنوی۔ ان کی نعتیں "ارمغانِ نعت" اور "گلدستۂ نعت" میں درج ہیں۔ [ارمغانِ نعت: ۱۲۹ و گلدستۂ نعت: ۱۷]۔

۲۲۴۔ ہوش، نیاز احمد خاں روہیلکھنڈی ثم لکھنوی ثم کانپوری ثم حیدرآبادی۔ تیرہ چودہ برس کی عمر میں "معراجیہ نعت" نظم کیا۔ [یادگارِ ضیغم: ۳۶۵]

۲۲۵۔ یاور، لکھنوی۔ ایک نعت "گلدستۂ نعت" میں صفحہ ۱۲۴ پر درج ہے۔

۲۲۶۔ یحییٰ اعظمی۔ (حیات ہیں) ذی علم نعت نگاروں کے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک نعت "ارمغانِ نعت" میں نظر سے گذری (ص: ۲۶۸)

۲۲۷۔ یکتا، قاضی عبدالرشید بستوی۔ ان کی دو نعتیں "گلدستۂ نعت" میں نقل کی گئی ہیں (ص: ۹ و ۱۰۲)

## کتابیات


۱۔ مجموعۂ نغز: میر قدرت اللہ قاسم مرتبہ حافظ محمود شیرانی (کریمی پریس لاہور، ۱۹۳۳ء)

۲۔ تذکرۂ شعرائے اردو: میر حسن دہلوی مرتبہ حبیب الرحمٰن شیروانی (لطیفی پریس دہلی، ۱۹۴۰ء)

۳۔ عمدۂ منتخبہ: اعظم الدولہ سرور مرتبہ خواجہ احمد فاروقی (ادبی پرنٹنگ پریس، بمبئی، ۱۹۶۱ء)

۴۔ ریاض الفصحا: غلام ہمدانی مصحفی مرتبہ عبدالحق (مطبع اردو باغ، اورنگ آباد، ۱۹۳۹ء)

۵۔ یادگارِ ضیغم: محمد عبداللہ خاں ضیغم (مطبع قادری، حیدرآباد دکن، ۱۳۰۲ھ)

۶۔ ارمغانِ نعت: مرتبہ ساجد صدیقی و والی آسی (شاہی پریس، لکھنؤ، مئی ۱۹۶۲ء)

۷۔ گلدستۂ نعت: مرتبہ ظلِ عباس عباسی (مطبوعہ بمبئی)

۸۔ جلوۂ خضر: سید صفیر احمد صفیر بلگرامی (مطبع نور الانوار، آرہ، ۱۸۸۵ء)

۹۔ انتخاب یادگار: امیر احمد امیر مینائی (تاج المطابع، رام پور، ۱۹۲۷ء)

۱۰۔ تذکرۂ کاملانِ رام پور: حافظ احمد علی خان شوقؔ (ہمدرد پریس، دہلی، ۱۹۲۹ء)

۱۱۔ حاشیۂ خمخانۂ جاوید: مالک رام [قلمی]

۱۲۔ خمخانۂ جاوید: سری رام [۱ تا ۵] (نول کشور پریس، لاہور۔ وغیرہ، ۱۹۰۸۔۱۹۴۰ء)

۱۳۔ لکھنؤ کا دبستانِ شاعری: ابواللیث صدیقی۔ (گیلانی پریس لاہور، طبع دوم، سنہ ندارد)

۱۴۔ مرآۃ الشعراء: محمد یحییٰ تنہا (تعلیمی پریس لاہور، ۱۹۵۰ء)

۱۵۔ اکمل التاریخ: محمد یعقوب ضیاؔ بدایونی (مطبع قادری بدایوں، ۱۳۳۲ھ)

۱۶۔ تاریخ شیرازِ ہند، جونپور: سید اقبال احمد (نامی پریس لکھنؤ، ۱۹۶۳ء)

۱۷۔ دبستانِ دبیر: ذاکر حسین فاروقی (الواعظ منصور پریس، لکھنؤ، مئی ۱۹۶۶ء)

۱۸۔ تلامذۂ غالب: مالک رام (کوہ نور پرنٹنگ پریس، دلی، ۱۹۵۷ء)

۱۹۔ انتخاب زریں: سر سید راس مسعود (نظامی پریس، بدایوں، ۱۹۳۷ء، بار سوم)

۲۰۔ تذکرۂ مسرت افزا: ابوالحسن امیر الدین احمد عرف امراللہ الہ آبادی، مرتبہ قاضی عبدالودود
(مشمولہ "معاصر" پٹنہ ۱۹۵۴ء)

۲۱۔ تذکرۂ مشاہیر کاکوری: مولوی حافظ محمد علی حیدر علوی کاکوروی (اصح المطابع، لکھنؤ، ۱۹۲۷)

۲۲۔ مختصر تاریخ ادب اردو: ڈاکٹر سید اعجاز حسین یونین پرنٹنگ پریس، دلی، ۱۹۵۲ء

۲۳۔ تذکرۂ صبح گلشن، سید علی حسن خان (مطبع شاہجہانی، بھوپال، ۱۲۹۵ھ)

۲۴۔ بیاضِ سخن: عبدالشکور شیداؔ (زندۂ طلسمات فائن آرٹ پریس، حیدرآباد دکن، ۱۳۵۵ھ)

۲۵۔ تذکرۃ الکرام: محمود احمد عباسی (محبوب المطابع، دلی، غالباً ۱۹۳۲ء)

۲۶۔ شمیمِ سخن: محمد عبدالحی صفاؔ بدایونی (مطبع عین الہند و عین الاخبار، مرادآباد، ۱۳۰۱ھ/۱۸۸۴ء)

۲۷۔ سخن شعرا: عبدالغفور نساخ (نول کشور پریس، لکھنؤ، ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء)

۲۸۔ گلستانِ بیخزاں: حکیم سید قطب الدین باطنؔ (نول کشور پریس، لکھنؤ، ۱۲۹۱ھ)

۲۹۔ اردو کے ہندو ادیب: [مشیر احمد علوی] ناظر کاکوروی (یونائیٹڈ انڈیا پریس، لکھنؤ، ۱۳۴۸ھ/۱۹۲۹ء)

۳۰۔ بہارِ سخن: بابو شیام سندر برقؔ (ایل بی پریس، سیتاپور، غالباً ۱۹۳۲ء)

۳۱۔ کلیاتِ نظیر اکبرآبادی، مرتبہ آسی اُلدنی (نول کشور پریس، ۱۹۵۱ء)

۳۲۔ تذکرۂ نادر، نواب کلب حسین خان نادر، مرتبہ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب سرفراز پریس لکھنؤ، ۱۹۵۷ء)

۳۳۔ تذکرۂ ماہ و سال، مالک رام (قلمی)

۳۴۔ یادگارِ شعرا: ڈاکٹر اشپرنگر مرتبہ طفیل احمد سٹی پریس الہ آباد، ۱۹۴۳ء)

۳۵۔ جدید شعرائے اردو، ڈاکٹر عبدالوحید (فیروز سنز پاکستان، سنہ ندارد)

۳۶۔ کلامِ انشا مرتبہ مرزا محمد عسکری و محمد رفیع، ہندستانی اکیڈمی الہ آباد، ۱۹۵۲ء

## مراسلہ

محترمی، تسلیم

"تحریر" کے پہلے شمارے میں میر ضمیر لکھنوی سے متعلق میرا جو مضمون شائع ہوا ہے، اس کے آخر میں چند سطریں 'استدراک' کے عنوان سے درج ہیں۔

اس سلسلے میں کرمی پروفیسر سید مسیح الزماں نے میری توجہ اس حقیقت کی طرف منعطف کرائی ہے کہ مشار الیہ کرم خوردہ مرثیہ دراصل ایک دوسرے مرثیے کا چوتھا بند ہے۔ اس مرثیے کا مطلع ہے:

ہاں، ساکنانِ ارض و سما، فکرِ غم کرو

یہ مرثیہ مطبوعہ جلد میں موجود ہے۔

پروفیسر مسیح الزماں کا خیال ہے کہ پروفیسر رضوی ادیب کے ذاتی کتابخانے میں ضمیر کے جو غیر مطبوعہ مراثی ہیں اور جن کی فہرست میں نے اپنے مضمون میں دی ہے، ان میں بھی ایسی الٹ پھیر کے امکانات ہیں۔ کچھ مرثیے تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ مکرر درج ہو گئے ہیں۔

نیاز کیش

علی جواد زیدی

بنسی لال گپتا

# ڈوگری زبان

## ایک لسانی تعارف

ہندستانی یا ہندی کو اس کی سب بولیوں سمیت اگر واحد زبان مان لیا جائے اور اس کا ایک لسانی خط متعین کیا جائے، تو معلوم ہوگا کہ یہ بھاشا چاروں طرف کئی زبانوں سے گھری ہوئی ہے جو اسے دوسری زبانوں سے جدا رکھتے ہوئے بھی، متاثر کرتی رہتی ہیں اور خود بھی اس سے متاثر ہوتی ہیں۔ ان زبانوں میں اگر ہم پچھم سے شروع کریں، تو مراٹھی، گجراتی، سندھی، شمال میں پنجابی، ڈوگری، پہاڑی؛ مشرق میں اڑیا، بنگلا اور دکھن میں آدمی باسیوں کی بولیاں ہیں جن کا دراوڑی الن سے زیادہ تعلق ہے۔

طرح ڈوگری بھاشا کو ہندی کی ایک سرحدی زبان کہا جا سکتا ہے۔ یہ ریاست کشمیر کے ڈگر، ہماچل پردیش کے اضلاع کانگڑہ، چمبہ اور اس کے گرد و نواح میں بولی جاتی ہے ی کے شمال میں رام بنی اور پوگی بولیاں ہیں جو کسی حد تک کشمیری سے اور زیادہ تر ڈوگری سے تی ہیں۔ شمال مشرق میں بھدرواہی بولی ہے جو بھی پہاڑی ہی کا ایک گروپ ہے۔ ڈگر کے میں پنجابی زبان ہے، جس کا ڈگر کے شہروں میں بولی جانے والی ڈوگری پر خاص اثر ہے۔ با میں چبالی اور پوٹھوہاری بولیاں ہیں جو کچھ پنجابی یا لہندا سے ملتی ہیں۔

# ڈوگری زبان

ڈوگری کی اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ رام بن، پوگل، بھدرواہی، پہاڑی، پنجابی اور پوٹھوہاری لکھنے میں نہیں آتیں اور ادبی روایات سے عاری ہیں، اس سارے علاقے کی واحد مقامی ادبی زبان ڈوگری ہے۔ مشہور ماہر لسانیات ڈاکٹر سید میشور نما لکھتے ہیں:[1]

"معلوم تو یہ ہو رہا ہے کہ موجودہ ڈوگری ایک عظیم زبان کا کھنڈر ہے۔"

بقول ان کے اس کی تائید تاریخ سے بھی ہوتی ہے۔ گریرسن اپنے "سروے" کی تمہید کے پہلے صفحے ہی میں لکھتے ہیں کہ امیر خسرو نے بھارت کی بولیوں کی جو فہرست دی تھی اُس میں دلّی کی زبان کے بعد ڈوگری بھاشا کا ذکر تھا۔ سیکڑوں سال بعد انگریزی راج میں پادری کیری (carey) نے بھی انیسویں صدی کے پہلے حصے میں اس طرح کی فہرست بنائی تھی، اس میں بھی دلّی کی زبان کے بعد ڈوگری کا مقام تھا۔

رسم الخط

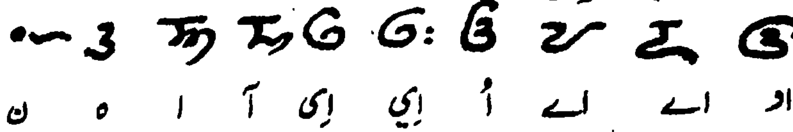
ڈوگری کا اپنا رسم الخط ہے، جو صدیوں پرانا ہے۔ یوں اس علاقے میں کئی ایک رسم الخط رائج ہیں جنھیں ٹاکری یا ٹکری کہتے ہیں۔ گریرسن کا خیال ہے کہ شاردا اور ٹاکری ایک ہی رسم الخط سے مشتق ہیں۔ اس کے برخلاف ڈولنر کے نزدیک ٹاکری اور متعلقہ رسم الخط شاردا سے نکلے ہیں۔ ڈوگری رسم الخط کی جسے کچھ دن پہلے تک 'پرانی ڈوگری' کہا جاتا تھا، خاصیت یہ ہے کہ اس کے حروف الفاظ کے شروع میں ہوں وسط یا اختتام پر سب جگہ ایک ہی طرح سے لکھے جاتے ہیں، بالکل رومن حروف کی طرح۔ اس میں نہ کبھی دُہرے حروف لکھے جاتے ہیں، نہ آدھے۔ اس میں حروف مصوتوں کی علامتیں (اعراب) بھی نہیں ہیں۔ رسم الخط کی بنیاد حروف پر ہے، آواز کے رکنوں (syllables) پر نہیں ظاہر ہے کہ اس قسم کا رسم الخط موجودہ طباعت کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ اسے حسنِ اتفاق کہیے کہ ڈوگری میں طول کی علامت (:) اور علامتِ النفی (–) وہی ہیں۔ جو آج بین الاقوامی صوتی رسم الخط میں استعمال ہو رہی ہیں۔

---

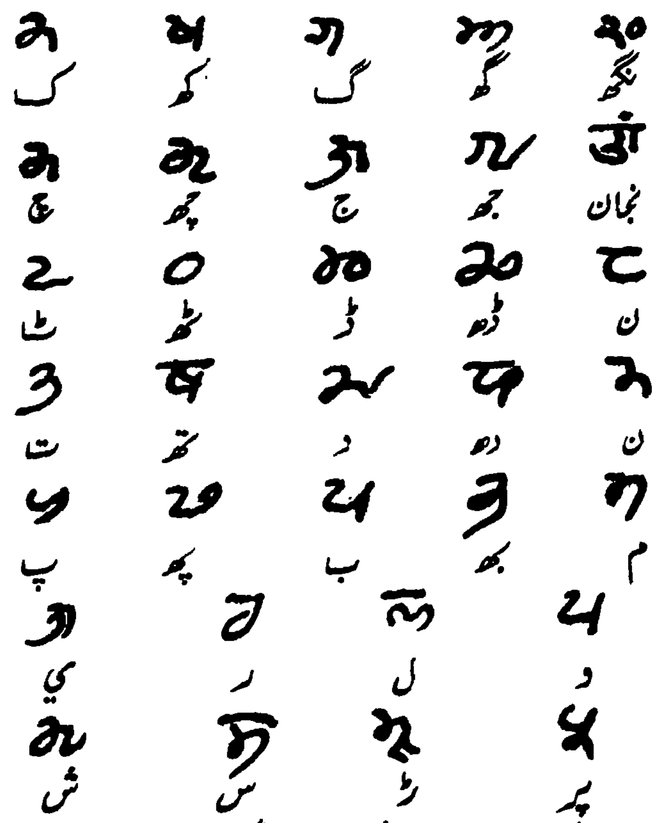
۱۔ ڈوگری بھاشا اور ویاکرن صفحہ ۔ ۷

## حروف تہجی

### (الف) مصوّتے




### (ب) مصمتّے




یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ 'ج' اور 'ي' کے لیے الگ الگ حروف نہیں ہیں، بلکہ ان دونوں کی آواز ایک ہی حرف سے ظاہر کی جاتی ہے؛ 'ب' اور 'و' کا بھی یہی حال ہے۔ شاید سب سے اہم بات یہ ہے کہ 'ہ' کا شمار مصوّتوں میں ہے۔ یہ ڈوگری صوتیات کا خصوصی امتیاز ہے۔

دیوناگری میں 'رِی' (ऋ) اور 'لِری' (ऌ) کو مصوّتوں کی فہرست میں لکھنے کی روایت چلی

آرہی ہے، حال آنکہ ان کے مصوتی تلفظ کی اس وقت کوئی شہادت نہیں ملتی۔ ڈوگری میر
ایسا نہیں ہے۔ ڈوگری میں 'ہ' کا مصوتوں میں شمار قدیم زبان دانوں کے لسانی تفحص و تامل
مثال ہے۔ ڈوگری میں 'ہ' اکثر اس طرح سے بولا جاتا ہے کہ سننے میں 'الف' معلوم ہوتا ہے او
اس میں پورے مصوتی اوصاف ہیں۔

ڈوگری میں کچھ آوازیں ایسی بھی ہیں جن کے مترادفات ہندی وغیرہ میں نہیں ہیں۔ مثلاً اینڈ
(اینٹ)، لیٹ (زلف)۔ اسی طرح 'دودھ' اور سوٹ پھینک۔ ڈوگری رسم الخط میں ان
آوازوں کے لیے الگ سے کوئی حرف نہیں ہے۔ اس لیے یہ مخصوص آوازیں کبھی حرف 'ای' اور کبھ
حرف 'اے' سے ظاہر کی جاتی ہیں۔ ان مصوتی آوازوں کی تحریر میں کوئی باقاعدگی نہیں ہے۔ قد
ڈوگری رسم الخط میں مصوتی علامات یا اعراب نہیں ؛ غالباً اسی وجہ سے یہ بے یقینی کی صورر
کسی حد تک بعد کو بھی باقی رہ گئی۔

کوئی ایک سو برس ہوئے، ریاست جموں کشمیر میں ڈوگری رسم الخط کی اصلاح کی کوشش ہو
اس کا مقصد ڈوگری کو دیوناگری کے مطابق بنا کر اس میں ماترائیں (اعراب) کا شامل کرنا تھ
سرکاری دستاویزوں میں تو نئے رسم الخط کا استعمال بھی ہونے لگا تھا، لیکن عوام میں نیا رسم الخط
رائج نہ ہو سکا۔ آج بھی بیوپاری گاؤں اور پہاڑوں میں اپنی روزمرہ کی خط و کتابت اور بہی کھات
پرانے رسم الخط ہی میں کرتا ہے۔

ملک میں قومی تحریک اور آزادی کے ساتھ عوام میں نئی ثقافتی اور ادبی بیداری آئی۔ اس بیداری کے
جلو میں علاقائی زبانوں کی اہمیت بھی تسلیم کی گئی۔ چنانچہ مقامی لوگوں نے ڈوگری کی اہمیت کا
بھی اندازہ کیا اور اسے عوام میں ثقافتی، سیاسی تحریک کا ذریعہ بنایا۔ اس تحریک کا ایک اثر یہ ہوا
کہ کچھ مصلحتوں کو دیکھتے ہوئے، جس میں طباعت کی سہولت بھی شامل ہے، ڈوگری نے اپنا
رسم الخط ترک کر کے دیوناگری کو اپنایا۔ ویسے کسی دوسرے رسم الخط کے استعمال پر بھی روک
نہیں ہے۔ ڈوگری کا موجودہ ادب تقریباً نوے فی صد دیوناگری میں طبع ہوا ہے اور کوئی دس
فی صد فارسی رسم الخط میں۔

زبانوں کی فطرت ان کی خصوصی صوتیات سے ظاہر ہوتی ہے۔ زبان یا بولی میں اتنی زیادہ آوازیں

ہوتی ہیں کہ ان سب کے لیے الگ الگ حروف یا علامتیں مقرر کرنا ممکن نہیں ہو سکتا۔ اس لیے بسا اوقات بہت سے حروف نہ صرف خاص خاص آوازیں ظاہر کرتے ہیں، بلکہ اپنی نزدیک کی آوازیں بھی انھیں کے ذریعہ سے ادا کی جاتی ہیں۔ ایک مثالی لسانی نظام میں ہونا یہ چاہیے کہ جب معمولی صوتی فرق سے معنوں میں تبدیلی پیدا ہو جاتی ہو تو ان سب کے لیے الگ الگ حروف ہوں اور اگر کوئی فرق نہ ہو، تو اسے آواز کا ایک صوتی رُوپ مان لیا جائے۔

مخارج اور ان کی ہیئت وغیرہ کی بنا پر آوازوں کو کئی طرح پر تقسیم کیا گیا ہے۔ سب سے اہم دو قسمیں ہیں:

۱۔ مصوّتے
۲۔ مصمّتے

جو آواز کسی دوسری آواز کی مدد کے بغیر نکالی جا سکے، اور جس کے اظہار میں کسی طرح کی بندش، رگڑ یا ٹھیک پیدا نہ ہو اور جسے کوئی جتنا چاہے لمبا کھینچ لے، وہ مصوّتہ ہے۔ جیسے آ.... آ..، اُو..... اُو.....

مصوّتوں کی بھی کئی قسمیں ہیں، جن کے تفصیل بیان کی یہاں ضرورت نہیں ہے، ہندی یعنی کھڑی بولی کے گیارہ مصوّتوں کے مقابلے میں ڈوگری میں سولہ مصوّتے ہیں۔ جنھیں بین الاقوامی رسم الخط میں اس طرح سے ظاہر کیا جا سکتا ہے:

| حروف | آواز | مثال | معنی |
|---|---|---|---|
| ا | ʌ | اکرا | کڑوا |
| ا | ʌ: | آتّ | بالکل |
| اِیَہ | ə | لیٹ (ذِلت) | (آخری آواز) |
| آ | a | آکھے | (ایک جنگلی پھل) |
| اِ | I | اِتّا | (اتنا) |
| اِی | i | اِیاں (اس طرح) | رینی (ضد) |
| اُ | U | اُکّا | (بالکل) |

| | | |
|---|---|---|
| اُ | u | اُوت (موڑکر) کُون (بولنا) |
| ایہ | e | ایجلا (ظاہر کی محبت دکھانے والا) |
| او | o | اوپرا (سطحی) کھوبا (دلدل) |
| اَیہ | ɛ | اَیت (اس میں) |
| اَو | ɔ | اودا (اس کا)، سُٹ (پھینک) |
| اَیۂ | E | ایتا (بالکل یا ٹھیک وقت کر) تینتھی (بال کی کھال اتارنا) |
| آو | ãũ | آؤتر (اولاد) آؤکھا (لاچار) |
| ں | ~ | کاں (کوّا) |
| ھ | A.v | گھر ہتھ (ہاتھ) |

## مصمتے

مصمتوں کو بولنے میں کسی مصوّتے کی مدد درکار ہوتی ہے، اور ان کے تلفظ میں بندش، رگڑ یا تھپک کا استعمال ہوتا ہے۔ ڈوگری میں مندرجہ ذیل مصمتے ہیں۔

| حروف | آواز | مثال | معنی |
|---|---|---|---|
| ک | K | کن | کان |
| کھ | kh | کھل | نیچے |
| خ | x | بکھتاں | میں نے کہا |
| گ | g | گندل | نرم شاخ |
| گھ | K.v | گھگو | سائرن |
| ن | ŋ | نگھارا | (انگارہ) |
| گ | ɣ | مگی | مجھے |
| چ | tʃ | چچل | کاریگر (عورت) |
| چھ | ch | چھچ | (چھاچ) |
| ج | ʤ | جھپتی | بغل گیر |

| | | | |
|---|---|---|---|
| جھ | c.v | جھاری | حُقّہ |
| نج | ɲ | نجیاناں | چھوٹا بچہ |
| ژ | zh | جاجڑو | پاخانہ |
| ٹ | t | ٹپلا | غلطی۔ بھول |
| ٹھ | th | ٹھار | سردی |
| ڈ | d | ڈکرا | ٹکڑا (گوشت کا) |
| ڈھ | t.v | ڈِھل | نرمی |
| ڑن | ɽ̃ | گُوڑن | بولنا |
| ڑ | ɽ | مڑا | ارے |
| ت | t | | کمی |
| تھ | θ | تھم | سُتون |
| د | d | دلی | پھاٹک |
| دھ | t.v | دھاں | |
| ن | n | نکّ | ناک |
| پ | p | وچ | بات چھپانے کی کوشش |
| پھ | ph | پھکّڑ | فقیر ملآخ |
| ف | f | دھوفہ | دھوکا |
| ب | b | بن تر | صلح۔ دوستی |
| بھ | p.v | بھس | خاک |
| م | m | مکھیر | شہد |
| ی | j | تایا | باپ کا بڑا بھائی |
| ر | r | رت | خون |
| ل | l | لت | بُری عادت |

| | | | |
|---|---|---|---|
| د | [illegible] | موا | کھویا |
| ش | [illegible] | شال | چھلانگ |
| س | [illegible] | نَسگا | سگا |
| ھ | h | ہا | تھا |

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ ایک زبان کے الفاظ کی شکل دوسری زبان میں جا کر تبدیل ہو جاتی ہے اس تبدیلی کو "بگاڑ" کہنا ٹھیک نہ ہوگا۔ اس کے پیچھے بعض لسانی اصول کام کرتے ہیں، اس عمل کا ایک مجلسی پہلو بھی ہے۔ زبان کے عمل کے مکمل طور پر کارگر ہونے کے لیے بولنے اور سننے والوں میں پوری پوری ذہنی ہم آہنگی ضروری ہے۔ اگر کوئی لفظ قاعدے سے مختلف ڈھنگ سے بولا جائے، تو ممکن ہے کہ سننے والا تحتِ شعور میں سوچنے لگے کہ بولنے والا ہمارے لسانی دائرے سے باہر ہے۔ اکثر اس سے لسانی ربط کے قیام میں ایک دیوار سی حائل ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ جب ڈوگری صوتیات کو رسم الخط میں ظاہر کرنا پڑتا ہے تو کئی مسئلے سامنے آجاتے ہیں۔ مثلاً کوئی بھی لفظ 'ھ' سے شروع نہیں ہوتا، لیکن لفظ کے آخر میں ایسی آواز کا اظہار ہوتا ہے۔ جیسے کپاہ۔ کپاس۔ پیہا۔ پیسہ

اسی طرح 'د' شروع میں نہیں آتی، لیکن مُوا، مَوا (کھویا)، سَوا میں یہ آواز صاف ہے۔ الفاظ کے شروع اور بیچ میں 'ھ' سُر (tone) کے ساتھ بولا جاتا ہے جیسے بین الاقوامی رسم الخط میں 'ں'، یا '٦' علامت سے ظاہر کیا جاتا ہے۔

| | | | |
|---|---|---|---|
| ہتھ | ہاتھ | ں | چڑھتی سُر |
| ہائے | ہائے | ں | چڑھتی سُر |
| پہاڑ | پہاڑ | ٦ | اُترتی سُر |
| مھاڑا | میرا | ٦ | اُترتی سُر |

لکھنے کا انداز کچھ بھی کیوں نہ ہو، کوئی لفظ جب 'آ'، 'اُو'، 'اے'، 'اِ'، 'یئے'، 'او' اور 'اؤ' سے شروع ہو یا یہ آوازیں کسی لفظ کے بیچ میں آئیں، تو آخری مصمتہ بولا جائیگا۔

| | |
|---|---|
| آمبا | ہاتھ کی رسائی |

| | |
|---|---|
| اِین | غیرت |
| پُور | ایک پیمانہ |
| لُور | آوارہ |
| سیک | حرارت |
| سِیک | ترسنا |
| لوڑ | ضرورت |
| تھوڑ | کمی |
| آوَر | رائی |

دیگر الفاظ اکثر مصوتہ پر ہی ختم ہوتے ہیں، جیسے

| | |
|---|---|
| اُت | بالکل |
| اکھّ | آنکھ |
| ککھ | تِنکا |
| بُھتّ | ملاقات |
| نَسّ | دوڑ |

کسی زبان کا خصوصی مزاج سمجھنے کے لیے یہ دیکھنا اکثر مفید ہوتا ہے کہ دوسری زبانوں کے الفاظ اس زبان میں آکر کس طرح بدل جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں ڈوگری کی کچھ خاصیتیں یہ ہیں:

ا ۔ ڈوگری میں 'ر' کا استعمال زیادہ ہے۔ جہاں سنسکرت کے بہت سے الفاظ سے ہندی یا اس سے پہلے پراکرت میں 'ر' غائب ہو گئی، وہیں ڈوگری میں یہ 'ر' جوں کی توں قائم ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

| سنسکرت | ہندی وغیرہ | ڈوگری |
|---|---|---|
| پُتر | پات، پتّہ | پُتّر |
| گرام | گاؤں، گام | گراں |
| ستری | ستری، تی، تیمی | ترمیت |

تامر  تانبہ  تراما

یہی نہیں کہ 'ر' باقی رہ گئی، بلکہ کئی الفاظ میں جن کو اصل میں 'ر' نہیں تھی اس کا اضافہ کر دیا گیا:

| ہندی | | ڈوگری |
| --- | --- | --- |
| سمبندھ | | سر بندھ |
| پسینہ | | پرسا، پرسینہ |
| پیہولی | (چیونٹی) | پرپُولی |
| توڑ | | تروڑ |
| دوڑ | | درُوڑ |

۲۔ ڈوگری میں کوئی لفظ 'و' سے شروع نہیں ہوتا۔ دوسری زبانوں کے جو 'و' والے الفاظ ڈوگری میں استعمال ہوتے ہیں، ان کا 'و' بھی 'ب' سے بدل جاتا ہے:

| | | |
| --- | --- | --- |
| ورش | (برس، سال) | برا |
| ویلا | (وقت) | بیلا |
| ویہڑا | (آنگن) | بیڑا |

یہ صورت حال کئی اور بولیوں اور زبانوں میں بھی دیکھنے میں آتی ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ 'ب' اور 'و' دونوں شفائی حرف ہیں اور ان کے ادا کرتے وقت ذرا سی بے احتیاطی ایک کو دوسرے میں تبدیل کر دیگی، اور متواتر اسی طرح بولتے رہنے سے تلفظ اور ہجا دونوں پختہ ہو جائینگے۔ کئی الفاظ میں 'و' ساقط بھی ہو جاتا ہے:

| | |
| --- | --- |
| وہ | او |
| والا | آلا |
| اماوسیہ | آنس |

یا پھر 'و' کو 'م' میں بدل دیا جاتا ہے:

| | | |
| --- | --- | --- |
| نواں | (۹) | نوماں |
| نواں | (نیا) | نماں |

۳ ۔ اسی طرح کوئی بھی لفظ 'ی' سے شروع نہیں ہوتا۔ ابتدائی 'ی' ہمیشہ 'ج' میں بدل جاتی ہے:

| | |
|---|---|
| یاترا | جاترا |
| یتی | جتی |
| یگتی | (تدبیر) جُگت |

۴ ۔ تلفظ کے لحاظ سے کئی الفاظ اس لیے اہم ہیں کہ وہ غیر معمولی انفی صوتیات سے شروع ہوتے ہیں:

| | | |
|---|---|---|
| ںگھارا | ङगारा | انگارہ |
| ںگھُور | ङूर | کونپل |
| ںگھورا | ङूरा | ہامی بھرنا |
| ںجاراں | ञारां | گیارہ |
| گُنگنجناں | ङुङगुंआ | جو ناک سے بولتا ہو۔ |

۵ ۔ الفاظ اور جملوں کے حصوں میں جنسیائی عمل ( syncopation ) اس قدر زیادہ ہے کہ جو لوگ صرف الفاظ سے واقف ہوں کئی مرتبہ صحیح معنی سمجھ نہیں سکتے۔ اس عمل میں 'ک'، 'ہ'، 'ن' اور کئی ایک مصوتے خارج ہو جاتے ہیں:

| | | |
|---|---|---|
| جاکہدا | جاردا | جارہا ہے۔ |
| نساکردے | نساردے | بھاگ رہے |

اگر پہلے لفظ میں طویل مصوتہ ہو، تو اکثر وہ مختصر کر کے بولا جاتا ہے یا کئی بار غائب بھی ہو جاتا ہے۔

| | |
|---|---|
| جان ہوگ | جنوگ |
| سَون سوندا | سنوندا |
| کھان سوندا | کھنوندا |

اگر پہلے لفظ میں کوئی طویل مصوتہ نہ ہو تو عموماً پہلے لفظ کا آخری مصمتہ یا 'ن' لاحقہ غائب ہو جاتا ہے۔

| | | |
|---|---|---|
| بلگن ہوندا | بلگوندا | انتظار کیا جا سکتا |
| ٹُرن ہوندا | ٹروندا | چلا جا سکتا |

ترٹن ہونا ۔ ترٹونا ۔ گرایا جاسکتا

عام بول چال میں کئی علامات فاعلی و مفعولی ( [illegible] ) مختصر ہو جاتی ہیں:

کنتے ۔ نے ۔ (ساتھ) ۔ محارٹے سے نے کھا (میرے ساتھ کھاؤ)

نچ ۔ چ ۔ (بیچ) ۔ گھر سے چ نئیں بھکات، حکمن ناتھیں دی تک

کی ۔ گی ری ۔ (ڈنو) ۔ می دس ۔ مجھے بتاؤ ۔

جب لفظ مصوتے سے شروع ہوتا ہو اور اس کے بعد کوئی طویل مصوتہ یا دہرا مصمتہ آئے، تو شروع کا مصوتہ غائب ہو جاتا ہے:

اناج ۔ ناج

اکھنور ۔ کھنور

اترکھ ۔ ترکھ

آنند ۔ نند

اخروٹ ۔ کھوڑ کھروٹ

اماوسیا ۔ مسیا یا آنس

ایکادشی ۔ کاستی

۶ ۔ جب منفی صفات بنانا مقصود ہو تو شروع میں 'ا' کا نہیں، بلکہ 'ان' کا اضافہ کیا جاتا ہے۔

ان تک ۔ لانتہا

ان ٹرٹ ۔ جو توڑا نہ جاسکے

اس معنی میں 'بے' اور 'نی' کا استعمال بھی ہوتا ہے مثلاً

؟ ۔ بے ابسائی ۔ نا اعتباری ۔ ادشواس (ہندی)

بے نیائیں ۔ بے انصافی ۔ انیائے (")

بے مناسب ۔ نامناسب

نربلا ۔ شفاف صاف (پانی)

نکیما ۔ بے کار

## ڈوگری کا زبان

۷ ۔ جن الفاظ کے شروع کے رکن میں 'او' کی آواز ہو اور اس کے بعد 'آ' کی تو اُن کے ڈوگری روپ میں 'او' کی آواز کی جگہ بدل کر اسے پہلے مصمتے کے بعد کر دیتے ہیں، اور شروع سے اڑا دیتے ہیں۔ اور رسم الخط میں 'او' کی یہ آواز 'وائے' سے ظاہر ہوگی:

| | |
|---|---|
| اُداس | دوآس |
| اُتار | لوَار |
| اُڈاری | ڈواری |
| اُجاڑ | جوآڑ |
| اُپائے | پوآ |
| اُبال | بوآل |
| اولاد | لوآد |

۸ ۔ جب بناشی آواز کے ساتھ غیر بناشی آواز آجائے، تو بعض مصمتوں کی جگہ کبھی بدل جاتی ہے بناشی رغیر بناشی ترتیب ، غیر بناشی، بناشی ترتیب کا روپ دھارن کر لیتی ہے ، اور بعض آوازیں قریب المخارج آوازوں میں کبھی تبدیل ہو جاتی ہیں مثلاً:

| | |
|---|---|
| دیگچی ۔ | دیشکی |
| جاتک ۔ | جاگت (بچہ) |
| نگروٹہ ۔ | نرگوٹہ |
| مُبکچھ ۔ | بُشکا |
| کیچڑ ۔ | چکڑ |
| ایکادشی | کاستی |

کسی بھی زبان میں دوسری زبانوں کے وہی الفاظ قبول کیے جاتے ہیں، جو اس کے صوتیاتی نظام کے لیے قابل قبول ہوں۔ اس کی کئی ایک مثالیں ہیں:

ڈوگری میں یہ الفاظ عام طور سے استعمال ہوتے ہیں:

فرانسیسی سے ۔ کمیدان شسکتر

# ڈوگری زبان

عربی فارسی سے۔ غریب غربا۔ تعطیل۔ طلب (تنخواہ)
توفیق۔ موجب۔ محرم۔ جاجرور (جائے ضرور)
کچھ الفاظ کے معنی بھی قدرے بدل گئے ہیں۔ یہ عمل دوسری زبانوں میں بھی عام طور سے ملتا ہے۔

| اصلی لفظ | ڈوگری شکل | معنی |
|---|---|---|
| مزاج | مجاج | نزاکت |
| دماغ | دماک | غرور |
| نشر | نشر | بدنام |

## صرف و نحو

ہند آریائی زبانوں میں صرف و نحو کی بہت سی باتیں مشترک ہیں، اگرچہ ان میں کہیں کہیں انفرادی خصوصیات بھی پائی جاتی ہیں، اگر ہم یہ تحقیق کرلیں کہ ان زبانوں اور بولیوں میں صرف و نحو کے لحاظ سے کہاں کہاں اختلاف ہے، تو اس کے نتائج ہندوستان کی زبانوں کی تقابلی گرامر مرتب کرنے میں مفید ثابت ہونگے۔ مثال کے طور پر ڈوگری میں علامت فاعلی 'نے' کا استعمال صرف واحد میں ہوتا ہے، جمع کی صورت میں اسے گرادیتے ہیں۔ بلکہ یہاں تک کہ کئی جگہ واحد میں بھی یہ غیر ضروری خیال کیا جاتا ہے۔

جاگتا نے کھوتا کھدیا (یعنی لڑکے نے گدھے کو ہانکا) یا جاگتے کھوتا کھدیا دونوں ٹھیک ہیں۔ لیکن جمع کی صورت میں ہم صرف جاگتیں کھوتا کھدیا (بچوں نے گدھے کو ہانکا) کہینگے، اور یہی ایک صورت ہوگی۔ گویا 'نے' فاعلی کا استعمال واحد کی صورت میں تو اکثر ہوتا ہے لیکن جمع میں کبھی نہیں ہوتا۔

ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ ڈوگری میں مفعولی حالت (passive case) کا استعمال بہت زیادہ ہے۔ دوسری ہمسایہ زبانوں میں مفعولی حالت متعدی فعل (transitive) ہی میں آتی ہے، لیکن ڈوگری غیر متعدی افعال میں بھی یہ شکل پائی جاتی ہے، خاص کر منفی جملوں میں دیکھیے:

سنّونداننئیں = سویا نہیں جاتا
سونداننئیں = ہنسا نہیں جاتا
بلگونداننئیں = رُکا نہیں جاتا

یہاں صرف کی ایک خصوصیت کا ذکر کرتا ہوں :
اکثر ہندستانی زبانوں میں الفاظ متعلق فعل مستقل طور پر ایک ہی شکل میں استعمال ہوتے ہیں۔ انگریزی میں صفت کا رُوپ یکساں رہتا ہے، ہندستانی زبانوں میں اس کی شکل موصوف کی جنس اور تعداد کے مطابق بدلتی رہتی ہے۔ لیکن متعلق فعل الفاظ کا موصوف کی جنس، تعداد اور ظرفیت کے مطابق تبدیل ہوجانا ڈوگری صرف و نحو کا خصوصی امتیاز ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں۔

ہندی ڈوگری

(۱) پرے = گیڈا۔ گیڈی۔ گیڈے۔ گیڈیاں
واحد کی مثال : تُمی گیڈا او، تے لشکڑی بی گیڈی کر۔ (تم بھی پرے ہو اور گٹھڑی بھی پرے کرو)
جمع کی مثال : بسّے جنے گیڈے او۔ (سب لوگ پرے ہٹو)۔
(۲) پیچھے = پچھڑا۔ پچھڑی۔ پچھڑے۔ پچھڑیاں پیچھے چل (مذکر واحد) = پچھڑا چل پیچھے مڑ (مؤنث واحد) = پچھڑی پرت پیچھے بھاگ گئے (مذکر جمع) پچھڑے نسّی گئے پیچھے (واپس) چلی گئیں (مؤنث جمع) پچھڑیاں پرتوئی گئیاں
(۳) قریب، پاس، نزدیک = ریڈا۔ ریڈی۔ ریڈے۔ ریڈیاں
قریب (پاس) آ (واحد مذکر) = ریڈا آ
(واحد مؤنث) = ریڈی آ
قریب (پاس) نہ آؤ (جمع مذکر) = ریڈے نئیں آیئو
(جمع مؤنث) = ریڈیاں نئیں آیئو

اسی طرح 'آج کل' کے لیے بھی 'جوکا'، 'جوکے'، 'جوکی' اور 'جوکیاں'۔ یہ چاروں صورتیں بنیں گی دیکھا گیا ہے کہ الفاظ یا گرامر کی بعض باتوں کے مشترک ہونے کی وجہ سے کچھ لوگ جلد بازی میں

# ڈوگری زبان

ڈوگری کو پنجابی یا کبھی کبھی ہندی کی ایک بولی (یا شکل) کہہ دیتے ہیں کسی حد تک اشتراک پڑوسی زبانوں میں ہونا قدرتی بلکہ ناگزیر ہے۔ لیکن کسی زبان کی مستقل حیثیت کا فیصلہ کرتے وقت ہمیں الفاظ کی ساخت علاماتِ تعریف، جملوں کی بناوٹ وغیرہ کو دھیان میں رکھنا چاہیے۔

ڈوگری قواعد کی جن چند خصوصیتوں کا اوپر ذکر ہوا ہے۔ ان میں اس کا بعض دوسری زبانوں سے اشتراک ہے۔ اب چند ایسے الفاظ دیکھیے، جن میں پنجابی یا کوئی دوسری زبان اس کی شریک نہیں ہے۔

| | | |
|---|---|---|
| باکنا | - | کھولنا (منہ) |
| بلگنا | - | انتظار کرنا |
| بَھڑسیرنا | - | نہلانا (بچے کو) |
| دَبڑ | - | میدان |
| سُرُنڈ | - | اچُھو ہونا |
| سے | - | حجامت (سر کے بالوں کی) |
| سوارت | - | حجامت (ڈاڑھی مونچھ کی) |
| جباتا | - | مُنہ |
| تَلیاں | - | ٹِڈی دل |
| تیتڑین | - | کپڑ گندھ |
| اَکڑین | - | جلے دودھ کی بُو |
| روآ | - | ہوش |
| نینْوں | - | اب تک |
| زینبدارا | - | بُلاوا |
| تسار روڑ | - | سارے خاندان کی دعوت |
| دھام | - | دعوت |

ایسے الفاظ کی فہرست طویل ہو سکتی ہے۔
اگر علاماتِ حالت کو دیکھیں، تو یہاں بھی اختلاف نظر آئیگا۔ مثلاً:

| ہندی | پنجابی | ڈوگری |
|---|---|---|
| کو | نوں | ی، گی |
| ساتھ، سے | نال | کنّے |
| سے | توں، تھوں | کشا، سواں |
| کے لیے | لئی، واسطے | گیتے، تائیں، جوگا |
| ذریعے (دوارا) | دوارا، ولوں | راہیں، آسیہ |

ڈوگری کے اپنے کئی مسائل ہیں جو اس کی خصوصیات کے پیدا کردہ ہے۔ مثلاً تحریر میں اس وقت کچھ مشکلات سامنے آرہی ہیں۔ جیسا پہلے ذکر کیا گیا ڈوگری میں کئی آوازیں ایسی ہیں، جو الفاظ کے شروع میں نہیں بولی جاتیں، صرف درمیان یا آخر میں ان کا استعمال ہوتا ہے۔ جیسے 'ھ'، 'ی'، 'و'، 'خ'، 'ف' ہیں۔ اسی طرح اُردو یا ہندی کی ہائے مخلوط سے بنی ہوئی آوازیں ہیں، جیسے گھ، بھ وغیرہ یہ بھی صرف الفاظ کے شروع میں بولی جاتی ہیں۔ بیچ یا آخیر میں اُن کے بولے جانے کی کوئی مثال نہیں ملتی ہے۔
اس کے علاوہ کچھ مصوتوں کی آواز کو حروف کی شکل میں ٹھیک طور سے ظاہر کرنا بھی ممکن نہیں ہے؛ اور اگر اس کے لیے جلد ہی کچھ نہ کیا گیا تو اندیشہ ہے کہ وقت گذرنے پر تلفظ اور تحریر میں خلیج بڑھتی جائیگی یہ صورتِ حال دیگر زبانوں میں بھی ہو سکتی ہے۔

# کربل کتھا

از

# فضل علی فضلی

مرتبہ

## مالک رام

و

## مختار الدین احمد

علمی اور ادبی حلقوں میں یہ بات ایک زمانے سے معلوم تھی کہ فضلی نے شہدائے کربلا کے حالات میں ایک کتاب لکھی تھی، جو شمالی ہند میں اردو نثر کی سب سے پہلی کتاب ہے، لیکن کسی نے اسے دیکھا نہیں تھا۔ بڑی تلاش کے بعد ڈاکٹر مختار الدین احمد نے جرمنی کے ایک دور افتادہ مقام ٹوبنگن کے کتب خانے سے اس کا خطی نسخہ ڈھونڈ نکالا۔ اب یہی نسخہ مبسوط دیباچے اور مفصل حواشی اور اخاریوں کے ساتھ شائع کر دیا گیا ہے۔ یہ قیمتی کتاب پہلی مرتبہ شائع ہوئی ہے۔

کتابت، طباعت، گرد پوش، جلد — ہر ایک تیز معیاری۔

قیمت ساڑھے سات روپیہ

مالک رام

# ہفتہ وار کوہ نور لاہور

ہمارے ہاں جدید قسم کے اخبار اور اخبار نویسی کا رواج انگریزوں کے اس ملک میں آنے کے بعد شروع ہوا۔ اس میں اب کوئی شبہ نہیں کہ اردو کا سب سے پہلا اخبار جام جہاں نما تھا۔ دراصل یہ ایک ہفتہ وار فارسی پرچہ تھا جو غالباً مئی ۱۸۲۲ء میں منشی سدا سکھ کی ادارت میں کلکتے سے شائع ہونا شروع ہوا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ بعد کو اردو داں طبقے نے مطالبہ کیا کہ فارسی کے ساتھ اردو کا ضمیمہ بھی شائع ہوا کرے۔ اس مطالبے کو تسلیم کرتے ہوئے جام جہاں نما کے منتظمین نے اگلے ہی سال یعنی ۱۸۲۳ء سے اس کے ساتھ اردو ضمیمے کا اضافہ کر دیا۔ اصل فارسی حصے کے آٹھ اور اردو ضمیمے کے چار صفحے تھے۔ لیکن اردو حصے کے خریداروں کی تعداد زیادہ نہیں رہی، خاص طور پر بنگال میں جہاں فارسی ہی کا زیادہ رواج تھا، اس لیے اردو ضمیمہ گھاٹے کا سودا تھا۔ بالآخر منتظمین نے اردو حصے کی اشاعت ترک کر دینے کا فیصلہ کیا۔ آخری اردو ضمیمہ ۲۳ جنوری ۱۸۲۸ء کو نکلا تھا۔ اس کے بعد بارہ صفحوں پر مشتمل پورا پرچہ فارسی میں نکلتا رہا۔ اس کا چندہ تین روپیہ ماہانہ تھا۔

جام جہاں نما کی دیکھا دیکھی کلکتے ہی میں اور بھی فارسی اور اردو کے مشترک اخبار چھپنے لگے۔ صرف اردو کے اخباروں کا چلن دلّی اور پنجاب سے ہوا۔ دلّی کا دہلی اردو اخبار اپنے زمانے کا مشہور

## ہفتہ وار کوہ نور

اخبار تھا، جسے مدتوں مولانا محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر شائع کرتے رہے۔
پنجاب میں غالباً سب پرچوں کی زبان اردو رہی۔ یہاں سے شائع ہونے والے پرچوں میں 'کوہ نور' کو کئی لحاظ سے نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ یہ اپنے زمانے کا مشہور اور مقبول اخبار تھا۔ یہ جنوری ۱۸۵۰ء میں لاہور سے جاری ہوا۔ اس کے مالک اور ایڈیٹر منشی ہرسکھ رائے بھٹناگر کائستھ سکندر آباد (یوپی) کے رہنے والے تھے، جہاں سے نقلِ مکان کر کے وہ لاہور چلے آئے۔ ان کا یہاں عمائد میں شمار ہوتا تھا۔ وہ لاہور کی علمی اور ادبی، معاشرتی اور تہذیبی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے تھے۔ جنوری ۱۸۶۵ء میں ڈاکٹر جی۔ ڈبلیو۔ لائٹنر پرنسپل گورنمنٹ کالج، لاہور کے ایما بلکہ ان کی سرپرستی میں ایک تہذیبی انجمن کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ اس کارِ خیر کی تکمیل کے لیے لاہور کے سرآوردہ شہریوں کا جلسہ بلایا گیا، جس میں مختلف فرقوں کے تقریباً ۴۰ اصحاب شریک ہوتے۔ منشی ہرسکھ رائے بھی اس جلسے میں موجود تھے۔ انجمن کی تشکیل عمل میں آئی، اور اس کا نام تجویز ہوا: "انجمنِ مطالب مفیدۂ پنجاب" لیکن عوام اتنے لمبے نام کے کیونکر روادار ہو سکتے تھے! رفتہ رفتہ اس کا نام صرف 'انجمن پنجاب' رہ گیا۔ یہی وہ انجمن ہے جس کے زیرِ اہتمام اردو کا جدید رنگ کا پہلا مشاعرہ مولانا محمد حسین آزاد نے ۳۰ مئی ۱۸۷۴ء کو کیا تھا۔ اس انجمن کے عہدے داروں کا انتخاب اس صورت سے ہوا تھا۔
صدر: پنڈت من پھول؛ منشی ہرسکھ رائے: سکرٹری فارسی؛ بابو نوین چندر: سکرٹری انگریزی۔ مجلسِ عاملہ کے چار اراکین میں ان تینوں عہدہ داروں کے علاوہ ڈاکٹر لائٹنر بھی تھے۔
اس سے منشی ہرسکھ رائے کی لاہور کے تہذیبی حلقوں میں اہمیت ثابت ہوتی ہے۔
بعد کو اس انجمن میں دلی کے سرکردہ اصحاب بھی حصہ لینے لگے تھے۔ چنانچہ اس کے دوسرے ہی جلسے میں ماسٹر رام چندر، میرزا علاء الدین احمد خان علائی والیِ لوہارو اور میرزا شہاب الدین احمد خان ثاقب کے نام بھی ملتے ہیں۔
کوہ نور شروع میں ہفتہ وار رہا، لیکن اپنی ہر دلعزیزی کے باعث اگلے ہی برس یعنی ۱۸۵۱ء میں ہفتے میں دو مرتبہ شائع ہونے لگا۔ لیکن یہ سہ روزہ سلسلہ زیادہ دن نہ چل سکا اور جلد ہی یہ پھر ہفتہ وار چھپنے لگا۔ منشی ہرسکھ رائے نے اخبار ہی کے نام پر مطبع کوہ نور بھی قائم کیا تھا۔

## ہفتہ وار کوہ نور

دونوں کا دفتر لاہور کے کی دروازہ کے اندر تھا۔ اس مطبع سے وہ اخبار کے علاوہ کتابیں بھی چھاپتے رہے

اس اخبار کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ ابتدا میں منشی نولکشور بھی اس سے وابستہ رہے۔ وہ اس کے منیجر تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس زمانے میں انھیں صرف دس روپیہ ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔ بعد کو وہ کوہ نور کی ملازمت چھوڑ کر لکھنؤ چلے گئے۔ اخبار اور مطبع کا یہ تجربہ ان کے بہت کام آیا۔ یہاں سے انھوں نے اپنا ذاتی اردو اخبار جاری کیا۔ ان کے نولکشور پریس نے علم و ادب کی جو خدمت کی ہے، اس سے کون پڑھا لکھا واقف نہیں۔ اس مطبع کی چھپی ہوئی کتابوں کی بدولت منشی نولکشور نے ہندستان میں اور ہندستان سے باہر بھی لازوال شہرت حاصل کی۔ ان کے خلوص اور دیانت اور محنت کی برکت تھی کہ جب وہ مرے ہیں، تو ان کا لاکھوں کا کاروبار تھا۔

کوہ نور بہت دن تک جاری رہا۔ بلکہ ۱۸۸۳ء میں تو شاید یہ روزانہ میں تبدیل ہو گیا تھا۔ یہ نہ معلوم ہو سکا کہ یہ کب بند ہوا۔

وقتاً فوقتاً جو لوگ اس کی ترتیب میں شریک رہے ان میں بعض مشہور مصنفوں کے نام ملتے ہیں مثلاً مولوی سیف الحق ادیب دہلوی، مولوی محمد دین فوق، مولوی محرم علی چشتی وغیرہ۔ اس سے معلوم ہوگا کہ یہ پرچہ ہندو مسلم ادیبوں میں یکساں مقبول تھا۔

(۲)

پچھلے دنوں مجھے ایک دوست کی نوازش سے کوہ نور کی جلد ۹ یعنی ۱۸۵۹ء کے آخری سات پرچے اور جلد ۱۰ یعنی ۱۸۶۰ کے ۴۶ شمارے دیکھنے کو ملے، ۱۸۶۰ کی جلد کے ابتدائی ۶ شمارے موجود نہیں۔ ان پرچوں کو دیکھنے سے جو کوائف معلوم ہوئے، انھیں بیان کرتا ہوں:

۱۔ پرچہ ہر شنبے کو شائع ہوتا تھا۔

۲۔ اس کی ضخامت مقرر نہیں تھی۔ بعض شمارے صرف دس صفحے کے ہیں اور بعض ۳۵۔ ۴۰ کے بھی۔

۳۔ صفحات مسلسل تھے۔ جلد ۹ (۱۸۵۹ء) ۷۸۳ صفحات پر ختم ہوئی ہے اور جلد ۱۰ (۱۸۶۰ء) ۸۹۲ پر۔

۴۔ اخبار کی قیمت دو گونہ تھی: پیشگی دینے والوں سے ماہانہ ایک روپیہ، ششماہی ۷ روپیہ اور سالانہ ۱۲ روپیہ لیے جاتے۔ جو چندہ بعد کو دیتے تھے ان سے علی الترتیب ۱۲ روپیہ، ۱۰ روپیہ اور ۲۴ روپیہ لیے جاتے تھے۔

اس میں محصول ڈاک بھی شامل تھا۔ جنوری ۱۸۶۱ء میں ڈاک کے محکمے نے یہ قاعدہ نافذ کیا کہ آئندہ اخبارات ڈاک کا محصول پیشگی ادا کریں گے، تو انھوں نے چندہ بڑھا کر پندرہ روپیہ سال کر دیا۔

۵۔ خاص مفید مضامین کی اجرت بحساب ۲ آنہ فی سطر دی جاتی تھی۔ عام قاعدے کے مضمون مفت تھے۔ اس پرچے کی بعض نمایاں خصوصیات تھیں مثلاً ہر ایک پرچے میں انگریزی اور دیسی ملازمین سرکار کی رخصت، تبدیلی، تقرری وغیرہ کی خبریں چھپی ہیں۔ ان میں پنجاب کے علاوہ ممالک غرب و شمال (حال یوپی) مرکزی حکومت کلکتہ کے ملازموں کی نقل و حرکت بھی شامل ہے۔ یہ گویا پنجاب گزٹ اور گورنمنٹ گزٹ الہ آباد کا انتخاب ہوتا تھا۔

والسرائے اور لفٹنٹ گورنر اور کمانڈر انچیف کے دوروں کی خبریں اور ان کے درباروں کے حالات پوری تفصیل سے چھپے ہیں۔ ایک ایک دربار کی خبر اور اس میں شامل ہونے والے والیان ریاست اور رؤسا کے نام ملتے ہیں۔

یوں معلوم ہوتا ہے کہ مختلف مقامات پر پرچے کے اپنے نامہ نگار اور خبر نویس تھے جو وہاں کی خبریں باقاعدگی سے بھیجتے رہتے تھے۔ لیکن ان کے علاوہ دوسرے اخباروں سے ــــ اردو ہوں یا انگریزی ــــ خبریں نقل کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ اس سے غالباً مفر بھی نہیں تھا۔ دوسرے اخبار بھی یہی کرتے تھے۔

ہندستان سے باہر کے دو ملکوں کی خبریں بہت کثرت سے ملتی ہیں ــــ افغانستان اور چین! افغانستان کی خبریں اور وہاں کے حکمران کے جزوی حالات تک ہر ہفتے شائع ہوتے تھے۔ خدا معلوم ان کا منبع کیا تھا!

خبروں میں تنوع ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ پرچہ زیادہ سے زیادہ دلچسپ اور عام فہم بنایا جائے۔

ادبی حصہ بہت کم ہے ، بالعموم یہ دلچسپی مقامی حالات کے بیان سے پیدا کی جاتی ہے :
ذیل میں ان پرچوں کا انتخاب مختلف عنوانات کے تحت دیا جاتا ہے ۔ تمام اقتباس اصلی عبارت اور اسلوبِ خط میں دیے جا رہے ہیں :

(الف) حالاتِ شورش ۱۸۵۷ء : اگرچہ انگریزوں نے دلی ستمبر ۱۸۵۷ء میں دوبارہ فتح کر لی تھی، لیکن ملک کے باقی حصوں میں شورش اس کے بعد بھی بہت دن تک رہی ۔ ان اخبارات میں اس طرح کی خبریں ملتی ہیں، جن سے شورش پر قابو پانے کی رفتار اور مختلف لوگوں کی گرفتاری کا حال معلوم ہوتا ہے ۔ ان میں سے بعض نام ہماری دلچسپی کے بھی ہیں ۔ ان کا خلاصہ ذیل میں دیا جاتا ہے :

۱ ۔ بندھیل کھنڈ میں بریگیڈیر وھیلر صاحب نے ۔ ۔ نگود میں ۔ محاصرہ باغیانِ بداندیشاں ۔ ۔ کر لیا ہے ۔ ۔ سردارِ باغیان فیروز شاہ و فرزند علی و رحمت خان اور لچھمن سنگھ ہیں (کوہ نور ۸ نومبر ۱۸۵۹ ماخوذ از لاہور کرانیکل ۵ نومبر ۱۸۵۹ء)

۲ ۔ سید محمد اسمٰعیل حسین خان معروف بہ منشی ملازم نواب باندا بجرم البغاوت کے معرفت کوتوال فرخ آباد گرفتار ہو کر صاحب مجسٹریٹ کی خدمت میں روانہ ہوا اور وہاں سے ۱۲ اکتوبر کو لیسواری بہلی معہ ایک آدمی بحراست سپاہیانِ سکھ کے روانہ باندا ہوا ۔ باندا میں تحقیقاتِ جرم ہو کر حکم مناسب صادر ہوگا ۔ (۱۵ نومبر ۱۸۵۹ء)

[ میرا خیال ہے کہ یہ سید محمد اسمٰعیل حسین خان غالباً مشہور شاعر منیرؔ شکوہ آبادی (ف ۱۴ اگست ۱۸۸۰ء) ہیں ۔ ]

۳ ۔ جناب صاحب سکرٹری ہند کی تحریر بموجب گورنمنٹ انگریزی سے تجویز ہوئی کہ ہر ایک احاطہ میں ایک ایک کمشنر واسطے تحقیقاتِ مقدماتِ نقصان ایام مفسدہ کے مقرر ہو دیں ۔ تحقیقات ۱۵ نومبر سے چار مہینے کے عرصہ میں ختم ہوگی اور سائلِ استحقاق کو معاوضہ ملیگا ۔ ۔ واسطے تحقیقات مقدمات پنجاب میں ۔ ۔ ۔ آرتھمپل صاحب بہادر کمشنر لاہور مقرر ہوئے ہیں ۔ (۱۰ نومبر ۱۸۵۹ء)

۴ ۔ معلوم ہوا کہ ۔ ۔ ۔ ۸ نومبر سنہ حال یوم شنبہ وقت ۱۱ بجے صبح کے مسمّی وزیر خان مفسد

کو جوان نواب باغی فرخ آباد کو خاص فرخ آباد میں پھانسی ہوگئی، اور لاش اس کی جلائی گئی اور راکھ کھیتوں میں ڈلوائی گئی (۲۲ نومبر ۱۸۵۵ء)

۵۔ محمد شاہ مفسد جو آگرہ سے آیا ہے، کلکتہ کو جاتا ہے۔ وہاں اوس کے لیے تجویز پنشن کی ہوگی اور کسی مکان میں نظر بند رہیگا (۲۹ نومبر ۱۸۵۹ء)

۶۔ ایک شخص محمد دستگیر خاں نامی مفسد ساکنہ لکھنؤ جو علاقہ ٹونک میں چھپا ہوا تھا اور اہالیان نواب صاحب بہادر والیِ ٹونک کی کوشش سے گرفتار ہو کر چھاؤنی دیولی میں قید تھا، واسطے تحقیقات کے لکھنؤ کو بھیجا گیا (۶ دسمبر ۱۸۵۹ء)

۷۔ کل کی خبر ہے کہ رانی گونڈا نے مع کچھ آدمیوں کے اپنے تئیں سپرد سرکار کر دیا۔ وہ شدت سے بیمار اور قریب المرگ ہے۔ راجہ دلیپ بخش، مدت ہوئی، اس دنیا کو پدرود کر گیا۔ (۱۳ دسمبر ۱۸۵۹ء)

۸۔ سرکار نے فضل عظیم مفسد کو جس نے ایام غدر میں اپنے تئیں ناظم مشہور کیا تھا، معاف کر دیا کہتے ہیں کہ مسٹر براڈفٹ صاحب بہادر نے اس سے اقرار جان بخشی کا فرمایا تھا (۲۰ دسمبر ۱۸۵۹ء)

۹۔ نیپال سنگھ ٹھاکر سرغنہ مفسدین بحراست شجاعانِ انگریزی الٰہ آباد آویگا اور وہاں سے بسواری مرکب دخانی ڈھاکہ پہنچیگا۔ جہاں وہ حیات باقی بسر کریگا۔ سرکار نے اس کے گذارہ کے واسطے ۲۵ ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر کی ہے (ایضاً)

۱۰۔ جواہرات نواب باغی فرخ آباد کے جو آگرہ کو بھیجا گیا ہے، کلکتہ میں لا کر نیلام کیے جاوینگے (ایضاً)

۱۱۔ خان بہادر خان نمک حرام جلیعہ سرکار ہو گیا (ایضاً)

۱۲۔ معلوم ہوا کہ خان بہادر خان نواب بریلی والا اور ممو خان ۱۱ تاریخ دسمبر کو بحراست گارڈ جوانانِ گورکھہ بمقام دہلی پہنچ گئے (۲۷ دسمبر ۱۸۵۹ء)

۱۳۔ مقدمہ ممو خان نمک حرام کا طے ہو کر حکم اخیر کے واسطے بخدمت جناب صاحب چیف کمشنر بہادر بھیجا گیا ہے (۱۱ فروری ۱۸۶۰ء)

۱۴۔ دہلی میں میدان کف دست صاف کر دینے کا حکم ہوا ہے۔ صاحب خبر لکھتے ہیں کہ یہ مقام بہت بلند ناف شہر ہے۔ وہاں ایک توپخانہ رہیگا۔ ہماری رائے میں یہ بات غلط ہے، وہاں کالج بننے کی تجویز ہے۔ چنانچہ اس بارہ میں گورنمنٹ پنجاب سے بنام صاحب کمشنر بہادر دہلی حکم گیا ہے

۲۷ دسمبر ۱۸۵۹ء)

۱۷۔ تحقیقات مقدمۂ خان بہادر خان مفسد کی یکم فروری سے شروع ہوگی؛ چنانچہ صاحبان مندرجہ ذیل کمیشن میں مقرر ہوئے ہیں:

مسٹر رو برٹس صاحب بہادر کمشنر روہیل کھنڈ: پریسیڈنٹ

مسٹر وانسٹارٹ صاحب بہادر، جج بریلی

مسٹر شیکسپیر صاحب بہادر قائم مقام جج مرادآباد : ممبران

مسٹر مولس صاحب بہادر اسسٹنٹ مجسٹریٹ بریلی: مدعی از جانب سرکار (۱۰ فروری ۱۸۶۰ء)

۱۶۔ جو جرائم ۔ منجانب سرکار ۔ ۔ بر سر اجلاس (خان بہادر خان کے خلاف) ۔ ۔ ۔ بیان کیے ہیں حسب ذیل ہیں:

(۱) باوجودے کہ وہ پنشن خوار اور بذاتِ خود مطیع سرکار انگریزی تھا۔ اس نے مئی ۱۸۵۸ء تک مفسدہ کیا۔ اور سرکار سے مقابلہ کیا اور روہیل کھنڈ میں جو عرصۂ مذکور میں مرکز فساد کا تھا، سردار اور سرغنہ باغیوں کا بنا رہا۔ اس کا ثبوت مراتب مندرجۂ ذیل سے ہوتا ہے:

اول، یہ کہ اس نے اشتہارات اس مضمون کے جاری کیے کہ میں روہیل کھنڈ کا حاکم بنا ہوں۔

دوم، یہ کہ اس نے بدایوں و شاہجہاں پور و پیلی بھیت میں ناظم مقرر کیے۔

سوم، یہ کہ اس نے عملگان پولیس و مال مقرر کیے۔

چہارم، یہ کہ اس نے محاصل زمین وصول کیا اور ٹیکس بھی لیا۔

پنجم، یہ کہ اس نے سکہ چلایا۔

ششم، یہ کہ اس نے نینی تال پر حملہ کرنے اور جناب کمانڈر انچیف صاحب بہادر سے لڑنے کو فوج بھیجی۔

(۲) خان بہادر خاں ۳۱ مئی و یکم جون ۱۸۵۷ء کو قتل صاحبانِ مندرجہ ذیل میں شریک تھا بلکہ وہ سردار قاتلان کا تھا اور اس نے کئی اور عیسائیوں کو قتل کردیا (اس کے بعد ۱۳ آدمیوں کے نام ہیں) (۱۸ فروری ۱۸۶۰ء)

۱۷۔ ۱۳ تاریخ (فروری) کو بریلی سے تار برقی پر خبر آئی کہ اوس دن مقدمہ خان بہادر خان مفسد کا طے ہوگیا۔ صاحبان کمیشن نے اوس کی نسبت حکم قصاص کا دیا (۱۸ فروری ۱۸۶۰ء)

۱۸۔ ۲۸ تاریخ جنوری کو مسٹر لنکن صاحب بہادر اسسٹنٹ کمشنر لکھنؤ نے روبرو ممو خان مفسد کے نواب اشرف الدولہ کو بلا کر پوچھا کہ ایام غدر میں ممو خان نے کوئی حکم قتل کسی صاحب انگریز بہادر کا دیا تھا یا نہیں ـــ نواب مذکور نے جواب دیا کہ میں نے ممو خان کو ایسا حکم دیتے کبھی نہیں سنا (۱۸ فروری ۱۸۶۰ء)

۱۹۔ خط مورخہ دوم فروری آمدہ عدن سے معلوم ہوا کہ ۲ جنوری کو تفضل حسین خاں باغی نواب فرخ آباد عدن میں پہونچ گیا اور کل کی تاریخ صاحب انگریز بہادر محافظ نواب مذکور نے اوس کو شمال کی جانب لے جا کر کنارۂ عرب پر آزاد کر دیا اور کہہ دیا کہ اگر کبھی ہندستان یا کسی ملک ماتحت سرکار انگریزی میں واپس آئیگا تو جان کو خطرہ میں ڈالیگا۔ ایک ہزار روپیہ بھی نواب مذکور کو دیا گیا کہ اپنے اور اپنے خدمتگاروں کے خرچ میں لگاوے (۱۸ فروری ۱۸۶۰ء)

[یہ فرخ آباد کے آخری حکمران نواب تفضل حسین خاں ہیں، جو جانشین تھے نواب تجمل حسین (بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لیے والے) کے۔ غالب کے ایک خط میں بھی ان کا ذکر ہے ۱۸۸۳ء میں حجاز ہی میں انتقال ہوا]

۲۰۔ مسٹر پی کارنگی صاحب بہادر نے مقدمہ ممو خان مفسد کا سپرد عدالت جناب کرنیل ریبٹ صاحب بہادر فرما دیا۔ مجرم مذکور کی نسبت صرف یہی ثابت نہیں کہ وہ سرغنہ باغیوں کا رہا، بلکہ یہ بھی ثابت ہے کہ وہ قتل سر ایم جیکسن صاحب بہادر و دیگر صاحبان انگریز میں جن کو باغیوں نے قیصر باغ میں قید کر لیا تھا شریک تھا (۳ مارچ ۱۸۶۰ء)

۲۱۔ مقدمہ ممو خان مفسد جو عاشق بیگم مفسدہ مشہور ہے، طے ہو گیا۔ اگرچہ عوام کی یہ رائے تھی کہ وہ مستوجب سزائے قصاص ہے، مگر حکام نصفت نشان نے ازراہ ترحم اوس کی نسبت حکم جلاوطنی میعاد حیات نافذ فرمایا ہے (اپریل ۱۸۶۰ء)

۲۲۔ سنتے ہیں کہ جناب نائب السلطنت امیر کبیر نواب گورنر جنرل بہادر نے براہ الطاف خسروانہ ارشاد کیا ہے کہ جامع مسجد واقع دہلی، مسلمانان دہلی کو واپس مل جاوے (۵ مئی ۱۸۶۰ء)

۲۳۔ خبر ہے کہ پنشن داران دہلی کی نسبت یہ حکم ہوا ہے کہ جن لوگوں نے بایام مفسدہ شاہ دہلی کی فہرست پنشنداران میں اپنا نام لکھایا تھا، ان کو جو پنشن مہینے میں ملتی تھی، اب سال بھر میں ملے، اور جو آزاد اور صابر رہے، ان کو پنشن مقررہ بدستور ملا کرے (۵ مئی ۱۸۶۰ء)

۲۴۔ کانپور: ۴ تاریخ مئی کو جوالا پرشاد باغی اوس مقام پر پھانسی دیا گیا، جہاں اس سے
ہم غدر میں افعالِ زشتِ خونریزی صاحبانِ انگریز بہادر کے سرزد ہوتے تھے۔ اُس نے تا دم
بست اپنی تقصیرات سے انکار کیا؛ اور جب اوس سے وجہ اس کی پوچھی گئی، تو اُس نے بیان کیا کہ
ب سچ بولنے سے کچھ فائدہ نہیں، اور نہ تب تھا یعنی ۱۸۵۷ء میں (۱۲ مئی ۱۸۶۰ء)

[ ایام فساد میں کانپور میں تین آدمیوں پر انگریزوں کو قتل کرنے کا الزام عائد ہوا تھا:

جوالا پرشاد، اعظم اللہ اور نانا صاحب ]

۲۵۔ ایک صاحب اپنے خط مورخہ ۱۳ جون میں لکھتے ہیں کہ پہلے یہ تجویز تھی کہ جامع مسجد بدستور
سلمانوں کو دی جاوے مگر اب جناب سر روبرٹ مانٹ گمبری صاحب بہادر لفٹنٹ گورنر پنجاب نے
یصلہ کیا ہے کہ جامع مسجد ملکیت شاہ دہلی کی تھی اور مثل اور اسباب شاہِ دہلی کے سرکار نے
ں کو ضبط کیا تھا۔ پس وہ سرکار کی ملکیت ہے اور مسلمانوں کو واپس نہ ملنی چاہیے۔ سوائے اس
سجد کے اور مساجد مسلمانوں کو واپس دی گئی ہیں۔ جامع مسجد میں؛ اسباب تبکی رہا کریگا (۲۳ جون
۱۸۶۰ء)

۲۶۔ مفید الانام میں لکھا دیکھا کہ جامع مسجد و دریبہ کے نواح میں پیمائش مکانات کی ہوگی۔ کچھ مکانات
زانچیوں کے اور دو دکانیں دریبہ کی باقی رہیں، باقی جملہ مکانات کوچہ چودھری تک گرا دیے جاوینگے
نونی دروازہ کے سامنے سے چار چار سو فٹ تک میدان ہوگا۔ (۴ اگست ۱۸۶۰ء)

۲۷۔ میرزا الٰہی بخش شاہزادہ شاہِ معزولِ دہلی خیرخواہ سرکار کے حق میں یہ حکم ہوا ہے کہ ایامِ غدر کی
بابت سب تنخواہ دی جاتے اور آئندہ قریب دو ہزار دو سو روپیہ ماہواری ملا کرے (ایضاً)

۲۸۔ اخبار بہکارہ سے معلوم ہوا کہ قیدیانِ شاہی مقیم رنگون یعنی شاہِ دہلی اور اس کے
ہمراہیوں کا ماہوار پائی ۶۔ آنہ ۷۔ ۱۳۱ ۶ روپیہ ہر ماہ اور علاوہ اس کے دو سو ماہوار اس افسر
کو ملتا ہے، جو ان کا مہتمم ہے (۲۵ اگست ۱۸۶۰ء)

۲۹۔ خطوط آمدہ دہلی سے واضح ہوا کہ ان دنوں سرکار فیض مدار انگریزی نے مرزا الٰہی بخش کو
بلدوے اس کے کہ اوس نے گرفتاریِ شاہِ دہلی میں مدد دی تھی، ایک لاکھ روپیہ مرحمت کیا ہے اور
تنخواہ ماہوار بھی مقرر کی ہے۔ مرزا مذکور خسر مرزا فخر الدین ولی عہد کا ہے جو کچھ مہینہ پیشتر مفسدہ کے

راہیِ عالمِ بقا ہوا تھا۔ (یکم ستمبر ۱۸۶۰ء)

۳۰۔ از روے خط خانگی آمدۂ نیپال دہلی گزٹ میں درج ہے کہ کچھ سپاہیان مفسد الشوالہ پشن پت ناتھ (پشوپتی ناتھ) نیپال میں جمع ہوئے تھے اور اپنے تئیں برہمن اور معتقد شنو کا ظاہر کیا تھا۔ مہاراجہ جنگ بہادر نے خبر پاکر ان کو وہاں سے نکال دیا۔ (۸ ستمبر ۱۸۶۰ء)

۳۱۔ بیگم مفسدہ مع اپنے بیٹے برجیس قدر کے و بالا راؤ و دیگر سرغنۂ مفسدین پہاڑوں میں اپنے رہنے کے واسطے مکانات بنا رہے ہیں۔ اکثر ہمراہی ان کے بباعث وباہیضہ ان سے علیحدہ ہوگئے ہیں (ایضاً)

۳۲۔ تختِ شاہِ سابق دہلی جو دہلی سے کلکتہ کو بھیجا گیا تھا، مرکب دخانی 'سلیڈن' نام پر انگلینڈ کو بھیجا گیا (۱۵ ستمبر ۱۸۶۰ء)

۳۳۔ جامع مسجد دہلی کی نسبت سابق حکم واگذار ہوگیا تھا، مگر بسبب نزاع باہم فرقۂ وہابی و فریق ثانی اہلِ اسلام کے بیاد خلی رہ کر حضور نواب لفٹنٹ گورنر بہادر سے حکم ضبطی بدستور سابق نافذ ہوا تھا۔ اب پیشگاہ نواب مستطاب گورنر جنرل بہادر سے پھر حکم واگذاشت اوس کا نافذ ہوا ہے اور قبل از دخل مسلمانانِ دہلی کو حکم ہوا ہے کہ اول تم آپس کا نزاع رفع کر کے فہرست اون رئیسوں کی پیش کرو، جو حامی ہر نوع انتظام مسجد مذکور کے ہونگے۔ چنانچہ مسلمانوں نے ایک فتویٰ علمایانِ دین کا مرتب کر کے مع تفصیل اون عقائد کے پیش کیا ہے، جو قبل از غدر منعقد تھے۔ اور جواب قائم رہینگے۔ فتویٰ حسبِ ذیل ہے:

سوال۔ کیا فرماتے ہیں علمایانِ دین اس صورت میں کہ جامع مسجد مسلمانوں کے ہاتھ سے چھین گئی تھی اب حاکمانِ وقت نے کہ کسی کے دین اور مذہب سے اون کو مزاحمت اور تعرض نہیں اور نہ پہلے تھا، اور نماز و اذان اور اقامتِ جمع و اعیاد و شعائرِ اہلِ اسلام علی الاعلان اون کے عہد میں بخوبی جاری تھے اور جاری ہیں۔ از راہِ نصفت و عدالت کے حکم دیا کہ اہلِ اسلام بدستورِ سابق جامع مسجد میں نماز پڑھا کریں۔ مگر بعض مسلمان یہ کہتے ہیں کہ تبرکات منسوبہ حضرت سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم

بھی بدستورِ سابق رکھے جاویں، اور صورت درگاہ کی قرار پاوے۔ اور اکثر اہلِ اسلام مانع اس امر کے ہیں اور حکام کی طرف سے تاکید ہے کہ آپس میں سب مسلمان اتفاق کر کر مسجد اپنے تصرف میں لاویں، ورنہ مسجد نہ ملیگی۔ پس یہ عذر تبرکات کے نہ رکھنے کا جو جانب بعضے اسلام سے ہے، حال میں اور اوس وقت میں ٹھیک ہے یا نہیں؟

جواب: یہ عذر ٹھیک نہیں اور خلافِ مصلحتِ وقت ہے۔ اوّل، تبرکات باسنادِ صحیح کہاں، بلکہ بیشتر وضعی ہیں؛ اور وہ وضع بھی اب نہیں رہی، وضع ثانی ہے۔ دوسرے، یہ کہ مسجد واسطے فرائض اور مکتوبات کے ہے، نہ واسطے زیارتِ تبرکات کے گو باسنادِ ضعیفہ ثابت ہی ہو جاویں بلکہ اکابر اہلِ اسلام سنن و نوافل بھی مسجد میں ادا نکرتے تھے، اپنے گھر میں پڑھتے تھے۔
تیسرے، یہ کہ اس وقت میں ایسی تکرار باہم نہ چاہیے، بلکہ تمام اہلِ قبلہ کو چاہیے کہ آپس میں اتفاق کریں اور متفق علیہ کو اختیار کریں، مختلف فیہ کو چھوڑ دیں۔
چوتھے، یہ کہ ایک امرِ زاید کی تکرار سے مقصودِ اصلی و مہتم بالشان یعنی صلوٰۃ اور امامت و جماعت کو چھوڑ دینا خلافِ دینداری ہے اور بموجب فساد کہ اس نزاع و تکرارِ مذہبی میں مسجد پھر مسلمانوں کو نہ ملیگی اور ہمیشہ کفِ افسوس ملتے رہینگے:

| | |
|---|---|
| محمد صدر الدین سابق صدر الصدور | مولوی محمد قطب الدین |
| محمد نقی خان | سید محبوب علی جعفری |
| فقیر خواجہ ضیاء الدین احمد | سید محمد نذیر حسین |
| محمد عبدالقادر | محمد رحمت اللہ |
| محمد یوسف | محمد اسمٰعیل |

تفصیل اون صاحبوں کی جو اہتمام مسجد کے واسطے رضامند ہوئے جن کی طرف سے درخواست گذاشت کی ہے۔

۱۔ صاحب عالم مرزا الٰہی بخش صاحب شہزادۂ خیر خواہ؛ ۲۔ مولوی محمد صدر الدین صاحب؛ ۳۔ سید محی الدین خان بہادر؛ ۴۔ مرزا اسفندیار بیگ صاحب؛ ۵۔ سید احمد علی صاحب؛ ۶۔ امام مسجد جامع داؤد خان صاحب، ۷۔ حاجی قطب الدین صاحب؛ ۸۔ معمور بخش صاحب سوداگر؛ ۹۔ شیخ برکت اللہ صاحب؛ ۱۰۔ منشی تراب علی صاحب

تفصیل عقائد و دستور جامع مسجد کا از بانی سید احمد علی صاحب امام مسجد تا تاریخ فرقی

دفعہ ۱۔ مسجد میں اذان، نماز، خطبہ ہوتا تھا بعد نماز جمعہ کے مسائل روزہ نماز کے کوئی کوئی مولوی ہمیشہ واسطے ثواب کے بیان کرتے تھے۔

دفعہ ۲۔ حجروں میں حافظ جو لڑکوں کو کلام اللہ پڑھاتے تھے، رہتے تھے؛ اور بعض درویش متوکل بھی رہتے تھے۔

دفعہ ۳۔ رات کو ایک پہر پر دو گھڑی بجے جامع مسجد کی سنبھال ہوتی تھی، غیر آدمی سوائے معمولی رہنے والوں کے نہ رہنے پاوے تھا؛ اجنبی کو باہر کر دیتے تھے، اِلّا ماہ رمضان میں اکثر اور لوگ معتمد بھی رات کو رہتے تھے، واسطے اعتکاف اور ختم کلام اللہ کے۔

دفعہ ۴۔ ایک پہر رہے پر دو گھڑی رات گئے کیواڑ بند ہوتے تھے اور چار گھڑی رات رہے کھلتے تھے۔

دفعہ ۵۔ آثار شریف میں پانچوں وقت بعد ہر نماز کے صلوٰۃ پڑھی جاتی تھی اور پنجشنبہ کو ختم ہوتا تھا اور مدح خوانی اور کچھ شیرینی تقسیم ہوتی تھی اور جمعہ کو بعد نماز کے صلوٰۃ پڑھ کر بعضے تبرکات کی زیارت ہوتی تھی اور محرم و ربیع الاول اور جمعہ وداع کو زیارت تبرکات کی ہوتی تھی۔

دفعہ ۶۔ جو نذر نیاز مسجد میں چڑھتی (چڑھتی) تھی، اوس میں خادمانِ آثار شریف شریک نہیں تھے اور جو آثار شریف میں چڑھتی (چڑھتی) تھی، اوس میں خادمانِ مسجد شریک نہ تھے۔

دفعہ ۷۔ جو راجہ بابو آیا چاہتے تھے، تو قلعہ دار صاحب کا حکم پہلے آتا تھا۔

دفعہ ۸۔ جو صاحبانِ انگریز بہادر مسجد میں آتے تھے، جن کے موزہ صاف ہوتے تھے، وہ مع موزہ چلے جاتے تھے۔ جن کے موزہ ناپاک ہوتے تھے، وہ اتار کر آتے تھے۔

دفعہ ۹۔ گوروں کے آنے کی ممانعت تھی
[گوروں سے یہاں مراد انگریز فوجی ہیں]
دفعہ ۱۰۔ آثار شریف میں جالیوں کے اندر حکام یا انگریز موزہ پہنے نہیں جاتے تھے۔ جن کو جانا منظور ہوتا تھا، موزہ اتار کر جاتے تھے۔
دفعہ ۱۱۔ جو صاحب واسطے سیر مینار کے آتے تھے، پہلے صاحب قلعہ دار اوس کا حکم بھجواتے تھے اور داروغہ مسجد ساتھ ہو کر سیر کراتا تھا۔
دفعہ ۱۲۔ ہندو مسجد میں نہیں جاتے تھے۔
دفعہ ۱۳۔ جس صاحب کی خوشی ہوتی تھی، خادمانِ مسجد کو انعام دیتے تھے۔
دفعہ ۱۴۔ نواب گورنر جنرل جب تشریف لاتے تھے، پانچ سو روپیہ انعام دیتے تھے۔ اوس میں خادمانِ آثار شریف اور درویشان و طالب علمان ساکنِ مسجد کو شرکت تھی۔
دفعہ ۱۵۔ سو روپیہ سالیانہ سرکار سے آثار شریف کی نیاز مقرر تھی
دفعہ ۱۶۔ آمدنی تہ بازاری و کرایہ دکاکین تخمیناً تین سو روپیہ سے زیادہ تھی، اوس میں خرچ ہوتا تھا۔
دفعہ ۱۷۔ دو گھڑیال اور ایک نقارہ رہتا تھا۔ فقط
تفصیل اون عقائد کی جو حال کے واسطے درخواست میں پیش ہوئے۔
دفعہ ۱۔ تین پہرہ تینوں دروازہ جامع مسجد پر سرکار کی طرف سے معین ہوں اور اون کو ہدایت ہو کہ بموجب ہدایت مہتمان کے کاربند رہیں۔
دفعہ ۲۔ تھانہ دار اوس علاقہ کو معاونتِ مہتمان کا حکم دیا جاوے۔
دفعہ ۳۔ محکمہ محتشمہ کمشنری سے تینوں دروازہ پر دستور العمل انگریزی بموجب عقائدِ سابق لگایا جاوے۔
دفعہ ۴۔ بموجب دستور کے مرمت شکست ریخت مسجد کی سرکار سے ہوا کرے۔
دفعہ ۵۔ مسجد میں سوائے خدام اور معلم اور کوئی اجنبی نہیں رہنے پاویگا۔
دفعہ ۶۔ لوگ نماز و وظیفہ، ختم وغیرہ پڑھ کر چلے جایا کرینگے۔

دفعہ ۷۔ تہ بازاری وکرایۂ دکاکینِ متعلقہ، مسجد متعلق ہوجاویں۔
دفعہ ۸۔ گھڑیال اور نقارہ رکھنے کی اجازت ہو۔
دفعہ ۹۔ اگر کوئی مسجد میں دنگہ کریگا یا ارادہ یا مشورہ دنگہ فساد کا کریگا، اوس کا بندوبست کرینگے۔ اگر ہم سے بندوبست اوس کا نہوگا، تو سرکار میں اطلاع کرینگے۔
دفعہ ۱۱۔ جو اخراجات ماہواری اور مرمت قلیل ہوگی، اوس کا بندوبست ہم مہتمان کے ذمہ ہوگا کہ باعانت دیگر مسلمانان کے بندوبست کیا کرینگے۔

(۲۹ ستمبر ۱۸۶۰ء)

۳۴۔ خطوط آمدۂ نیپال سے معلوم ہوا کہ بالاراؤ مفسد نے نانا مکھرام بطور والا کے شرادھ میں عسہ ہزار روپیا خرچ کیا ہے۔
بیگم مفسدہ حضرت محل کو سانپ نے کاٹا تھا، اور اب تندرست ہے۔
سنتے ہیں کہ اب نیپال میں صرف ۵۹ مفسد باقی رہ گئے ہیں، بہت سے اپنے گھروں کو چلے گئے اور بہت بعض سے انتقال کر گئے ہیں۔ منجملہ ہمراہیانِ نانا مکھرام صرف ۷ آدمی ہیں، جن میں بالاراؤ بھی ہے۔
دربار نیپال کو لکھا گیا ہے کہ دے بالاراؤ و برجیس قدر و بیگم مفسدہ حضرت محل کو بشرطیکہ وہ ممالکِ محروسہ سرکار انگریزی میں توسیعِ خلل انداز نہ ہوں، پناہ دیں۔ (۲۹ ستمبر ۱۸۶۰ء)
۳۵۔ سابق رانی جھانسی کا دیوان مفسد مطیع سرکار انگریزی ہوکر صاحب پولیٹکل ایجنٹ بہادر گوالیار کے پاس آگیا ہے (ایضاً)
۳۶۔ خبر ہے کہ نواب مفسد فرخ آباد لندن سے مع چار آدمیوں کے لباس فقیرانہ کر کے مدینہ کی زیارت کو گیا ہے۔ نواب مذکور کے بال بچوں کے گذارہ کی تجویز سرکار میں پیش ہے (ایضاً)
۳۷۔ ۱۹ اکتوبر (۱۸۶۰ء) کو پیشگاہ حکامِ نظامت عدالتِ آگرہ سے ولایت حسین خاں مفسد مشیرِ نواب سابق باندا کی نسبت حکمِ قید با مشقت ۱۴ سال مع جلاوطنی دریائے شور نافذ ہوگیا ہے۔ وارنٹ مجرم مذکور کو سنایا گیا ہے، اور آج کل میں کلکتہ کو بھیجا جاویگا (۷ اکتوبر ۱۸۶۰ء)

ہفتہ وار کوہ نور

[بعد کو ۱۵ دسمبر ۱۸۶۰ء کے شمارے سے معلوم ہوتا ہے کہ قید صرف ۴ سال کی ہوئی تھی]

(ب) **بعض تاریخی شخصیتیں**۔ بعض خبریں ایسی بھی ملتی ہیں، جن سے تاریخی شخصیتوں سے متعلق ہماری معلومات میں اضافہ ہوتا ہے یا ان خبروں کے بارے میں جو پہلے سے ہمارے علم میں ہیں، نئی تفصیلات ملتی ہیں:

۱۔ اخبار ہرکارہ سے دریافت ہوا کہ پنشن ۱۲ لاکھ روپیہ شاہ اودھ کو اُس تاریخ سے منظور کی گئی ہے کہ اوس نے پیشکش سرکارِ انگریزی کو منظور کیا، اور نہ اوس تاریخ سے جب ملک اودھ قبضہ میں آیا۔ بدھ گذشتہ کو تین لاکھ چوہتر ہزار روپیہ بقایا پنشن شاہِ اودھ کو ادا کیا گیا (۲۹ نومبر ۱۸۵۹ء)

اعیانِ سلطانی ولایت نے حضرت شاہِ اودھ کے حق میں یہ بات تفصیل کی ہے کہ شاہِ موصوف کی پنشن جو بارہ لاکھ سالیانہ ہے، تین لاکھ روپیہ اور اضافہ کیا جائے یعنی پندرہ لاکھ روپیہ سالیانہ سے (ایضاً)

۔ حسب تجویز جناب نواب گورنر جنرل بہادر راجہ جیکشن داس رئیس ہاتھرس کو بجلدوے خدمات بابت ایام غدر کے خطاب راجہ بہادر کا عطا کیا گیا (۸ فروری ۱۸۶۰ء)

۔ مسٹر ایل کوان صاحب بہادر اکسٹرا اسسٹنٹ لیہ، گورگانوہ کو تبدیل ہونے (۳ مارچ ۱۸۶۰ء) سے پیشتر میں انھوں نے دو مہینہ کی رخصت لی۔ اور ان کی جگہ مسٹر ڈی فٹز پیٹرک اسسٹنٹ مقرر ہوئے (۱۵ ستمبر ۱۸۶۰ء)

۔ مسٹر چارلس لے سانڈرس صاحب بہادر کمشنر قسمت دہلی و قائم مقام کمشنر قسمت گورنمنٹ نے عہدۂ جلیلہ نائب رزیڈنٹ و جوڈیشل کمشنر اضلاع محروسہ حیدر آباد پر مقرر فرمایا (۱۸۶۰ء)

۔ کوان صاحب بہادر اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کو چارج خزانہ ضلع گوڑگانوہ کا (اپریل ۱۸۶۰ء)

یہ گوڑگانواں سے تبدیل ہوئے تو اہلِ شہر نے ان کی خدمت میں ایک قلمدان پیش کیا

اس پر لکھنے کو غالب نے مندرجہ ذیل قطعہ ماسٹر پیارے لال آشوب کی فرمائش پر کہا تھا:

گوڑگاویں کی ہے جتنی رعیت، وہ یک قلم — عاشق ہے اپنے حاکم عادل کے نام کی
سو یہ نظر فروز قلمدان نذر ہے — مسٹر کووان صاحب عالی مقام کی

(خم خانہ جاوید (۱): ۱۸)

۷۔ لفٹنٹ ہالرائیڈ صاحب بہادر انسپکٹر مدارس حلقۂ انبالہ کو ۶ مہینہ کی رخصت ولایت جانے کے واسطے دی گئی اور مسٹر آر سپنسر صاحب بہادر قائم مقام اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر سرسہ ان کی جگہ قائم مقام انسپکٹر مدارس حلقۂ انبالہ مقرر ہوئے (۵ مئی ۱۸۶۰ء)

۸۔ اخبار انگلش مین میں درج ہے کہ ۱۸ اپریل ۱۸۶۰ء کو شاہ اودھ کے مکانات واقع گارڈن ریچ کلکتہ میں آگ لگی اور بہت سامان و اسباب جل کر خاک سیاہ ہو گیا۔ سنتے ہیں کہ جو جواہرات تھوڑا ہی عرصہ گذرا، سرکار سے ان کو واپس ملے تھے، وہ بھی جل کر خاک ہو گئے، اور نقصان قریب ۵ لاکھ روپیہ کا ہوا ہے۔ بیگم خاص محل اپنے بیٹے حامد علی بہادر کی سعی سے جاں بسلامت رہی کہتے ہیں کہ کسی نے آگ بجھانے میں کوشش نہ کی اور جس وقت اہالی پولس آئے، سب اسباب برباد ہو چکا تھا (۵ مئی ۱۸۶۰ء)

۹۔ حضرت شاہ اودھ کے خیام دولت میں ایسی آگ لگی کہ تین چار کروڑ روپیے کا مال و متاع خاکستر ہوا۔ محلات سلطانی میں کسی کے پاس زیور کے نام لوت کا چھلا بھی نہ رہا۔ اگرچہ حضرت کو کچھ تردد نہیں، مگر بیگمات بالکل تہی دست ہو گئیں۔ اب شاہ جمجاہ کے ذمہ آٹھ دس لاکھ روپیے سوداگروں کے قرض ہو گئے ہیں۔ اب اودھ اخبار سے معلوم ہوا کہ بعد اس صدمۂ عظیم کے حضور ممدوح میں ایک بنارسی فاحشہ پہونچی، اپنا عشق جتایا؛ حضرت نے ارشاد کیا کہ اب تو میرے پاس کچھ دینے کو نہیں رہا۔ خوشامدی لوگ درمیان میں پڑے۔ عرض کی کہ جہاں پناہ، اس کو خواہش زر نہیں، صرف سرفرازی کی تمنا ہے، تا آنکہ مقبول ہوئی، سرفرازی پائی اور حضرت اس کی طرف ایسے متوجہ ہوئے کہ قرض دام سے پچاس ہزار روپیے کا زیور بنوا دیا اور دہلی والی خطاب عطا کیا (۲۳ جون ۱۸۶۰ء)

۱۰۔ ایک عنایت فرما تحریر فرماتے ہیں کہ بادشاہ اودھ بخیریت تندرست ہیں۔ ۹ لاکھ کا قرض اور ڈگری جو بتغافل اہالیان کے تھا، اب ادا ہوگا، اس لیے کہ شاہ ممدوح نے قریب ۱۴ لاکھ کے عمدہ جواہرات و تحفہ اسباب معرفت ہملٹن صاحب سوداگر کے نیلام کرا لیا ہے جس میں مالا ے مروارید کلاں اور حقہ مرصع جواہرات بیش بہا اور ایک الماس ۸۴ رتی کا تھا۔ باقی علیٰ ہٰذا۔ اور نیز سے اب علاوہ اُن محلات اور بیگمات لکھنؤ کے جن میں سے کچھ خارج اور طلاق یاب بھی ہوگئیں ہیں، مع محلات جدید بنگالنوں کے ۱۰۳ ہیں۔ اَللّٰھُمَّ زِدْ فَزِدْ ثُمَّ زِدْ وَلَا تَنْقُص (۶ اکتوبر ۱۸۶۰ء)

۱۱۔ بادشاہِ اودھ چین کرتے ہیں، شب و روز بے غل و غش گذرانتے ہیں، بطنِ مبارک نواب معشوق محل سے دریں ولا فرزندِ ارجمند تولد ہوا۔ جلسوں کی دھوم دھام ہے، مبارک سلامت کا اژدہام ہے (۳ نومبر ۱۸۶۰ء)

۱۲۔ (واجد علی شاہ کو سوا لاکھ ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔ اس میں سے) دس ہزار روپے ماہواری اس قرض میں مجرا ہوتے ہیں کہ سرکار نے ولی عہد بہادر کو مقام لندن میں دیا تھا۔ باقی نوے ہزار سے تین ہزار چھ سو انکم ٹکس کی بابت حسبِ ضابطہ منہا کیے جاتے ہیں۔ (یکم دسمبر ۱۸۶۰ء)

۱۳۔ اخبارات انگریزی سے معلوم ہوا کہ ان دنوں مولوی مسیح الدین خان صاحب متوطن کاکوری نے کہ شاہِ اودھ کی طرف سے وکیل ہو کر لندن کو گئے تھے، کسی صاحب انگریز کی دختر نیک اختر سے شادی کرلی اور وہ اوقاتِ عزیز خاص لندن میں بعیش و عشرت بسر کرتے ہیں (یکم دسمبر ۱۸۶۰ء)

(ج) ادبی خبریں۔ اگرچہ اس زمانے کے ان ہفتہ وار اخباروں کا مقصد دراصل جلب زر ہوتا تھا یا سرکارِ دولت مدار کی مدح سرائی، لیکن اس کے باوجود کبھی کبھار کچھ ادبی نوعیت کی خبریں بھی ان میں چھپ جاتی تھیں۔

۱۔ ۱۳ دسمبر ۱۸۵۹ء کے پرچے میں ۱۰۲ اشعر کا طویل قصیدہ مہاراجہ جموں و کشمیر کی مدح میں محمد مروان علی خان مراد آبادی کے قلم سے چھپا ہے، اس میں تخلص رعنا لکھا ہے۔

## ہفتہ وار کوہ نور

[محمد مروان علی خاں رعنا نے بعد کو تخلص تظام کر لیا تھا۔ غالب کے شاگرد تھے۔ ان کے حالات تلامذۂ غالب میں دیکھے جا سکتے ہیں]

۲۔ انتخاب گورنمنٹ گزٹ الہ آباد، ۲۷ مارچ ۱۸۶۰ء۔ سرکلر نمبر ۱۶ (صاحبان جج اضلاع ملک غربی مکتوب الیہم) ۲۲ مارچ ۱۸۶۰ء احکام صدر کو نسبت طریقۂ تحریر فیصلہ جات حاکمانِ ہندوستانی ماتحت کے اکثر محل شکایت ہوا کرتا ہے، کس واسطے کہ اولاً فیصلہ جات مذکور بیشتر لعبارتِ طویل و لفاظیِ فضول تحریر ہوتے ہیں اور ثانیاً ان میں خصوصاً ایسے الفاظ عربی جو زبانِ اردو کے روزمرہ میں مستعمل نہیں اور جن کو سوائے شخص عربی دان کے کوئی کم سمجھتا ہے، کثرت سے آتے ہیں (۲۸ اپریل ۱۸۶۰ء)

[خود اس خط کی عبارت آرائی قابلِ داد ہے]

۳۔ مہاراجہ کپورتھلا اور ان کے چھوٹے بھائی کنور سوچیت سنگھ کے مابین کچھ تنازع ہوا تھا اور بامدادِ سرکار کنور صاحب کو علاقہ بنگہ کا عوض ایک لاکھ روپیے کے علاقہ کپورتھلہ سے علیحدہ مل گیا تھا۔ . . اب حسبِ تحریک جناب نواب لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب دونوں بھائیوں میں باہم اتفاق ہو گیا۔ . . یہ موقع نہایت خوشی اور کمال مبارکبادی کا تھا، جناب مرزا خاور صاحب [illegible] سیستانی نے قطعۂ تاریخ مصالحت کا موزوں فرمایا۔ (اس کے بعد ۳۱ شعر کا فارسی قطعہ تاریخ مصالحت، درج ہے) (۲۸ اپریل ۱۸۶۰ء)

[یہ خاور، میرزا محمد اکبر خان قزلباش سیستانی بھی غالب کے شاگرد تھے۔ ان کے حالات بھی تلامذۂ غالب میں شامل ہیں]

۴۔ ہورس ہمن ولسن صاحب مدرس سنسکرت کالج آکسفورڈ و داروغۂ کتب خانۂ سرکار دولتمدار حضرت ملکۂ معظمہ . . نے بعمر ۷۵ سالگی ۸ مئی ۱۸۶۰ء کو . . رحلت فرمائی . . . شاعرِ شیریں زبان . . منشی سید عبداللہ . . مدرس یونیورسٹی کالج، لندن (کی دو فارسی تاریخیں درج ہیں) پہلی کی تاریخ ہے:

سیدا، تاریخش از روے بکا    'ہورس ہمن ولسن مغفور ہیں'

اور دوسری تاریخ ہے:

سید برائے سالِ وفاتش بصد الم　　گفتا زمرگ ولسن داغ قلوب شب۔

(۲۹ ستمبر ۱۸۶۰ء)

(د) معاصر تصنیفات: کوہ نور کے زیر نظر پرچوں میں بعض کتابوں سے متعلق بھی کچھ معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ بعض اوقات کتاب کا اشتہار ہے، یا کسی صاحب کی کتاب کی تفصیل ہے جو صاحبِ مطبع کا دوست معلوم ہوتا ہے۔ ان میں سے بعض کے کوائف دیے جاتے ہیں:

۱۔ سفرنامہ منشی امین چند ۲ حصہ، قیمت تین روپیہ

یہ صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر راولپنڈی تھے۔ پہلی جلد آگرہ میں چھپی اور لکھا ہے کہ "مدارسِ سرکاری میں بھی داخل رہی تھی"۔ دوسری جلد مطبع کوہ نور میں چھپی۔ پہلے حصے میں پنجاب، کشمیر، سندھ اور بعضے از ملکِ دکن و خاندیس و مالوہ و راجپوتانہ کا ذکر ہے۔ دوسرے میں اضلاع ممالک مغربی و شمالی، اودھ مع عجائبات و نوادر ممالکِ مذکورہ و اضلاعِ بنگال و نواحِ کلکتہ و جگناتھ پوری وغیرہ (۲۲ نومبر ۱۸۵۹ء)

۲۔ اشتہار منتخباتِ مہدیہ یعنی نسخہ آیین و ضوابطِ فوجداری مرتبہ تا ۱۸۵۹ء از منشی مہدی علی۔۔ جسے صاحب سررشتہ دار کلکٹری ضلع اٹاوہ نے۔۔ مرتب کیا۔۔ مطبع نولکشور کی صحت اور خوشخطی اور عمدگی چھاپہ۔۔۔ بحساب پانچ روپیہ پیشگی۔۔۔ ورنہ بعد اختتام سات روپے لیے جاوینگے (۱۰ مارچ ۱۸۶۰ء)

[یہی منشی مہدی علی بعد کے نواب محسن الملک ہیں۔]

۳۔ دیوان تفتہ جلد دوم از منشی ہرگوپال صاحب سکندرآبادی قیمت ۳ روپیہ (۷ اپریل ۱۸۶۰ء)

۴۔ تضمین گلستان تصنیف تفتہ صاحب　　قیمت ۲ آنہ (ایضاً)

۵۔ جناب نادر الدولہ منشی مظفر علی خان متخلص بہ اسیر۔۔ میاں مصحفی کے شاگرد رشید۔۔ مقرب بارگاہِ سلطان رہے۔۔ سیکڑوں شاگرد ہیں، فارسی اردو میں صاحب دیوان و قصیدہ و مثنوی نہایت خوش بیان۔ دو دیوان ان کے کاغذ شرنج فلس ولایتی پر بخطِ عمدہ ایک جلد میں بتیس جزو: ایک حاشیہ پر، ایک متن میں چھپے ہوئے۔۔۔ دو روپیہ فی جلد۔۔۔ پچیس جلد۔۔ پونے دو روپیہ، اور پچاس جلد کے۔۔ یہ فی جلد مقرر ہے اور سو جلد کے خریدار سوا روپیہ فی جلد

اشتہار از منیجر مطبع اودھ گزٹ، لکھنؤ (۱۹ مئی ۱۸۶۰ء)

۶۔ اشتہار: مثنوی زینت ... سرآمد شعرائے حال جناب منشی ہرگوپال صاحب تفتہ شاگرد رشید فاضلِ دہر علامۃ العصر جناب مرزا اسد اللہ خاں صاحب متخلص بہ غالب . . بعرصت اس مطبع میں تیار ہے . . جو صاحب اس کی پچاس جلدیں خریدینگے، سوا سو روپے کو . . دے دینگے اور سو جلد . . دو سو کو، دس پانچ یا ایک دو . . فی جلد تین روپے کو . . . زرِ نقد مہتمم کو ڈاک کے پاس بھیج کر منگالیں۔ (۹ جون ۱۸۶۰ء)

۷۔ اسی پرچے میں مرزا حاتم علی مہر کی ایک کتاب کا اشتہار ہے:

رسالہ قاعدۂ نغمہ: . . تالیف مرزا حاتم علی مہر . . کمال کیا ہے صرف نقشوں کی ترتیب میں تمام راگوں اور راگنیوں اور ان کے پتروں اور بھاریاؤں اور سُروں کو ایسی اچھی ترتیب سے مرتب کیا ہے کہ تھوڑے سے تردد میں اس علم کے شائق کو تمیز اوقاتِ راگ اور سروں اور سنیکرتوں کی ہو جاتی ہے۔ قیمت مع محصول ۳ر (۹ جون ۱۸۶۰ء)

۸۔ کتاب لاجواب مسمٰی مہابھارت جو زبان سنسکرت سے زبانِ فارسی میں جناب شیخ ابوالفیض فیضی صاحب نے ترجمہ کیا، الحال یہاں لکھنؤ میں جناب منشی طوطارام نے اس کو زبان اردو میں نظم کیا ہے، عرصہ چھ برس میں . . . دس ہزار شعر ہیں . . جس وقت ایک سو درخواست آچکے، اُس وقت کتاب کا چھاپنا شروع ہو . . خریداران درخواست اپنی . . . اور دو روپیہ قیمت پیشگی . . عنایت فرمائیں۔ اشتہار از مطبع اودھ گزٹ، لکھنؤ (۷ جولائی ۱۸۶۰ء)

۹۔ گوردوارہ جو سنگھ کرتارپور والے نے ایک گرنتھ صحیح اور عہد قدیم کا لکھا ہوا کتب خانہ انڈیا ہوم کے واسطے سرکار میں پیشکش کیا تھا، اس کے صلے میں اس کو خلعت پندرہ سو روپیہ مع ایک سند خوشنودی مرحمت ہوئی۔ اور بیدی بکرم سنگھ امرتسر والے نے جنم ساکھی مشرح اور صحیح بابا نانک کی سرکار میں پیشکش کی تھی، اس کو خلعت پانسو روپیہ مع ایک سند خوشنودی بوجہ انعام عطا ہوئی۔
(یکم ستمبر ۱۸۶۰ء)

۱۰۔ اشتہار: جتر چندر کا مولفہ مہاراجہ بلونت سنگھ بہادر کاشی نریش در صنائع و بدائع مطبع ہندی قیمت مع محصول ۲ روپیہ ۸ر

[مہاراجہ بلونت سنگھ سے غالباً مہاراجہ بلوان سنگھ مراد ہیں، جو بیٹے تھے مہاراجہ چیت سنگھ والی بنارس کے، جن کا اردو میں راجہ تخلص تھا۔ ان کا دیوان مطبوعہ موجود ہے ]

۱۱۔ اشتہار۔ کتاب تاریخ اودھ جس میں تمام جغرافیہ ملک اودھ اور کل حال مفصل از عہد نواب سعادت خان تا زمانِ واجد علی شاہ۔ ۔ ۔ مع سبب ضبطیِ ملکِ اودھ۔ ۔ از منشی ہمت پرشاد۔۔ ۸ ر قیمت اس مطبع میں بھیج کر۔ طلب فرماویں۔ ۔ ۔ کتاب تخمیناً چھ جزو پر ہوگی (۲۹ دسمبر ۱۸۶۶)

(ح) عام دلچسپی کی خبروں کی بھی کمی نہیں ہے۔ ایسی خبروں سے ان اقدامات کا پتا ملتا ہے جو انگریزی حکومت نے یہاں کے نظم و نسق اور اپنے تسلط کے استحکام سے متعلق کیے۔

۱۔ سڑک آہنی لکھنؤ مارچ ۱۸۶۰ء میں شروع ہو جاوے گی (۱۰ نومبر ۱۸۵۹ء)

۲۔ اقتضائے رائے ملاء اعلیٰ سلطانی در یں ولایوں قرار پایا کہ زمینداران زراعت پیشہ تو اپنے معاملات زراعت میں سے سرکار کو حسب جمعبندی و مشخصہ معمولی زرِ واجب ادا کرتے ہیں، مگر دیگر پیشہ وران مثل تجاران و ساہوکاران و نوکران وغیرہ اپنے محاصل میں سے کچھ نہیں دیتے۔ ۔ ۔ پس انصاف سے بعید ہے کہ ایک گروہ کے ماحصل میں سے سرکار اپنا حقِ مالکانہ و خسروانہ وصول کرے، اور دوسرا تیسرا فریق مرفوع القلم رہے۔ چنانچہ ولایت میں کوئی پیشہ ور۔ ۔ ۔ ۔ اس دین سے بری نہیں ہے، پانچ روپیہ سیکڑہ سے سات روپیہ سیکڑہ تک ہر پیشہ ور نوکر چاکر اپنے منافع سالیانہ سے بطریقِ شکرانہ امن چین مملکت کے سرکار کو نذر کرتا ہے۔ ۔ ۔ معہذا ماہِ گذشتہ میں یہ حکم صادر ہوا تھا کہ محاصلِ مذکورۂ بالا جس کا نام ٹکس ہے، مثل انگلستان، ہندوستان میں بھی سب پیشہ وروں و سوداگروں و نوکروں چاکروں سے لیا جاوے۔ ۔ ۔ اور علی قدرِ مراتبِ آمدنی و محاصل ہر واحد سے (۳ روپیہ) سیکڑہ کے حساب سے لیا جاوے اور بموجب زرِ ٹکس پیشہ ور کے نمبر مقرر کیے جاویں اور جس نمبر پر جو شخص بموجب تشخیصِ منافعِ خود قائم ہو، زرِ واجبی سال بسال سرکار کو دیا کرے۔ (۱۵ نومبر ۱۸۵۹ء)

۳۔ روبکاری عدالت فوجداری ضلع لاہور ۲۳ نومبر ۱۸۵۹ء:

"حکم تھانہ داروں اور کوتوال لاہور کو دیا گیا تھا کہ طوائف شہر اور انار کلی کے جو پیشہ

کرتی ہیں، وہ اندر گھر کے بیٹھا کریں اور دروازوں پر چق ڈالا کریں، کسی وقت چق نہ اٹھاویں" اور چنداں بازار میں نہ ٹھہرا کریں۔ اس حکم کی کچھ تعمیل تھانہ داراں اور کوتوال بخوبی نہیں کرتے اور خبر گیری اون کی کوشش سے نہیں ہوتی۔ ایسا مناسب نہیں اس واسطے حکم ہوا کہ

پروانہ بنام کوتوال اور تھانہ داران شہر اور اناکلی کے جاری ہووے کہ بموجب حکم سابق کے تعمیل اس کی بخوبی کریں اور نگرانی اس کی رکھیں۔ اگر پھر ہم برخلاف حکم کے دیکھینگے، تو حکم مناسب ہوگا اور نسبت طوائفاں کے حکم اوٹھا دیا جانے کا ہوگا"

(۲۲ نومبر ۱۸۵۹ء)

۴۔ امرتسر میں چنگی کے محصول کے قواعد شائع ہوئے ہیں (ضمیمہ ۲۲ نومبر ۱۸۵۹ء)

۵۔ لدھیانہ میں ٹھیکہ چنگی بشرح فیصدی چار روپیہ ۸ رہا ہے (۶ دسمبر ۱۹۵۹ء)

۶۔ حسب منظوری سوپریم گورنمنٹ یہ تجویز ہوئی ہے کہ ۱۲ اپریل سے نمک پنجاب پر بمقام کان نمک جو صاحب کلکٹر بہادر نمک کے اہتمام میں ہے بجائے عہ (۲ روپیہ) فی من کہ ۸۰ پونڈ کے مساوی ہے، عہ/۲ (۲ روپیہ ۲ آنہ) محصول لیا جاوے، اور محصول نمک کان کوہاٹ میں کچھ اضافہ یا کمی نہ کی جاویگی (۲۰ دسمبر ۱۸۵۹ء)

[کان نمک پنجاب سے مراد کھیوڑہ ہے، جہاں کا نمک مشہور ہے۔ من میں وزن ۸۰ پونڈ نہیں، بلکہ ۸۲ پونڈ کے قریب ہوتا ہے]

۷۔ ۷ تاریخ فروری ۱۸۶۰ء کو سورت سے بروچ تک سڑک آہنی جاری ہو گئی، اور عوام کو بھی اجازت آمدورفت کی دی گئی۔ اوس تاریخ صبح کو صدہا آدمی تماشا دیکھنے کو جمع ہوئے، اور اوسی دن قریب ۸ سو آدمیوں کے سورت سے بروچ کو سواری دخانی گاڑی گئے (۳ مارچ ۱۸۶۰ء)

۸۔ واسطے تجویز تقرر مدرسہ انگریزیک بمقام لاہور، ۲۷ فروری ۱۸۶۰ء کو حضوری باغ میں ایک جلسہ عالی قرار پایا، جس میں . . . (رؤسائے شہر کے نام) رونق افروز ہوتے اور صاحب ڈپٹی کمشنر (اور دوسرے افسران) تشریف لائے۔ صاحب ڈپٹی کمشنر نے رئیسوں کی طرف مخاطب

ہو کر فرمایا کہ سرکار کا منشا ہے کہ لاہور میں ایک اسکول ایسا مقرر کریے جس میں ادنیٰ و اعلیٰ درجہ کے لوگ تعلیم بخوبی پاویں اور جب سلسلہ ترقی علم کا خاطر خواہ جاری ہو جاوے، تو کوئی تدبیر اس کے کالج بنانے کی کی جاوے۔ سو بلحاظ ان امور کے بعد خوض جملہ مراتب یہ بات فیصلہ پائی ہے کہ اس مدرسہ میں تین جماعت قرار پاویں: اول، میں اطفالِ رئیساں تعلیم پاویں۔ دوم، میں اطفالِ صرافاں و ساہوکاران و دیگر تاجرانِ متمول۔ سوم میں غریب لوگوں کے اطفال تحصیلِ علوم کریں۔

(۳ مارچ ۱۸۶۰ء)

۹۔ مدرسہ انگریزی تعلیم۔ ۔ ۔ کے لیے باہتمام مسٹر جی سی میٹکی صاحب مدرس سابق بریلی مقرر ہوا ہے۔ فی طفل رئیس حد تین روپیہ، اور فی طفل تاجر یا ساہوکار ۸ ر ماہوار فیس مقرر ہوئی ہے۔ ۔ ۔ مکان مدرسہ بالفعل حویلی راجہ سوچیت سنگھ میں قرار پایا ہے۔ ۔ ۔ ۱۲ مارچ ۱۸۶۰ء روز دوشنبہ کو یہ مدرسہ جاری ہوگا (۱۰ مارچ ۱۸۶۰ء)

۱۰۔ اشتہار: ازآنجا کہ امیر کبیر وزیر اعظم کشور ہند نے لاہور میں ایک مدرسہ ڈاکٹری کا مقرر کرایا جانا منظور فرمالیا ہے: فریق اول۔ ۔ میں وہ طالب علم ہونگے جن کو سب اسسٹنٹ سرجن بنانے لائق تعلیم دی جاویگی۔ جن کی عمر سولہ سال سے کم نہ ہوگی اور۔ ۔ ۔ داخل کیے جانے سے پہلے ان کو انگریزی زبان میں امتحان دینا ہوگا۔ ۔ ۔ حساب میں بھی ان کو۔ ۔ ۔ ۔ کسور اعشاریہ تک دخل ہونا ضرور ہوگا۔ جو شخص اس فریق میں نہایت ہوشیار اور لائق ہوں، ان کو عنـ روپیہ مہینے تک کی اسکالرشپ ملیگی چار سے چھ سکالرشپ تک اس فریق میں دی جاوینگی۔ ۔ اس فریق میں تعلیم کی مدت پانچ سال تک ہوگی۔

فریق دوم میں ایسی تعلیم ہوگی، جو نیٹو ڈاکٹروں کے بنانے کے لائق ہوگی۔ اس میں پنجاب کے رہنے والے داخل کیے جاوینگے اور عمر طالب علموں کی سولہ سال سے کم نہ ہونی چاہیے۔ داخل کیے جانے سے پہلے۔ ۔ ہندوستانی اور پنجابی زبان میں امتحان دینا ہوگا۔ ۔ اور اصولِ حساب میں ان کو اچھا دخل ہونا چاہیے۔

اس فریق کے طالب علم بطور فوج کے آدمیوں کے بھرتی ہونگے اور جنگی قواعد کے پابند رہینگے۔ ۔ ۔ مدت تعلیم۔ ۔ تین سال تک ہوگی۔ ہندوستانی فریق کے طالب علم اگر انگریزی زبان میں

ہوشیار ہو جاویں اور . تعلیم طلب . . کے اکتساب میں ان کی فہم اچھی معلوم ہو، تو ان کے واسطے یہ امر حاصل ہوگا کہ اونچے فریق میں منتقل ہو کر عہدہ سب اسسٹنٹ سرجن کی تحصیل کی لیاقت حاصل کریں . . . (۷ اپریل ۱۸۶۰ء)

۱۱۔ پرچہ زائد گورنمنٹ گزٹ نمبر ۶۷، ۱۳، شملہ ۲۰ اپریل ۱۸۶۰ کی بنا پر یہ خبر کہ سلسلہ تار برقی جس کے ذریعے سے مملکت ہند انگلستان کے ساتھ ملائی گئی ہے، انجام کو پہنچا ہے۔ (۵ مئی ۱۸۶۰ء)

۱۲۔ یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ ضلع آگرہ میں لوہے کی سڑک بہت تاکید کے ساتھ تیار ہو رہی ہے اور الہ آباد کی طرف کام خوب جاری ہے۔ جو سڑک کہ اعتماد پور سے علی گڈھ کو جائیگی، اس کی منظوری سرکار سے آگئی لیکن سامان اس پر بھی بہت سا جمع ہے اور مٹی کا کام اکثر بن گیا۔ راقم اس خبر کے لکھتے ہیں کہ آثار سے یقین ہوتا ہے کہ یکم مئی ۱۸۶۱ء تک الہ آباد سے تا آگرہ دخانی گاڑیوں کی آمدورفت جاری ہو جائیگی۔ (۱۶ جون ۱۸۶۰ء)

۱۳۔ شکوہ آباد سے آگرہ تک آہنی سڑک بالکل تیار ہے (۲۵ اگست ۱۸۶۰ء)

۱۴۔ ہندوستان میں ابتداے ۱۸۵۳ء سے جنوری ۱۸۶۰ء تک آہنی سڑک اور گردونواح کے دخانی صرف میں دو کروڑ تریسٹھ لاکھ چھ ہزار ستر روپیہ خرچ ہوا اور آمدنی ابتداے جولائی ۱۸۵۶ء سے جنوری ۱۸۶۰ء تک پندرہ لاکھ ستاون ہزار ایک سو اکہتر روپیہ ہوئی (ایضاً)

۱۵۔ . . . میڈیکل کالج . خاص لاہور اس مہینے (یعنی نومبر ۱۸۶۰ء) کی یکم تاریخ سے . . لاہور میں قائم ہو کر بہت شاگرد بعد امتحان کے بھرتی ہوئے۔ جی پی سکربون صاحب اسسٹنٹ سرجن پرنسپل و پروفیسر سرجری۔ (دوسرے اساتذہ کے نام بھی ہیں) (۱۰ نومبر ۱۸۶۰ء)

۱۶۔ اخبار مجمع البحرین میں از روے اخبارات بمبئی لکھا دیکھا کہ مابین سورت اور بھروچ کے کام سڑک آہنی کا، ۳۱ اکتوبر کو اجرا پاویگا۔ پل دریاے تاپتی کا بڑا طویل اور عریض اور نہایت مستحکم اور استوار بنا ہے۔ طول اس کا چار سو گز ہے جس میں ۵۰ ستون . . . . اور تیس محرابیں ہیں (یکم دسمبر ۱۸۶۰ء)

اس سے معلوم ہوگا کہ اس زمانے کا یہ اخبار کتنا اہم اور پُر از معلومات تھا۔

نعیم احمد

# میر جعفر زٹلی : ایک مطالعہ

جعفر نارنول کے ایک سید گھرانے کے چشم و چراغ[1] اور دہلی کے باشندے تھے[2]۔ میر نے لکھا ہے[3] کہ وہ "نادرۂ زمان و اعجوبۂ دوران" تھے۔ میر حسن نے بھی ان کے ذکر میں یہی الفاظ دہرائے ہیں[4]۔ قائم انھیں "از تحائفِ روزگار" قرار دیتا ہے[5]۔

ان کی تاریخِ ولادت اور عمر کے بارے میں کچھ پتا نہیں چلتا۔ شورش نے صرف اتنا کہا ہے کہ فرخ سیر نے انھیں قتل کرا دیا تھا۔ ان کا بیان ہے کہ نواب ذوالفقار خان بہادر کے انتقال کے بعد جعفر نے کہا تھا:

سکّہ زد بر گندم و موٹھ و مٹر　　بادشاہے تسمہ کش فرّخ سیر

---

۱۔ مجموعۂ نغز، ۱: ۱۶۷

۲۔ تذکرۂ شورش (دو تذکرے): ۱۶۳

۳۔ نکات الشعرا: ۳۰

۴۔ شعرائے اردو: ۳۹

۵۔ مخزنِ نکات: ۱۳

یہ شعر سن کر بادشاہ کا مزاج برہم ہوگیا اور اس نے جعفر کو جنت روانہ کر دیا۔"[6]
فرخ سیر ۱۱۲۵ھ میں تخت نشین ہوا تھا۔ اس نے جہاندار کو شکست دینے کے بعد اسے اور اس کے وزیر کو گرفتار کر لیا اور دونوں کو تسموں سے گلا گھونٹ کر مروا ڈالا۔ جب وہ دہلی میں داخل ہوا ہے، تو اس کے استقبال کو جہاندار کا سر نیزے پر چڑھا ہوا اور دھڑ ہاتھی کی ننگی پیٹھ پر رکھا تھا؛ اور اس کے وزیر ذوالفقار خان کی لاش اسی ہاتھی کی دُم سے بندھی ہوئی تھی۔ ان لاشوں کی اسی طرح شہر میں تشہیر کی گئی۔[7] محمد ہادی کامیدخان کے بقول[8] یہ نظارہ اتنا حیرت افزا اور ہوشربا تھا کہ خاص و عام بلکہ جمہور انام کی زبان سے کلمۂ لاحول نکل رہا تھا۔ دنیا پرست سنگین دلوں تک کی آنکھ سے آنسو جاری تھے اور دنیا کی خاطر دین فروش فولادی جگر رکھنے والوں کا پتہ بھی درد سے پانی پانی ہو گیا تھا۔[8]
فرخ سیر کی تخت نشینی کے بعد بھی تسمہ کشی کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ خاندانِ شاہی کے متعدد افراد موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ اگر کوئی دربار سے صحیح سلامت گھر واپس آجاتا، تو شکرانے میں نذر نیاز دیتا تھا۔[9] سب لوگ فرخ سیر کی اس تسمہ کشی سے آگاہ تھے۔ جعفر کا شعر بھی اسی ہراس اور دہشت زدگی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ بس اس کا صحیح 'دانہ کش' کی جگہ 'تسمہ کش' ہی ہوگا۔ جب یہ تسمہ کشی ذوالفقار خان اور جہاندار شاہ کے قتل کے بعد بھی مدتوں جاری رہی اور شورش نے بھی صرف اتنا لکھا ہے کہ فرخ سیر نے جعفر کو سزائے موت دی تھی۔ تو ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی کا فرخ سیر کی تخت نشینی اور جعفر کی موت کو ایک ہی سال کے واقعے قرار دے دینا محض قیاس ہے، قطعی یقین سے نہیں

---

۶۔ تذکرۂ شورش (دو تذکرے) : ۱۶۳
ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے جعفر کی موت کا سال ۱۱۲۵ھ متعین کیا ہے، نیز مندرجہ بالا شعر کے مصرع ثانی میں 'تسمہ کش' کی جگہ 'دانہ کش' لکھا ہے (دہلی کا دبستانِ شاعری : ۱۱۰)، لیکن کوئی حوالہ نہیں دیا۔
۷۔ تاریخِ چغتائی (قلمی)، ۱۸۹ (الف و ب)؛ سیر المتاخرین : ۳۹۵
۸۔ ہفت گلشن محمد شاہی (قلمی) : ۹ (الف و ب)  ۹۔ سیر المتاخرین : ۳۹۵

کہا جا سکتا کہ جعفر کی وفات ۱۱۲۵ھ میں ہوئی یا اس کے بعد بھی ہو سکتی ہے۔ البتہ یہ بات ٹھیک ہے کہ جعفر کا قتل فرخ سیر کی حکومت کے ابتدائی زمانے میں ضرور ہو گیا ہوگا۔ جعفر کی جو افتادِ مزاج تھی، اس کے پیشِ نظر یقین ہے کہ وہ خاموش رہنے والے آدمی نہیں تھے، اس نے یہ شعر اسی زمانے میں کہا ہوگا جب قتل در تسمہ کشی کا بازار گرم تھا۔ اور یہ بھی یقینی ہے کہ فرخ سیر معاف کر دینے والا آدمی نہیں تھا۔ اس نے شعر سن کر اسے موت کے گھاٹ اتروا دیا۔

جعفر کی زندگی کے جو واقعات ملتے ہیں ان سے اس کی فسادِ طبع، زبانت، حاضر جوابی اور مزاج کی تیزی ظاہر ہے۔ میر نے لکھا ہے[۱۰] وہ "زبانِ گزندہ" رکھتا تھا، وضیع و شریف سب اس کا خیال کرتے اور اسے کچھ نہ کچھ دے دیا کرتے تھے۔ وہ جب کسی کے گھر جاتا تو دو پرچے لے کر جاتا۔ ایک پر اس کی مدح اور دوسرے پر ہجو لکھی ہوتی۔ اگر اس سے کچھ مل جانے کی صورت نظر آتی، تو مدح پڑھتا؛ ورنہ ہجو کا پرچہ نکال لیتا۔ پھر لکھتے ہیں کہ ایک دن جعفر مرزا بیدل کے گھر پہنچا اور یہ مصرع پڑھا:

ع چہ عرفی چہ فیضی، بہ پیشِ تو پش

مرزا کو یہ سن کر بہت رنج ہوا اور اسے جھٹ پٹ رخصت کیا![۱۱]

ایسا ہی ایک واقعہ میر حسن نے بھی نقل کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ وہ ایک دن مرزا بیدل کے پاس گیا۔ مرزا اس وقت کسی مصرع میں گرہ لگانے کی فکر میں تھے، اس کی طرف متوجہ نہ ہوئے۔ جعفر نے کہا کہ "صاحب و قبلہ آپ نے کونسا مصرع فرمایا ہے؟" اس پر مرزا بیدل نے مصرع پڑھا:

---

۱۰۔ نکات الشعرا: ۳۰۔۳۱

۱۱۔ قائم نے یہ واقعہ اس طرح لکھا ہے: "کہتے ہیں کہ ایک دن (جعفر) مرزا عبدالقادر کی خدمت میں پہنچا۔ بیدل نے اس کی نظم و نثر سننے کے بعد اسے چند اشرفیاں انعام میں دیں۔ جعفر نے چلتے وقت یہ مصرع پڑھا اور چلتا بنا:

ع ظہوری و عرفی بہ پیشِ تو پش

لالہ بر سینہ داغ چوں دارد

اس پر جعفر نے فوراً کہا اس میں فکر کی کیا بات ہے:

ع چوبکے سبز زیر کوں دارد

بیدل برہم تو بہت ہوا لیکن جعفر کو رخصت کرنے سے قبل کچھ نہ کچھ اسے دینا ہی پڑا۔[۱۲] ان بیانات سے بآسانی یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ جعفر یہ سمجھ گیا تھا کہ امرا مذمت سے ڈرتے ہیں اور وہ ان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھانا اپنا حق سمجھتا تھا۔[۱۳] شفیق نے لکھا ہے[۱۴] کہ جب کبھی اسے کسی چیز کی ضرورت ہوتی، تو کسی بھی امیر کو مدح میں چند شعر لکھ بھیجتا۔ اگر وہ اس پر کچھ بھیج دیتا، تو خیر، ورنہ اس کی مذمت میں دفتر کے دفتر سیاہ کر ڈالتا۔ جعفر کی آتش زبانی کا یہ عالم تھا کہ متصدی اور اہلِ خدمت تو کیا، ظلِ سبحانی (اورنگ زیب) تک اس سے بید کی طرح لرزتے تھے۔ وہ ایک روز کسی امیر کے گھر گیا اور اپنے احوال کی فرد لکھ کر پیش کی۔ اس نے کوئی توجہ نہ دی بلکہ فرد بھی اکراہ کے ساتھ واپس کر دی۔ جعفر نے امیر کے روبرو وہ فرد چاک کر دی اور چلا گیا۔ حاضرینِ محفل نے امیر کو جعفر کا حال اور اس کے مزاج کی کیفیت بتائی۔ یہ سنتے ہی امیر سراسیمہ ہوا، اس نے جعفر کو راستے سے واپس بلا کر معذرت کی۔ جعفر نے جواب دیا کہ میں نے "پیشی" دی اور حضرت نے "پس"، میں نے "چاک" کر دیا۔ امیر ہجو سے ڈر رہا تھا

۱۲۔ شعرائے اردو: ۴۰

۱۳۔ جعفر نے دو رقعوں میں اپنی اس خصوصیت کی طرف اشارہ بھی کیا ہے۔ ایک رقعہ میں جو اخبارِ دربارِ شاہی کی تضمین میں لکھا گیا ہے، یہ بات اس انداز میں بیان کرتا ہے:

"......ظلِ شیطانی عدالت فرمودند۔ بعرض رسید کہ دولتمنداں بمیر جعفر زٹلی متواتر عنایت و رعایت نمی کنند تا بشکوہ نپردازد و ہجو نکند ــــ فرمودند کہ مثلہ دہنِ سگ بہ لقمہ دوختہ بہ۔"

ایک اور ایسی ہی تضمین میں جعفر خود کو مدح کے صلے میں ایک ہزار روپیہ دیے جانے کا ذکر کرتا ہے اور اس نے بادشاہ کا جواب اس مثل سے دیا ہے: اونٹ کے منہ کو زیرہ۔ دیوانِ میر جعفر (قلمی)،۱۹۰۔۲۰: ۲۲

۱۴۔ چمنستانِ شعرا: ۶۸

اس نے جعفر کے ان چند مکالموں پر اکتفا کر لینے کو غنیمت سمجھا۔ شفیق کے بیان کیے ہوئے ایک دو واقعے سے بھی جعفر کی جولانیِ طبع اور زبان کی کاٹ کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس نے کسی اشرف کا سجع کہا: محمد اشرف پیغمبران است

اس شخص نے بے توجہی سے کام لیا اور صلہ نہ دیا۔ جعفر نے غصہ میں آ کر فوراً گرہ لگائی:

نہ ایں اشرف کہ مردودِ زمان است

جعفر کے ذہن کی ایک اور نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی کمزوری پر بھی اسی طرح ہنس سکتا ہے، جس طرح دوسروں کی کمزوریوں پر۔ ایک غزل میں اپنی جنگی صلاحیت کا خاکہ اڑاتے ہوئے کہتا ہے:

گر بادشاہ پنج ہزاری کند مرا  ازپشمِ خایہ زود دو جھنڈا برآورم

ہر جا کہ بادشاہ فرستد مرا بجنگ  آنجا صدائے تِڑ تِڑک و ٹنڈا برآورم

جعفر زٹلی ام کہ اگر نوکری کنم

از بہرِ داغ اسپ سہ لنڈا برآورم

جعفر کی اس خصوصیت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ وہ خود کو زٹلی کہنے سے بھی نہیں جھجکتا۔

شفیق اس کی صفت کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"۔۔۔۔ حاشا کہ طرزِ روزمرہ او طرزِ علیحدہ میدارد و چہ جولانی می نماید، خود را بجائے اسمِ زٹلی یاد کردہ می گوید:

کشتیِ جعفر زٹلی در بھنور افتادہ است

ڈبکو ڈبکو می کند از یک توجہ پار کن

زٹلی لقب اختیار کرنے سے متعلق دو مختلف روایتیں ہم تک پہنچی ہیں۔ قاسم لکھتا ہے[16] کہ جعفر کہا کرتا تھا کہ میں کتنی بھی کوشش کروں، سعدی یا فردوسی نہیں بن سکتا۔ پس زٹلی کہتا ہوں کہ کسی طور ممتازِ عالم تو ہو جاؤں۔

شورش کا بیان ہے کہ جعفر نے ایک بار ہمعصر شاعروں کے سامنے اپنا یہ فارسی شعر پڑھا:

---

۱۵۔ ایضاً: ۶۷  ۱۶۔ مجموعۂ نغز، ۱: ۱۶۷

مارا اگرچہ دیدنِ دُرِّ یتیم نیست — قطارہ سوے دانۂ شبنم غنیمت است

ان شعرا نے رشک کے مارے اس شعر کو زٹل قرار دیا۔ جعفر نے جواب دیا کہ اگر یہ زٹل ہے تو میں زٹل ہی کہونگا اور یہ شعر بداہتہ کہا:

گرنیچۂ پیچدار میسر نہ آیدت — ناچار نُمرِ حقہ، سگ دُم غنیمت است

جعفر نے ایک اور نظم میں اپنا خاکہ کھینچا ہے۔ ایک بار اس نے شہزادہ کام بخش کی ہجو کہی۔ اس نے اسے شہر بدر کر دیا۔ اس پریشانی کے عالم میں جعفر نے ایک نظم کہی، جس کا پہلا شعر ہے:

تنہا شدی اندر سفر، کہ جعفر اب کیسے بنے — افتادی اندر بحر و بر، کہ جعفر اب کیسے بنے

اس نظم میں جعفر نے اپنے دربدر مارے مارے پھرنے کا ذکر کرتے ہوئے وہ لذتیں اور آسائشیں یاد کی ہیں، جو اسے دربار سے وابستگی کے ایام میں میسر تھیں۔ ساقی و بادہ، فالودہ و فرنی، پن بھتہ و شربت، دلبرانِ دلبند، عطر، بیگم اور مان دادو کی یاد میں وہ اپنے آپ کو بڑے دلچسپ انداز میں ملامت کرتا ہے کہ ہجو کیوں کہی کہ یہ سب مزے جاتے رہے۔

آن دیدنِ شہزادہ کو، آں ساقی و آں بادہ کو — کردی خطا خود سربسر، کہ جعفر اب کیسے بنے!
فالودہ و فرنی چہ شد، پن بھتہ و شربت چہ شد — واں بستر و بالیں چہ شد، کہ جعفر اب کیسے بنے!
وہ ذوق ہر دم کا کہاں، نہ عطر بیگم کا کہاں — در خاک شداں کرد فر، کہ جعفر اب کیسے بنے!
وہ مان وہ آدر کجا، وہ لونڈۂ نادر کجا — حالا نیابی آں وقر کہ جعفرا اب کیسے بنے!
دل کو ٹھکانے لا کر اب، مت صبر کو پچھتاوا اب — ہرگز مگو بارِ دگر، کہ جعفرا اب کیسے بنے!

جعفر کے کلام سے اس کی تلخ ازدواجی زندگی کی شہادت ملتی ہے۔ اس واقعے نے بھی دنیا کے بارے میں اس کے مخصوص اور بے لاگ نقطۂ نظر کی تشکیل میں ضرور حصہ لیا ہوگا۔ ایک مثنوی میں جس کا عنوان ہے "در شرح نسبتِ کدخدائی خود کہ در دہلی کردہ بود" جعفر نے دھوکے سے ایک انتہائی بدصورت اور پہلوان قسم کی عورت سے اپنی شادی کا ذکر کیا ہے، اس عورت کو مرد مار، پھوہڑ اور کام چور لکھنے کے بعد اپنی حالتِ زار لکھتا ہے:

بیٹھا رہوں میں حجرے بھیتر — پنجرے میں جوں لنڈا تیتر
چار پانچ دن بیاہی بیتے — بی بی نے تب راہی کیتے

جھگڑا رگڑا بڑا پسارا — لاگی ہونے مارک مارا
دئی دھما دھم ایدھر اودھر — اب مولا میں جاؤں کیدھر
بات بات میں کنٹھی دابے — ہڈی کڈی میری چابے ....
ہاتھی ہو کر مجھ کو پیلا — چیل جھپٹا مجھ سے کھیلا

دوا ور نظموں میں بھی یہی صورت بیان ہوتی ہے۔ "قصیدۂ عشقیہ درباب شہوت" میں جنگجو عورت کی مذمت کی ہے۔ دوسری جگہ بھی لکھا ہے:

درخانہ کہ صورتِ زنِ جنگجو بود — زاں خانہ محنت سفر وزم غنیمت ست

انھیں تلخ تجربوں کی بنا پر وہ شادی نہ کرنے کو بہتر سمجھنے لگا تھا چنانچہ "دربیانِ مجردی" نام کی نظم میں یہ مشورہ دیتا ہے:

مکن زن کہ اندوہِ دردِ سر است — اگرچہ بصورت پری پیکر است

یہی مضمون ایک اخبارِ عدالت شاہی کی تضمین میں اس طرح لکھا گیا ہے: ... ظلِ شیطانی عدالت فرمودند۔ بعرض رسید کہ میر جعفر زٹلی بعلتِ خرخشۂ زنِ ناموافق درخانہ نمی ماند۔ فرمودند کہ مثلاً جس گھر میں سنپت نہیں، تل سے بھلا بدیس۔

(۲)

پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب نے فائز کو شمالی ہند میں اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

۱۷۔ شمالی ہند میں اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر: "فائز نے اپنی کلیات کے خطبے میں لکھا "مخفی نماند کہ ایں رسالہ در ابتدائے سنِ شباب چناں چہ مذکور شد، مرقوم شدہ ..... وفقیر نظر برآں کہ رطب و یابس در کلام می باشد، ارادۂ نظرِ ثانی برآں داشت، لیکن تا پانزدہ سال بیشتر بنا بر کہ اشغالِ دیگر درمیاں بود۔ بعد از انقضائے ایں مدت سنہ یکہزار و یک صد و چہل و دو، فرصتے اتفاق افتاد، نظرِ ثانی براں مجموعہ کردم۔ قریب یک سال دریں کار کشید ....." جناب سید مسعود حسن رضوی نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ "۱۱۴۲ھ سے پندرہ برس پہلے یعنی ۱۱۲۷ھ میں جو عہدِ فرخ سیر کا پانچواں سال تھا، فائز کا کلیات مکمل ہو چکا تھا۔" (ص ۲۶)

"..... حاتم ۱۱۲۸ھ سے فارسی میں شاعری کر رہے تھے، مگر جب محمد شاہی عہد کے دوسرے سال یعنی ۱۱۳۲ھ میں ولی کا دیوان دہلی آیا اور ان کا کلام ہر طبقے میں مقبول ہوا، تو حاتم نے ناجی، مضمون اور آبرو کے ساتھ اردو میں شعر کہنا شروع کیا۔ فائز اپنا کلیات جس میں اردو دیوان بھی شامل ہے، ۱۱۲۷ھ میں مرتب کر چکے تھے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ فائز کا کلیات مرتب ہو چکنے کے ایک سال بعد حاتم نے فارسی میں اور پانچ سال بعد اردو میں شعر کہنا شروع کیا۔ اس طرح حاتم اور ان کے ساتھ شاعری شروع کرنے والے تمام شاعروں پر فائز کا تقدم ثابت ہے۔"

لیکن اس استدلال سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی چنانچہ قاضی عبدالودود نے لکھا ہے[18]:

"..... کلیات ..... ۱۱۴۲ھ سے پندرہ سال قبل مرتب ہوا تھا اور فاضل مرتب کی قطعی رائے ہے کہ ترتیب کے وقت دیوانِ اردو اس میں شامل تھا مگر یہ ہرگز متیقن نہیں۔ فائز نے ایک مثنوی میں ...... بادشاہوں کے عبرتناک انجام کا ذکر کیا ہے۔ اس میں عالمگیر کی وفات کے ۱۴ سال بعد تک (وفات عالمگیر ۱۱۱۸ھ / ۱۷۰۷ء) جتنے بادشاہ ہوئے تھے، سب کے نام آئے ہیں۔ ایک مصرع جس میں محمد شاہ کا نام ہے (سالِ جلوس، ۱۱۳۱ھ) یہ ہے: "پس از وے محمد شہ آمد پدید" ظاہر ہے کہ یہ مثنوی ۱۱۲۷ھ میں شاملِ کلیات نہ ہوگی۔ فہرست آکسفرڈ میں ایک مثنوی کا ذکر ہے جو ۱۱۳۴ھ کی ہے، سالِ تصنیف "دولت خانۂ والا" سے معلوم ہوتا ہے..... یہ مثنوی بھی ۱۱۲۷ھ کے مرتبہ کلیات سے غیر حاضر ہوگی۔ ان دو مثنویوں کا یہ حال ہے تو یہ کس طرح لازم آتا ہے کہ دیوان اردو اس میں موجود تھا۔"

اپنے اس جائزے میں قاضی عبدالودود صاحب نے صاف الفاظ میں فائز کی قدامت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ ان کے الفاظ میں[19]:

"..... کلیات کے نسخۂ ۱۱۴۲ھ میں دیوان اردو کے شمول کی بنا پر یہ کہنا بھی ممکن نہیں کہ ۱۱۲۷ھ میں فائز کی ریختہ گوئی کا آغاز ہو چکا تھا۔ ۱۱۴۲ھ سے کتنے برس قبل اس کی

---

۱۸۔ عیارستان، ۹۶

۱۹۔ ایضاً

ابتدا ہوئی، اس کا فیصلہ موجودہ مواد سے نہیں ہو سکتا۔"

سید مسعود حسن رضوی صاحب نے دیوان فائز کا جو مقدمہ لکھا ہے، اسے پڑھنے سے خیال ہوتا ہے کہ شاید خود انھیں بھی فائز کے شمالی ہند میں اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر ہونے کا یقین نہیں ہے وہ لکھتے ہیں:[20]

"۔۔۔۔ فائز کے ایک دوسرے ہم عصر میر جعفر تھے جو زٹل یا زٹلی کی صفت کے ساتھ آج بھی مشہور و معروف ہیں۔ ان کا اردو کلام کافی مقدار میں اب تک موجود ہے۔ مگر وہ زیادہ تر ہجو اور فحش پر مشتمل ہے۔۔۔۔"

فحش نگاری سے تو آئندہ صفحات میں بحث ہوگی یہاں صرف یہ کہنا ہے کہ فائز اور میر جعفر کو ہم عصر نہیں کہا جا سکتا۔ خود رضوی صاحب فائز کے کلیات کی (جس میں دیوان اردو کی شمولیت ہرگز ثابت نہیں) ترتیب کا زمانہ عہدِ فرخ سیر کا پانچواں سال بتاتے ہیں، جب کہ میر جعفر اس بادشاہ کے عہدِ حکومت کے ابتدائی زمانے میں قتل کر دیا گیا تھا۔ اس لیے یہ بات بآسانی کہی جا سکتی ہے کہ اب تک فراہم شدہ مواد کی بنا پر میر جعفر شمالی ہند میں اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہے۔[21]

(۳)

جعفر کے کلام کی مقبولیت کا کئی تذکروں میں اعتراف کیا گیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اسے مزخرفات بھی قرار دیا گیا ہے۔ میر حسن کا خیال ہے کہ وہ مدح و قدح اپنے انداز میں خوب کہتا تھا۔ قائم نے لکھا ہے کہ اس کا کلام عوام و خواص میں مشہور ہے لیکن اتنا مبتذل ہے کہ اسے نقل نہیں کیا جا سکتا۔

قاسم کا کہنا ہے کہ "زٹلیا تش تا الیوم بر صفحۂ روزگار یادگار، بر زبانِ خاص و عام جاری است"

---

۲۰۔ شمالی ہند میں اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر: ۸

۲۱۔ میر جعفر کے جائز مقام کے عدم تعین اور اس کی اہمیت سے انکار کی دوسری مثال ڈاکٹر محمد حسن نے مہیا کی ہے۔ انھوں نے پچھلے دنوں "دیوان آبرو" شائع کیا تو اس میں سید مسعود حسن رضوی پر نکتہ چینی کرتے ہوئے صاحبِ دیوان ہونے کی اولیت کا سہرا آبرو کے سر باندھ دیا۔ حاتم کے بقول آبرو نے ۱۱۳۲ھ میں اردو میں شعر کہنا شروع کیا اور اس سے پانچ چھ برس پہلے جعفر کا انتقال ہو چکا تھا۔

# میر جعفر زٹلی

شفیق نے محمد اعظم شاہ کی یہ رائے درج کی ہے کہ جعفر اگر زٹل نہ کہتا تو ملک الشعرا ہو جاتا۔ اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ جعفر کے اشعار اتنے عالمگیر ہیں کہ انھیں بطور مثال پیش کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔

خود جعفر نے اپنے کلام اور انداز بیان پر اس انداز میں تبصرہ کیا ہے:

جعفر زٹلی از لب توق ... بہتر است | در آبداری سخنت موت بہتر است
در حق بندگان خدا آنچہ گفتہ | لاحول می کنم کہ زتو چھوٹ بہتر است

جعفر کے کلام کے بارے میں بھی بہت سی غلط رائیں سکہ رائج الوقت بن گئی ہیں۔ لیکن اس کے کلام کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس کے عہد کا جائزہ لیں۔

کلام جعفر دراصل اپنے دور کے معاشرتی ادبار اور اخلاق انحطاط کا آئینہ دار ہے۔ اس کی یہ نظمیں اس قسم کی شاعری کا جسے ہم "شہر آشوب" کہتے ہیں، پہلا اردو نمونہ ہیں۔ اورنگزیب ۸ ستمبر ۱۶۸۱ء کو دکن کے لیے روانہ ہوا۔ اس کی زندگی کے بقیہ چھبیس سال جنوب میں گذرے اور اسے شمال کی طرف پلٹنا نصیب نہ ہوا۔ اس عرصے میں شمالی اور وسطی ہند نراج اور انتشار کی آماجگاہ بن گیا۔ عمر رسیدہ شہنشاہ اور مرکزی حکومت کی اس علاقے کے عہدہ داروں پر گرفت نہ رہی چنانچہ نظم ونسق میں ڈھیل پیدا ہو گئی اور زندگی کے تمام شعبوں میں فساد نے راہ پالی سربرآوردہ لوگ اور زمیندار مقامی حکام کی حکم عدولی اور من مانی کرنے لگے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ملک میں بدنظمی کا دور دورہ ہو گیا۔

اورنگزیب دکن کی مہمات میں اپنی تمام فتوحات کے باوجود وہاں جغرافیائی سیاسی حالات کے ہاتھوں بیدست و پا ہو کر رہ گیا تھا۔ اس صورت حال اور اس کے سلطنت پر پڑنے والے اثرات کا بعض امرا کو بخوبی احساس تھا۔ چنانچہ بیجاپور اور حیدرآباد کی فتح کے بعد عمدۃ الملک مدارالمہام اسد خان نے بادشاہ سے درخواست کی کہ الحمد للہ بفضل قادر متعال اور اقبال بےزوال دو عظیم ملک فتح ہو گئے ہیں۔ اب صلاح یہ ہے کہ رایات عالیات ہندستان بہشت نشان کی طرف متوجہ ہوں تاکہ دنیا والوں کو معلوم ہو جائے کہ کوئی کام باقی نہیں رہ گیا ہے۔ اس درخواست پر عالمگیر نے اپنے دستخطوں سے یہ جواب دیا:[۲۲]

۲۲۔ احکام عالمگیری: ۹۴

"عجب از آں خانہ زادِ ہمہ داں کہ چنیں عرض نمودہ۔ اگر غرض آنست کہ بر مردم معلوم شود کہ کار بسر نماندہ است، خلافِ واقع است، تا دمے زحیاتِ فانی باقی است از شغل و کار خلاصی نیست:

رہ ہر دو طولِ ایں راہ رہبرے در کار نیست | تا نفس باقیست، راہِ زندگی ہموار نیست
مشکل بدلِ رسیدہ ہوائے وطن کند | شبنم چناں برفت کہ یاد از وطن کند

اگر حضرتِ اعلیٰ (شاہجہاں) بودنِ دار الخلافت و مستقر الخلافت اختیار نمی کردند و ہمیشہ در سفر بودند، کار بایں جا نمی رسید کہ رسید۔ و اگر از راہِ پاسِ ادب عرض نمی کند و در تردّدِ قلعہ گیریہا مشقت میکشد، آیندہ در محاصرۂ قلعہ ہا متوجہ میشوم:

غریقِ عشق چہ اندیشہ از خطر دارد | ز سر گذشتہ چہ پروائے دردِ سر دارد

الحمد اللہ در ہر مکان و ہر جا کہ ہستیم بر ور دل از تعلقات بر داشتہ ایم و مردن را بر خود آسان کردہ ایم:

عقدۂ دلبستگی را اندک اندک باز کن | ورنہ مرگ ایں رشتہ را یکبارہ غافل می کشد"

اگر شاہجہان کا کبھی زحمتِ سفر نہ اٹھانا غلط تھا، تو عالمگیر کا طویل مدت تک دار السلطنت سے غیر حاضر رہنا بھی صحیح نہیں تھا۔ دونوں سے خرابی ہی پیدا ہو سکتی تھی، اور ہوئی۔ میر جعفر کی تحریروں میں عالمگیر کی دکن میں مہم جوئی اور اس کے تباہ کن عواقب کا گہرا احساس ملتا ہے۔ وہ ایک اخبارِ دیوان خاص کی تضمین میں بادشاہ کی بے بسی کا یوں اظہار کرتا ہے:

"...... ظلِ شیطانی زدیوانِ خاص فرمودند۔ وکیلِ زیب النسا بیگم عرض کرد کہ حضرت خود بدولت تماشائے ملکِ دکھن بسیار دیدند۔ حالا در ہندوستان مراجعت فرمایند۔ فرمودند کہ مثلہ:

ان نینوں کا یہی بسیکھ | یہ بھی دیکھا، وہ بھی دیکھ"

جعفر کے ایک اور رقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ دکن میں بادشاہ کی حالت وہی تھی جیسے کسی بادبان شکستہ جہاز کے ناخدا کی ہوا کرتی ہے۔ اسے خود یہ احساس تھا کہ یہ مہم جوئی بھول بھلیاں ہے۔ جعفر کا اس بات کو سمجھ لینا اس کی زبردست ذہانت اور دقیق قوتِ مشاہدہ کا بیّن ثبوت ہے:

"۔ ۔ ۔ ۔ اورک خلقِ شیطانی بر درِ دیوان فرمودند۔ ترلینڈ خان بہادر عرض نمود کہ جہاں پناہ سلامت، در ملکِ دکھن اینقدر تلاش و تردد تا بکے؟ فرمودند کہ مثلہ:

یا تو بھینسا بھینسوں میں یا قصائی کے کھونٹے"

جعفر عالمگیر کی ناکامی کے ایک اہم سبب پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ بادشاہ کے اپنے نامور سردار بلکہ شہزادے تک اس کے مخالفوں سے ملے ہوئے تھے۔ مثلاً بیجاپور کی مہم کے دوران میں اورنگزیب کا داروغۂ توپ خانہ مومن خان اور بخشیِ دوم ملتفت خان سکندر کے مخبر بنے ہوئے تھے۔ اور تو اور شہزادہ محمد معظم بھی اس سلسلے میں ملزم قرار پایا تھا اور ثبوت مل جانے پر اس کا اثاثہ ضبط کر کے اسے قید کر دیا گیا تھا[۲۳]۔ جعفر ایک تضمین میں اس کے بیان میں لکھتا ہے کہ دیوانِ عام میں گپ چپ رانے ہرکارے نے عرض کیا کہ شیخ رد ٹی توڑ ولد مفت خور ابن نمک حرام نمک تو حضرت کا کھاتا ہے، لیکن غنیم کا خیر خواہ ہے۔ بادشاہ نے جواب دیا کہ یہ ایسی بات ہے جیسے، کھاویں بیویں محمود کے اور انڈے دیویں مسعود کے۔

امرائے سلطنت کی کامچوری اور نااہلی بھی جعفر کی نظر سے پوشیدہ نہیں تھی۔ بادشاہ کے ہمراہ کثیر افواج تھیں لیکن اس کے منصوبوں اور احکام پہ خاطر خواہ عمل نہیں کیا جاتا تھا۔ اس بات سے خود بادشاہ بھی آگاہ تھا۔ جعفر اس صورتِ حال کے بیان میں لکھتا ہے:

نفس پرور خان نے دیوانِ خاص میں بادشاہ سے عرض کیا کہ امرا حضرت کا اس قدر مال کھاتے ہیں، لیکن مزاج کے موافق کام نہیں کرتے۔ بادشاہ جواب دیتا ہے کہ "گدھوں کھایا کھیت پاپ نہ پُن۔" ایک اور رقعہ میں ایسی ہی عرض کے جواب میں یہ مثل نقل کی گئی ہے: سو غلام گھر سُونا۔

کئی ایسی تضمینیں ہیں، جن میں جعفر یہ ظاہر کرتا ہے کہ شمال میں بدامنی اور سرکشی کا دور دورا ہو گیا تھا اور عالمگیر جیسے سخت گیر اور ضابطے کے طلبگار بادشاہ نے عالمِ بیچارگی میں حالات کی اس رفتار سے گویا سمجھوتہ کر لیا تھا۔ لکھتا ہے کہ بادشاہ سے جب یہ کہا گیا کہ حضرت کو دکن کی تسخیر میں ملکِ ہند کی خرابی کی خبر نہیں رہی، تو بادشاہ کہتا ہے: اوکھل میں سر دیا

۲۳۔ مآثرِ عالمگیری، ۲۹۳۔۲۹۴۔

تو دھمکوں سے کیا ڈر۔

ایک اور مرتبہ بادشاہ سے کہا گیا ہے کہ حضرت کے مبارک قدم مدتِ مدید سے ملک دکھن میں ہیں، ایسا نہ ہو کہ سلطان محمد اکبر کسی کے ساتھ مل کر موروثی ملک پر حملہ کر دے یا اس کے دل میں کوئی فاسد خیال آجائے[24]۔ بادشاہ کی طرف سے جواب ملا: راجا چھوڑے نگری، جو چاہے سو لے۔

جعفر کے دو رقعوں کا مضمون یہ ہے کہ بادشاہ سے عرض کیا گیا کہ حضرت کی تختگاہ اکبر آباد پر مفسد دیہاتی اور چودھرا کے ماستے اور دھاوے کرتے ہیں۔ اور کوئی مانع نہیں آتا ہے۔ ایک موقع پر بادشاہ کا جواب یہ مثل ہے: دیوے کی گ۔ ٹھکانہ جب کہ دوسری مرتبہ یہ کہاوت درج ہوئی ہے: ندی کنارے روکھڑا، جب تب ہوئے بناس۔

جعفر کی بعض تحریریں امرا کے ظلم و ستم کی شہادت دیتی ہیں۔ اس سلسلے میں اس کے تین رقعے قابلِ ذکر ہیں۔ ایک رقعہ میں بادشاہ سے اکبر آباد کے قلعہ دار عبداللہ کے خلاف شکایت کی گئی ہے کہ یومیہ داروں اور وظیفہ خواروں کی طلب بہت تاخیر سے دیتا ہے۔ بادشاہ کا یہ جواب اس کے اہلکاروں پر مناسب ترین محاکمہ بن گیا ہے: ڈوم، پیادہ، پوستی، تینوں بے ایمان میر ملک حسین بہادر خان، اعظم خان کوکہ کا بھائی اور عالمگیر کے نامور ترین امرا میں سے تھا۔ اس کو ۱۶۷۳ء میں خان جہاں بہادر کوکلتاش اور ۱۶۷۵ء میں ظفر جنگ کے خطابات دیے گئے۔ وہ کافی مدت دکن میں رہا تھا۔ اسے اپریل ۱۶۹۱ء میں پنجاب کا صوبہ دار مقرر کیا گیا لیکن ۱۶۹۳ء کے وسط میں معزول کر دیا گیا[25]۔ خان جہاں نے صوبے کے باشندوں اور خاص

---

۲۴۔ سلطان محمد اکبر نے بالآخر ۱۰۹۱ھ / ۱۶۸۱ء میں اپنے باپ کے خلاف بغاوت کی۔ اس کے جھنڈے تلے دس ہزار فوجی جمع ہو گئے۔ راجپوت سرداروں کی حمایت بھی اسے حاصل ہو گئی تھی۔ اورنگزیب نے خود باغی شہزادے کے خلاف فوج کی کمان کی۔ لیکن شہزادہ فرار ہو گیا اور اس کی فوج منتشر ہو گئی۔ وہ اگلے پچیس برس تک ایک مفرور باغی کی حیثیت میں دربدر پھرتا رہا۔ ایران میں ۱۱۱۸ھ / ۱۷۰۶ء میں وفات پائی۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: مآثر عالمگیری (اردو ترجمہ) ۲۱۷۔ ۲۲۶۔ ۳۰۱۔ ۴۷۸؛۴۸۔

۲۵۔ مآثرالامرا (۱): ۸۰۹۔ ۸۱۳؛ ۱۸۹۰

طور پر لاہور کے لوگوں پر اس قدر شدت کی تھی کہ خود اورنگزیب نے ایک بار اس سے کہا کہ "مارا بشما ایں گمان نبود"[26] اس کے زمانے میں شہر لاہور کے عوام و خواص کو طرح طرح کی اذیتیں اٹھانا پڑی تھیں۔ کھیت اور باغ اجڑ گئے، مکان ڈھ گئے، غلہ گراں ہو گیا، پانی تک میسر نہ آتا تھا۔ جعفر نے خان جہان کے قہر و ستم کی اپنے مخصوص انداز میں عکاسی کی ہے۔ اس نے ایک عرضی کی تضمین میں خان جہان کو اپنے کارنامے گنواتے اور بادشاہ سے شکایت کرتے دکھایا ہے۔ یہ رقعہ اس کی طنز نگاری کا نمایاں فن پارہ ہے:

"... ظلِ شیطانی عدالت فرمودند۔ عرضداشتِ خانِ جہان بہادر بنظرِ اقدس گذشت۔ خلاصۂ مضمون آنکہ جہان پناہ سلامت، از مقدمِ خیر ایں پیرِ غلام در بلدۂ لاہور بجز روباہ و شغال دیگر دم زمارا اصلاً مطلقاً اثر و نشانِ انسان نماندہ و نرخِ غلہ بقیمتِ جواہر زواہر برابر شدہ و آب نیز ہمیں دستور و باغ و بوستانِ نزہت افزاے اطراف و جوانب را سوختہ، صد کردہ بے بلک، دو صد کردہ آبادانی طرق و سبیل را صفاً صفاً دگا دگا نمودہ، میانۂ شہر را نمونۂ دشتِ کربلا ساختہ و خشت خشتِ قلعہ را برآوردہ بہوا رساندہ و رعایا برایا را برآوردہ از جرعۂ بادۂ ادبارِ خود سرمست و مخمور ساختہ و جمیع حرکات و سکنات و تحیات و زاکیاتِ بلدۂ مذکورہ راہ تحت الثریٰ گرفتہ ـــــ باوجود ایں قدر سعی و تردد بر ایں پیر غلام لطفِ حضرت معطل است۔"

جعفر کے مابعد زمانے میں شعرائے جابجا اپنے شہر آشوبوں میں فوجیوں کی معاشی بدحالی اور ان کے ہتھیار فروخت کرنے کا تذکرہ کیا ہے۔ جعفر کے ایک رقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک کے فوجی نظام میں ابتری جبھی شروع ہو چکی تھی۔ وہ ایک رقعہ میں فوجیوں کی حالتِ زار کے بیان میں لکھتا ہے کہ چپ چاپ رائے ہرکارہ نے دیوانِ عام میں بادشاہ سے عرض کیا کہ پشت اندازخان کے نوکر اسپ و سلاح فروخت کر رہے ہیں، مگر کوئی گھاس کے نرخ خرید نے کو بھی تیار نہیں[27]

26۔ احکام عالمگیری: 39

27۔ عالمگیر کے زمانے میں تنخواہ کی ادائی میں تاخیر اور سپاہیوں کے تشدد پر اتر آنے اور میر آتش میر محمد خلیل کو مجبور کر کے تنخواہ وصول کرنے کے حالات کے لیے دیکھیے احکام عالمگیری: 61

ایسے انتشار میں سماجی اور معاشرتی اقدار تہ و بالا ہو جاتی ہیں۔ جیسے دنیا ہی بدل گئی ہو جعفر بھی کچھ ایسا ہی محسوس کرنے لگے تھے۔ اپنے ایک رقعے میں جس کا عنوان ہے "در حسبِ حالِ زمانہ" اپنے خیالات اور جذبات کا اس طرح اظہار کرتے ہیں:

"سبحان اللہ زمانہ چہ پُرکٹھن و چلنِ جہاں چہ پُرمحن است۔ ہر کرا کرّ و فر و زیب و زاب و چہرہ پر ٹیپ و ٹاپ بیشتر بینند، او را آدر و منوہار بسیار میکنند و ہر ٹرو پوں کہ از دہ حادر میشود، مخلصِ موسیقار و نادرۃ الادوار گویند، و ہر کہ بوجھ بے حاصل را بکار برند خواہ بالنسل ابن المینڈک و ولد الکنسٹ و ذوی الٹرک و فی الحقیقت بے ادراک باشد۔ مثلہ: اندھا بگلا کیچ کھائے از ہمیں جاست اگر صحیح الکتب و الپروار فی الکچ پچ البدک و الادبار گرفتار آید، ہر لینڈی بوچی بخاطرش نیاورند و در گلی کوچہ قربتش ندارند، خواہ بذات سادھو و آٹھوں گانٹھ جوہر پاک اصل باشد مثلہ:

اندھا مُلّا، پھوٹی مسیت۔ ........ یا ایہا الدہ یان والگیان قیل بر مثال ابیات:

اہلِ دنیا جھک جھک بک بک قیل و قال　　　اور سر چُپ کی ڈومنی گاوے تال بے تال

معذور فرمایند و پر کہا سنایند بر کہاوت این کہ مثلہ: اونٹ رے اونٹ، تیری کونسی جا کہ سیدھی ہے؟"

اس اختلال میں نا اہلوں کو عروج حاصل ہونا شروع ہو گیا تھا۔ یہ بیان اردو شہر آشوب کا ایک اہم عنصر ہے۔ جعفر اس واقعے کے اظہار میں بھی اولیت رکھتا ہے۔ وہ ایک عرضی کی تضمین میں بادشاہ پر طنز کرتا ہے کہ عہدوں کی تقسیم میں سفارش چلتی ہے اور اہلیت کو مدِ نظر نہیں رکھا جاتا۔ ذوالفقار خان بادشاہ سے سفارش کرتا ہے کہ "...... جہاں پناہ سلامت ڈھلڈ داد خاں کنبوہ مردِ قابل و بکار آمدنی است و از مدت بیکار نشستہ از فضل و کرم امیدوار است کہ مشار الیہ را بخدمتِ عمدہ سرفراز فرمایند۔" بادشاہ تمام ممالکِ محروسہ کی ٹلہ نویسی اس کے نام مقرر کر دیتا ہے۔

جعفر شاہجہان آباد کے کسی نامعلوم کوتوال کو جسے اس نے ک. ن پرست کا خطاب دیا ہے، نااہل قرار دیتا ہے۔ اور بادشاہ کی طرف سے جو مثل بطور جواب درج کرتا ہے وہ اس بات پہ

، لوگ

یہ جان گئے تھے کہ عالمگیر اپنے دور دراز کے امرا کی نا اہلی سے واقف تھا،

یا جنھیں اٹھا سکتا تھا وہ رقعہ یہ ہے :

ری تعبیر

دلالت کرتی ہے کہ لوگ ... بطانی ہر روز دربار فرمودند۔ بغرض رسید کہ اندھا دھند خان عرض

نگران کے خلاف کوئی قدم ... ن پرست خان را کوتوالیِ شاہجہان آباد نمی زیبد؟ فرمودند کہ مثل

"... . ظلِ شیطانی محمل کی جھول"

نمودند کہ ک... ظل ... تو اپنے رقعوں یا تضمینوں میں جو نام دیے ہیں، وہ بھی بتاتے ہیں کہ

خارشتی کتا او ... ل اور انتہائی گھٹیا درجہ کے انسان سمجھتا ہے۔ اس کے استعمال کیے ہوئے

جعفر نے عالمگیری امرا

مُصنّفت انھیں نالا ... خان ولد موٹل خان دا مادِ آقا تھل تھل ؛ مرزا تا لود بیگ ولد بے نشان خان؛

نام یہ ہیں ؛ بوزینہ بیگ ولد لنگور بیگ ؛ عصمت خراب ؛ چپٹی خانم ؛ شیخ ہلچل ولد شیخ کھلبل ؛

اندھا دھند خان ؛ بھَیتّہ گو برچند ولد مینگنی داس دکیل ؛ بھینسا سُر خان ابن

ترلینڈ خان۔

یہ تمام باتیں بدترین اخلاقی زوال کا سبب بن گئی تھیں۔ جعفر کی نثری نگارشات میں امرا کے مذاق کی گراوٹ اور ان کے غیر صحتمند جنسی مشغلوں کی مذمّت کی گئی ہے۔ اس پستی کی سب سے نمایاں مثال مدار المہام عالمگیری اسد خان کا گھرانا ہے۔ اس کے بھانجے مرزا تفاخر نے دار الخلافہ دہلی کو اپنی ہوسناکی کی تسکین کا مرکز بنا لیا تھا۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ جب چاہتا، بقالوں اور تیسیرینی فروشوں کی دکانوں پر ٹلہ کر دیتا اور انھیں لوٹ لیتا۔ وہ راہ چلتی عورتوں سے بدتمیزی کرتا۔ ایک بار اس نے گھنشام نامی ایک بکسریہ کی نوبیاہتا دلہن کو اس کی ڈولی میں سے اڑا لیا۔ اس پر کشت و خون تک نوبت پہنچی[29]۔

۲۸۔ شہر آشوب میں جا بجا سوکھے ٹکڑوں کے محتاجوں کو عروج حاصل ہونے کا تذکرہ ہے۔ جعفر اسی کے بیان میں لکھتا ہے : "... . . ظلِ شیطانی ہر روز دیوان فرمودند۔ شیخ ہلچل ولد شیخ کھلبل عرض نمود کہ مرزا چیت پکار خان پیش ازیں بنانِ جویں محتاج بود، حالا صاحبِ سیف والقلم و خداوندِ لوائے والعلم گردیدہ است"۔

۲۹۔ احکام عالمگیری : ۵۰۔ ۱۵

جعفر نے اخبارات دربار شاہی کی تضمینوں میں جا بجا اس اخلاقی گراوٹ کا پردہ فاش کیا ہے ۔ امرد پرستی اسی جنسی غیر صحتمندی کا ایک روپ تھی۔ اس سلسلے میں جعفر کی ایک تحریر بطور مثال پیش کی جاتی ہے:

"۔۔۔۔ ظل شیطانی دیوان عام فرمودند۔ مرزا تابود بیگ ولد بے نشان خان عرض نمود کہ د۔ر دادخان ولد آ۔ت پرست خان دعوئی تہوری میکند و دم سخاوت می زند باآنکہ مفعول است۔ فرمودند کہ مثلہ:

کو۔۔۔ں را ہیچ دانی زعم شمشیر از کجاست
آب مرداں را بجائے شیر مادر خوردہ اند

(۴)

کلام ۔ سیاسی ادبار، نظم و نسق کی خرابی، معاشرتی انتشار اور اخلاقی پستی کے یہی رنگ جعفر کی شاعری میں بھی اپنی تمام تیزی کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ اسے اپنے دور کی خامیوں اور خرابیوں کا شدت سے احساس تھا، بعض وقت وہ اکتا کر یہ سوچنے لگتا کہ ایسے معاشرے سے راہِ فرار اختیار کر لے۔ چنانچہ ایک قصیدے میں کہتا ہے:

جس شہر میں دلبر نہیں اشراف کا آدر نہیں
قاضی شرع کا ڈر نہیں، اوس شہر سے کہسار بہ

لیکن اس کے بجائے اس نے سماج کے گھناؤنے اور ناپسندیدہ گوشوں کو بے نقاب کرنے اور اس خلل اور ہیجان کو مضمونِ شعر بنانے کا راستہ اختیار کیا۔ اس نے عشق و عاشقی، ہجر و وصال اور راز و نیاز یا مدح کی بجائے عوام و خواص کے دکھ درد اور تاریخی جبر کی پردہ دری کو موضوعِ سخن بنایا یہ اچھوتا اور صحتمند ادبی اجتہاد تھا۔ یوں معنی اور بیان کے ان تجربوں نے شمالی ہند میں اردو شاعری کو اس کی باقاعدہ ابتدا ہی میں حقیقت اور واقعیت کی راہ پر ڈال دیا۔ اس کی ان ادبی کوششوں میں اتنی سچائی اور پیرایۂ بیان میں اتنی تلخی اور تندی تھی کہ لطافت و نزاکت پسند طبیعتیں اسے برداشت نہ کر سکیں انھوں نے اسے ہزال، فحش گو اور ہجو نگار کہہ کر ٹالنا چاہا۔ وہ تو خیر کیا کامیاب ہوتے، اردو شاعری پر اس کی گہری اور

امسٹ چھاپ لگ گئی۔ وہی تذکرہ نگار جو اس کے کلام کی تنقیص کرتے ہیں، ہمیں اس کی پیرو[ی] میں شہر آشوب لکھتے نظر آتے ہیں۔[۳]

جعفر کے اہم موضوعات پند و نصیحت، کردار کی سا[قط] خصوصیتوں پر زور، امرا کی کمزوریوں کی مذمت، اخلاقی گراوٹ کا اظہار اور آشوبیہ مضامین ہیں۔

"مخمس در کچھوہ نامہ" میں تیس بند ہیں۔ اس میں ایک ریاکار شیخ صاحب کے کردار پر نکتہ چینی کی گئی ہے۔ وہ کچھوے کی پیٹھ پر بیٹھ کر دریا پار کرتا ہے۔ لیکن کنارے پہنچ کر اسے درخت سے باندھ دیتا ہے۔ واپسی میں دریا میں سخت طوفان آجاتا ہے اور شیخ ڈوب جاتا ہے۔ جعفر اس سے یہ سبق دینا چاہتا ہے کہ ریاکاری اور ایذارسانی کا انجام برا ہوتا ہے۔ مخمس کا آخری بند ہے:

مردار ہوئے شیخ رہے ڈبکوں ڈبکوں کر تسلیم جاں بحق ہوئے اب کبکوں کبکوں کر
پانی بھرا از ار میں اب لپکوں لپکوں کر خاموش آ اجل نے کیا چپکوں چپکوں کر

جیسا کرے، سو پاوے خدا کے بھون سیتی

قناعت جعفر کا دلپسند موضوع ہے۔ اس نے کئی نظموں میں اپنی حالت پر صابر و شاکر رہنے کا درس دیا ہے۔ ایک نظم میں جس کا عنوان "قصیدہ در قناعت و غنیمت شمردن زندگی" ہے، وہ یہ نظریہ پیش کرتا ہے کہ آسایش، راحت یا ناز و نعم قطعی غیر اہم ہیں ــــ سب سے زیادہ متاع اور قابلِ لحاظ بات انسان کا وجود یعنی زندگی ہے:

جعفر بہ بوستانِ جہاں دم غنیمت است شادی نصیب گر نبود غم غنیمت است

دال روٹی کی اہمیت سمجھنا، قالین و سوزنی نہ ہونے پر پارینہ بستر و کہنہ جاجم، اسپ صفاہانی نہ ہو پر گدھے، ٹٹو، پالم، دو پیازہ اور کباب نہ میسر ہونے پر ساگ خام، بھجیہ، شلغم اور تربوز، خربزہ نہ خرید سکنے پر کھیرا، پالم کی ایک سیر پھانک کو غنیمت سمجھنا اور ان ادنی چیزوں کی قدر و قیمت کا اعتراف جعفر کی حقیقت پسندی کی نمایاں مثالیں ہیں:

چوں دال روٹی آمدہ فرمانِ کردگار گر بیشتر بہم نرسد، کم غنیمت است

۳. اسی سلسلے میں میر اور قائم کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ قائم نے اورنگزیب کے جانشینوں کے بارے میں اپنے شہر آشوب میں جو کچھ لکھا ہے وہ جعفر کے کلام کی صدائے بازگشت ہے۔

قالین و سوزنی نبود گر میسر ست       پارینہ کہنہ بستر جاجم غنیمت است
گر اسپک صفا نبود در بکار تو       یک خچر گدھڑی پالم غنیمت است
دو پیازہ و کباب نباشد اگر ترا       دال ساگ خام بھجیہ قلیہ غنیمت است
تربوز و خربزہ نبود گر میسر ست       یک سبز پھانک کھیرا پالم غنیمت است

جعفر آزادہ روی کو سب سے اچھا سمجھتا ہے۔ شاید نوکری میں اسے ذہنی اذیتیں اٹھانا پڑی تھیں۔ ملّا شاہزادہ معظم شاہ کے دربار سے وابستگی کو وہ خواری و گدائی کے مترادف قرار دیتا ہے:

گر شیوۂ گدائی و خواری طلب کنی       بس نوکری شاہ معظم غنیمت است

اسی لیے وہ اس احساس کے باوجود کہ اسے اعلیٰ مراتب یا انسان کو معتبر کرنے والی اشیا حاصل نہیں ہیں، اپنی قلندری پر نازاں نظر آتا ہے:

ہزار شکر نہ چوکی نہ پہرہ دارم من       نہ از یگانہ و بیگانہ بہرہ دارم من ....
غریب و بیکس و مسکین و بینوا ہستم       نہ باغ و مملکت نہ جاہ و گہرہ دارم من ....
نہ زر، نہ زیور و نقد و نہ کوٹھۂ اجناس       نہ اسپ داغ، نہ دستخط، نہ چہرہ دارم من

اس کی میزانِ قدر میں انانیت، آزاد خیالی اور کسی کا احسان نہ اٹھانا سب سے زیادہ قدر و قیمت رکھتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کسی کے سامنے نہ جھکو، عزتِ نفس کو ہاتھ سے نہ جانے دو، خواہ کتنی ہی مالی مشکلات سے دوچار ہونا پڑے:

دلا اور مفلسی سب سے اکڑ رہ       بعالم بیکسی سب سے اکڑ رہ
چکن اور زرکا چیرہ پشم کر بوجھ       پھٹی پگ باندھ کر سب سے اکڑ رہ ...
اگر یہ بھی میسر جو نہ ہووے       اکیلا جوں الف سب سے اکڑ رہ

جعفر نے مادی آسائشوں سے مستغنی ہونے کے ساتھ ہی زندگی کی دھوپ کے جلد ڈھل جانے کے دائمی احساس اور اپنی روحانی اصلاح میں لگے رہنے پر بھی بہت زور دیا ہے۔ جوانی ڈھلنے اور پھر اس کے واپس نہ آنے کے باب میں کہتا ہے:

گیا جو بنا اب کہاں پائیے       اگر کانور و دیس بھی جائیے ....

## میر جعفری

نہ آوے یہ پھر سے کسی کے کہے      نہ تھا نا تجھے اب، نہ ابھار ہے

(در صفت تنزل حسن و جوبن)

بڑھاپے میں انسان کی جو حالت ہو جاتی ہے اسے جعفر بڑے دلچسپ استعاروں میں بیان کرتا ہے۔ پیری کو وہ دیوار کو کلڑہ لگ جانا، پرانی اینٹوں کا گھسنا، چھان اور بندھن کا بودا ہونا، گلگلوں کا پلپلا ہونا اور برتن جھوجھرا ہونا کہہ کر ہمارا ذہن انسان کی فناپذیر جسمانی حالت کی طرف منتقل کر لیتا ہے:

کلڑہ لگا دیوار کو کہ جعفر اب کیا کیجیے      خطرہ ہوا آثار کو، کہ جعفر اب کیا کیجیے

اینٹیں پرانی گھس چلیں، مانی نمانی رس چلی      کیا دوس ہے معمار کو، کہ جعفر اب کیا کیجیے

بودے ہوئے ہیں چھان بھی اور بندھن بان بھی      کیوں کر رکھوں گھر بار کو کہ جعفر اب کیا کیجیے

تم تو پکانے گلگلے وہ ہو گئے ہیں پلپلے      کیوں کر چلوں سرکار کو، کہ جعفر اب کیا کیجیے

برتن ہوا ہے جھوجھرا، لاگا لکلنے کو چرا      کیا میہنا کمھیار کو، کہ جعفر اب کیا کیجیے

اسی لیے وہ دنیا کے بدلے عقبیٰ کی فکر کرنے کو کہتا ہے۔ مثنوی "طوطی نامہ" میں جو ۵۲ اشعار پر مشتمل ہے، دنیا کی کم فرصتی، بے مائگی اور انسان کی نا سمجھی کا بیان اور خدا سے لو لگانے کی ترغیب دی گئی ہے۔ تصوف کے یہ سیدھے سادے اور عام فہم خیالات بہت مقبول ہوئے اور یہ مثنوی اکثر مولود کی محفلوں میں پڑھی جانے لگی۔[۳۱]

شنوا اے طوطیِ روحانیِ من      نہ کر الفت بر نگین پنجرۂ تن . . .

نہ تو رہنی نہ یہ پنجڑا رہیگا      بولا کر لال تجھ کو کیا کہیگا

جو پوچھے بات تجکو لال پیارا      کہ پنجڑے بیچ تیں کیا کیا سنوارا

خبر خواہی داد اے طوطی! جو ابش      بکن امروز فکر اِس خطابش

موت کا خوف ہمیشہ سے انسان کے تمام نشے ہرن کرتا آیا ہے۔ جعفر نے اپنی بات میں اثر پیدا کرنے کے لیے اسی جذبے کو ابھارا ہے! وہ انسان کو کمزور مرغ اور موت کو گربہ قرار دیتا ہے:

---

۳۱۔ شعرائے اردو: ۱۴

تجھے جب آن کے بلی دبوچے — پکڑکر ٹینکھ، پر اور ماس نوچے
نہ ما اور باپ کوئی کام آسا — نہ ماچا چا، نہ بھائی، اور نہ موسیا

جعفر کے یہی نظریات اسے معاشرے کی غیر صالح باتوں پر سخت گرفت کرنے اور کسی لگی لپٹی کے بغیر انھیں رد کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ امرد پرستی محض جنسی یا اخلاقی گراوٹ ہی نہیں تھی۔ بلکہ امرد پرست کے وابستگان کے لیے اس کا یہ مشغلہ معاشی پریشانی کا باعث بن جاتا۔ جعفر اس بے راہ روی کے اقتصادی عواقب کے بارے میں کہتا ہے:

گ۔۔۔ وجہ ہے اس دور میں سو ہی بلند اقبال ہے
اوڑھے دو شالہ بے بہا، پالوں سے مکھڑا لال ہے
لونڈے ہوئے ہیں گھر بہ گھر، کھادیں نوالہ تر بہ تر
بھوکے پھیریں جا کر نفر، بی بی پھٹی احوال ہے

اردو شاعری میں جنس زدگی کی عکاسی کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ اس سلسلے میں لکھنوی شعرا اور ان کے معاشرے کو عام طور پر ہدف ملامت بنایا جاتا ہے۔ جعفر کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خصوصیت اس کے دور میں بھی موجود تھی۔ مثلاً وہ کہتا ہے کہ عصمت فروشی آج کے دور میں مشکل کشا ہے اور صرف اسی سے سب کچھ حاصل ہو سکتا ہے:

بیا جعفر از کُ۔ ادب کن ادب — کہ کُ۔ مایۂ شادی است و طرب

معلوم ہوتا ہے، یہ بے راہ روی عورتوں میں بھی سرایت کر گئی تھی۔ جعفر نے اپنی نظموں میں جا بجا اس حقیقت کا اظہار کیا اور اسے ناپسندیدہ قرار دیا ہے۔ ایک خط میں کوئی محمد یار بیگ نامی امیر اپنی بیوی کی بد چلنی کا شاکی نظر آتا ہے۔ جعفر نے اپنی بات حدیث دیگراں کے پردے میں بیان کی ہے۔ لکھتا ہے:

شنیدہ ام خبرے خوش کہ کردۂ شوہر — دریغ دارم ازیں نقص بود قول و قرار
مرا گذاشتہ شوہر کہ کردۂ دیگر — ز من قصور چہ دیدی؟ جواب این بنگار
دہم طلاق ترا پیش شاہ عالمگیر — کنم شکایت تو پیش ہر صغار و کبار

ان زمانے میں عورتوں میں بھی تلذذ بالذات کا رجحان زور پکڑ گیا تھا۔ یہ مسئلہ آج ماہرین جنسیات کے

دو دہر بنا ہوا ہے۔ اس جنسی مرض میں عورت کو مرد سے نفرت ہو جاتی ہے اور اسے ہم جنس ہی سے تسکین حاصل ہوتی ہے۔ جعفر کی مثنوی "در مذمتِ زنان و چیپٹی نامہ کہ زنان قحبہ را بہتر می نماید" میں اس مرض کی علامتوں اور ایسی مریض عورتوں کے احساسات اور تاثرات بڑی صراحت سے بیان ہوئے ہیں۔ یہ نظم جعفر کی باریک بینی اور اپنے گرد و پیش سے بخوبی باخبر ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ اپنے ان تجربات اور مشاہدات کی وجہ سے عورتوں کے بارے میں اتنی معلومات حاصل ہو گئی تھیں کہ وہ ان کی ہر حرکت اور ادا سے فوراً ان کے کردار کا اندازہ لگا لیتا ہے۔ اس نے اپنا یہ علم "دستور العمل نصیحت آمیز و علت انگیز" میں منتقل کر دیا ہے۔ وہ جو مشورے دیتا ہے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جعفر ... کنندہ بے حیائی اور ... حرکتوں کو قطعاً پسند نہیں کرتا:

هر زن کہ باشد تجو زر پال مٹکے مو مو — دا دہ دلشو ہر گفتگو، اُس نار سے انکار بہ
جو بہو ہتیوری بہ ہجی، آتمہ ہے گھر کھوتے جی — ہر گھٹ نہاں کیا ہوئے جی گنگتا، از وصلِ یار بہ
جو استری تلی الٹے، ہر بات میں کھل کھل ہنسے — ہر ایک سے لب لب ہنسے بے مصلحت، بگذار بہ
جو نار چھکے چال میں، سسکی بھرے ہر حال میں — کالا ہے کچھ دال میں، از قرب او زنہار بہ
جو رانڈ ہو کاجل کرے، چوٹی چھندا پھن دھرے — چوڑی پہن مہندی کرے، بر گردنش تلوار بہ
پھرتی ہوں جو جا بت رانڈ جی، وہ رانڈ نا ہیں سانڈ جی — تلکے پرایال ڈھی، بر فرج او پھٹکار بہ
دا ہر کہ باشد عشوہ گر، جوبن دکھا دے گھر بہ گھر — لالچ کند بر سیم و زر، دوری از و بسیار بہ

جعفر کردار میں تقدس چاہتا ہے۔ وہ غیر تہذیب یافتہ لوگوں کی صحبت تک گوارا نہیں کرتا چنانچہ ایک غزل میں محبوب کو مشورہ دیتا ہے:

با گرہ مردہ و مسخرہ و بھانڈ بھنڈیلہ — زنہار مکن خندہ و گفتار جو بے شُو
در بزم شہ ریتری و دز بچڑہ نہ لوزہ — مت بیٹھ بجز صحبتِ ابرار جو بے شُو

(غزل در وصف محبوب)

جعفر نے بعض امرائے سلطنت یا عہدہ داروں کی ہجویں بھی کہی ہیں۔ ظاہر ان میں سے بعض با اختیار لوگوں نے اس کا دل دکھایا تھا اور اسے پریشانیوں میں مبتلا کر دیا تھا۔ مثلاً مرزا خدا یار بیگ کی ہجو میں صاف کہتا ہے کہ مذمت کا سبب لالچ نہیں بلکہ اس کا دل آزار سلوک ہے:

نہ ایں ہجو از راہِ حرص و ہواست　　دل آزار را ہجو کردن رواست

خدایار بیگ نے جعفر کے انعام کی پانچ اشرفیاں ہضم کرلی تھیں، لکھتا ہے:

جہاں بہکناں ہووے ایسا عزیز　　کرے نام بدنام پیسا عزیز
مصاحب عجب مخبطی یافت کار　　لگاؤں او سے کفش گن گن ہزار
مصاحب نہ کیجیے کفن چور کو　　کہ کھودے پدر پیر کی گور کو
مرا خان دہانید پنج اشرفی　　تصرف نمود آں دغل در خفی

قمر النسا بیگم نے جعفر کو تیس روپیے بھیجے، مگر اس کا دیوان فتح خان پچیس خود کھا گیا اور صرف پانچ اسے دینے لگا۔ جعفر ایسے لوگوں سے نبٹنا خوب جانتا تھا۔ اس نے روپیے لینے سے انکار کر دیا اور دیوان کی ہجو کہہ کر قمر النسا بیگم کو بھیج دی۔ دیوان کو زجر و توبیخ کی گئی اور جعفر کو پورے تیس دلوائے گئے:

جو میں نے مدح بیگم کی بنائی　　لکھی اور جائے کر میں پڑھ سنائی
دلائے تیس لیکن پانچ نکلے　　فتح خان کی الٰہی کانچ نکلے

چوکی نویس سبھانند[۳۲] نے بھی جعفر کو فریب دینے کی کوشش کی تھی۔ اس نے پہلے تو جعفر کا ٹٹو معاف کر دیا لیکن بعد کو اپنے وعدے سے پھر گیا اور تحریری حکم کا مطالبہ کیا۔ جعفر نے اس کے جواب میں ایک نظم لکھ بھیجی۔ وہ سبھانند کی مکاری کے بارے میں کہتا ہے:

سبھانند جی تم بڑے ڈھینگ ہو　　کہ گرڑ پنکھ اور بیل کے سینگ ہو
کہیں سینگ اٹکائے کھڑ کھڑ کرو　　کہیں پنکھ پھیلائے پھڑ پھڑ کرو
لطافت کرو سات اور پانچ پر　　مبادا پڑے تو جواب کانچ پر

خان جہاں کوکلتاش کا اوپر ذکر آچکا ہے۔ جعفر نے اسے مصحف بھیجا۔ اس نے صلہ تو کیا، اس نسخے کا ہدیہ تک نہ دیا۔ جعفر کہتا ہے کہ مجھے مجبور ہو کر اس کی ہجو لکھنی پڑی، جو مشہور ہوئی۔ اس نظم میں ستارے کے ابھوں خان جہاں کی شکست کو موضوع بنا کر اسے ملامت کی گئی ہے۔ اس میں جو زور بیان اور تیزی ہے وہ قابلِ توجہ ہے:

خلقِ جہاں را گرد چہ نمائی لعنت تیری ہمت کوں　　ماٹ بٹوہی پہلی سواری، سُوکھے ڈاڑھی پھٹے منہ

۳۲۔ شفیق نے اس کا نام بابا سنگھ لکھا ہے (چمنستان شعرا: ۲۸۸) لیکن دیوان جعفر زٹلی کے اس قلمی نسخے میں سبھانند ہی درج ہے۔

## میر جعفر زٹلی

منصب داری پنج ہزاری بجاہ وجلالت چندد چند ۔۔۔ تیری سدھ بدھ گن بساری تھکے ڈاڑھی پھٹے منہ
مطلب خود را پیش آوردی، غارت کردی عالم را ۔۔۔ تجھ سے بھلی وہ کنیاں کواری تھکے ڈاڑھی پھٹے منہ
جانوں کو تیں پیٹھ دکھائی، لاج نہ آئی ڈاڑھی کی ۔۔۔ اب ہن توں ڈنڈیا ساری تھکے ڈاڑھی پھٹے منہ
ہندستان چو گلستاں بودہ، آمدہ کردی گورستاں ۔۔۔ کہتی تجھ کوں بیٹی کواری، تھکے ڈاڑھی پھٹے منہ

جعفر نے ایک طویل نظم میں اورنگزیب کی دکن میں معرکہ آرائیوں پر تبصرہ کیا ہے۔ اسی میں اس کے بیٹوں محمد معظم، محمد اعظم، محمد اکبر، اور محمد کام بخش کے کردار اور ان کی نااہلی بھی بے نقاب ہو گئی ہے۔ بیجاپور اپنے وقت کا زبردست قلعہ تھا۔ اس کی شان اور مضبوطی کے بارے میں لکھتا ہے:

عجب اوٹ ایں کوٹ بیجاپور است ۔۔۔ کہ ہر برج او مثل بھینسا سر است
چہ گوییم ازیں قلعۂ بے لگاؤ ۔۔۔ کر انگشت دانیست در دے لگاؤ

اس کے باوجود اورنگزیب کی لشکر کشی اور محاصرہ والی بیجاپور سکندر حسن کے لیے پیام اجل بن گیا۔ بیجاپور میں جو ہلچل مچ گئی تھی، اس کا ان اشعار سے اندازہ ہو سکتا ہے:

بڑے جھاڑ جھنکاڑ اورنگ شاہ ۔۔۔ کند کار صد تیغ در یک نگاہ.....
بڑی دند ڈالی دکن بیچ آئے ۔۔۔ سکندر حسن کو کیا رنج لائے.....
ز حول خیال شہ دادگر ۔۔۔ تفرقہ پڑا مہر اور ماہ پر [۳۳]

جعفر اپنے زمانے کی سیاسی صورت حال سے پوری طرح باخبر ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اورنگزیب اپنی اہلیت اور صلاحیت سے بڑے سے بڑے دشمن کو قلیل مدت میں فیصلہ کن شکست دے سکتا ہے، لیکن اس کے نااہل بیٹوں نے اس کے منصوبے مٹی میں ملا دیے ہیں:

زہے بادشاہ او جبڑا دلو بھوت ۔۔۔ ملے وولی نعمت چار پوت
ازاں تین بیٹے نپٹ ناخلف ۔۔۔ پسر خود خلف بہ، دگر نہ تلف
دگر یک پسر ہر برہ شود ۔۔۔ شہنشاہ از سگ برہ شود

جعفر نے شاہزادوں کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اسے ہجو کہ کر ٹالا جاتا رہا ہے جو حقیقت ہے

---

۳۳ فتح بیجاپور کی تفصیلات کے لیے دیکھیے، مآثر عالمگیری، ۲۸۲-۲۸۹

کہ اورنگزیب کی اپنی بھی بیٹوں کے کردار اور ان کی صلاحیتوں کے بارے میں جعفر سے ملتی جلتی رائے تھی۔ اس کے رقعوں میں جا بجا ان کی مذمت کی گئی ہے اور وہ ہمیشہ انھیں اپنی اصلاح کے احکام دیتا رہا۔ اس کے باوجود ہر شاہزادہ کسی نہ کسی موقع پر اپنی ناقابلِ معافی خطا پر موردِ عتاب بھی رہا۔ آج تک اورنگزیب کو اپنے بیٹوں کے بارے میں ایسی رائے اور ایسے تاثرات رکھنے پر موردِ الزام نہیں ٹھہرایا گیا۔ اس لیے جعفر کی حقیقت بیانی کو ہجو نہیں کہا جا سکتا وہ ہر مسئلے میں اپنی رائے انتہائی بیباکی اور صفائی سے پیش کرتا ہے۔ یہ جرأتِ رندانہ مذمت کی نہیں بلکہ صد تحسین کی مستحق ہے۔ وہ بڑے بیٹے معظم کے بارے میں کہتا ہے:

نخستیں کلاں ترک برکھنڈ کرد ہمہ کارد بارِ پدر سھنڈ کرد . . .

جہاں ہووے ایسا کو چھن کپوت لگے خلق کے منہ کو کالک بھبھوت

اس نے اعظم اور معظم کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے ظاہر ہے کہ وہ ان کی ناروا حرکتوں کو کسی طرح قابلِ تحسین نہیں مان سکتا:

دگر شاہ اعظم بڑے گنڈور بہ رسوائی انداخت کارِ پدر . . . . .

شب و روز مشتاق ہنڈیاں کا گرفتار و عاشق مٹک چال کا

رہے رات دن گ۔مڈ کی فکر میں بلہو و لعب چ۔ت کے ذکر میں

سیوم معدنِ شر و کانِ فساد رگِ چرد چوں ٹرد ٹوں پر گشاد

چہارم پسر ڈومنی کا جنا سبھی میں رہے جوں ف۔ج میں ٹٹا

خطا بخش انان اکبرِ ابتر است خطِ مفسدی راہماں مسطر است

ڈنڈھچر میں ڈالا بڈھے باپ کوں گرڈکی میں کہا اپن آپ کوں (؟)[۲۴]

"قصیدہ در اختلافِ زمانہ" معاشرتی اقتدار کے زیر و زبر ہو جانے کا نوحہ ہے۔ صالح اقدار کے مٹنے، اچھے بُرے کی تمیز نہ رہنے، ہر زہ گوں کے عزیز ہو جانے اور باصلاحیت افراد کی خواری ایسے سانحات جعفر کے حساس ذہن کے لیے شدید کرب کا باعث بن گئے۔ اس

---

۲۴۔ اس نظم میں شاہزادہ کام بخش کی تعریف کی گئی ہے لیکن ایک اور جگہ اسی کے بارے میں یہ کہا ہے:

یہ کام بخش کمبخت تھا، امراکشی کو سخت تھا وہ بھی عجائب رخت تھا۔ آخر فنا آخر فنا

# میر جعفر زٹلی

نظم میں مفہوم کے بیان میں صراحت اور تاثر میں شدت پیدا کرنے کے لیے تضاد اور موازنے کا ادبی حربہ استعمال کیا گیا ہے وہ اعلیٰ صلاحیت رکھنے والوں کی ذلت اور بربادی اور نا اہلوں کے عروج و اقتدار کے بیان میں کہتا ہے:

سمندِ خستہ محتاجِ بوے دانہ و کاہ — خرِ ہمیشہ بگلگشت سرخوشی و سرور
پلنگ بردرِ خرگوشس رفتہ حاجتمند — ہژبر جستہ پناہ و توسلِ لنگور
نشستہ بیخ مغیلاں بجاے نخلِ رطب — زقوم رستہ سراسر بجز رزِ انگور
خبیث خفتہ بناز و خسیس دارد داد — نجیب لقمۂ نانے زعام نامھجور
دریں زمانہ یکے شد بہاے ہیزم و عود — تمیز نیست یکے رابہوے جرم و بخور
نماند عزتِ علم و ادب، نہ پیر و پدر — نہ قدرِ زمزم و کوثر، نہ قربِ سرِ طور
نماند قدرِ شبِ قدر و حرمتِ رمضان — شد است رائج و شائع دروغ و فسق و فجور [۲۵]

جعفر نے فوجیوں اور فوجی جانوروں کی خستہ حالی کئی نظموں میں بیان کی ہے۔ نوکری ڈھونڈے نہ ملنا، مل جائے تو تنخواہ نہ وصول ہونا، انسانوں کو خوراک اور جانوروں کو چارہ میسر نہ آنا ہتھیار بے کار ہو جانا ـــ یہ تاریخی حقائق بڑی خوبی سے شعر کے سانچے میں ڈھالے ہیں:

ہر صبح ڈھونڈے چاکری کوئی نہ پوچھے بات ری
سب قوم ڈھونڈھن لاگ رہی، یہ نوکری کا حظ ہے
شش ماہہ حقِ مرداں، برگردنِ دولتوراں
تس پر سواری ناگہاں، یہ نوکری کا حظ ہے
دم خیز ہو گھوڑا رہا، یہ دکھ بچارا سہ رہا
پیشاب کر کے سو رہا، یہ نوکری کا حظ ہے
بس خستہ و بیحال ہے، ٹوٹی پرانی ڈھال ہے
جامہ مشنگ جال ہے، یہ نوکری کا حظ ہے

---

۲۵ جعفر مذہب سے بیگانگی اور بدعت پرستی کے بارے میں ایک تضمین میں لکھتا ہے: "... ظلِ شیطانی عدالت فرمودند. فوندل خان ولد ہوتل خان داماد آقا تحل تحل بعرض رسانید کہ مرزا اتمر تحریک بدعت میکنند ہرچند با تسخر تاکید و تہدید و منع نمودہ، باز نمی آید"

ترے ہمیشہ گھیو کو، سمجھائے رکھے جیو کو
جیسا پپیہا پیو کو، یہ نوکری کا حظ ہے

جعفر کے دیوان میں اورنگزیب کی وفات پر دو نظمیں موجود ہیں۔ ان دونوں میں اس کی اولاد کے مابین خانہ جنگی اور کشت و خون کا تذکرہ ہے۔ مورخوں کے علاوہ جعفر واحد اہلِ قلم ہے جس نے ان واقعات و سانحات کی تصویر کشی کی ہے۔ اس نے مختلف شہزادوں کو اس طرح میدانِ جنگ میں لڑتے ہوئے دکھایا ہے:

اعظم معظم بھاگ رے آکر لڑے پھر آگرے ۔۔۔ لشکر میں بھاگا بھاگ رے آخر فنا آخر فنا
لڑتے بہادر شاہ ہیں، چاروں بیٹے ہمراہ ہیں ۔۔۔ وہ جگ سے گمراہ ہیں، آخر فنا آخر فنا
رن میں معزالدین ہنسے، ہنس لڑائی میں دھنسے ۔۔۔ لوہو کی ندی میں پھنسے، آخر فنا آخر فنا
لڑتا رفیع القدر ہے، وہ آسماں میں بدر ہے ۔۔۔ شہزادوں میں وہ صدر ہے، آخر فنا آخر فنا
چارم خجستہ اختر است برندہ شمشیر بدست ۔۔۔ غرندہ بچوں فیل مست، آخر فنا آخر فنا
خاجو پراب جو مار ہے، ابر سے جو لوہا دھار ہے ۔۔۔ اعظم اجل سردار ہے، آخر فنا آخر فنا
بیدار جس کا بخت ہے، کرتا ہے لوہا سخت ہے ۔۔۔ ناہیں نصیبوں تخت ہے، آخر فنا آخر فنا
سارے امیر آکر گئے ہودے لہو سے بھر گئے ۔۔۔ ساکھا جگت میں کر گئے، آخر فنا آخر فنا
تب فتح ہو گئی شاہ کی، بازی ہوئی گمراہ کی ۔۔۔ اب تو رضا اللہ کی، آخر فنا آخر فنا
یہ شہ عجب گمراہ ہے، منعم وزیر شاہ ہے ۔۔۔ نہ نوردنہ تنخواہ ہے، آخر فنا آخر فنا

محمد معظم بہادر شاہ کی فتح، اس کی برائے نام بادشاہت، اس کی مفلسی وغیرہ جعفر کی نظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔ جعفر نے اورنگزیب کی زندگی میں اس کے بارے میں جو رائے قائم کی تھی بعد کے واقعات سے وہ درست ثابت ہو گئی ـــــ ان روح فرسا حالات میں لوگوں کو بار بار اورنگزیب کا زمانہ یاد آتا ہے۔ یہ اشعار اس کی وفات کے بعد کے حادثات اور تاراج تصویر ہیں:

اکل بیکل ہوا سنسار سارا ۔۔۔ مجنوں تیار مدمریخ تارا . . .
کہاں اب پائینگے ایسا شہنشاہ ۔۔۔ مکمل اکمل و کامل دل آگاہ . . .

## میر جعفر زٹلی

صدائے توپ و بندوق است ہر سو  —  بسر اسباب و صندوق است ہر سو
ردا ردو ہر طرف بھا جڑ پڑی ہے  —  بچہ در گود، سر گٹھیا دھری ہے
کٹا کٹ و لٹالٹ است ہر سو  —  چھٹا چھٹ و پھٹا پھٹ است ہر سو
بہر سو مار مار و دھاڑ دھاڑ است  —  اوچل چال و بتر، خنجر، کٹار است

منوچی نے جو ایک اطالوی سیاح تھا ہندستان میں تقریباً ۴۸ برس (۱۶۴۹ء-۱۶۹۷ء) قیام کیا تھا۔ اس جیسے جہاندیدہ شخص نے اورنگزیب کے دور میں ہندستان اور یہاں کی حکومت کے احوال کے بارے میں یہ نتیجہ اخذ کیا تھا[۲۷] کہ اگرچہ ہندستانی نظم و نسق نقائص سے خالی نہیں ہے، تاہم دوسری قوموں کے مقابلے میں کچھ اتنا خراب بھی نہیں۔ شہنشاہ (اورنگزیب) نے اپنی دور اندیشی سے ملک کو روز افزوں ترقی دی ہے۔ اس رنگین تصویر کے مقابلے میں آپ جعفر کی رائے اوپر دیکھ چکے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جعفر نے اپنے گرد و پیش کے حالات کے مطالعہ سے سلطنت کے زوال کا اس وقت اندازہ کر لیا تھا جب کسی اور کے خیال میں بھی یہ بات نہیں آئی ہوگی۔ یہ اس کی سیاسی اور سماجی فراست اور ژرف نگاہی کی بہت بڑی اور قابلِ تعریف شہادت ہے۔

۲۷. سٹوریا ڈو موگری انگریزی : ۲۲۶

## فضلی

# "مرثیہ امامِ مظلوم علیہ السّلام
# من کلامِ فضلیؔ"

[ فضل علی فضلیؔ کا نام کربل کتھا کے مصنف کی حیثیت سے ہمارے علمی حلقوں میں بہت دن سے معروف تھا، اگرچہ اس کی یہ کتاب مفقود ہو چکی تھی خوش قسمتی سے ڈاکٹر مختارالدین احمد نے اس کا خطی نسخہ اشپرنگر کے ذخیرے سے جو آج کل ٹوبنگن یونیورسٹی (جرمنی) میں محفوظ ہے، ڈھونڈ نکالا۔ یہ نسخہ ہم نے مرتّب کر کے اکتوبر ۱۹۶۵ء میں شائع کر دیا تھا۔

فضلیؔ کا ایک مرثیہ جناب سیّد مسعود حسن رضوی ادیبؔ کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ کربل کتھا کی طباعت آخری منازل پر تھی، جب ہمیں اس کا علم ہوا چنانچہ ہم نے 'استدراک' کے تحت اس کا ذکر بھی کر دیا تھا۔ اب پروفیسر صاحب موصوف نے اسے تحریر میں اشاعت کے لیے عنایت فرمایا ہے جسے ہم ان کے شکریہ کے ساتھ یہاں شائع کر رہے ہیں۔ متن اصل نسخے کے مطابق ہے۔

فضلیؔ کی زبان آج سے ڈھائی سو برس پہلے کی زبان ہے۔ زبان کی تاریخ اور اس کے ارتقا میں اس کا بہت اہم مقام ہے۔ یہ پرانے تو ادر جو گویا زبان کی گم شدہ کڑیاں

## مرثیہ امام مظلوم علیہ السلام

ہیں، اس قابل ہیں کہ جہاں تک ہو سکے انھیں محفوظ کر دیا جائے۔
میں نے ان لفظوں کے معانی حاشیے میں لکھ دیے ہیں، جو آج کل مستعمل نہیں
ہیں۔ مالک رام]

۱

کربلا میں کیسا پڑا گھمسان ہے[1]　　عابدیں جس دکھ سیتی[2] گریان ہے
فاطمہ کا جان یو[3] بیجان ہے　　آج کی شب کا دیکھو[4] مہمان ہے

۲

جس کا نانا ہے محمّد مصطفےٰ　　ہو[7] بہ بیشک ہے شاہِ لافتا
کیوں جگر ان کا پڑا ہے سر جُدا　　تن مبارک بھوئیں[5] اوپر نالان ہے

۳

آشتابی یا علیؑ دیکھو حوال[6]　　رن میں پیاسا یو سوکھا تیرا نہال
سر جُدا کر، لے چلے تن بھوئیں[5] پہ ڈال　　لال لہو میں ڈوڈ[10] ترا ریحان ہے

۴

فاطمہؑ جنت میں سن کر یو[3] حوال[6]　　ڈال کفنی کھول کر سب سر کے بال
جا بہ پیمبرؐ سے کہا، رو، اس مثال　　آج میرا طفل بے درمان ہے

۵

جس مبارک گل[9] پہ تھی بوسے کی بار　　اُس کو کاٹا شمر نے خنجر چلا
خاک و خوں میں ڈو[10] پڑا ہے دلربا　　اس کے دُکھ میں جیو مرا[8] سرسان[10] ہے[1]

---

۱۔ سے　　۲۔ بیاس قدنہ
۳۔ "ی" تلفظ میں نہیں آئیگی، "ذال" مکسور ہوگی　　۴۔ ادر
۵۔ بھومی کی تحریف بوم (فارسی)، زمین　　۶۔ یعنی احوال
۷۔ وہ　　۸۔ یہ　　۹۔ یعنی گلا
۱۰۔ یہ لفظ اور کہیں نظر سے نہیں گذرا۔ سیاق سے معنی ہونگے حیران، سراسیمہ، المناک

## مرثیہ امام مظلوم علیہ السلام

۶

پیرہن جس تن کو لایا جبرئیلؑ — بے کفن رن میں پڑا ہیگا قتیل
جس کے غم میں دو جہاں بینگے ذلیل — کربلا میں سو وو تن عریان ہے

۷

جس کے جھولے کو جُھلائے جبرئیلؑ — کیا کہوں میں، اس کا قصہ ہے طویل
جس کا خاطر حق بنایا سلسبیل — وہ پڑا بے نیر یو ہلکان ہے

۸

جس بدل گریاں تھی حضرت فاطمہؑ — جس بدل نالاں تھی حضرت فاطمہؑ
جس بدل سرساں تھی حضرت فاطمہؑ — وُو پڑا بیہوش و بے درمان ہے

۹

نیر بن گریاں علی اصغرؑ پڑا — حلق اس کا لہو سیتی یو تر پڑا
ہور علی اکبر ترا بے سر پڑا — العطش اب العطش الحان ہے

۱۰

رو پکاری شہر بانو آہ نار — ہور سکینہ دکھ سے ہو کر بیقرار
کہاں گیا، کہنے لگی، اے غمگسار — جان میری تجھ اوپر قربان ہے

۱۱

رو، سکینہ دکھ سے کرتیں یو بیان — اے حسینؑ، امت کے ہادی بیکسان
چھوڑ کر مجھ کو گیا تو اب کہاں؟ — کربلا کا کیا بلا میدان ہے!

۱۲

رو پکاریں سب یتیماں یا حسینؑ! — ہم ہوے تم بن غریباں، یا حسینؑ
بخت الٹ گئے ہور نصیباں یا حسینؑ — چو طرف سے ہم اوپر طوفان ہے

باقی

۱۳

چھوڑ کر ہم کو کہاں گئے، اے پدر! جس کے ماتم میں ملک ہے خیر البشر
تم بنا اب ہم پھرے ہیں دربدر بیکسی کا سر بسر سامان ہے

۱۴

فوج اُلٹی بیکسی کی آج ہے راج سب لوٹا، یو لُٹا تاراج ہے
نہیں وو ہرگز ظالماں کو لاج ہے تم بنا سب ملکِ دل ویران ہے

۱۵

آج ہے فقتی قیامت وادریغ! ڈھل پڑا تاجِ امامت، وادریغ!
نہیں گگن[۱۲] پر استقامت وادریغ! غم سیتی[۱۳] سا توں زمین سرزان ہے

---

۱۲۔ گگن = آسمان ۱۳ سیتی = سے

سید امیر حسن عابدی

# فارسی میں ستی کی داستانیں

قدیم زمانے میں ہندوؤں میں رسم تھی کہ شوہر مر جاتا، تو اس کی بیوی بھی اسی کے ساتھ آگ میں جل کر اپنے کو ختم کر دیتی تھی اس رسم کو ستی کہتے ہیں۔ بہت سے فارسی شعرا نے ہندوستانی عورتوں کی وفاداری کی تعریف کی ہے، نیز ان کے ستی ہو جانے کو ان کی شوہر پرستی کے ثبوت میں پیش کیا ہے۔ مثلاً یہ شعر کتنا مشہور ہے:

چوں زنِ ہندو کسے در عاشقی دیوانہ نیست　　سوختن بر شمعِ کشتہ کارِ ہر پروانہ نیست[1]

امیر خسرو (م ۱۳۲۵ء) نے اس مضمون کی طرف کئی شعروں میں اشارہ کیا ہے مثلاً کہتے ہیں:

خسروا، در عشقبازی کم ز ہندو زن مباش　　کز برائے مردہ سوزد زندہ جانِ خویش را

یا کہتے ہیں:

جان فدائے دوست کن کم زان زنِ ہندو مشو　　کز وفائے شوئے در آتش بسوزد خویش را

مگر یہ سب تعریفیں زیادہ تر اشارۃً پائی جاتی ہیں، عام طور سے شعرا نے اس سلسلے میں کوئی

---

۱۔ ڈاکٹر اظہر علی نے سفرنامۂ آنند رام مخلص کے حاشیہ (ص ۲۵) میں یہ شعر صائب کی طرف منسوب کیا ہے، مگر دیوان صائب کے مطبوعہ نسخہ (طبع تہران) میں یہ شعر موجود نہیں ہے۔

بھی ستی کی داستان نظم نہیں کی ہے۔ فارسی کے دو شاعر اس سے مستثنیٰ نظر آتے ہیں، ایک نوعی خبوشانی اور دوسرے مجرم کشمیری۔

ملا نوعی خبوشانی (م ۱۶۱۰ء، ۱۶۱۱ء) دربار اکبری کے اہم شعرا میں سے ہیں۔ صائب نے ان کے مصرع پر مصرع لگایا ہے:

این جواب مصرعِ نوعی کہ خاکش سبز باد ۔۔۔ سایۂ ابر بہاری کشت را سیراب کرد

یوں تو نوعی نے تقریباً تمام اصنافِ سخن میں کلام چھوڑا ہے، لیکن ان کے آثار میں غالباً سب سے اہم چیز ان کی مثنوی "سوز و گداز" ہے، جو مختلف سفینوں اور بیاضوں میں نقل کی گئی ہے، اور جسے ہم فارسی کا سب سے پہلا "ستی نامہ" کہہ سکتے ہیں۔ اس سے متعلق سرخوش نے لکھا ہے:[2] "مثنوی سوز و گداز بسیار بسوز و گداز گفتہ" اور اس سے یہ شعر انتخاب کیا ہے:

چناں مستانہ بر آتش نظر کرد ۔۔۔ کہ از بدمستیش آتش حذر کرد

خان آرزو کہتے ہیں:[3] "بسیار بمزہ گفتہ"۔ یہ مثنوی اس شعر سے شروع ہوتی ہے:

الٰہی خندہ ام را تازگی دہ ۔۔۔ شکم را جگر بیگانگی دہ

مثنوی سوز و گداز کے شروع میں نوعی لکھتا ہے کہ شہنشاہ اکبر (م ۱۶۰۵ء) نے مجھے خاص آدمی بھیج کر بلایا:

درآمد از درم ہدہد سرشتی ۔۔۔ چہ ہدہد بلکہ طاؤس بہشتی

. . . . . .

تو خدمت ناصبوری شاہ مشتاق ۔۔۔ بایں نسبت رسد یارے بر آفاق

ہنوز آں مژدہ آور در سخن بود ۔۔۔ کہ شوقم بر دریچہ بوسہ زن بود

. . . . . .

قضا فرماں شہنشاہِ جواں بخت ۔۔۔ فلک خرگاہ ماہِ آسماں تخت

. . . . . .

چو دید افتادِ من، قدرا برافراشت ۔۔۔ بدستِ خود سرم از سجدہ برداشت

نسیم خندہ بر خاموشیم زد ۔۔۔ گلاب مژدہ بر بیہوشیم زد

اور کہا کہ گل و بلبل، شمع و پروانہ، فرہاد و شیریں، لیلیٰ و مجنوں جیسے پرانے قصوں سے طبیعت گھبرا گئی ہے۔

---

۲۔ کلمات الشعرا: ۱۴۴ ۔۔۔ ۳۔ مجمع النفائس: ۴۹۳

بگفت اے برہمن زادِ محبّت !    کہن شاگردِ استادِ محبّت

نواہائے کہن خاطر خراشید    بصد ناخن جگر را در تراشید

حدیثِ بلبل و پروانہ تاچند    ہوس در خوابِ ایں افسانہ تاچند

کہن افسانہ ہا نشنیدہ اولیٰ    سخن از ہرچہ گوئی دیدہ اولیٰ

اب ہمیں نئے اور تازہ افسانوں سے آشنا ہونا چاہیے۔ نیز ہندوستان میں رہ کر نئی نئی داستانوں کی تلاش کرنا چاہیے۔ اور دیکھنا چاہیے کہ کس طرح یہاں کے جانباز محبوب اپنے کو نذرِ آتش کر دیتے ہیں :

نوائے تازہ برکش زمنقار    کہ گل در گل گذار و خار در خار

کہن شد قصّۂ فرہاد و شیریں    چو عیسیٰ رفتہ در تقویمِ پاریں

بجز نامے زلیلیٰ در جہاں نیست    بجز حرفے، زمجنوں درمیاں نیست

یکے برطرفِ آتشخانہ بگذر    برآئینِ بت و بتخانہ بنگر

بہ بیں رونق کہ در آتش پرستی    گل افشانِ خس و خاشاکِ ہستی

گروہے از تعلّقہائے جان فرد    کبابِ شعلۂ آتش زن و مرد

پس از مردن زہم رُو برنتابند    بہم در بسترِ آتش بخوابند

اسی کے ساتھ ساتھ ایک تازہ اور درد بھری سچّی داستان کے نظم کرنے کی فرمائش کی :

بحرفِ تازۂ خرسم کنم گوش    کہ تاریخِ کہن گردد فراموش

**داستان :** عہدِ اکبری میں لاہور میں دو ہندو عاشق و معشوق ایک دوسرے سے بیحد محبّت کرتے تھے :

دو ہندو زادۂ مشرب سرشتہ    بشر خلقت، ولے قدسی سرشتہ

جب ان سے ہجر کی تکلیف برداشت نہ ہو سکی :

کہ چند از ہم تہی آغوش بودن    قدح ناخوردہ و مدہوش بودن

اور دس برس عالمِ مجبوری میں گذر گئے :

چو سالِ انتظار از دہ فزوں شد    نوائے طاقت از ہر سو نگوں شد

تو لڑکے نے باپ کو مجبور کیا کہ وہ اس کی شادی کر دے۔ باپ نے لڑکی والوں کو پیغام بھیجا کہ وہ بھی شادی کی تیاری کریں:

شما ہم جشنِ شور آبادہ سازید     جہاں خرم بہارِ بادہ سازید

دونوں طرف کے لوگ خوشی سے پھولے نہیں سماتے تھے:

سماع از شوق سر از پا نمی یافت     ز شادی خندہ بر لب جا نمی یافت

ایک ہفتے تک شادی کی تیاریاں ہوتی رہیں:

پس از یک ہفتہ ترتیبِ عروسی     زمیں داد آسماں را خاکبوسی

بہرحال دولھا کی بارات بڑی دھوم دھام سے روانہ ہوئی:

قدم در آرزو می سود و می رفت     نگاہش بر قضا می بود و می رفت

لیکن انھیں کیا پتا تھا کہ تھوڑی ہی دیر میں یہ خوشی غم سے بدل جانے والی ہے:

ز دل دور از طرب بیگانہ می رفت     تو می گفتی بماتم خانہ می رفت

بارات چلی جا رہی تھی کہ اچانک ایک پرانا مکان گر پڑا جس کے نیچے دب کر دولھا ہلاک ہو گیا پھر تو ایک کہرام مچ گیا:

خروش از چرخِ نیلی پوش برخاست     ز ہر دل صد قیامت جوش برخاست

ادھر جونہی دلھن کو اس حادثے کی خبر ملی، وہ فوراً ستی ہونے کو تیار ہو گئی:

چرا تا زندہ ام، شرمندہ باشم     کہ سوزد دلبر و من زندہ باشم

شہنشاہ اکبر کو اس کی اطلاع ملی، تو اسے بھی بہت رنج ہوا اور وہ رونے لگا:

چو شاہ ایں ماجرا بشنید، بگریست     کہ عنقا ایں ہمہ کافر دلی چیست

اکبر نے امتحان لینے کو اس غمزدہ حسینہ کو بلا کر اپنے ساتھ تخت پر بٹھایا، اسے اپنی فرزندی میں لے کر رانی کا خطاب عنایت کیا اور دنیا جہان کی نعمتیں اس کے سامنے رکھیں تاکہ کسی طرح اس کا دل بہلے اور وہ اپنے ارادے سے باز آ جائے:

شکوہش با ترحم آشنا شد     بحکمِ امتحان فرماں رواں شد
شہ از لطفش بپائے تخت بنشاند     جواہر ہائے لب بر فرقش افشاند

بفرزندی خود داد اختصاصش | بعصمت گاہ خلوت کرد خاصش
بہر کشور خطاب رانیش داد | بماکِ ہند فرماں رانیش داد

لیکن وہ لڑکی کسی صورت اپنے مستحکم ارادے نیں نس سے مس نہ ہوئی:

لبش جز گوہر آتش نمی سُفت | بغیر سوختن چیزے نمی گفت
لبشہ گفتا، مرا بدنام کردی | بافسوں روز عیشم شام کردی
خیالت را دریں رہ خضر دل کن | مرا آمرزہ و آتش را بحل کن

آخر کار اکبر مجبور ہو گیا اور اس نے شاہزادہ دانیال (م ۱۶۰۴ء) کو حکم دیا کہ اس کے ساتھ جائے اور شاہانہ اہتمام اور شان سے اس کے ستی ہونے کا انتظام کر دیا جائے:

اجازت گونہ دادش از تہِ دل | نہ شادی بر پرید آں مرغِ بسمل
اشارت کرد با پورِ جوان بخت | کہ اے چشم و چراغِ افسر و تخت
ببر ایں شعلہ را تا کانِ آتش | در افگن آتشے در جانِ آتش
بخرمن عود و صندل برفروزاں | برسم دختِ را یالش بسوزاں

شاہزادہ دانیال اس غمزدہ کے ساتھ روانہ ہوا اور شہنشاہ اکبر بھی مڑ مڑ کر اسے دیکھتا جاتا تھا:

گلِ بخت و بہارستانِ اقبال | مرادِ انس و جاں شہزادہ دنیال
بحکم شاہ و فرمانِ تماشا | رواں شد ہمرہِ آں ناشکیبا
جہانے کردہ وقف از ہر کنارہ | متاعِ جاں بتاراجِ نظارہ
شہنشہ بر نظر کردی پیامی | بہر گامی رواں کردیش کامی

وہ محبوبہ اپنے عاشق کی لاش پر پہنچی، تو اس نے اسے بوسہ دیا، بغلگیر ہوئی اور پھر اس کے ساتھ جل کر خود بھی خاکستر ہو گئی:

سرِ شوریدہ برزانو نہادش | لبش بوسید و رو بر رُو نہادش
کشیدش تنگ تراز جاں در آغوش | چو جاناں یافت کرد از جاں فراموش

شہزادہ دانیال یہ دردناک منظر دیکھ کر روتے روتے بیہوش ہو گیا۔ جب اس نے شہنشاہ اکبر کی آواز سنی، تو غشی سے بیدار ہو کر باپ کا استقبال کیا اور اس ہولناک واقعے کا حال رو رو کر

بیان کرنے لگا:

چو نقش حالِ اُو شہزادہ برخواند — گلاب از گلبنِ مژگان برافشاند
ہوس خلیۂ محبّت باد برتو — خود آتش ابرِ رحمت باد برتو
ہوس از عیشِ من شرمندہ بہتر — بمرگِ من محبّت زندہ بہتر
لبش باشاہ در گفت وشنو بود — دلے ہر زرّہ اش آتش درو بود

سروآزاد اور مغل ببلیو گرافی کے مؤلفین نے لکھا ہے کہ نوعی نے یہ مثنوی شہزادہ دانیال کی فرمائش پر لکھی تھی۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ مثنوی کے شروع میں شاعر نے صراحت سے شہنشاہ اکبر کا ذکر کیا ہے جس کی فرمائش پر اس نے یہ داستان نظم کی تھی۔ نیز مغل ببلیو گرافی میں لکھا ہے کہ یہ مثنوی ۱۵۰۶ء میں لکھی گئی تھی، جو قطعاً غلط ہے۔ یہ واقعہ اکبر کی زندگی کا ہے اور ۱۵۰۶ عیسوی میں وہ پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔ ممکن ہے کہ مولف ۱۶۰۵ء کے بجائے غلطی سے ۱۵۰۶ء لکھ گیا ہو۔ ۱۶۰۵ء ہی میں اکبر کا انتقال ہوا۔

مثنوی سوز وگداز ۱۲۸۴ھ / ۶۸-۱۸۶۷ء میں لکھنؤ میں اکبر نامہ کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔ نیز ایران کے میرزا داؤد اور لنکا کے اننت کمار اسوامی نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا جو ۱۹۱۲ء میں لندن سے شائع ہوا۔

(۲)

نوعی کے بعد مجرم کشمیری (م ۱۲۷۳ھ / ۱۸۵۶ء) نے جو کشمیر کے ممتاز شعراء میں سے ہے، اپنے زمانہ کی ایک سچی ستی کا قصہ نظم کیا ہے۔ اس کی مثنوی کا نام ستی نامہ ہے۔

قصہ: دیوان کرپارام کے زمانے میں کشمیر کے تکو خاندان کا ایک دانشمند جوان جو فارسی اور ہندوستانی علوم سے واقف تھا:

فروزانم چو شمع این داستان را — بسوزانم حدیثِ باستان را
کہ در دورانِ دیوانِ فلک قدر — جلالت پیشگاہ و معدلت صدر
جوانے بود درا قصائے کشمیر — سراپا ہوش، در فرزانگی پیر
ز علمِ ہندوی کاں کیشِ بودش — ہزار افسانہ از بر بیش بودش

جُزایں چندیں کتاب از پارسی داشت | دراں ہم نکتہ نکتہ دارزی داشت
مگو جسمش بہ پرو بالے برافراشت | کہ اسمش بال و گوپال دگر داشت
بُد از نسلِ نکو ہا اصل بودشس | چراغِ دودۂ ایشاں وجودشس

وہ کسی مرض میں انتقال کرگیا۔ جب اس کی حسین اور باوفا بیوی نے دیکھا کہ عنقریب اس کا شوہر آگ میں جلادیا جائیگا:

غرض آں از مرض جاں دادہ دلتنگ | نگارے داشت اندر پردہ خوش رنگ
پری پرسی از آں زیبندہ قامت | قیامت، ہی قیامت، ہی قیامت
زگیسو عالمے دیوانہ کردہ | خراجِ چیں بہاے شانہ کردہ
حیا از خانہ زادانِ جبینش | لطافت را نزاکت ہم نشینش
پے دل بردنش بس ایں نشانہ | کہ رُوے فشقہ بودش درمیانہ
مپرس از شیوہ ہاے چشمِ بیمار | سراسر بے مروت، مردم آزار
لبِ لعلش چناں در آبداری | کہ شد یاقوت خشک از شرمساری
ظہورِ گوشس و نورِ گوشوارہ | صفاے جلوۂ صبح و ستارہ
بنا گوشش چو انداز گہر کرد | حسابِ بحر و کاں را مختصر کرد
کفِ پاے برنگِ برگِ گل نرم | چناں گلگوں کہ گل شد آب از شرم
مع القصہ چو ایں قصہ دلش سُفت | کہ جفت اُو باآتش می شود جفت

تو اس نے بھی تیاری کی کہ اسی آگ میں وہ بھی جل جائے۔ چنانچہ وہ اپنے حجرے میں گئی، خوشی خوشی پرانے کپڑے اتار، نیا لباس پہن اور اپنے آپ کو سر سے پیر تک آراستہ کرکے باہر نکلی اور بڑے ناز و انداز سے اپنے مردہ شوہر کی طرف بڑھی:

زجا برجست، ہمچو شعلہ سرکش | بسوداے سرو سامانِ آتش
گریباں چاک زد پیراہنش را | گرفتہ اشکِ شادی دامنش را
درونِ حجرہ شد چوں برق تازاں | بسوز و سازِ عشقِ خویش نازاں
زتن برکند رخت کہنہ، نو ساخت | بہر ہفتی کہ می بایست پرداخت؟

فارسی میں ستی کی داستانیں

چو شد آراستہ از فرق تا پا | برون آمد بہار جلوہ پیرا
بصد آئین بصد تمکین بصد ناز | سوے ہمساز خود بنمود پرواز

اس طرح سج سجا کر وہ اپنے شوہر کی لاش کے سرہانے جا کر بیٹھ گئی اور لوگوں کو مخاطب کر کے کہنے لگی، میرا دل بیتاب ہو رہا ہے کہ کس طرح میں اس محبوب شوہر کے ساتھ جل کر خاک ہو جاؤں:

چو بر بالینش آمد، راست بنشست | بمہر از تنگ شکر مہر بشکست
کہ اے روشندلان روے محفل را | بداغش بازدان راز ہر دل
دلم خواہد کہ با ایں آشنا دوست | شوم یک مغز و بیرون آیم از پوست
بسوزم با تن او جسم خود را | برافروزم چراغ اسم خود را
شما ہم از در یاری درآیید | دریں میداں بغمخواری درآیید

سب لوگوں نے مل کر اسے منع کرنا شروع کیا۔ کسی شخص نے کہا کہ اپنے کو جلانا ناممکن ہے۔ تو اس نے جواب دیا کہ اصل وصال تو یہی ہے۔ ایک اور نے کہا کہ اس طرح جل مرنا محض پاگل پن ہے، تو اس نے جواب میں کہا کہ عشق میں یہ ایک اچھا شگون ہے۔ کسی نے اسے آگ سے ڈرایا تو کہا کہ جس کا دل خود ہی جل رہا ہو، اسے آگ میں جلنے کی کیا پروا ہوگی۔ کسی نے نصیحت کی کہ اس خیال سے باز آؤ، تو اس نے جواب دیا کہ یہ نامردی کی علامت ہوگی:

ہمہ چوں شمع کردہ یک زبانی | بمنعش تر زبان گشتند آنی
یکے گفتش کہ خود سوزی محال است | بگفت، ایں سوختن عین وصال است
یکے گفتش کہ سربازی جنون است | بگفت ایں عشقبازی را شگون است
یکے گفتش کہ آتش سوزناک است | بگفت، ایں شعلہ در بر را چہ باک است
یکے گفتش، کزیں اندیشہ برگرد | بگفت، اے مرد، ایں شد کار نامرد
یکے گفتش، مکن سر اندریں سر | بگفت، ایں درد سر شد غیر ہمسر

بہر حال جب لوگ اس جوان کی لاش جلانے کے لیے لے چلے، تو وہ مہ جبیں بھی آراستہ و پیراستہ ہو کر پیچھے پیچھے چلی:

تن بیجاں چو در پوشش سپردند — بآتشگاہِ ہندو سوز بردند
رواں شد از عقب ماہِ رو ہفتہ — چو بلبل نذر گو، چوں گل شگفتہ
رخِ گلگونش از بس غازہ کاری — بتن برکردہ طرحِ تازہ کاری
بیک جنبش کہ خورد آں حلقہ بینی — رساند جاں بصد زاہد بہ بینی
بقیمت سنجی آں عقدِ بازو — فگندہ مشتری از کف ترازو

ب اس نے دیکھا کہ جوگی اور سنیاسی وغیرہ ناقوس اور طبل بجا رہے ہیں اور شور و غل برپا ہے
اس نے انھیں منع کیا:

چو شد سبزہ جولانگاہِ یار نزدیک — گذشت از کار کامد کار نزدیک
زیک سو جوگیاں ناقوس در دست — ہماں سنیاسیاں از شور سرمست
دگر سو بانگِ نائے و نالۂ بوق — زدے بر اوج و می سر زد بعیوق
چو دید آں ترکِ چیں ایں ترکتازاں — زباں بکشاد و گفت اے حقہ بازاں!
چرا شورِ نفیر و طبل و کوس است — نہ جنگِ زنگیاں، نے جنگِ روس است

ر پھر مستی کے عالم میں زبانِ حال سے یہ غزل پڑھی:

دریں شادی کہ سرعت پیشکار است — گر آزادی بود، نقارہ بار است
دریں میداں کہ جولانگاہِ عشق است — اگر ہمت بود شمشیر عار است
دریں منزل کہ ماند ناقہ در گل — بدستِ دل زمامِ اختیار است
دریں دریا کہ آمد ناخدا گم — کسے کو باخدا شد، در گذار است

س کے بعد جب چتا میں آگ روشن ہوئی تو وہ اس میں بیٹھ گئی؛ اپنے شوہر کا سر اپنے زانو پر رکھا، اپنا چہرہ اس کے چہرہ پر ملا اور اس کے ساتھ اپنے آپ کو آگ کی نذر کر دیا۔ اس طرح شوہر در بیوی دونوں خاک کا ایک ڈھیر ہو کر رہ گئے:

سراپا سرخ شد چوں روے آتش — دعا سر کرد و در زد سوے آتش
در آتش تا نشست آں سر گرفتہ — سرِ ہمسر بزانو برگرفتہ
رخِ خود بر رخش مالید بالید — ز دل دید آنچہ با دل می سگالید

نفس تا داشت در پاسِ نفس بود | چو مرغش از قفس پر زد در آسود
چو آں ابکار گرد مساز گشتند | کہ از ناسازگاری باز گشتند
دو تن یک تن شدند از مہربانی | پدید آمد نشانِ بے نشانی
ایں بیالشاں عاقبت خاکستری ماند | پے وا ماندگاں چشمِ ترے ماند

اس سے باہر "ستی نامہ" کی تصنیف کی وجہ بھی بتلائی ہے۔ وہ اپنی پیری کے زمانے میں شاہ بہاء الدین نجم الدین پہاڑوں میں نکل گئے۔ جہاں شہر کے کنارے انھیں ایک خانقاہ ملی جس میں دلیکن از لقاصنہ نام کے بہت بڑے خدارسیدہ غریب نواز بزرگ رہتے تھے:

زجیبِ شہریک آشنائے زمانہ | غلط گفتم بجذبِ آب ودانہ
کریم باتنِ او چیزے دم سری مست | بدامانِ کہستاں برزدم دست
باہم اینہ ذر کر بوہ سر گذشتم | بسیاری زگردوں درگذشتم
رسیدم ناگہاں در مرغزارے | رواں در وے چو کوثر جوئبارے
زیک سو جو، دگر سو خانقاہے | درونِ خانقہ عرواں پناہے
ملک کیشے کز اوجِ آفتابش | رسیدہ شہ بہاء الدین خطابش
یتیماں آب یاب از خاکِ کویش | کدوے خشکِ شاں سبز از سبویش
غریباں میوہ چیں از نخلِ جودش | کرم برگ و برِ شاخِ وجودش
گمانم شد چو اسمش نجم دیں بود | کہ پیشِ اخترِ برجِ یقیں بود

اس خانقاہ میں مجرم تقریباً دو ہفتے ان عارف کے ساتھ رہے اور انھیں کے حجرے میں کسی شخص نے آن کران سے بیان کیا کہ شہر میں ایک عورت اپنے مردہ شوہر کے ساتھ جل کر ستی ہو گئی ہے:

غریبِ خوش نصیبِ خانہ پرداز | قریب نیم ماہے بود ہمراز
سخن اینست کاندر حجرۂ پیر | سخن سازے در آمد، کرد تقریر
کہ ایں شہر سر زد طرفہ حالے | علاماتِ قیامت را مثالے
زنِ گبرے ز مہرِ شوے مردہ | بآتش داد تن، تا جان سپردہ

اس درد بھری داستان کو سن کر ایک عارف کی آنکھ سے آنسو بہنے لگے۔ انھوں نے مجرم سے خواہش ظاہر کی کہ اس قصے کو جامۂ نظم پہنا دیے:

زچشمش چشمہ چشمہ اشک واشد — زیک پلکش ہزاراں مشک واشد
بعینِ گریہ آں عینِ عرفاں — بگفت اے دال برحال شکرخاں
مکن سستی، طبیعت آزما شو — بایں بیگانہ مشرب آشنا شو
بساز افسانۂ بر حسبِ ایں حال — بانگشتِ قلم گوشِ ورق مال

کمزوری اور پیری کے باوجود شاعر نے اس خدا رسیدہ بزرگ کی فرمائش پر کمر ہمت باندھ لی اور ایک دن میں یہ بھی داستان نظم کر ڈالی:

چو شد در گوش حرفِ گوشہ گیرم — جوانی یافت از سر طبعِ پیرم
قلم برکردہ، سرگردم حکایت — بیک روز از بدایت تا نہایت

آخر میں مجرم نے خدا سے دعا مانگی ہے کہ وہ انھیں دنیا کے لوگوں کے احسان اٹھائے بغیر روزی عنایت کرے اور جسمانی بیماریوں سے نجات بخشے:

دگر بے منتِ یارانِ فانی — رساں روزی کہ خود روزی رسانی
ہم از امراضِ جسمانی کہ دارم — بکن طاقم کہ من طاقت ندارم

یہ "ستی نامہ" جس میں تقریباً ۲۶۳ شعر ہیں، دیوان کرپارام کے زمانے میں تصنیف کیا گیا تھا۔ اگرچہ نظم میں ان کی طرف صرف "دیوانِ فلک قدر" سے اشارہ کیا ہے، مگر شروع میں عنوان میں صاف طور سے تصریح کر دی گئی ہے کہ اس سے مراد دیوان کرپارام ہی ہیں:

"ستی نامہ کہ در زمانِ دیوان کرپارام وقوع یافتہ"

(۳)

آنند رام مخلص (م ۱۱۶۴ھ / ۱۷۵۱ء) نے بھی اپنے سفرنامہ میں ایک ستی کا واقعہ بیان کیا ہے۔ جب ۱۱۵۸ھ (۱۷۴۵ء) میں محمد شاہ بادشاہ گڑھ مکتیشر کے لیے روانہ ہوئے، تو مخلص ان کے ساتھ تھے۔ دریا کے کنارے جن لوگوں کے خیمے لگے ہوئے تھے ان میں فرید نگر، مراد آباد کے ایک زمیندار بھی تھے۔ ان کا بیحد خوبصورت بیس سال کا جوان بیٹا اپنے ہمسنوں کے ساتھ

دریا پر نہانے گیا اور ڈوب گیا۔ جب اس کی بیوی کو گھر پر اس کی خبر ملی تو وہ ستی ہو گئی۔ مخلص اس واقعے کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے[4]:

"زمیندار فرید نگر کہ متعلق بہ مرادآباد است، . . . پسرے داشت، در سن بیست سالگی، در نہایت رعنائی و خوشنمائی۔ از آنجا کہ زمیندار مذکور خیمہ کنارۂ دریا داشت پسرش روزے با ہمہ یاران خود در دریا برائے غسل در آمد۔ ہنگام بازی پایش از جا لغزید و تا بہ احوالش پرداز ند، در آب غرق گردید . . . بر حال بیچارہ پدر پیر قیامت گذشت و زنش کہ در وطن بود، چوں ایں خبر شنید، ستی گشت۔"

حسب ذیل رباعی میں بھی مخلص نے اس ستی کے واقعے کی طرف اشارہ کیا ہے[5]:

دل سوخت زنے زندہ فغانہا کردیم   دشت و در را ز گریہ دریا کردیم
دنیاست عجب مرقع رنگیں   تصویر ستی نیز تماشا کردیم

## کتابیات


سفرنامۂ آنند رام مخلص مرتبہ ڈاکٹر اظہر علی

مجمع النفائس از خان آرزو خطی نسخہ خدا بخش لائبریری، پٹنہ (شمارہ ۶۹۹)

کلمات الشعرا از سرخوش، دین محمدی پریس، لاہور

مغل بیلیوگرافی (انگریزی) مرتبہ تاریپور کی وال و مارشل، بمبئی، ۱۹۶۰ء


---

۴۔ سفرنامۂ مخلص: ۲۵

۵۔ دیوان آنند رام مخلص (قلمی) (شمارہ ۳۶۹۹، ۳۰۰۷) رضا لائبریری، رام پور

ضیاالدین ڈیسائی

# دسویں صدی ہجری کا ایک اُردو کتبہ

تین چار سال ہوئے، شہر احمد آباد کی ایک علمی صحبت میں ہندستان کے فارسی عربی کتبوں کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی۔ اثنائے گفتگو میں اردو کے کتبوں کا ذکر آگیا۔ حاضرین میں بمبئی کے مشہور ماہرِ تعلیم جناب سید شہاب الدین دسنوی بھی تھے۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ جب کئی سال پہلے وہ صوبہ بمبئی (موجودہ مہاراشٹر) کے مشہور تاریخی اور صنعتی شہر شولاپور گئے تھے، تو کچھ مقامی احباب نے ان کی توجہ وہاں کے ایک لوحِ مزار پر منقوش اردو کتبے کی طرف مبذول کرائی تھی، لیکن چونکہ وہ کتبہ پڑھا نہیں گیا تھا، اس لیے اس وقت اس کی نوعیت کا پتا نہ چل سکا۔ کتبے کی جائے وقوع بھی دسنوی صاحب کے ذہن سے اتر چکی تھی۔ شولاپور کے تقریباً سب کتبے لاہور کے مشہور و معروف ماہرِ آثارِ قدیمہ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی، جو ان دنوں دکن کالج، پونہ سے وابستہ تھے، اپنے ایک مقالے میں شائع کر چکے ہیں[1] لیکن انھوں نے کسی اردو کتبے کا ذکر نہیں کیا ہے۔ بہرحال گذشتہ سال شولاپور کے کتبوں کی گرد آوری کے موقع پر یہ ایک سطری کتبہ کسی غیر معمولی تلاش و تحقیق کے بغیر دستیاب ہوگیا، چنانچہ میرے ایک رفیقِ کار جناب سید عبدالشکور قادری نے دوسرے کتبوں کے چربوں کے ساتھ اس کا چربہ بھی حاصل کر لیا۔ قرینِ قیاس ہے کہ ڈاکٹر چغتائی صاحب کی نظر اس کتبے پر اس لیے نہیں

۱۔ پروسیڈنگز آف دی دکن ہسٹری کانگرس، فرسٹ سیشن، حیدرآباد (۱۹۴۵ء): ۲۳۵-۲۳۷

پڑی کہ اس کی مختصر عبارت کو بھی انھوں نے غالباً قرآن شریف کی ان آیتوں کا حصہ سمجھ لیا جو لوحِ قبر کی تمام سطح پر اس کتبے کے ارد گرد منقوش ہیں۔ گو یہ کتبہ بہت ہی مختصر ہے اور اس کا متن صرف ایک شعر پر مشتمل ہے تاہم دسویں صدی ہجری کے اختتام کی فارسی کے نمونے کی حیثیت سے دلچسپ اور اہمیت سے خالی نہیں ہے۔

شولاپور کی جامع مسجد کے مشرق میں جو سڑک جاتی ہے اس کے اس پار ایک گلی ہے جس میں تقریباً دو سو گز کے فاصلے پر دو بڑے گنبد ہیں جو ماشیجیہ کہلاتے ہیں۔ ایک بڑا سا ہے اور دوسرا جو قد سے چھوٹا ہے، اس کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ عام لوگ بڑے مزار کو کالا گنبد کہتے ہیں۔ یہ وجہ تسمیہ غالباً اس کے لوحِ مزار کی مناسبت سے ہے، جو کالے پتھر کی ایک ہی بڑی سل سے تراشا گیا ہے۔ ان دونوں گنبدوں کے طرزِ تعمیر سے صاف ظاہر ہے کہ یہ عادل شاہی دور کی یادگار ہیں۔ چھوٹے گنبد کا لوحِ مزار بھی عادل شاہی عہد کی ان الواح کے بالکل مشابہ ہے، جو پلنگ کے چار پایوں پر رکھے ہوئے تابوت کی شکل میں بنے ہوئے آج بھی بیجاپور اور اس کے اطراف میں پائے جاتے ہیں۔ غرض یہ کہ لوحِ مزار کی ساخت، پرداخت اور تراش خراش سے بھی عمارت کی قدامت ثابت ہوتی ہے۔

لوح کے چاروں طرف اوپر سے لے کر نیچے تک قرآن شریف کی آیتیں مثلاً سورۃ اخلاص وغیرہ ابھرویں حروف میں بخطِ نسخ منقوش ہیں۔ صرف سرہانے کے بالائی حصے میں افقی نہج پر ایک شعر پر مشتمل مندرجہ ذیل ایک سطری کتبہ ہے:

اللہ نگاھبان تو بی هر دو جهان     هردم کلیمہ کھو بابا جی ضابطخان

شعر کا مطلب محتاجِ بیان نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ قبر بابا جی ضابطخان کی ہے جو ایک عادل شاہی امیر اور والی تھے۔ لیکن کتبے میں یا قبر کے کسی اور حصے پر منقوش تحریروں میں نہ ان کا سالِ وفات ملتا ہے، نہ مقبرے کی عمارت کی تاریخ ہی درج ہے۔ اس لیے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس شعر کے زمانہ تصنیف کی نشاندہی کیونکر کی جائے۔

یوں تو صاحبِ مقبرہ بابا جی ضابطخان گمنام شخص نہیں ہیں، لیکن تاریخوں میں ان کا حال تو کجا نام تک نہیں ملتا۔ خوش قسمتی سے شولاپور اور گلبرگہ میں ان کے کچھ اور کتبے دستیاب ہوئے ہیں،

جن سے ان کے زمانۂ حیات پر روشنی پڑتی ہے... ثابت ہوتا ہے کہ وہ بحیثیت نائب غیبت بادشاہ اس خطے کے حاکم تھے۔ ان کا تعلق عادل شاہ اوّل (۹۶۵-۹۸۸ھ) اور ابراہیم عادل شاہ ثانی (۹۸۸-۱۰۳۷ھ) کے زمانے سے تعلق رہا۔ دو کتبوں کو چھوڑ کر جن میں بادشاہ کا نام تو ہے، لیکن تاریخ نہیں، سب سے قدیم کتبہ ۹۸۱ھ کا اور سب سے مؤخر ۹۹۴ھ کا ہے[۲]۔ اس سے ظاہر ہے کہ باباجی ضابطہ خاں دسویں صدی کے نصف آخر میں زندہ تھے اور کوئی تعجب نہیں اگر ان کی وفات ۹۹۴ھ کے فوراً بعد ہوئی ہو، کیونکہ ۹۸۱ھ میں شولاپور اور گلبرگہ جیسے نہایت ہی اہم خطے کے حاکم کے لیے کافی تجربہ کار ہونا لازمی تھا بالفاظ دیگر وہ ۹۸۱ھ میں زیادہ نہیں، تو چالیس سال کے لگ بھگ ہوں گے، اور اس لحاظ سے ان کی عمر ساٹھ سال کے لگ بھگ بھی شمار کی جائے، تو سال وفات... ھ حاصل ہوگا بہر صورت ان کی وفات دسویں صدی ہجری کے اواخر یا بحد آخر گیارھویں صدی ہجری کے اوائل میں ہوئی ہوگی، اس صورت میں مندرجہ بالا شعر کو دسویں صدی ہجری کی نظم کا نمونہ سمجھنا بجا نہ ہوگا۔

جیسا کہ اوپر اشارہ کر چکا ہوں، مقبرے کی طرز تعمیر، لوح مزار کی ساخت اور تراش، اور عبارت کا طرز تحریر جو دسویں صدی ہجری کے کتبوں کا مماثل ہے، اس نظریے کی پورے طور پر تائید کرتے ہیں۔

ایک اور بات قابل ذکر ہے۔ کتبے میں لفظ کلمہ "کلیمہ" کی شکل میں تحریر ہوا ہے۔ اسے کاتب کی غلطی پر محمول تو کیا جا سکتا ہے، لیکن یہاں شاید اس نے یہ املا دانستہ لکھا ہے، دکن کے دسویں اور گیارھویں صدی ہجری کے بعض دوسرے کتبوں میں بھی لفظ کلمہ بعینہ اسی املا کے ساتھ لکھا ملتا ہے۔

اس شعر میں مخاطب خود ضابطہ خان ہیں۔ اس کے معنی یا تو یہ ہیں کہ یہ انھیں کے فکر کا نتیجہ ہے، یا یہ کہ کسی اور بزرگ نے انھیں اس شعر کے ذریعہ کلمہ کے ورد کی تلقین کی ہو یہ شعر کم از کم اس بات کا مزید ثبوت ہے کہ اس وقت عام بول چال کی زبان یہی قدیم اردو تھی۔

---

۲۔ ملاحظہ ہو:

(الف) ایپگرافیا انڈیکا سپلمنٹ (۱۹۰۷-۱۹۰۸): ۶،۳

(ب) اینول رپورٹ آن انڈین ایپگرافی فار ۶۰-۱۹۵۹ اپینڈکس ڈی نمبر ۱۶۲؛ نیز ۶۶-۱۹۶۵ نمبر ۲۲۳

(ج) پروسیڈنگز آف دی دکن ہسٹری کانگریس، فرسٹ سیشن حیدرآباد (۱۹۴۵): ۲۳۵-۲۳۶

# علمی مجلس، دلّی کی پہلی پیشکش

تذکرہ

# گلشنِ ہند

از

سید حیدر بخش حیدری

مرتّبہ

ڈاکٹر مختار الدّین احمد، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اس تذکرے کے دنیا میں صرف دو نسخے ہیں: ایک آکسفرڈ میں، دوسرا لندن میں، جن کی مدد سے ڈاکٹر مختار الدّین احمد نے اس کا متن تیار کیا ہے۔ حواشی جس دقّتِ نظر اور محنت سے لکھے گئے ہیں، اس کا اندازہ صرف انھیں دیکھنے کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔

سید اکبر علی ترمذی

# شاہجہانی عہد کی ایک گجری مثنوی

ہندوستان کی گنگا جمنی زبان جسے ہم آج اردو کہتے ہیں اپنے ارتقا کے ابتدائی مدارج میں ہندوی، زبانِ دہلوی، ریختہ، زبانِ ہندوستانی وغیرہ ناموں سے یاد کی جاتی تھی۔[1] ابتدائی شکل میں یہ زبان شمالی ہندوستان میں ملتی ہے لیکن اس کی ادبی نشوونما دکن اور گجرات میں ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ اس زبان کے دو اور نام یعنی دکھنی (یا دکنی) اور گجری (یا گوجری) بھی ملتے ہیں۔

دکن اور گجرات میں اس زبان کی ادبی نشوونما کا سب سے بڑا سبب وہ سیاسی اور معاشرتی حالات ہیں جن کے ماتحت وہاں کے مقامی صوبہ داروں نے دہلی کی مرکزی حکومت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر کے خودمختار سلطنتوں کی بنیاد ڈالی۔ ان خودمختار سلطنتوں کے حکمرانوں نے مقامی لوگوں کے جذبات سے ہم آہنگی پیدا کرنے کی غرض سے بدیسی کے مقابلے میں دیسی چیزوں کو اہمیت دینا شروع کی۔ انہی دیسی اہم چیزوں میں زبان بھی تھی۔ چنانچہ دکن اور گجرات کے سلاطین نے اس کی طرف خاص طور پر توجہ کی۔ یہی حکمتِ عملی تھی جس پر دکن کے بہمنیوں، قطب شاہیوں، نظام شاہیوں، عادل شاہیوں اور گجرات کے مظفر شاہیوں نے بڑی حد تک عمل کیا اور اس کا

---

1۔ پنجاب میں اردو: ۲۱-۲۲

خوشگوار نتیجہ یہ نکلا کہ اردو دکن اور گجرات میں اپنے ادبی خدوخال کے ساتھ دہلی سے سیکڑوں برس پہلے جلوہ گر ہوئی۔

گجرات کی مظفر شاہی سلطنت کا بانی ظفر خان ایک راجپوت مسلمان ہونے کے باعث خالص ہندستانی اور دیسی پردیسی کے جذبات سے اچھی طرح واقف تھا دہلی پر تیموری حملے نے تغلقوں کے فرسودہ نظامِ حکومت کی جڑیں ہلا دیں، تو ظفر خان نے اپنی مطلق العنانی کا اعلان کر دیا اور اس طرح مظفر شاہی سلطنت عالمِ وجود میں آئی۔ مظفر شاہی خاندان کے اکثر حکمرانوں نے راجپوت شہزادیوں سے شادیاں کر کے ایک طرف تو اپنے ایوانِ سلطنت کی بنیادوں کو مضبوط بنایا اور دوسری طرف ایک ایسی زبان کو جنم دیا جو فارسی اور گجراتی کے سنگم سے وجود میں آئی اس ملی جلی زبان میں سلاطینِ گجرات نہ صرف گفتگو ہی کرتے، بلکہ کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے مثلاً قطب الدین (۱۴۵۱-۱۴۵۸ء) کا یہ شعر ملتا ہے جو اس نے سید سراج الدین محمد شاہ عالم بخاری عرف میاں منجھن (ف ۱۴۷۶ء) کی مدح میں کہا تھا ؎

منجھن شاہ جہانیاں جس دیتا سبحان!
شاہوں کیرا[۱] شاہ توں[۲] دوؤ[۳] جگ تیری[۴] آن[۵]

مظفر شاہیوں کے ایوانِ شاہی کے علاوہ یہ مشترکہ زبان گجرات کی خانقاہوں میں پروان چڑھی، جہاں صوفیوں نے اسے عوام میں صلح کل اور وحدت الوجود کے پرچار کا ذریعہ بنایا۔ یہ صوفی وہ بزرگ تھے، جو تیموری تاخت و تاراج کے زمانے میں شمالی ہندستان سے ہجرت کر کے گجرات میں آ بسے اور وہیں پیوندِ خاک ہوئے۔ ان مہاجرین صوفیہ میں سلسلہ سہروردیہ کے سرحلقہ شیخ شہاب الدین احمد کھیتو (ف ۱۴۴۵ء) اور سید جلال الدین مخدوم جہانیاں جہانگشت کے پوتے سید برہان الدین عبداللہ قطب عالم بخاری (ف ۱۴۵۳ء) کے نام نمایاں نظر آتے ہیں۔ قطب عالم کے بیٹے اور جانشین سید سراج الدین محمد شاہ عالم گجرات کے بخاری سادات کے سرحلقہ تصور کیے جاتے ہیں۔ ان کے ہمعصر انھیں مقامی زبان میں باپ جیسا میاں منجھلا اور منجھن

---

۱۔ مناسب ۲۔ کا ۳۔ تو ۴۔ دونوں

۵۔ جمعاتِ شاہیہ (قلمی) جلد پنجم، جمعہ ۲۴

لر پکارتے تھے۔ میاں منجھلا مقامی زبان میں گفتگو کرنے کے علاوہ کبھی کبھی اس میں شعر بھی
تے تھے۔ ان کا ایک شعر ہے :

منجھلا اک بھیک ہے، راجن جیو کی بھیران کی
ہوں اک بھیک ہوں راجن جیو کی بھیران کی[6]

یاں منجھلا کے ہمعصر شیخ بہاءالدین باجن (۱۳۸۸-۱۵۰۶) بھی اسی مقامی
بان میں اپنے صوفیانہ خیالات کو دوہروں کی شکل میں موزوں کرتے تھے۔ ان کے چند شعر
حظہ ہوں :

راول[9] دیول[10] کہیں نہ جانا | پھٹا پہننا روکھا کھانا
ہم درویشاں ایسی[11] ریت | پاتی لوڑیں[12] ہور[13] مسیت[14]
بیٹھیں ٹھنڈی اچھی[15] چھاؤں | جو کوئی دیوے سوہی کھاؤں[16]

جن کے بعد اس مشترکہ زبان میں تصنیف و تالیف کا کام شروع ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں
سب سے پہلا نام قاضی محمود بیرپوری (ف ۱۵۴۰ء) کا لیا جاتا ہے۔ گجرات کے لوگ انھیں
پنے علاقے کا خواجہ خضر سمجھتے ہیں، چنانچہ وہ محمود دریائی کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ انھوں
نے گجری میں ایک دیوان یادگار چھوڑا ہے، جس سے ایک غزل کے چند اشعار نمونے کے
طور پر پیش کیے جاتے ہیں :

مکھی سمانی بیچ[18] ہوں رانی | پل پل کروں ودھاوا[19]
پرتھوی ساری سب ڈھونڈی | کہیں کھوج نہ پایا
اچپت میری من چیتنا[20] ناہیں | سو گھر بیٹھے آیا[21]

محمود دریائی کے ہمعصر شیخ علی جیو گام دھنی (ف ۱۵۶۵ء / ۹۷۳ھ) کے دوہروں اور مثنویوں کا

۶۔ لسی۔ ۷۔ خدا ۸۔ موصل الطالبین (قلمی) ۸ : ۵۱۱
۹۔ شاہی دربار ۱۰۔ مندر ۱۱۔ ایسی ۱۲۔ تلاش کرنا
۱۳۔ اور ۱۴۔ مسجد ۱۵۔ اچھی ۱۶۔ اسلامک کلچر (جنوری ۱۹۵۲) : ۲۴
۱۷۔ باعزت ۱۸۔ درمیان ۱۹۔ مبارک باد دینا ۲۰۔ سوچنا ۲۱۔ اسلامک کلچر جنوری ۱۹۵۲ : ۲۵

خوشگوار نتیجہ نکلا کہ اردو دکن اور گجرات میں اپنے ادبی خدوخال کے ساتھ دہلی سے سیکڑوں برس پہلے جلوہ گر ہوئی۔

گجرات کی مظفر شاہی سلطنت کا بانی ظفر خان ایک راجپوت مسلمان ہونے کے باعث خالص ہندوستانی اور دیسی، پردیسی کے جذبات سے اچھی طرح واقف تھا۔ دہلی پر تیموری حملے نے تغلقوں کے فرسودہ نظامِ حکومت کی جڑیں ہلا دیں، تو ظفر خان نے اپنی مطلق العنانی کا اعلان کر دیا اور اس طرح مظفر شاہی سلطنت عالمِ وجود میں آئی۔ مظفر شاہی خاندان کے اکثر حکمرانوں نے راجپوت شہزادیوں سے شادی کر کے ایک طرف تو اپنے ایوانِ سلطنت کی بنیادوں کو مضبوط بنایا اور دوسری طرف ایک ایسی زبان کو جنم دیا جو ماسی اور گجراتی کے سنگم سے وجود میں آئی اس ملی جلی زبان میں سلاطینِ گجرات نہ صرف گفتگو ہی کرتے، بلکہ کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے۔ مثلاً قطب الدین (۱۴۰۸ - ۱۴۵۱ء) کا شعر ملتا ہے جو اس نے سید سراج الدین محمد شاہ عالم بخاری عرف میاں منجھن (م ۱۴۷۰ء) کی مدح میں کہا تھا ۔

منجھن شاہ جہانیاں جس دیتا سبحان[1]

شاہوں کیرا[2] شاہ توں[3] دوہ[4] نہ جگ تیری آن[5]

مظفر شاہیوں کے ایوانِ شاہی کے علاوہ یہ مشترکہ زبان گجرات کی خانقاہوں میں پروان چڑھی، جہاں صوفیوں نے اسے عوام میں صلح کل اور وحدت الوجود کے پرچار کا ذریعہ بنایا۔ یہ صوفی وہ بزرگ تھے، جو تیموری تاخت و تاراج کے زمانے میں شمالی ہندوستان سے ہجرت کر کے گجرات میں آ بسے اور وہیں پیوندِ خاک ہوئے۔ ان مہاجرین صوفیہ میں سلسلہ مغربیہ کے سرحلقہ شیخ شہاب الدین احمد کھٹو (ف ۱۴۴۵ء) اور سید جلال الدین مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے پوتے سید برہان الدین عبداللہ قطب عالم بخاری (ف ۱۴۵۳ء) کے نام نمایاں نظر آتے ہیں۔ قطب عالم کے بیٹے اور جانشین سید سراج الدین محمد شاہ عالم گجرات کے بخاری سادات کے سرحلقہ تصور کیے جاتے ہیں۔ ان کے ہمعصر انھیں مقامی زبان میں باپ جیسا میاں منجھلا اور منجھن شا[6]

۱۔ مناسب ۲۔ کا ۳۔ تو ۴۔ دونوں

۵۔ جمعاتِ شاہیہ (قلمی) جلد پنجم، جمعہ ۲۴

نہ پکارتے تھے۔ میاں منجھلا مقامی زبان میں گفتگو کرنے کے علاوہ کبھی کبھی اس میں شعر بھی
تھے۔ ان کا ایک شعر ہے:

منجھلا اک بھیک ہے، راجن جیو کی بھیران کی
ہوں اک بھیک ہوں راجن جیو کی بھیران کی[8]

اں منجھلا کے ہمعصر شیخ بہاالدین باجن (۱۳۸۸-۱۵۰۶) بھی اسی مقامی
بان میں اپنے صوفیانہ خیالات کو دوہوں کی شکل میں موزوں کرتے تھے۔ ان کے چند شعر
حظہ ہوں:

راول[9] دیول[10] کہیں نہ جانا — پھٹا پہننا رو کھا کھانا
ہم درویشاں ایٹھی[11] ریت — پانی لوڑیں[12] ہور[13] مسیت[14]
بیٹھیں ٹھنڈی اچھی[15] چھاؤں — جو کوئی دیوے سوہی کھاؤں[16]

جن کے بعد اس مشترکہ زبان میں تصنیف و تالیف کا کام شروع ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں
سب سے پہلا نام قاضی محمود بیرپوری (ف ۱۵۴۰ء) کا لیا جاتا ہے۔ گجرات کے لوگ انھیں
پنے علاقے کا خواجہ خضر سمجھتے ہیں، چنانچہ وہ محمود دریائی کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ انھوں
نے گجری میں ایک دیوان یادگار چھوڑا ہے، جس سے ایک غزل کے چند اشعار نمونے کے
طور پر پیش کیے جاتے ہیں:

مکھی سمانی بیچ[17] ہوں رانی[18] — پل پل کروں ودھاوا[19]
پرتھوی ساری سب ڈھونڈی — کہیں کھوج نہ پایا
اچپت میری من چنتنا[20] ناہیں — سو گھر بیٹھے آیا[21]

مود دریائی کے ہمعصر شیخ علی جیو گام دھنی (ف ۱۵۶۵ء/۹۷۳ھ) کے دوہروں اور مثنویوں کا

۔ کسی۔ ۷۔ خدا ۸۔ موصل الطالبین (قلمی) ۸: ۱۱۵
۔ شاہی دربار ۱۰۔ مندر ۱۱۔ ایسی ۱۲۔ تلاش کرنا
۱۳۔ اور ۱۴۔ مسجد ۱۵۔ اچھی ۱۶۔ اسلامک کلچر (جنوری ۱۹۰۳): ۲۴
۱۷۔ باعزت ۱۸۔ درمیان ۱۹۔ مبارک باد دینا ۲۰۔ سوچنا ۲۱۔ اسلامک کلچر (جنوری ۱۹۰۳): ۲۵

مجموعہ "جواہر اسرار اللہ" کے نام سے دستیاب ہوتا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں :

کہیں سُو[22] مجنوں ہو برلاوے[23]      کہیں سُو لیلا ہو کہلاوے

کہیں سُو خسرو شاہ کہلاوے      کہیں سُو شیریں ہو کر آوے

شاہ علی جیو کی وفات کے تیرہ سال بعد احمد آباد میں شیخ خوب محمد چشتی نے تصوف کی ایک مثنوی "خوب ترنگ" گجری میں تصنیف کی، اور سیہ ۱۵۹۲ء میں "امواجِ خوبی" کے نام سے اس کی فارسی میں شرح لکھی۔ وہ اپنی زبان کو عربی اور فارسی آمیز گجراتی کہتے ہیں :

جیوں دل عرب عجم کی بات      سن بولے بولی گجرات[24]

(۲)

خوب محمد چشتی کے ہمعصر سید جلال مقصود عالم بخاری فارسی کے علاوہ گجری میں بھی کہتے تھے۔ وہ ۱۵۹۵ء میں احمد آباد میں پیدا ہوئے اور ۳۵ سال کی عمر میں اپنے پدر بزرگوار سید محمد مقبول عالم بخاری کی اجازت سے شاہجہان کے جشنِ تخت نشینی میں شرکت کے لیے آگرے تشریف لے گئے۔ بادشاہ نے خلعت و فیل اور تین ہزار روپیہ نقد عنایت کیا۔[26] ۱۶۳۷ء میں مزید دس ہزار روپیہ اور ان کے لڑکوں کو دستار اور شالیں عنایت ہوئیں ; اسی موقع پر انھیں چار سو اشرفیاں گجرات کے زاویہ نشینوں میں تقسیم کرنے کو دی گئیں۔[27] اس کے بعد وہ کئی بار دربار میں طلب کیے گئے اور ہر مرتبہ انعام و اعزاز سے مشرف ہوئے، یہاں تک کہ ۱۶۴۲ء میں انھیں مجبور کیا گیا کہ وہ ملازمتِ شاہی اختیار کریں۔ آخر کار انھوں نے اپنے بڑے بیٹے سید جعفر بدر عالم کو اپنا مرقع درویشی دے کر صدارتِ عظمیٰ کا خلعت حاصل کیا۔ چہار ہزاری ذات اور ہفت صدی سوار کا منصب ملا۔[28] ۱۶۴۵ء میں شش ہزاری ذات اور یک ہزاری سوار کے عالی منصب پر ترقی کی۔[29] چند لوگوں کے بعد ان کے منصب میں پانسو سواروں کا اور

۲۲۔ سے      ۲۳۔ نمودار ہو      ۲۴۔ خوب ترنگ

۲۵۔ مرآۃ احمدی، خاتمہ: ۴۲؛ مآثر الامرا، ۳: ۴۴۹      ۲۶۔ بادشاہ نامہ، ۱(۱)، ۲۷۲

۲۷۔ ایضاً ۲(۱)؛ ۴-۱۱      ۲۸۔ مآثر الامرا ۳: ۴۴۹

۲۹۔ بادشاہ نامہ، ۲(۱)، ۴۷۹

...ناقہ ہوا لیکن دو سال بعد یعنی ۱۶۴۷ء میں انھوں نے لاہور میں وفات پائی نعش گجرات بھیجی گئی
...رسول آباد میں اپنے بزرگوں کے پاس گنبد ثانی میں پیوند خاک ہوئے:[۳۰]

(۳)

...جلال الدین بخاری کی ایک گجری مثنوی ان کے بڑے بیٹے سید جعفر بدرعالم کی "روضات شاہی"
...سترھویں جلد کے ایک قلمی نسخے میں محفوظ ہے۔ یہ مثنوی خوشخط نستعلیق میں لکھی گئی ہے۔ اور
...میں کل ۱۳۷ اشعار ہیں۔ اس میں شاعر نے اپنے جدِ اعلیٰ سید سراج الدین محمد شاہ عالم عرف
...ں منجھن کی مدح میں بڑے مبالغے سے کام لیا ہے۔ ہر مصرعے کا آغاز "شاہ عالم" سے ہوتا ہے۔
...ر کبھی انھیں "حیدر کرار" کبھی "احمد مختار" کبھی "شاہدِ مشہود" کبھی "واحدِ موجود" اور کبھی "بن
احمد" کہہ کر یاد کرتا ہے۔ مثنوی ملاحظہ ہو:

شاہ عالم سلطانِ اولیا — شاہ عالم برہانِ اصفیا
شاہ عالم نت[۳۱] پار اتاریں — شاہ عالم سب کام سنواریں
شاہ عالم پر[۳۲] ہوں بلہار[۳۳] — شاہ عالم منجھ[۳۴] تیریں[۳۵] یار
شاہ عالم کی کروں بکھان[۳۶] — شاہ عالم منجھ جیو[۳۷] پران[۳۸]
شاہ عالم پیروں کا پیر — شاہ عالم میروں کا میر
شاہ عالم منجھ جیون مول[۳۹] — شاہ عالم جیوں[۴۰] نبی رسول
شاہ عالم حق کا محبوب — شاہ عالم جگ[۴۱] کا مطلوب
شاہ عالم میرا ہے پیر — شاہ عالم منجھ دیوے[۴۲] دھیر[۴۳]
شاہ عالم کی منجھ ہے پیاس — شاہ عالم ہی میری آس
شاہ عالم کون سنورُوں[۴۴] نت — شاہ عالم سب میرا بت[۴۵]
شاہ عالم منجھ جیو[۴۶] کا جیو — شاہ عالم ہی پیو[۴۷] کا پیو

---

...مآثر الامرا، ۳: ۷۶۴؛ مراۃ احمدی، خاتمہ: ۴۳ ۳۱۔ ہمیشہ ۳۲۔ میں
...۔ قربان ۳۴۔ میرے ۳۵۔ تیرے ۳۶۔ مدح ۳۷۔ زندگی ۳۸۔ روح
...۔ بنیاد ۴۰۔ جیسے ۴۱۔ دنیا ۴۲۔ دیں ۴۳۔ آسرا ۴۴۔ سمروں، یاد کروں ۴۵۔ سرمایہ، پونجی ۴۶۔ جان ۴۷۔ محبوب

شاہ عالم احمد مختار — شاہ عالم حیدر کرار
شاہ عالم جیوں [حسنین] — شاہ عالم ہیے[٤٨] کے نین
شاہ عالم دکھلاویں[٤٩] غیب — شاہ عالم سب . . . . .
شاہ عالم سوں[٥٠] بانہ بیا نیہہ[٥١] — شاہ عالم منجھ درسن دیہہ[٥٢]
شاہ عالم منجھ دیویں [ساج][٥٣] — شاہ عالم منجھ راکھیں[٥٤] لاج
شاہ عالم کا منجھ پہ سادھ[٥٥] — شاہ عالم [بن] اسب . . .
شاہ عالم منجھ اوگن[٥٦] دھوئے — شاہ عالم بہو[٥٧] کرے سو ہوئے
شاہ عالم اپجاویں[٥٨] [میت][٥٩] — شاہ عالم کی ایہی[٦٠] ریت
شاہ عالم کے کھلے ہیں دوار[٦١] — شاہ عالم نت دیویں بار
شاہ عالم کے کن[٦٢] ہوں گھیرا — شاہ عالم پر وار[٦٣] یا پھیرا[٦٤]
شاہ عالم پر رائی لون[٦٥] — شاہ عالم بن سکھ ہے کون[٦٦]
شاہ عالم سو سید محمد — شاہ عالم بن میم احمد
شاہ عالم شاہد مشہود — شاہ عالم واحد موجود
شاہ عالم منجھ گھٹ[٦٧] میں ساس — شاہ عالم پھولوں میں باس
شاہ عالم ہے جگ کا سوہت — شاہ عالم تینوں میں سوہن
شاہ عالم سہاگ جگاویں — شاہ عالم منجھ بارے لگاویں[٦٨]
شاہ عالم آکھوں[٦٩] کا تیج[٧٠] — شاہ عالم سینے کا ہیج[٧١]
شاہ عالم میرے سرتاج — شاہ عالم ستھی[٧٢] پاؤں لاج[٧٣]

---

٤٨۔ دل ٤٩۔ دکھلائیں ٥٠۔ سے ٥١۔ بیعانہ ٥٢۔ دیں
٥٣۔ سامان ٥٤۔ رکھیں ٥٥۔ کرم ٥٦۔ برائیاں ٥٧۔ بہو
٥٨۔ پیدا کریں ٥٩۔ پریتم۔ محبت ٦٠۔ یہی ٦١۔ دروازے ٦٢۔ نزدیک۔ پاس
٦٣۔ نثار ٦٤۔ طواف ٦٥۔ کتنا ٦٦۔ کیسے ٦٧۔ گھٹ۔ جسم
٦٨۔ لگائیں ٦٩۔ آنکھوں ٧٠۔ روشنی ٧١۔ کتنا ٧٢۔ سے ٧٣۔ عزت

شاہ عالم کے بار براجوں[74] شاہ عالم پر سہوں نت کاجوں[75]
شاہ عالم بن[76] کوں کئے پچھانوں[77] شاہ عالم کوں جنم بکھانوں[78]
شاہ عالم دیدار دلاویں[79] شاہ عالم ہر بار بلاویں[80]
شاہ عالم منجھ داون[81] ڈاکھیں[82] شاہ عالم پاؤں تل راکھیں[83]
شاہ عالم بن مانگیا دیئے[84] شاہ عالم سچ کوں نہ لیئے[85]
شاہ عالم دکھلائے اڈیٹ[86] شاہ عالم منجھ تھاییں پیٹ[87]
شاہ عالم ہی بجا جیں دکھ[88] شاہ عالم تھی پاسی[89] سکھ

شاہ عالم منجھ لیویں مان[90]
شاہ عالم نت دیویں مان[91]

(۴)

اس مثنوی کے مطالعے سے سترھویں صدی عیسوی کے نصف اول میں جو زبان گجرات میں مروج تھی، اس کا کسی قدر اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کی ترکیبیں اور محاورے زبان کے ابتدائی خدوخال روشن کرنے میں ہماری بڑی مدد کرتے ہیں۔ خالص ادبی لحاظ سے یہ مثنوی بلند مرتبہ نہیں کہی جا سکتی۔ اچھی مثنوی کے خصائص اس میں کلیۃً مفقود ہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ جب زبان ارتقائی منزلیں طے کر رہی ہو، تو اس کے ذریعے سے کوئی ایسا ادب پیش نہیں کیا جا سکتا، جو بلند پایہ ہو۔ زبان کی خامیاں بلند ادب کی تخلیق میں رکاوٹیں پیدا کر دیتی ہیں۔

ادبی اہمیت سے کہیں زیادہ اس مثنوی کی لسانی اہمیت ہے۔ مثنوی نگار کا ذخیرۂ الفاظ بظاہر محدود ہے، لیکن اسے اپنے دور کی زبان پر عبور معلوم ہوتا تھا، محاورے اور روزمرہ کا استعمال اس بات کا ثبوت ہے۔ لہٰذا اس مثنوی کی زبان کا دستورِ زبان کی روشنی میں مطالعہ مفید ہوگا:

---

۷۴۔ بیٹھوں ۷۵۔ کندا ۷۶۔ کیسے ۷۷۔ پہچانوں ۷۸۔ مدح کروں ۷۹۔ دلائیں
۸۰۔ بلائیں ۸۱۔ طرف ۸۲۔ دیکھیں ۸۳۔ رکھیں ۸۴۔ دیں ۸۵۔ لیں
۸۶۔ غیب ۸۷۔ بیٹھ ۸۸۔ تکلیف ۸۹۔ پائیں ۹۰۔ قبول کریں ۹۱۔ عزت

# شاہجہانی عہد کی ایک گجری مثنوی

۱۔ اسماء:

(الف) دیسی الفاظ

بلہار، پران، جیون، اوگن، لاج، مول،
جگ، پیاس، بٹ، جیو، پیو، مان،
بھاگ، پانی، آکھ (آنکھ)، سوہن، سوہن، سکھ،
گھٹ، ساس (سواس)، دیہہ، ہی، نین، ریت،
دوار، باس، جنم، اڈیٹ، پیٹھ، دکھ، تیج،

(ب) فارسی الفاظ

یار، پیر، میر، سینہ، سرتاج، بار، دیدار، ساج (ساز)

(ج) عربی الفاظ

سلطان، ولی، برہان، نبی، رسول، حق، واحد، شاہد، مشہود
موجود، محبوب، مطلوب، مختار،

۲۔ جمع:

ہندی قاعدے سے: پیر سے پیروں، میر سے میروں، پھول سے پھولوں، آنکھ سے آکھوں، نین سے نینوں کی مثالیں ملتی ہیں۔

عربی قاعدے سے صرف دو لفظوں کی جمع آئی ہے:
ولی سے اولیاء اور صفی سے اصفیا۔

۳۔ ضمایر:

مثنوی میں ضمیر شخصی کی مندرجہ ذیل مثالیں آئی ہیں:

| | غائب | | حاضر | | متکلم | |
|---|---|---|---|---|---|---|
| | واحد | جمع | واحد | جمع | واحد | جمع |
| فاعلی | ۔ | ۔ | ۔ | ۔ | ہوں | ۔ |
| اضافی | ۔ | ۔ | تیریں | ۔ | منجھ (میرا)۔ (میری) | |

مفعولی - - - - منجمد -

۴۔ حروف :

حرف جار : میں ۔ پر ۔ تھی (سے)

حرف اضافت : کا ۔ کی ۔ کون ۔

حرف تشبیہ : جیوں

حرف اشارہ : ایہ + (ہی) (ایہی)

حرف استفہام : کون

حرف قید : کن ۔ نت

۵۔ افعال :

مضارع ۔ افعال میں مضارع کا استعمال سب سے زیادہ ہوا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

(الف) ادتاریں ۔ دکھلاویں ۔ اپجاویں ۔ دلویں ۔ جگاویں ۔ لگاویں ۔ دلاویں ۔ بلاویں ڈاکھیں ۔ راکھیں ۔ تھامیں ۔ بھابیں ۔ لیویں

(ب) بجھا لوں ۔ سنوروں ۔ پاؤں

امر :

اس فعل کا استعمال بہت کم ہوا ہے۔ صرف یہ چند مثالیں ملتی ہیں : باندھ ۔ دیہ ۔ لیہ

۶۔ محاورات :

اس میں فارسی محاوروں کے ترجمہ کے ساتھ ساتھ ہندی کے بعض محاورے بھی استعمال ہوئے ہیں مثلاً

فارسی محاوروں کے ترجمے :

پیانہ ، باندھنا ؛ بار دینا ؛ دیدار دلاتا ۔

ہندی محاورے :

کام سنوارنا ؛ لاج رکھنا ؛ پیت اپجانا ؛ سبھاگ جگانا ؛ بای لگانا ؛ پیٹھ تھامنا ؛ دکھ بھاجنا ۔

۷۔ ساخت الفاظ :

الفاظ کی ساخت کی بعض خصوصیتیں بھی قابلِ ذکر ہیں:

(الف) (۱) بعض الفاظ میں ن کی کمی مثلاً آنکھوں کے بجائے آکھوں (۲) "ہ" کی کمی۔ اڈیٹھ کی جگہ اڈیٹ اور بیٹھ کی جگہ بیٹ

(ب) (۱) چند الفاظ میں موجودہ زبان کے مقابلہ میں الف زاید۔ مثلاً رکھیں = مانگ = ای کی گراکھیں = مانگیا = ایہی۔ (۲) ن زاید: تیرے تیریں

سطورِ بالا میں جو چند اشارے کیے گئے ہیں، ان کے پیشِ نظر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ سید جلال کی یہ مثنوی لسانی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ اس کی دریافت سے اگر ایک طرف قدیم اردو کے ذخیرے میں اضافہ ہوتا ہے تو دوسری طرف ہمیں گجری کی ارتقائی منازل کی ایک ابتدائی کڑی بھی دستیاب ہوتی ہے۔ اس کی صرف و نحو، ترکیبوں، محاوروں اور الفاظ کی ساخت کے تجزیے سے سترھویں صدی عیسوی کی ابتدا میں بولی جانے والی گجری کے لسانی رجحانات کا خاکہ مرتب کیا جا سکتا ہے۔

## کتابیات


پنجاب میں اردو از حافظ محمود شیرانی: لاہور (طبع اول)

جمعاتِ شاہیہ از سید محمد مقبول عالم بخاری: (قلمی)

رسالہ موصل الطالبین از شاہ عالم بخاری: (قلمی) کتابخانہ پیر محمد شاہ، (احمد آباد)

اسلامک کلچر (مجلہ انگریزی، حیدرآباد): مضمون محمد ابراہیم ڈار: جنوری ۱۹۵۳ء

مرآۃ احمدی، خاتمہ از علی محمد خان: کلکتہ، ۱۹۳۰ء

مآثر الامرا از شاہ نواز خان: کلکتہ، ۱۸۸۸۔ ۱۸۹۱ء

بادشاہ نامہ از عبدالحمید لاہوری: کلکتہ، ۱۸۶۶ء ببعد

خوب ترنگ از خوب محمد چشتی (قلمی) کتابخانہ پیر محمد شاہ (احمد آباد)

مالک رام

# وفیات

افسوس، پچھلی ششماہی اردو علم و ادب کے لیے بہت الم ناک ثابت ہوئی۔ اس دوران میں کئی مشہور ادیب اور شاعر ہمیں داغِ مفارقت دے گئے۔ ان کے کارنامے انھیں زندہ رکھیں گے اور آنے والی نسلیں ان سے مستفید ہوں گی۔ ان سب سے متعلق ضروری معلومات درج ذیل ہیں:

## اثر لکھنوی، میرزا جعفر علی خان

حضرت اثر بہت دن سے بیمار چلے آتے تھے۔ تین چار برس ہوئے، ان پر فالج کا حملہ ہوا، جس سے وہ زیادہ نقل و حرکت کے قابل نہیں رہے تھے۔ حافظہ بھی بہت کمزور ہو گیا تھا۔ نظر آ رہا تھا کہ اب وہ برسوں کے نہیں، ہفتوں اور دنوں کے مہمان ہیں۔ چنانچہ وقتِ موعود آن پہنچا، اور منگل کے دن ۶ جون ۱۹۶۷ء کی صبح کو وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

اثر صاحب کا خاندان ایرانی تھا۔ ان کے جدِ اعلیٰ میرزا محمد شفیع اصفہان سے آگرے آئے۔ پیشے کے لحاظ سے وہ طبیب تھے۔ آگرے میں ان کی حذاقت نے ایسی شہرت حاصل کی کہ نواب وزیر شجاع الدولہ نے انھیں فیض آباد طلب کر لیا۔ مناسب قدر و منزلت ہوئی اور وہ یہیں کے ہو کے رہ گئے۔ حکیم محمد شفیع کے صاحبزادے میرزا محمد سمیع ذرہ تخلص (ف ۱۳۰۰ھ) کربلا

چلے گئے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ یہ وہی حکیم محمد سمیع ذرہ ہیں، جن کی یہ رباعی بہت مشہور ہے:

گر ما بگذشت وایں دلِ زار بہاں ۔۔۔ سر ما بگذشت وایں دلِ زار بہاں
القصہ ہزار گرم و سرد عالم ۔۔۔ بر ما بگذشت وایں دلِ زار بہاں

نواب علامہ تفضل حسین خاں (ف ۱۸۰۱ء) بھی غالباً اسی خاندان سے تھے۔
حکیم محمد سمیع ذرہ کے بیٹے حکیم میرزا علی خاں جو والد ہی کے ساتھ کربلا گئے تھے، ان کے انتقال کے بعد واپس لکھنؤ چلے آئے۔ یہاں انھیں شاہی میں حکیم الملک کا خطاب ملا اور بڑا عروج پایا۔ انھیں کی اولاد میں اثر مرحوم کے والد بزرگوار حکیم میرزا افضل حسین خاں تھے۔
اثر اپنے خاندانی مکان کٹرہ ابو تراب خاں (لکھنؤ) میں ۱۲ جولائی ۱۸۸۵ء کو پیدا ہوئے۔ منہ میں روایتی چاندی کا چمچہ نہیں، سونے کا چمچہ لیے ہوئے بدلے ہوئے حالات کے اقتضا سے، خاندان کی روایات کے برخلاف، ان کی تعلیم مغربی طرز پر ہوئی۔ ۱۹۰۶ء میں بی اے کی سند لی، ۱۹۰۹ء میں ڈپٹی کلکٹر بنا دیے گئے اور ترقی کی منازل طے کرنے لگے۔ یو پی کے مختلف اضلاع میں ڈپٹی کمشنر اور کمشنر اور دوسرے ممتاز عہدوں پر فائز رہے۔ ۱۹۲۵ء میں کلکٹری پر مستقل ہوئے۔ ۱۹۴۰ء میں پنشن کے بعد اولاً کشمیر میں وزیر مال اور پھر وہیں چند سے وزیر اعظم بھی رہے۔ خدماتِ جلیلہ کے لیے حکومت کی طرف سے ۱۹۳۶ء میں خطاب خان بہادر اور ۱۹۳۶ء میں (ایم بی ای)، ملا۔ ۱۹۲۲ء میں زیاراتِ مقاماتِ مقدسہ کی غرض سے عراق کا سفر کیا۔

شاعری کا شوق اوائل سے تھا اور اس میں میرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی (ف ۱۹۳۵ء) سے تلمذ تھا۔ عزیز کے بعض دوسرے شاگردوں کے افسوسناک رویے کے بالعکس، اثر آخر تک استاد کے احسانات کے معترف رہے۔ انھیں زبان و بیان اور فنِ شعر میں غیر معمولی مہارت اور قدرت حاصل تھی، جس کی شہادت ان کی تالیف "فرہنگِ اثر" سے بھی ملتی ہے۔ اس میں انھوں نے نور اللغات کی تعمیری تنقید اور اس کی بعض خامیوں کی نشاندہی کی ہے۔ اس پر انھیں یو پی حکومت کی طرف سے انعام بھی ملا تھا۔

ان کے تنقیدی مضامین کے دو مجموعے "نہاں ہیں" اور "تاثر کے تنقیدی مضامین" کے نام سے چھپ چکے ہیں۔ غالب کے کچھ اشعار کے مطالب "مطالعۂ غالب" کے عنوان سے شائع کیے تھے۔ انیس سے متعلق بھی ایک مجموعۂ مضامین "انیس کی مرثیہ نگاری" کے نام سے ہے۔ ان کی غزلیات کے چار مجموعے شائع ہوئے: اخترستان، بہارستان، بہاراں، نوبہاراں ایک جلد (عروسِ فطرت) میں نظمیں ہیں۔ لکھنوی ہوتے ہوئے بھی وہ میر کے عاشق تھے، انھوں نے اس کے کلیات کا ایک نمائندہ انتخاب بھی "مزامیر" کے نام سے کیا، جو دو حصوں میں چھپ چکا ہے۔ دوسری زبانوں کی نظموں کے تراجم اور مختارات کا ایک مجموعہ (رنگ بست) بھی ان سے یادگار ہے۔ بھگوت گیتا کا ترجمہ "نغمۂ خداوندی" کے نام سے کیا تھا۔ دو ڈرامے زنگاری بیگم (منظوم) اور ہلاکِ فریب بھی چھپ چکے ہیں۔ پہلا فرانسیسی زبان سے ماخوذ ہے۔ دوسرا پولستانی مصنف سگمنڈ کراسکی کے ڈرامے کا آزاد ترجمہ۔

غرض شعر و ادب اور علم و فن میں ان کی تحریریں وقیع اور پائدار حیثیت کی مالک اور ہماری ادبی تاریخ کا قابلِ قدر حصہ ہیں۔

**اخگر فیروزپوری، نند کشور**

پرانے لکھنے والے تھے۔ خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی سے اصلاح لی۔ پیشے کے لحاظ سے وکیل اور نوٹری پبلک تھے، لیکن اس کے علاوہ بہت کامیاب کاروباری آدمی بھی تھے۔ فیروزپور کا سنیما ہال، شملہ ٹاکیز انھیں کی ملکیت تھا۔ ۲۰ اپریل ۱۹۶۷ء کو فیروزپور میں انتقال کیا۔

**رفیق مارہروی، رفیق احمد**

احسن مارہروی مرحوم کے صاحبزادے ۲۴ مئی ۱۹۶۷ء کو شام کے ساڑھے آٹھ بجے بدایوں اسپتال میں انتقال ہوا۔ متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی سب سے پہلی کتاب "اسلام اور منظریہ شرافت" تھی۔ چونکہ احسن مرحوم داغ کے محبوب شاگردوں میں تھے، اس لیے ان کے خاندان میں داغ سے متعلق بہت مواد تھا۔ اسی کا ثمرہ رفیق مرحوم کی دو کتابیں "زبانِ داغ" اور "بزمِ داغ" تھیں۔ وہ داغ کی سوانح عمری بھی مرتب کر رہے تھے، خدا معلوم، یہ کس مرحلے

پر تھی۔ ان کی ایک اور کتاب ہندو وقف میں اردو“ اگرچہ اغلاط اور عدم توازن سے خالی نہیں، تاہم قابلِ قدر ہے۔ اپنے والد احسن مرحوم کے کلام کا انتخاب جلوۂ احسن کے عنوان سے شائع کیا تھا۔ اس کے شروع میں ان کی اچھی مبسوط سوانح عمری کا اضافہ کیا۔

وہ ساری عمر معمولی ملازم رہے۔ کنبہ بھی بڑا تھا۔ اس لیے کبھی فراغت کا منہ نہ دیکھا۔ دل کا عارضہ تھا۔ اسی میں بعمر ۶۵ سال انتقال کیا۔

شاہد احمد دہلوی

مترجم قرآن شمس العلما مولوی نذیر احمد دہلوی (ت ۱۹۱۲ء) کے پوتے اور واقعات دار الحکومت دہلی کے مولف مولوی بشیر الدین احمد (ت ۱۹۲۷ء) کے بیٹے شاہد احمد دہلوی کا ۲۷/۲۸ مئی ۱۹۶۷ء کی درمیانی شب میں پونے بارہ بجے بعارضۂ قلب کراچی میں انتقال ہوگیا۔ وہ ۲۲ مئی ۱۹۰۶ء کو اپنے خاندانی مکان دلی میں پیدا ہوئے تھے؛ گویا ۶۱ سال کی عمر پائی۔ خدا مغفرت کرے۔ ان کے والد مولوی بشیر احمد ان کے بچپن کے زمانے میں ریاست حیدرآباد (دکن) میں ملازم تھے، اس لیے شاہد صاحب کی ابتدائی تعلیم حیدرآباد میں ہوئی۔ اس کے بعد پہلے علی گڑھ اور پھر دلی آگئے۔ دسویں درجے کی سند انھوں نے عربک اسکول سے لی تھی۔ اس کے بعد لاہور جا کر فورمین کرسچین کالج میں داخلہ لیا۔ ارادہ ڈاکٹر بننے کا تھا لیکن ایف ایس سی کرنے کے بعد جب یہ میڈیکل کالج میں پہنچے، تو یہاں مردہ لاشوں کی چیر پھاڑ سے طبیعت اتنی مکدر ہوئی کہ یہ بھاگ نکلے اور دلی آکر سان سٹیفنس کالج سے انگریزی ادبیات میں بی اے (آنرز) کی سند لی اور بالآخر یہیں دلی یونیورسٹی سے فارسی ادبیات میں ایم اے کیا۔ ادب کے علاوہ انھیں موسیقی سے بھی گہرا شغف تھا۔ انھوں نے سولہ برس کی عمر سے مختلف گھرانوں کے نمائندہ گائیکوں کی خدمت میں رہ کر کلاسیکی موسیقی میں کامل درک حاصل کیا۔ اس سلسلے میں ان کی معلومات اتنی وسیع اور جزئیات پر دسترس اتنی ماہرانہ تھی کہ وہ اس موضوع پر مستند صاحبِ فن اور بالغ نظر مبصر کی حیثیت سے گفتگو کر سکتے تھے۔

مولوی نذیر احمد حیدرآباد میں صوبیدار رہے تھے اور مولوی بشیر الدین احمد تعلقدار اول۔ دونوں بزرگ اور دانشمند بزرگ تھے چنانچہ ان کے والد اچھا خاصا اثاثہ چھوڑ مرے تھے۔

تینوں بھائیوں کے لیے پچاس پچاس ہزار روپیہ نقد اور متعدد مکانات جن کے کرایے سے دو دو سو کی آمدنی الگ تھی، لہٰذا شاہد صاحب کو بسر اوقات کے لیے کسی ملازمت کی ضرورت نہیں تھی۔ خاندانی ماحول میں انھیں لکھنے پڑھنے کا شوق بچپن سے ہوگیا تھا۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد انھوں نے اپنے ایک دوست کے عزیز انصار ناصری کے مشورے سے "گویا مہ وشوں" سے ملاقات کی تقریب پیدا کرنے کے لیے جنوری ۱۹۳۰ء میں یہیں دلّی سے ماہنامہ ساقی جاری کیا، اور اسی کے ساتھ ساقی بک ڈپو بھی قائم کر دیا۔ اس ادارے کی طرف سے تقریباً دو سو کتابیں شائع ہوئیں۔ ساقی اندو کا بہت کامیاب پرچہ ثابت ہوا۔ اس کے ذریعے سے انھوں نے اردو علم و ادب کی بڑی وسیع خدمات سرانجام دیں۔ وہ ہمیشہ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی اور دامے درمے مدد کرتے رہے۔

۱۹۴۷ء میں وہ پاکستان چلے گئے، اور دس مہینے لاہور میں قیام کرنے کے بعد انھوں نے کراچی میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ یہاں انھوں نے اپنا ذاتی مکان خرید لیا اور ساقی بھی دوبارہ جاری کر دیا۔ لیکن زمانہ بہت ناموافق رہا، اسے جاری رکھنے کے لیے انھیں کیا کیا جتن نہیں کرنا پڑے! ان حوصلہ شکن حالات میں بھی وہ ہمت نہیں ہارے اور جس استقلال سے مجلّے کو چلاتے رہے یہ ان کا قابلِ تعریف و تقلید کارنامہ ہے۔ یہاں انھوں نے اُجرت پر مضمون لکھے، ریڈیو کی ملازمت کی، جہاں وہ "ایس احمد" کے نام سے موسیقی کے پروگرام کے نگران اور ہدایت کار تھے اور اس طرح جو کچھ کمایا، اسے ساقی کے تنور میں جھونکتے رہے۔

پاکستان میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ "پاکستان رائٹرز گلڈ" کی تاسیس تھی، جسے انھوں نے ۱۹۵۹ء کے اوائل میں سات اور ادیب دوستوں کے ساتھ مل کر قائم کیا۔ انھیں دلّی کی ٹکسالی زبان پر حیرت انگیز قدرت حاصل تھی۔ انھوں نے کم و بیش پچاس کتابیں ترجمہ و تالیف کیں۔ ان میں دلّی کی بپتا، گنجینۂ گوہر اور فاؤسٹ بہت مشہور رہیں۔

پارسال وہ بیمار ہو گئے، ان کی ٹانگ کا آپریشن ہوا، اور بالکل ٹھیک ہو گئے۔ اب وہ چلنے پھرنے لگے اور ان کی صحت بھی بتدریج عود کرنے لگی تھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مسلسل محنت اور کم و ہات کی یورش نے ان کی صحت کی جڑیں کھوکھلی کر دی تھیں۔ ۸ فروری

## وفیات

۱۹۶۷ء کو دل پر پہلا حملہ ہوا۔ پندرہ بیس دن ہسپتال میں رہے اور بظاہر تندرست ہو کر گھر آگئے۔ لیکن یہ سنبھالا ثابت ہوا۔ ۲ مئی کو وہ دن بھر اچھے رہے۔ شب میں کچھ بے چینی کا اظہار کیا، نیند بھی ٹھیک سے نہیں آئی۔ یکایک کھانسی کا دورہ پڑا۔ فوراً ڈاکٹر کو بلایا گیا، لیکن ان کے پہنچنے سے پہلے وہ جاں بحق ہو چکے تھے۔ ان کی وفات سے ایک اردو کا شیدائی، دلّی کی تہذیب اور وضعداری و شرافت کا نمونہ ہم سے جدا ہو گیا۔ حق مغفرت کرے۔

### فلک، لالہ لال چند

اس بزرگ اور قوم پرست شاعر کا ۲۶ مارچ ۱۹۶۷ء کو دلّی میں انتقال ہو گیا، وفات کے وقت عمر ۸۲ سال کے قریب تھی۔ انھوں نے قومی تحریک میں اپنی شعلہ نوائی سے بہت قابل قدر خدمات سر انجام دیں۔ ان کا ایک مصرع تو ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکا ہے؛
تو بھی بدل فلک کہ زمانہ بدل گیا۔ کلام کے مجموعے، جام فلک، پیام فلک، کلام فلک کسی زمانے میں چھپے تھے۔ اب نایاب ہیں۔ کلام پر منشی دوارکا پرشاد افق سے اصلاح لی۔

پرنٹر پبلشر ظل عباس عباسی نے کوہ نور پرنٹنگ پریس، لال کنواں میں چھپوا کر علمی مجلس ۱۴۲۹، چھتہ نواب صاحب، فراشخانہ، دہلی سے شائع کیا (ایڈیٹر: مالک رام)

Printed by Z. A. Abbasi at Kohinoor Printing Press Lal Kuan
and Published from ILMI-MAJLIS OFFICE,
1429, Chhatta Nawab Saheb, Farrash Khana, DELHI-6


طویل تحقیق
اور
طویل تجربات
کامیاب
ہمدرد مرہم
صافی

# معیار

## علمی مجلس دِلّی کا تماہی رسالہ



۳

۴

مرتب،
[illegible]

[illegible]

# تحریر

## علمی مجلس دلّی کا سہ ماہی رسالہ


سالانہ ۱۲ روپے

اس شمارہ کی قیمت ۷ روپے

مرتب

مالک رام

جلد ۱ ۱۹۶۷ء شمارہ ۳ و ۴


فہرست

## ضروری اعلان

— جیسا کہ گذشتہ شمارے میں لکھا گیا تھا، یہ نمبر ۳ و ۴ کا مشترکہ شمارہ ہے اور اسی کے ساتھ ہماری پہلی جلد مکمل ہوگئی۔ دوسری جلد کا پہلا شمارہ فروری ۱۹۶۷ء میں شائع ہوگا۔ انشاءاللہ

— جن احباب کا چندہ ختم ہوگیا ہے وہ براہِ کرم ۱۹۶۸ء کا چندہ جلد روانہ فرمائیں۔

(منیجر)

**تصحیح:-** صفحہ ۴۰۱ کی جگہ صفحہ ۴۱۱ اور صفحہ ۴۱۱ کی جگہ ۴۰۱ اور صفحہ ۵۰۴ کی جگہ ۵۰۵ اور صفحہ ۵۰۵ کی جگہ ۵۰۴ لگ گیا ہے۔ اس طرح دونوں مقامات کے صفحات مقدم مؤخر ہوگئے ہیں۔

سیّد مسعود حسن رضوی ادیب

# نواز اور شکنتلا ناٹک

[نواز (؟) اور اس کی شکنتلا ناٹک (؟) کے بارے میں لکھنے والوں نے جتنی غلط بیانیاں کی ہیں اتنی شاید کسی مصنف اور کسی کتاب کے بارے میں کبھی نہیں کی گئیں۔ اس مقالے میں پہلی مرتبہ اس مصنف اور اس کتاب سے متعلق صحیح اطلاعات پیش کی گئی ہیں۔ یہ مقالہ آج سے چار سال پیشتر جون ۱۹۶۳ء کے نقوش، لاہور میں شائع ہوا۔ مگر اس میں جو ہندی دوہے وغیرہ ناگری حرفوں میں ہیں ان میں کچھ غلطیاں ہوگئیں اور بعض ماخذوں کے حوالے درج ہونے سے رہ گیے۔ اب ان غلطیوں کی تصحیح کردی گئی ہے اور وہ حوالے درج کردیے گیے ہیں۔ اس کے علاوہ مطالب میں کہیں کہیں کچھ اضافہ کیا گیا ہے اور چند صفحے پھر سے لکھ کر اُن کے مضامین کی ترتیب بہتر کردی گئی ہے۔ ادیب]

اردو ڈرامے اور اسٹیج کے ابتدائی دَور کی تاریخ کے لیے میں مدّت دراز تک مواد فراہم کرتا رہا۔ نواز کی شکنتلا ناٹک کو بعض مصنفوں نے اردو کا پہلا ڈراما کہا تھا، اس لیے میں برسوں اس کی تلاش میں رہا اور ہناری کے عالموں اور پروفیسروں سے پوچھتا رہا کہ اس کتاب کا کوئی قلمی یا مطبوعہ نسخہ کہیں موجود ہے، لیکن سب نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ میں کسی چیز کے بارے میں صرف دوسروں کے بیانات پر قناعت نہیں کرتا بلکہ خود اس چیز تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں، لیکن جب اس کتاب کا کہیں پتا نہ لگا، تو دوسروں کے بیانوں ہی سے کتاب کی حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کی، مگر اس کوشش کا نتیجہ

یہ نکلا کہ شاید پریشاں خواب من از کثرتِ تعبیرہا؛ ذیل میں وہ بیان نقل کیے جاتے ہیں:

کاظم علی جوان:

"اس داستان کے لکھنے والے نے یوں لکھا ہے کہ فرخ سیر بادشاہ کے فدویوں میں سے مولا خان فدائی خان کے بیٹے نے جب ایک لڑائی ماری، تب حضور پُرنور سے اس کا خطاب عظیم خان ہوا۔ اسی ایام میں اس نے نواز کبیشور کو حکم کیا کہ سکونتلا ناٹک جو سنسکرت میں ہے، برج کی بولی میں کہہ۔ اُس کبیشور نے یہ کہانی کبت دُہرے میں کہی، جس کا ترجمہ یہ ہے:" (نواز کی شکنتلا کا اردو ترجمہ، دیباچہ)

مرزا علی لطف:

"کاظم علی جوان نے ۱۸۰۲ء میں شکنتلا کا قصہ اردو میں لکھا ہے۔ نواز کبیشر نے جو برج بھاکا میں شکنتلا کی کہانی لکھی، اس کا ترجمہ یہ ہے۔" (تذکرہ گلشن ہند دیباچہ: ۲)

محمد حسین آزاد:

"نواز نام ایک مصنف نے فرخ سیر کے عہد میں شکنتلا کا ترجمہ بھاشا میں لکھا:"

(آبِ حیات: ۷۹)

کریم الدین:

"جوان نے ایک کتاب مسمیٰ شکنتلا ناٹک پسندیدہ لکھی ہے۔ یہ قصہ اوّل میں زبان براج بھاکا میں تصنیف ہوا تھا لیکن وہ کالیداس کے طور پر نہیں ہے بلکہ مہابھارت کے طور پر:" (طبقات الشعرائے ہند ۲۱۴)

مولوی عبدالحی:

"جوان نے شکنتلا کا قصہ لکھا، جو برج بھاشا کی کتاب سے ماخوذ ہے:" (گلِ رعنا: ۲۷)

حافظ محمود شیرانی:

"عالمگیر ... کا لاڈلا فرزند محمد اعظم شاہ ہندی سے بے حد الفت رکھتا تھا۔ نواز ایک مسلمان شاعر نے اعظم شاہ کی خواہش سے ۱۷۰۰ء میں شکنتلا ناٹک لکھی:"

(پنجاب میں اردو طبع ثانی): ۱۶۲)

**رام بابو سکسینہ:**

"کالیداس کی اصل کتاب کا ترجمہ برج بھاشا میں ۱۷۱۶ء میں نواز کیشر نے مولی خان پسر خدائی خان سپہ سالار فرخ سیر کے حکم سے کیا تھا اور برج بھاشا سے اردو میں ترجمہ جوان نے کیا۔" (تاریخ ادب اردو (حصۂ نثر) : ۱۱)

**سید محمد:**

"نواز کا ترجمہ ہندی میں ہے جو فرخ سیر کے ایک فوجی سردار مولا خاں ولد خدائی خان کے ایما سے لکھا گیا۔ جوان نے اس کا ترجمہ کر کے اردو کو پہلی مرتبہ ڈراما سے روشناس کرایا۔" (ارباب نثر اردو (طبع اول) ۱۸۵۹ء-۱۸۶)

**پنڈت کیفی:**

۱۔ "میاں نواز دہلوی . . . نے فرخ سیر کے عہد میں اردو میں شکنتلا کا ترجمہ بطرز ناٹک کیا۔"
(ناٹک ساگر (دیباچہ) : ۷)

۲۔ "اردو کا اول ناٹک نواز نے لکھا۔" (ایضاً)

**عبدالسلام خورشید:**

"مغل حکمرانوں میں سب سے پہلے فرخ سیر نے ایک شخص نواز نامی کو حکم دیا کہ وہ کالیداس کے ڈرامے شکنتلا کو اردو کا جامہ پہنائے۔ اگرچہ یہ ترجمہ ہو گیا لیکن آج کل نایاب ہے۔"
(اردو ڈراما : ۷)

**بادشاہ حسین:**

"فارسی کے زیر اثر چند تماشے مخلوط فارسی اور پراکرت میں تیار ہوئے۔ اس قسم کا ایک تماشا نواز نامی ایک شخص نے شاہ فرخ سیر کے حکم سے تیار کیا تھا۔"
(اردو میں ڈرامانگاری : ۷۶)

**نور الٰہی و محمد عمر:**

۱۔ "کالیداس . . . کا ڈراما شکنتلا گلشنِ ادبیاتِ ہند کا سدا بہار پھول ہے . . . شاہ فرخ سیر کے عہد حکومت میں نواز نامی ایک شاعر نے اسے اردو کا لباس پہنایا۔ لیکن نواز کی

کاوش دست بُرد زمانہ کی نذر ہوئی اور اب نادرالوجود ہے۔" (ناٹک ساگر: ۲۳۹)
۲۔ "شاہ فرخ سیر کے حکم سے نواز نامی ایک شخص نے شکنتلا کو رائج الوقت اردو میں منتقل کیا لیکن اس کے مزید حالات پردۂ خفا میں پڑے ہیں۔" (ایضاً: ۳۵۴)

سید علی حیدر:

"شاہ زادہ محمد معظم بہادر شاہ . . . فارسی اور بھاشا دونوں کے شعرا کا بیحد قدر دان تھا . . . اس کے ایما پر نواز شاعر نے کالی داس کے شاہکار شکنتلا ناٹک کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا اور بعدہ اس کو بھاشا کا بھی جامہ پہنایا۔" (نقد ادب: ۲۴)

الیف، ای، کے (F.E.KEAY)

نواز ایک برہمن تھا جو پنا کے راجا چھتر سال کے دربار میں رہتا تھا۔ وہ ایک ڈراما شکنتلا اور بہت سے متفرق اشعار کا مصنف تھا۔" (تاریخ ادب ہندی (بزبان انگریزی): ۴۹)

نواز اور شکنتلا ناٹک کے بارے میں جن لوگوں کے بیانات اوپر درج کیے گئے ہیں، ان میں اوروں کا کیا بلکہ حافظ محمود خاں شیرانی کے سے محقق کے دو سطری بیان سے جو باتیں معلوم ہوتی ہیں یعنی (۱) شکنتلا کے مصنف کا نام نواز ہے (۲) اس کی کتاب طبع زاد ناٹک ہے (۳) وہ عالمگیر کے فرزند محمد اعظم شاہ کی خواہش سے لکھی گئی (۴) اس کا سال تصنیف ۱۰۶۸ھ ہے ان میں سے ایک بات بھی تحقیق پر مبنی نہیں ہے۔

مذکورۂ بالا بیانوں سے جو سوال پیدا ہوتے ہیں اور ان کے جو جواب نکلتے ہیں، وہ حسب ذیل ہیں:

سوال: نواز کون تھا؟

جواب: نواز ایک مسلمان شاعر تھا۔

۲۔ نواز ایک برہمن تھا۔

سوال: نواز کی شکنتلا ناٹک کی نوعیت کیا ہے؟

جواب: ۱۔ وہ شکنتلا کی طبع زاد کہانی ہے۔

۲۔ شکنتلا کا ترجمہ ہے۔

۳۔ کالیداس کی شکنتلا ناٹک کا ترجمہ ہے۔

۴۔ ترجمہ قصے کی شکل میں ہے۔
۵۔ ترجمہ ناٹک کی صورت میں ہے۔
۶۔ طبع زاد ناٹک ہے۔
۷۔ اردو کا پہلا ناٹک ہے۔

سوال: اس کی زبان کیا ہے؟
جواب: ۱: اس کی زبان برج بھاشا ہے۔
۲: اُردو ہے۔
۳: مخلوط فارسی اور پراکرت ہے۔
۴: فارسی ہے، جسے بعد کو بھاشا کا جامہ پہنا دیا گیا ہے۔

سوال: وہ کسی کے حکم یا فرمایش سے لکھی گئی؟
جواب: ۱: عالمگیر کے فرزند محمد اعظم شاہ کی فرمایش سے۔
۲: شاہ زادہ محمد معظم بہادر شاہ کے ایما سے۔
۳: فرخ سیر بادشاہ کے حکم سے۔
۴: مولیٰ خان ولد فدائی خان کے حکم سے۔
۵: مولا خان ولد خدائی خان کے ایما سے

سوال: مولا خان کون تھا؟
جواب: ۱: مولیٰ خان ولد فدائی/خدائی خان فرخ سیر کا فدوی تھا۔
۲: فوجی سردار تھا
۳: فرخ سیر کا سپہ سالار تھا۔
۴: اس کا خطاب عظیم خان تھا۔

سوال: یہ کتاب کب لکھی گئی؟
جواب: ۱: فرخ سیر کے عہدِ سلطنت میں۔
۲: ۱۶۸۰ء میں۔

۳ : ۱۷۱۶ء میں۔

ان حوالوں کی غلطیوں اور جواب دینے والوں کی غلط بیانیوں سے اگر بحث کی جائے تو وہ ایک بڑا تحقیقی کارنامہ سمجھا جائیگا۔ مگر میں دوسروں کی غلطیاں نکالنے اور ان کے بیانات کو غلط ثابت کرنے کے لیے دلیلیں پیش کرنے میں اپنا وقت ضائع نہیں کرتا۔ میرا اصول یہ ہے کہ اپنی تحقیق کے نتائج کو ایسے معتبر حوالوں اور مضبوط دلیلوں کے ساتھ پیش کر دیا جائے جن کی رد ممکن نہ ہو اور جن سے دوسروں کی غلطیاں خود بخود واضح ہو جائیں۔ اس اصول کے مطابق ذیل میں نواز اور اس کی شکنتلا کے بارے میں صحیح اطلاعات مختصراً درج کی جاتی ہیں :

(۱) نواز ہندی یعنی برج بھاشا کا شاعر تھا اور ہندی تلفظ کے موافق نواج تخلص کرتا تھا جیساکہ ذیل کے دوہوں کے قافیوں پر نظر ڈالنے سے ظاہر ہوگا :

वाजमषान नवाब को भावहि सुकवि समाज ।
ताते अति ही करि कृपा राख्यो सुकवि नवाज़ ॥

भली रीत दरबार की छत्रसाल महराज ।
जंह भगवत गीता पढ़ी तहं कवि पढ़त निवाज़ ॥

پہلا دوہا خود نواج کا ہے اور دوسرا اس کے ہم عصر ہندی شاعر بھگوت کا ہے۔

(۲) نواج کی سکنتلا (بہ سینِ جہملہ) ناٹک نہیں ہے، ایک منظوم قصہ ہے جو ہندی کی مختلف بحروں (کبت، دوہا، دھناکشری، چھپئے، ہری گیت، چوپائی، سوَیا، سورٹھا) میں بیان کیا گیا ہے۔ ناٹک کی کوئی خصوصیت اس میں موجود نہیں ہے خود نواج اس کو ناٹک نہیں، بلکہ کتھا یعنی قصّہ کہتا ہے۔ اس نے اپنی کتاب کو چار حصّوں میں تقسیم کرکے ہر حصّے کے آخر میں بتایا ہے کہ یہاں پر فلاں حصہ تمام ہوا۔ پہلے دوسرے اور چوتھے حصے کے خاتمے پر اپنی کتاب کو سکنتلا ناٹک کتھا، اور تیسرے حصّے کے خاتمے پر سکنتلا کتھا کہا ہے یعنی سکنتلا ناٹک کا قصہ یا سکنتلا کا قصّہ۔

شکنتلا (بہ شین معجمہ) کا قصہ کالی داس کی مشہورِ عالم شکنتلا ناٹک سے بہت پہلے مہابھارت، پدم پران، بھاگوت اور سری مد بھاگوت نام کی سنسکرت کتابوں میں بعض تفصیلات میں اختلاف کے ساتھ بیان ہو چکا تھا۔ نواج نے شکنتلا کے قصے کا کون سا حصہ کسی ماخذ سے لیا، یہ تو مجھے معلوم نہیں، مگر اتنا معلوم ہے کہ نواج کی شکنتلا کالی داس کی شکنتلا ناٹک کا ترجمہ نہیں ہے۔

(۳) نواج کی شکنتلا کی زبان کا نمونہ یہ ہے؛ وہ تمہید کے بعد اصل قصہ اس کبت سے شروع کرتا ہے:-

एक समै मुन नायक कौसिक कानन जाइ महातप कीनो
देह को दीनो कलेस महा मिटि भेसु गयो न परै कछु चीनो॥
यौं नित नेम किये हैं निवज निरंजन के पद में चितु दीनो।
साधि के जोग कौ आसन यौं इन्द्रासन इन्द्र को चाहत लीनो॥

(ایک سمے مُنی نایک کوسِک کانن جائی مہا تپ کینو!!
دیہہ کو دینو کلیس مہا مٹی بھیسُ گیو نہ پرے کچھ چینو!
یوں نت نیم کیئے ہیں نواج نرنجن کے پد میں چتو دینو
سادھی کے جوگ کے آسن یوں اندراسن اندر کو چاہت لینو)

کیا اس زبان کو ہندی اور برج بھاشا کے سوا کچھ اور بھی کہہ سکتے ہیں؟

(۴) نواج کون تھا؟ ہندی کے ایک تذکرے شیو سنگھ سروج میں نواج نام کے تین شاعروں کا ذکر ملتا ہے، ایک بلگرام کا رہنے والا جولاہا، ایک برہمن اور ایک قدیم برہمن اور نواج کا سالِ پیدائش سمبت ۱۷۳۹ بتایا گیا ہے۔ ہندی کے دوسرے تذکرے 'شر بندھو ونود' میں نواج کو تیواری کا نکبج برہمن لکھا گیا ہے اور نواج نام کے تین شخصوں کے وجود کا ذکر کیا گیا ہے۔ 'ہندی مخطوطات کا مختصر بیان' میں ہے کہ نواج سمبت ۱۷۳۷ میں اورنگ زیب کے بیٹے اعظم شاہ کی خدمت میں تھا۔ ایک دوسرے ذریعے سے

معلوم ہوتا ہے کہ نواج بندیل کھنڈ کا رہنے والا برہمن تھا اور سمبت ۱۸۲۰ کے قریب موجود تھا۔ آچاریہ رام چندر شکل نے اپنی تاریخ ادبیات ہندی' میں لکھا ہے کہ نواج انتربید کا رہنے والا، اورنگ زیب کے بیٹے اعظم شاہ کے پاس سمبت ۱۷۳۷ میں موجود تھا اور اسی سال اس نے شکنتلا ناٹک لکھی۔ اس کے علاوہ دو اور نواج تھے، جن میں سے ایک بھگونت رائے کھیچی کے یہاں رہتا تھا!

ہندی مصنفوں کی مندرجۂ بالا سبھی باتیں بے بنیاد معلوم ہوتی ہیں۔ نواج ہندی زبان کا لفظ نہیں ہے اور ہندی میں اس کے کچھ معنی نہیں ہیں۔ یہ فارسی لفظ نواز کا ہندی تلفظ ہے۔ فارسی میں بھی اسم کی حیثیت سے یہ لفظ کبھی تنہا استعمال نہیں ہوتا ہمیشہ کسی مرکب کا جزو ہوتا ہے۔ مثلاً غریب نواز، مہمان نواز، بندہ نواز۔ ہندی کے کئی ہندو شاعر اور وہ بھی برہمن ایک ایسے لفظ کو اپنا تخلص کیونکر قرار دیتے جس کا ہندی میں وجود نہیں اور جو ہندی میں کوئی معنی نہیں رکھتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہندی کا کوئی مسلمان شاعر جس کے نام میں نواز کا لفظ شامل تھا جیسے شاہ نواز، علی نواز، اس نے اپنے نام کے اس جز کو اپنا تخلص قرار دیا۔ اب وہ خواہ بلگرام کا جولاہا ہو، خواہ کہیں کا شاہزادہ بہرحال وہ مسلمان تھا۔ اس کے مسلمان ہونے کا ایک قرینہ اور بھی ہے۔ مدت ہوئی ایک بہت ذی علم ہندو بزرگ نے یہ قصہ بیان کیا تھا کہ ریاست پنا کے راجا چھتر سال کا درباری شاعر بھگوت رخصت لے کر اپنے وطن گیا، واپسی میں اس کو بہت دیر ہوگئی اور اس کی عدم موجودگی میں نواج نے اس کی جگہ لے لی جب بھگوت واپس آیا تو اس نے راجا کو مخاطب کر کے وہ دوہا پڑھا جو اوپر لکھا جا چکا ہے یعنی

भली रीत दरबार की छत्रसाल महराज ।
जंह भगवत गीता पढ़ी तहं कवि पढ़त निवाज ॥

ہشر بندھو ونود میں بھی یہ دوہا ذرا سے لفظی تغیرات کے ساتھ نقل ہوا ہے۔ اس دوہے کے دوسرے مصرعے میں دو لفظ بھگوت اور نواج ذو معنیین ہیں۔ بھگوت شاعر کا تخلص ہے اور

---

۱- ماخوذ از مقدمہ شکنتلا ناٹک (مطبوعہ انڈین پریس الٰہ آباد ۱۹۵۹ء)

بھگوت گیتا ہندوؤں کی ایک مقدس کتاب کا نام بھی جس کو گیتا بھی کہتے ہیں۔ اسی طرح، نواج شاعر کا تخلص بھی ہے اور لفظ نماز کی بگڑی ہوئی صورت بھی۔ اس مصرعے کا مطلب یہ ہے کہ جہاں بھگوت نام کا شاعر گیتا پڑھتا تھا، وہاں اب شاعر نماز پڑھتے ہیں۔ اس مصرعے میں نواج کے مسلمان ہونے کی طرف صاف اشارہ موجود ہے۔

نواج کی زیر بحث کتاب میں ایک چیز ایسی ضرور موجود ہے، جس سے یہ دھوکا ہو سکتا ہے کہ نواج ہندو تھا اور وہ کتاب کی ابتدا میں ایک کبت ہے، جس میں درگا دیوی سے عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن یہ ہندی شاعروں کے ایک عام رواج کی صرف پابندی ہے، نہ کہ شاعر کے حقیقی عقیدے کا اظہار

فارسی اور اردو میں ایسی کتابیں کثیر تعداد میں موجود ہیں جن کے ہندو مصنفوں نے صرف رواج کی پابندی میں خدا کی حمد، رسولؐ کی نعت اور آل و اصحابؓ رسول کی منقبت میں بڑا زور قلم صرف کیا ہے۔ لیکن اس بنا پر کسی نے انھیں مسلمان نہیں کہا۔ مثنوی گلزار نسیم کی ابتدا یوں ہوئی ہے۔

ہر شاخ میں ہے شگفتہ کاری ثمرہ ہے قلم کا حمد باری
کرتا ہے یہ دو زباں سے یکسر حمد حق و مدحت پیمبر[۲]
پانچ انگلیوں سے یہ حرف زن ہو یعنی کہ مطیع پنجتن ہے

ان شعروں کی بنا پر کسی نے مثنوی کے مصنف پنڈت دیا شنکر کو مسلمان نہیں سمجھا اسی طرح نواج کا وہ کبت اس کے ہندو ہونے کا ثبوت نہیں ہے۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ ایک نواج کے تین نواج کیونکر بن گئے۔ سکنتلا کا مصنف نواج مانا گیا؛ 'برہ ڈاولی' کا مصنف دوسرا نواج قرار دیا گیا، چند متفرق دوہے ہوا

مصنف تیسرا نواج ٹھہرایا گیا۔ لیکن ان تینوں کا مصنف ایک ہی نواج کیوں نہیں ہو سکتا؟ بظاہر اس میں کوئی دشواری نظر نہیں آتی۔

(۵) نواج کا سرپرست کون تھا؟ اس نے سکنتلا کا قصہ کس کی فرمائش سے لکھا؟ ان سوالوں کا جواب خود نواج کی زبان سے سنیے۔ کہتا ہے:

नवल फ़िदाई षान जो बड़ी मुसाले षान।
फ़रुकसेर को दै फ़ते भयो वो आजमषान॥

[ترجمہ: نیا فدائی خان جو طاقت والا محمد صالح خان ہے، فرخ سیر کو فتح دے کر وہ اعظم خان ہو گیا:]

اس دوہے کی شرح یہ ہے کہ مظفر حسین فدائی خانِ اوّل کے بیٹے محمد صالح خان فدائی خانِ ثانی نے معز الدین جہاندار شاہ اور فرخ سیر کی جنگ میں فرخ سیر کا ساتھ دیا جس نے فتح پانے کے بعد اس نئے فدائی خان کو اعظم خاں کا خطاب دیا۔

वाजमषान नबाब को भावहि सुकवि समाज।
ताते अति ही करि कृपा राख्यो सुकवि नवाज

(ترجمہ: نواب اعظم خان کو اچھے شاعروں کی صحبت پسند ہے۔ اسی لیے اچھے شاعر نواج کو بہت ہی مہربانی کر کے رکھا ہے:)

आजमषान नवाज को दीनो यह फरमाइ।
संकुनला नाटक हमें भाषा देहु बनाइ॥

[ترجمہ: اعظم خان نے نواج سے یہ فرمائش کی کہ شکنتلا ناٹک ہمیں بھاکا میں بنا دو:]

نواج کے ایک کبت کا ایک ٹکڑا اور سن لیجیے:

फ़रुकसेर की तरफ़ होइ फ़ते कीनो हो तो।
मवज़दीन जो ग़नीम सो उतारियो॥

یہاں نواج معز الدین کو غنیم کے لفظ سے یاد کرتا ہے اور اعظم خان کا فرخ سیر کی طرف

ہو کر جنگ فتح کرنا بیان کرتا ہے ![2]
نواج کی سکنتلا کا نیا ایڈیشن نرمدلیشیور چترویدی نے مرتب کیا ہے۔ وہ کتاب کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ نواج کی شکنتلا ناٹک اعظم خان کی فرمائش پر لکھی گئی تھی۔ ناموں کی مشابہت کی بنا پر اس کو اعظم شاہ مان لیا گیا لیکن نواج کا سرپرست اعظم خان کوکہ اعظم شاہ سے مختلف شخص ہے۔ اس بیان میں اعظم خان کے ساتھ کوکہ کا لفظ شامل کر کے ایک غلط فہمی کی بنیاد رکھ دی گئی ہے۔ اعظم خان کوکہ کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے کہ وہ اورنگ زیب کا دودھ شریک بھائی تھا۔ اس کا اصلی نام مظفر حسین تھا۔ وہ آگے چل کر فدائی خان کوکہ کے نام سے مشہور ہوا۔ اس نے ۹ ربیع الاول ۱۰۸۹ھ کو انتقال کیا۔ اس کے بیٹے محمد صالح خان کو بھی فدائی خان کا خطاب ملا۔ یہ سب صحیح ہے مگر یہ صحیح نہیں ہے کہ اعظم خان کوکہ نواج کا سرپرست تھا حقیقت یہ ہے کہ نواج کا سرپرست اعظم خان کوکہ کا بیٹا محمد صالح خان تھا جسے فرخ سیر نے اعظم خان خطاب دیا تھا۔ مظفر حسین اور اس کے بیٹے محمد صالح خان دونوں کو پہلے فدائی خان اور پھر اعظم خان خطاب ملا تھا۔ مگر مظفر حسین اورنگ زیب کا کوکہ ہونے کی بنا پر اعظم خان کوکہ کے نام سے مشہور رہا۔ ان باپ بیٹوں کا مختصر تعارف ضروری معلوم ہوتا ہے۔
میر ابو المعالی ایران کے شہر خواف کے رہنے والے ایک صالح اور متقی درویش منش سید تھے۔ انکی زوجہ محترمہ نے شاہزادہ اورنگ زیب کو دودھ پلایا تھا۔ ان کے دو بیٹے تھے: میر مظفر حسین اور میر ملک حسین۔ مظفر حسین کی نشوونما شہنشاہ شاہجہان کے حضور میں ہوئی اور ملک حسین بچپن سے شاہزادہ اورنگ زیب کی خدمت میں رہا[3]۔ دونوں بھائیوں نے بڑے بڑے کارنمایاں انجام دیے اور بڑے بڑے معرکے سر کیے۔
میر مظفر حسین کو شاہجہان نے اپنے جلوس کے تیسویں سال ۱۰۶۷ھ میں فدائی خان خطاب دیا[4]۔

---

۲: نواج نے برج بھاشا کے عوامی تلفظ کے مطابق فدائی خان کو پھدائی کھان، محمد صالح خان کو مسالے کھان، فرخ سیر کو پھرک سیر، اعظم خان کو آجم کھان، معزالدین کو موج دین لکھا ہے۔

۳ مآثر الامراء، ۱: ۷۹۸ ۴ ۔ مآثر الامراء، ۱: ۲۴۷

عالمگیر نے اپنے جلوس کے سترھویں سال اس کو اعظم خان کوکہ کا خطاب دیا۔[۵] جلوسِ عالمگیر کے اکیسویں سال ۱۰۸۹ھ میں اس نے انتقال کیا۔[۶] اعظم خان کوکہ کے انتقال کے سترہ برس بعد عالمگیر نے اپنے جلوس کے اڑتیسویں سال اس کے بڑے بیٹے محمد صالح خان کو فدائی خان کا خطاب دیا۔[۷] اور نواز کے ایک دوہے سے جو اوپر نقل کیا گیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ فرخ سیر نے اپنے جلوس کے پہلے سال (۱۱۲۴ھ) میں محمد صالح خان کو اعظم خان خطاب دیا تھا:

اس سے معلوم ہوا کہ باپ اور بیٹے دونوں کو پہلے فدائی خان اور پھر اعظم خان کا خطاب ملا تھا لیکن پہلا اعظم خان جو اورنگ زیب کا کوکہ تھا، اس کا انتقال فرخ سیر کی تخت نشینی سے کوئی ۳۵ سال پہلے ہو چکا تھا۔ اس لیے نواج کی سکنتلا جو فرخ سیر کے عہد میں لکھی گئی تھی اسکو اعظم خان کوکہ کی فرمائش کا نتیجہ سمجھنا درست نہیں۔ حقیقت میں وہ اعظم خان کوکہ کے بیٹے اعظم خان کی تحریک سے وجود میں آئی۔

نواج اور اس کی سکنتلا کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کرنے کے بعد ذرا ہمارے مصنفوں کی شانِ تحقیق پر نظر کیجیے۔ اگلے مصنفوں نے اس بارے میں جو ناکافی اطلاع بہم پہنچائی تھی، اس میں کچھ باتیں صحیح اور کچھ صحت سے قریب تھیں۔ ان کے بعد آنے والے مصنفوں سے توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ تحقیق سے کام لے کر ہماری معلومات میں اضافہ کریں گے۔ مگر انھوں نے غلط سلط باتیں لکھ کر اگلے مصنفوں کی بہم پہنچائی ہوئی اطلاع کو بھی مشکوک بنا دیا اور غلط بیانیوں کی تہ پر تہ چڑھاتے چلے گئے۔ آج کل کے تحقیقی کاموں میں یہی صورت بیشتر نظر آتی ہے۔ ایک نئے محقق نے اپنی ایک غیر مطبوعہ کتاب میں تخیلی بنیادوں پر دلیلوں کا ایک قلعہ کھڑا کر دیا ہے اور آخر کار بخیال خود یہ ثابت کر دیا ہے کہ نوانکی شکنتلا ناٹک قصہ نہیں ڈراما ہے اور اس کی زبان برج بھاشا نہیں، اردو ہے۔ امید ہے کہ اس مضمون کو پڑھ کر وہ محسوس کریں گے کہ تحقیق کے معاملے میں خیالی اور قیاسی دلیلوں سے کوئی قطعی نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا۔

● ●

۵۔ مآثر الامرا، ۱: ۲۵۱ ۶۔ ایضاً۔ ۷۔ ایضاً، ۳: ۳۳-۳۴

قاضی عبدالودود

# دیوانِ ساحر کاکوروی

اس مقالے کی علتِ غائی ساحر کاکوروی نہیں، ان کے دیوان کے اُس نسخے کا تعارف کرانا ہے جو کتب خانۂ خدا بخش پٹنہ میں ہے اور جس کا اب تک اس کی کسی مطبوعہ فہرست میں ذکر نہیں آیا:

یہ نسخہ ۲۷ اوراق کا ہے، آغازِ دیوان ورق ۱ (الف) سے ہوتا ہے اور پہلا شعر وہی ہے جس سے نسخۂ دہلی کی ابتدا ہوتی ہے۔ ن کا آخری شعر یہ ہے:

برتن غبارِ کویش آلودہ پس از مرگ ساحر بجسمِ عُریاں شاید کفن نداری

اس کے بعد عبارتِ ذیل ہے: "تمت تمام شد دیوان شیخ غلام مینا متخلص بہ ساحر از دستِ حقیر شاہ علی بفرمایش شفیقی محمد عنایت حسین قلمی شد۔ فقط" ورق ۲۷ (الف) اس بنا پر کہ تخلص کے بعد "مرحوم" یا اس قبیل کا کوئی دوسرا لفظ نہیں، کہا جا سکتا ہے کہ ن کی کتابت ساحر کے دورانِ حیات میں ہوئی۔ کاتب اور صاحبِ فرمایش مجہول الاحوال ہیں، ن کے مطالعے سے کاتب کی غلط نویسی ظاہر ہے۔

ڈاکٹر سید امیر حسن عابدی کے مقالے "ساحر کاکوروی" میں ساحر کی وہ غزلیں نقل ہوئی ہیں جو فغانی، کلیم، صائب اور حزیں کی غزلوں کے جواب میں کہی گئی تھیں، یہ غزلیں ن میں موجود ہیں۔ ج میں مرقوم ہے کہ ندیمؔ مصحفی اور واقف اور مظہر۔۔ کے تتبع میں غزلیں ملتی ہیں، کسی نوری تخلص شاعر کی غزلوں سے متاثر ہوکر بھی دو غزلیں کہی ہیں، یہ سب غزلیں ن میں ہیں، ان کے مقطع درج ذیل ہیں:

---

ہ ۔ ن ۔ ند ۔ ح ۔ ع ۔

جواب آن غزل است اینکه مصحفی فرمود — بلای جانِ منست اینکه در کمین من ست (۳۲)
رفتن از خویشتن بریں مصرعِ واقف — نو بہار است کز و بوے جنوں میاید (۳۰)
تا خن (ناخنم؟) زد بجگر مصرعِ مظہر ساحر — مژہ جاروب کشِ کوچہ مژگان تو بود (۴۰)
مذاقِ جان شدہ شیریں ز مصرعِ نوری — کہ از تصورِ آں آب در دہان آید (۴۵)
ساحر ز طرزِ مصرعِ نوری در آتشم — امروز خوش بر آمدۂ آفتابِ من (۶۴)

ع کے کل اشعار جو نثرِ ساحر میں شامل ہیں، ن سے غیر حاضر ہیں؛ اشعارِ ذیل بھی جو ظاہرا غزل کے ہیں اور ع میں نہ یا کسی تذکرے سے منقول ہیں، ن میں نہیں ص ۱۳۸ جدا الخ، نوشتہ الخ، از نگاہ الخ؛ بچہ تقصیر الخ؛ دریں بہار الخ، دیشب الخ؛ بے حجابانہ الخ۔ ریاض الفصحا مصنفہ مصحفی (زمانہ تصنیف ۱۲۲۱ تا ۱۲۳۱ھ) میں ساحر کے بہت سے اشعار ہیں؛ میں نے اُن میں سے چند کو ن میں تلاش کیا، کسی کو پایا، کسی کو نہ پایا۔ اس تذکرے کے اشعار ذیل ن میں نہیں ہیں:

جواب آن غزلست اینکہ گفتہ است قتیل — نہ دشمنی ست سرِ نعشم نہ آشنائی ہست
ایں آں غزلِ دلکش نوریست کہ فرمود — آں نیست کہ از عذرِ ستم شاد نگردیم
از غیرتِ نوای نے کلکِ ہندیم — آتش و مانِ خاکِ صفاہان گداختند

ن کے کچھ اشعار درجِ ذیل ہیں:

این است اگر سوزنی خامۂ ساحر — از شرمِ حریری نکند کلکِ دبیری (۷۰)
مرا معلوم شد از شیوۂ نالیدنِ ساحر — کہ فریادِ حزیں در کوہ آہن میکند کاری (۶۹)
شبِ فراقِ تو از نالۂ حزینِ ساحر — شکست در دلِ چرخِ ستیزہ کار خدنگ (۵۳)
ایں آں غزلِ شوخِ حزین است کہ فرمود — ایں نامۂ سربستہ بدلدار فرستم (۶۰)
ساحر بپرس شرحِ گدازِ دلِ حزیں — پیش از ظہورِ جلوۂ جانانہ سوختم (۶۱)

---

۴ = یہ شعر نہیں، مگر اس زمین میں غزل ن میں ہے۔ ۵۔ ن میں ایک دوسرا مقطع ہے۔
۷۔ ساحر اضافۂ قیاسی، ۸۔ ن میں ردیف سوختم، خیال آتا ہے کہ کلیاتِ حزیں میں اس کی جگہ "سوختیم" ہے۔

ساحر بچمن مصرعِ رنگینِ حزیں خواند — از غنچہ صبا دم نزند گرد ہن اینست (۱۱)
جواب آں غزلِ شوخ ساحراست کگفت — سمندِ ناز ترا چشم من رکاب گرفت (۱۹)
نشد کہ در دلِ صیاد واکند راہی — و بال جاں شدہ مارا صفیر کوتاہی (۷۰)
نہ ہمدمی، نہ رفیقی، نہ پائے رفتاری — نشستہ ایم غریبانہ در گذرگاہی (۶۹)
چراغِ انجمنِ غیر تاکجا باشی — بجانکِ مرقدِ من ہم گذرکنی گاہی
چشمِ شوخِ تو بماداشت نگاہی گاہی — آں ہم از بیمِ رقیباں سرِ راہی گاہی (۶۸)
ساقی آتشیں شفا جام پُر از شراب کن — آئینہ پیالہ را ساغرِ آفتاب کن (۶۵)
ساحر غزلِ گرمِ حزیں بسکہ دلم سوخت — چوں شمع بلب سوختہ آمد نفسِ ما (۴)
کہیں کہیں نسخۂ بدل بھی ہے، شعر ہے:
نیرنگِ گلستانِ جہاں دیدنی نبود — بر خاک فرش بوقلموں چیدنی نبود (۲۷)
مصرعِ آخر کا نسخۂ بدل ' ایں گلشنِ خزاں زدہ گل چیدنی نبود '

••

---

۹ - اس زمین کی کوئی دوسری غزل ن میں نہیں -

---

تذکرہ

# "گلشن ہند"

مرتب

ڈاکٹر مختار الدین احمد

علمی
مجلس
دِلّی

مجلد ۵ روپے

گیان چند

# اوزانِ رُباعی میں اضافے

ناصر شہزاد کا ایک غزل نما گیت ملاحظہ کیجیے:

| | |
|---|---|
| ۱۔ چاندنی رات ہیں آلھا اودل گائیں | ۲۔ میرے گاؤں کی سُندر کنیائیں |
| ۳۔ گوری کچھ تو بتا! کس کی چاہت ہیں | ۴۔ تیری یہ نٹ کھٹ انکھیاں بھیر بھرائیں |
| ۵۔ ہیں، کھلتی رُت، شام بسنتی سائے | ۶۔ تیرے نگر کا رستہ، مست ہوائیں |
| ۷۔ سن ری سنی ساوتری! تیرے کارن | ۸۔ بستی بستی ہم پاگل کہلائیں |
| ۹۔ شاید من جائے وہ روٹھی ناری | ۱۰۔ چل اے دل! معبد میں دیپ جلائیں |
| ۱۱۔ ٹیلے کے اس پار، ندی کے تٹ پر | ۱۲۔ سانجھ بھئے، دو پریمی ملنے جائیں |
| ۱۳۔ ناصرا آ اس چندر وتی کی خاطر | ۱۴۔ باغ سے بیلے کے گجرے لے آئیں |

ہر مصرع موزوں اور مترنّم ہے۔ چودہ کے چودہ مصرعے پڑھنے میں صریحاً برابر معلوم ہوتے ہیں۔ اس غزل کی بحر کیا ہے؟ ذیل کے چھ مصرعے رباعی کی بحر میں تقطیع کیے جاسکتے ہیں:

۲۔ میرے گاؤں کی سندر کنیائیں
۸۔ بستی بستی ہم پاگل کہلائیں
۹۔ شاید من جائے، وہ روٹھی ناری!
} مفعولن مفعولن مفعولن فع

۵۔ ہیں، کھلتی رت، شام بسنتی سائے
۱۱۔ ٹیلے کے اُس پار، ندی کے تٹ پر
۱۳۔ ناصرا آ اس چندر وتی خاطر
} مفعولن مفعول، مفاعیلن فع۔

بقیہ آٹھ مصرع کس وزن میں ہیں، اردو عروض کے پاس اس کا جواب نہیں، اردو کی کسی بحر میں ان کی سمائی نہیں ہے۔ کیا یہ پڑھنے میں ناموزوں معلوم ہوتے ہیں، نہیں کیا اس

گیت کا ہر مصرع ایک دوسرے کے مساوی الوزن نہیں معلوم ہوتا۔ ضرور معلوم ہوتا ہے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارا علم عروض ناقص ہے۔ رباعی کے ۲۴ اوزان کے علاوہ کچھ اور اوزان بھی ہیں، جو طول میں ان کے برابر اور آہنگ میں ان کے مماثل ہیں، جن کے ساتھ ان کا اجتماع جائز ہونا چاہیئے۔ استاد رودکی یا یعقوب بن لیث کے مصاحبوں یا خواجہ امام حسن قطان جس نے بھی رباعی کے ۲۴ اوزان دریافت کرکے مدون کئے ان سے کسی قدر چوک ہو گئی۔ ان کی نظر ان اوزان کے تمام ہم صفیروں کی گرفت نہ کر سکی۔

عرصہ ہوا، عظمت اللہ خاں نے محسوس کیا تھا کہ رباعی کے اوزان کو ۲۴ تک محدود کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ انھوں نے ہندی عروض سے رباعی کے وزن کی تقطیع کی، تو معلوم ہوا کہ اس میں بیس ماترائیں ہوتی ہیں، رباعی کے جو اوزان فاع یا فعول پر ختم ہوتے ہیں ان کا آخری حرف زائد شمار کرنا چاہیئے، ورنہ ان اوزان میں ۲۱ ماترائیں ہو جائینگی۔ مختصراً یہ سمجھ لیجئے کہ مصرع میں جو حرف گرانا ہوتے ہیں، انھیں گرانے کے بعد جتنے حرف بچتے ہیں، اتنی ہی ماترائیں ہوتی ہیں۔ طویل اور خفیف حروف علت کی مختلف ترتیبوں سے مختلف اوزان بنتے ہیں۔ ہندی عروض کی کتابوں سے عظمت اللہ خاں کو معلوم ہوا کہ بیس ماتراؤں کو طرح طرح سے ترتیب دیا جائے، تو کُل ملاکر ۴۶ ۱۰۹ وزن برآمد ہونگے۔ یہ ان کی عروض سے ناواقفیت کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے ان سب کو رباعی کے لئے جائز قرار دے دیا۔ لکھتے ہیں:

> "لطف یہ ہے کہ بجائے چوبیس کے بحروں کی تعداد دس ہزار نو چھیالیس تک پہنچ جاتی ہے۔ اس تعداد سے شعرا کو گھبرانا نہیں چاہیئے اس لئے کہ وزن رباعی کی ان بحروں کی فہرست تیار کرنی ضروری نہیں ہے۔ ماترا اصول سے صرف شاعر کو یہ دیکھ لینا ہوگا کہ ہر مصرع میں بیس ماترائیں ہیں یا نہیں۔ اگر بیس ماترائیں ہوئیں تو پھر شاعر کو اس جھمیلے میں پڑنے کی حاجت نہیں کہ لکھ اور

---

۲۰۔ سریلے بول (دیباچہ)، ۸۰ - ۸۸ :

گرو (خفیف اور طویل حروف علت) کی ترتیب کیا ہے "

ذیل کے فرضی اوزان اور دو نثری جملے بیس ماتراؤں کے ہیں :

۱۔ متفاعلن فعول مفاعلن فعل

۲۔ مستفعلن مفاعلتن فاعلات

۳۔ مفاعیل فعلات مفعولاتُ فع

۴۔ یہاں واضح کر دینا ضروری ہے

۵۔ ان تجویزوں کا تجزیہ کیجئے

کیا یہ کسی رباعی یا نظم کے مصرعے ہو سکتے ہیں؟ صرف یہ کہہ دینا کہ بیس ماترائیں گن لیجئے بس رباعی کا وزن ہو گیا۔ یہ بہت غیر محتاط بیان ہے :

اوپر کے بیان میں انھوں نے کھلی چھٹی دے دی تھی کہ رباعی گو کو لگھ اور گرو کی ترتیب کے جھمیلے میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ آگے چل کر انھیں احساس ہوا کہ ان اَنگنت اوزان میں سے انتخاب کی ضرورت ہے۔ لیکن اس انتخاب کا کوئی اصول، کوئی معیار ان کی گرفت میں نہ آسکا، اس لئے وہ یہ کہہ کر رہ گئے :

"رہا یہ سوال کہ شاعر نے اپنی رباعی کے مصرعوں میں لگھ اور گرو کی ترتیب یعنی دوسرے الفاظ میں یہ اس وزن (چھند) کی جو جو قسمیں (بحریں) اختیار کی ہیں، وہ سُریلی ہیں یا نہیں، اس کا تصفیہ شاعر کا کان ہی کر سکتا ہے۔ اگر اس کی پسند کی ہوئی بحریں بلحاظ ترنم دلکش نہ ہونگی تو اس کی رباعی مقبول نہ ہوگی "

اگر شاعر کے کان ہی پر فیصلہ چھوڑنا ہے، تو بیس ماتراؤں کے جھمیلے کی بھی کیا ضرورت ہے؟ اردو کے نوّے فی صد رباعی گو شاعر نہ رباعی کی ۲۴ بحروں سے واقف ہیں، نہ ماترائیں ہی گنتے ہیں لیکن ان کی رباعی ہوتی صحیح وزن میں ہے اس سے قطع نظر سُریلی ہونے کی شرط کافی نہیں، ذیل کے چار اوزان دیکھئے :

---

۱۔ ایضاً :

## اوزان رباعی میں اضافے

۱۔ فعولن فعولن فعولن فعولن

۲۔ فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن

۳۔ فاعلاتن فاعلاتن فاعلات

۴۔ مفاعیلن مفاعیلن مفاعیل

ان میں سے ہر ایک وزن ۲۰ ماتراؤں کا ہے اور ان کے سریلے پن میں بھی کوئی شبہ نہیں ہے اس کے باوجود نہ ان وزنوں میں رباعی کہی جاسکتی ہے، نہ ایک رباعی میں ان کا اجتماع پسند کیا جا سکتا ہے۔ غرض رباعی کے ۲۴ اوزان اگر تفریط ہیں، تو عظمت اللہ کے ۴۶ + ۱۰۲ افراط؛ حقیقت کہیں ان کے درمیان ہے:

عروض بحث میں اور آگے جانے سے پہلے میں اپنی ایک مشکل پیش کرنا چاہتا ہوں عروض کے ذیل کے ارکان دیکھئے:

فعلن ۔ فعلن

فعل ۔ فعل

عروض کی کوئی کتاب اٹھا کر دیکھئے، ان کے امتیاز کے لیے بار بار بہ تحریک عین' (یا عین مکسور) اور بسکون عین' لکھا ملتا ہے اس کا بار بار لکھنا بڑا طویل اور اکتا دینے والا طریقہ ہے لیکن یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ کاتب یا ناقل پابندی اور صحت سے اعراب لگائیگا ہمیں عروض کی کتابوں میں ایسے مقامات ملتے ہیں جہاں ان کی نوعیت نہ اعراب سے واضح کی جاتی ہے نہ الفاظ سے، محض فعلن یا فعل لکھا ہوتا ہے۔ ایک ماہر عروض ہی پہچان سکتا ہے کہ ان ارکان میں 'ع' متحرک ہے یا ساکن۔ اس مسئلے کا کوئی حل ہونا چاہئے۔ ادھر میں نے عروض سے متعلق چند مضامین لکھے ہیں اور ان میں یہ تجویز پیش کی ہے کہ فعلن اور فعل کو تحریک عین کے لئے مخصوص کر دیا جائے، اور فعلن بسکون عین کی جگہ فاعل، اور فعل بسکون عین کی جگہ فاع استعمال کیا جائے۔ فاع فاعلن میں 'ع' کا تلفظ بدقت ہوتا تھا۔ اگر ہم تلفظ کی بنیادی اہمیت تسلیم کر کے املا کی صحت کو قربان کر دیں، تو ساکن 'ع' کی جگہ یائے مجہول استعمال کر سکتے ہیں میں اس مضمون میں سہولت کے پیش نظر فعلن بسکون عین کو فیلن (تلفظ فے لن) اور فعل

بسکون عین کو فیل لکھونگا۔ جو اصحاب صحت اور پابندی کے ساتھ اعراب لگا سکتے ہیں اور جنھیں یقین ہے کہ ان کی تحریر کی اشاعت کے موقع پر کاتب صحیح اعراب لگائیگا، وہ بخوشی عربی املا کی پابندی کریں، مجھے تو سہل طریقہ اپنانے دیجیے وہ ہزار جہل آمیز ہی:

یہ جاننے کے لئے کہ رباعی کے مروجہ اوزان کے ساتھ اور کتنے اوزان کا اجتماع ہوسکتا ہے، ہمیں بحر رباعی کی ساخت کو دیکھنا ہوگا۔ موجودہ اوزان اس اصول پر بنی ہیں:

سبب پے سبب است و وتد پے وتد است

عروض میں لفظ کے کئی اجزا کئے گئے ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں:

سبب خفیف: دو حرفی جزو جس کا پہلا حرف متحرک اور دوسرا ساکن ہو جیسے 'اب'

وتد مجموع: تین حرفی جزو جس کے پہلے دو حرف متحرک ہوں اور آخری ساکن جیسے 'نظر'

وتد مفروق: تین حرفی جزو جس کا پہلا اور تیسرا حرف متحرک ہوں اور دوسرا ساکن۔

یہ دراصل عربی اور سنسکرت کی چیز ہے اردو اور فارسی میں کوئی لفظ متحرک نہیں ہوتا، الا عطف و اضافت کی شکل میں مثلاً عکس جام۔ باغ و راغ یعنی پہلے جزو الآخر کا تیسرا لفظ۔ سنسکرت میں رام، وید، متر کا آخری حرف متحرک ہے۔ ہندی میں بھی بندو، اَرَوِندو، ہانی وغیرہ کے آخر میں خفیف حرف علت ہے جس کی وجہ سے یہ وتد مفروق کی مثالیں ہیں:

ہمارے عروضیوں نے عربی عروض کو جوں کا توں اردو پر لاد دیا، اردو کے مذاق کے مطابق اس میں ایک حرف کی تبدیلی نہ کی۔ عروض میں ایسا کوئی وتد نہیں ہے جس کا پہلا حرف متحرک ہو اور بعد کے دو ساکن ہوں مثلاً ہار، پان۔ الفاظ کی یہ ساخت اردو فارسی میں بہت عام ہے چونکہ عروض کا اصول یہ ہے کہ کسی لفظ میں ایک ساکن کے بعد دوسرا ساکن آئے تو دوسرے ساکن کو متحرک کر لیا جاتا ہے اس لئے صاحب بحر الفصاحت[3] کی رائے میں ہم ہار، پان جیسے الفاظ کو وتد مفروق ہی کی ذیل میں رکھ سکتے ہیں۔ اس طرح

---

۳۔ بحر الفصاحت: ۱۰۷

وتد دو قسم کے ہوئے : فعل اور فیل ( فاع ) کے وزن پر :
اب رباعی کا اصول یاد کیجئے۔ رباعی کے ہر وزن میں کسی رکن کے آخر میں سبب یا وتد میں سے جو کچھ ہوتا ہے، آئندہ رکن کی ابتدا میں بھی وہی ہوتا ہے۔ دو وزن ملاحظہ ہوں :

۱۔ مفعول ،مفاعلن مفاعیل فعول

۲۔ مفعول ،مفاعلن مفاعیلن فاع

پہلے وزن میں مفاعیل کے آخر میں وتد ہے ۔ فعول کیا ہے؟ وتد ہرگز نہیں۔ یہ تو چار حرفی لفظ ہے جب کہ وتد سہ حرفی ہوتا ہے ۔ دوسرے وزن میں مفاعیلن کے آخر میں سبب ہے اس کے بعد فاع ہے جو سبب نہیں، وہ اصول کہاں گیا! سچ یہ ہے کہ فعول یا فاع پر ختم ہونے والے بارہ اوزان پر اس اصول کا اطلاق نہیں ہوتا ۔[۴۴]

ہندی میں ۱۶ صرفی وزن چوپائی میں بھی بالکل یہی اصول کارفرما ہے۔ دو ماتراؤں کے جزو لایا جاتا ہے تین ماتراؤں کا جزو فعل ہوگا یا فیل یعنی وتد، دو ماتراؤں کا جزو سبب خفیف ہوگا، اگر مصرع میں تین ماتراؤں کے اجزا کا جوڑا آئے، تو استثنائی صورتوں کے علاوہ ان کے پہلے یا بعد دو ماتراؤں کا جزو ہوگا۔ اس طرح ذیل کے مجموعے پیدا ہو سکتے ہیں :

فعل فعل فع یعنی فعل فعولن

فعل فیل فع یعنی فعل فاعلن ( مفاعیل فع )

فعل فع فعل یعنی فعل فاعلن

فع فعل فعل یعنی فاعلن فعل

فیل فیل فع یعنی فیل فاعلن ( فاعلن فعل )

فیل فع فعل یعنی فیل فاعلن ( فاعلن فعل )

---

۴۴۔ اردو میں عروضی کتابوں کے مرتب آنکھ بند کر کے عربی کی تقلید کرتے ہیں نظم طباطبائی کے سوا کسی کو احساس نہیں ہوا کہ سبب و وتد کی موجودہ تقسیم جامع نہیں۔ اس میں فعول کے وزن کے الفاظ کو شمار میں لایا ہی نہیں گیا۔ ملاحظہ ہو شرح دیوان غالب : ۲۶۴

فیل فعل فع یعنی فیل فعولن

فع فیل فعل یعنی فیلن فعلن

ان کے ساتھ فعلن فعلن ۔ فعلن فیلن اور فیلن فیلن کو بھی رکھ لیجیے، تو آٹھ ماتراؤں کے ذیل کے دو رکنی جوڑے حاصل ہوتے ہیں، جن میں ہموزن ماننے میں کوئی قباحت نہیں:

فعلن فعلن ۔ فعلن فیلن ۔ فعلن فیلن فیلن ۔ فعل فعولن ۔ فعل

فاعلن ۔ فیل فعولن ۔ فیل ۔ فاعلن ۔

اردو میں بحرِ متقارب اثرم و اثلم اور متدارک مجنون اور مقطوع کی مثمن اور شانزدہ رکنی شکلوں میں روزِ اوّل سے آج تک شعرا نے ان آٹھ حرفی ارکان کو مساوی اور متبادل مانا ہے، گو عروض نے اس زندہ حقیقت کی طرف سے چشم پوشی کی۔ میر، سودا، نظیر، حالی، سیماب، یگانہ، فراق، سردار جعفری یا کوئی بھی شاعر جس نے ان بحروں کو استعمال کیا، اس لئے بار بار ان متبادل ارکان کو باندھا۔ میں نے اپنے ایک مضمون میں اس پہلو پر مفصل بحث کر کے یہ تجویز پیش کی ہے کہ ہمارے عروض میں اس قسم کی ترمیم شامل کر لینا چاہیئے۔

جس طرح انگریزی مٹھائیوں کا ذائقہ ایک لیکن شکلیں مختلف ہوتی ہیں اسی طرح ایک ہی عروضی وزن کو ارکان بدل کر لکھا جائے، تو وہ کوئی اور ہی چیز معلوم ہونے لگتا ہے۔ رباعی کے اوزان میں جہاں بھی مفعول یا مفاعیل ہوتا ہے، اس کا آخری 'ل' متحرک ہوتا ہے اور اسے اگلے رکن کی ابتدا کے ساتھ ملا کر پڑھنا ہوتا ہے آپ نے بچوں کو ریل گاڑی چلاتے دیکھا ہوگا۔ چند بچے ایک دوسرے کے پیچھے کھڑے ہو جاتے ہیں اور ہر ایک اپنے سے اگلے لڑکے کا دامن پکڑ لیتا ہے اور اس کے بعد ریل چالو ہو جاتی ہے رباعی کے بعض اوزان میں سارے رکن ایک دوسرے سے اسی طرح

---

۵۔ اُردو کی ہندی بحریں میں توسیع اور اضافے مشمولہ نذرِ ذاکر:

دست بداماں ہوتے ہیں : مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلُ فعل
ہم ان میں سے کچھ کی یا سب کی زنجیر توڑ دیں، تو یہ اپنے اصلی رُوپ میں سامنے آجائیں اس عملِ جراحی میں ان بارہ اوزان کو نظرانداز کر دیتا ہوں، جن کے آخر میں فعول یا فاع ہے، عروض کا یہ عام قاعدہ ہے کہ ہر وزن کے آخر میں ایک مزید ساکن حرف کا اضافہ کیا جاسکتا ہے اس زحاف کو کہیں تسبیغ اور کہیں اذالہ کہتے ہیں۔ اس طرح کے اضافہ شدہ وزن کا اصلی وزن کے ساتھ اجتماع جائز ہوتا ہے اس لیے فعول یا فاع پر ختم ہونے والے اوزان فعل یا فع پر ختم ہونے والے اوزان ہی کی فروعات ہیں۔ ایک نقشے میں بقیہ بارہ اوزان کے چہرہ سے نقاب ہٹا کر پیش کرتا ہوں :

| ۱ | ۲ | ۳ | ۴ |
|---|---|---|---|
| ۱ | مفعول مفاعلن مفاعیل فعل | =مفعول مفاعلن مفاعی افعل | =فیلن فعلن فعل فعولن فعلن |
| ۲ | مفعول مفاعلن مفاعیلن فع | =مفعول مفاعلن مفاعیلن فع | =فیلن فعلن فعل فعولن فیلن |
| ۳ | مفعول مفاعیل مفاعیل فعل | =مفعول مفاعیل مفاعی لن فعل | =فیلن فعلن فیل فعولن فعلن |
| ۴ | مفعول مفاعیلُ مفاعیلن فع | =مفعول مفاعیل مفاعیلن فع | =فیلن فعلن فیل فعولن فیلن |
| ۵ | مفعول مفاعیلن مفعول، فعل | =مفعول مفاعیلن مفعولن فع | =فیلن فعلن فیلن فیلن فعلن |
| ۶ | مفعول مفاعیلن مفعولن فع | =مفعول مفاعیلن مفعولن فع | =فیلن فعلن فعل فعولن فعلن |
| ۷ | مفعولن فاعلن مفاعیل فعل | =مفعولن فاعلن مفاعی لن فعل | =فیلن فیلن فعل فعولن فعلن |
| ۸ | مفعولن فاعلن مفاعیلن فع | | =فیلن فیلن فعل فعولن فیلن |
| ۹ | مفعولن مفعولُ مفاعیلُ فعل | =مفعولن مفعول مفاعی لفعل | =فیلن فیلن فیل فعولن فعلن |
| ۱۰ | مفعولن مفعولُ مفاعیلن فع | =مفعولن مفعول مفاعیلن فع | =فیلن فیلن فیلا فعولن فیلن |
| ۱۱ | مفعولن مفعولن مفعولُ فعل | =مفعولن مفعول مفعول فعل | =فیلن فیلن فیلن فیلن |
| ۱۲ | مفعولن مفعولن مفعولن فع | | =فیلن فیلن فیلن فیلن |

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش      من انداز قدت را می شناسم

اب رباعی کے اوزان کا مطلع دور ہوا ہے۔ ان میں سے وزن نمبر ۲ کے علاوہ بقیہ کا آخری

فعلن یا فیلن جدا کر لیجئے، تو اچھا خاصا متقارب یا متدارک کا مثمن وزن سامنے آجاتا ہے۔ یعنی رباعی کے اوزان متقارب یا متدارک کے مشہور مثمن اوزان پر چار حرفی رکن کے اضافے سے بنتے ہیں۔ اس سلسلے میں اگر میرا مضمون " اردو کی ہندی بحر میں توسیع اور اضافے" پڑھ لیا جائے تو مجھے بہت سی ضروری بحثوں کے اعادے کی ضرورت نہ رہیگی:

تیسرے کالم کو دیکھ کر کہا جائیگا کہ ایک وزن میں فعولن اور فعلن کا اجتماع کیا معنی؟ فعولن متقارب میں آتا ہے، متدارک میں نہیں، اور فعلن متدارک میں آتا ہے، متقارب میں نہیں۔ میں نے اپنے محولۂ بالا مضمون میں ان کے اجتماع کا جواز پیش کیا ہے اور ان اوزان دوئی ختم کر کے انھیں ایک بحر متدارک میں محصور کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ مندرجہ بالا نقشے میں قدما کو دو بہت بڑی بدعتیں دکھائی دینگی:

اگر کہا جائے کہ اردو میں مسدس، مثمن اور شانزدہ رکنی اوزان تو ہوتے ہی ہیں، شاذ و نادر مربع بھی دیکھنے میں آیا ہے، لیکن یہ پانچ رکن کا مصرع یعنی منتشر بحر کیا چیز ہے؟ تو یاد رہے کہ عربی میں دو بلکہ ایک اور تین رکن کی بحریں بھی ملتی ہیں یعنی پورے شعر میں صرف ایک یا دو یا تین رکن ہوتے ہیں۔ موحد اور مثلث میں مصرع کا تصور ہی ختم ہو جاتا ہے اور مصرعے اور بیت میں "من تو شدم تو من شدی" کی کیفیت ہو جاتی ہے، عربی میں اتنی آزادی ہے، تو اردو میں اتنی سختی کیوں، مسدس اور مثمن میں اسیر صاحب بحر الفصاحت لکھتے ہیں[6]:

"فارسی و ریختہ میں مثمن و مسدس کے سوائے بہت ہی کم رائج ہے، بلکہ متاخرین نے دس دس اور سولہ سولہ اور بیس بیس رکن کے اشعار کہے ہیں:

"حضرت ظفر علیہ الرحمۃ نے بحر رمل کو معشر بھی استعمال کیا ہے۔ یہ ان کا کلام ہے[7]:

---

۶۔ بحر الفصاحت: ۱۰۵ نیز مقیاس الاشعار، ۱۴۷:

۷۔ بحر الفصاحت: ۱۰۵:

ہو کے خاک اپنا مٹا دینا جسے منظور ہو وہ خاکسار
خاکِ رہ ہو، خاکِ پا ہو، یہ بھی ہو اور وہ بھی ہو اور کچھ نہ ہو

"بر وزن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلان"

دوسرا اعتراض یہ ہو سکتا ہے کہ رباعی جب قدیم سے بحر ہزج میں چلی آتی ہے، تو اسے اب بحر متدارک میں لانے کا کیا جواز ہے ؟

سچ یہ ہے کہ ہمارے عروض میں بحروں کی تشکیل اور تقسیم کسی اصول کے تحت نہیں کی گئی۔ بعض سالم بحریں ایک دوسرے سے اتنی ملتی جلتی ہیں کہ ان کے علیٰحدہ وجود کا کوئی جواز نہیں ہے مثلاً بحر مدید سالم (فاعلاتن فاعلن فاعلاتن فاعلن) کے وضع کرنے کی کیا ضرورت تھی، اسے بحر رمل ہی سے کیوں نہ لے لیا گیا جب کہ اول کا ایک وزن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن بھی ہے۔ یا مثلاً بحر وافر سالم میں دو جگہ زحاف لگا کر مفاعلتن کو مفاعیلن میں بدلتے ہیں۔ اگر یہ زحاف دو کی بجائے چاروں ارکان میں لگا دیا جائے، تو پوری بحر ہزج بحر وافر سے اور بحر رجز بحر کامل سے پیدا کی جا سکتی ہے۔ بحروں کی تقسیم سے بھی کہیں زیادہ نامعقول ایک بحر میں زحاف لگا کر ایسے اوزان اخذ کرنا ہے جو سالم بحر سے یا ایک دوسرے سے اتنے ہی مختلف ہیں جتنے دو مختلف بحروں کے اوزان مثلاً بحر رجز کے اوزان :

مطوی مخبون — مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلن

مخبون مرفل — مفاعلاتن مفاعلاتن مفاعلاتن

مطوی مرفل — مفتعلاتن مفتعلاتن مفتعلاتن

پس ایسا کہاں کا اشتراک ہے اور رجز سالم سے ایسی کون سی مشابہت ہے جو انھیں دوسری بحروں کے اوزان سے الگ کر دے۔ پہلا وزن ذیل کی بحروں کے اوزان سے کہیں زیادہ مشابہ ہے :

واخر اغضب معصوب — مفتعلن مفاعیلن مفتعلن مفاعیلن

بسیط اور منسرح کا مشترک وزن — مفتعلن فاعلن مفتعلن فاعلن

---

۸۔ ایضاً : ۷۲ :

دوسرے اور تیسرے وزن بالترتیب بحر متقارب مقبوض اثلم شانزدہ رکنی اور اثرم شانزدہ رکنی کے بالکل مطابق ہیں۔ سالم بحروں سے فروعی اوزان کا خفیف رشتہ پیدا کرنے کے لئے زحافات کا کھڑاگ اختراع کیا گیا۔ کسی بھی بنیادی رکن سے کوئی بھی فرع برآمد کی جاتی ہے اس طریقے کو تھوڑا اور بڑھا دیا جائے، تو کسی ایک افاعیل کو بنیاد قرار دیکر باقی تمام ارکان اسی سے نکالے جاسکتے ہیں مثلاً اگر مفاعیلن سے فعولن اور فاعلن دونوں نکالے جاسکتے ہیں، تو بحر متقارب یا بحر متدارک کا ہر وزن بحر ہزج کے تحت کیوں نہیں آسکتا! سالم بحروں سے فروعی اوزان کا استخراج سراسر غیر علمی اور غیر منطقی طریقہ ہے۔ واضعین بحور کا ذہنی خلفشار اس سے ظاہر ہے کہ بار بار ایک ہی وزن مختلف شکلوں میں (بعض اوقات شکل کی تبدیلی کے بغیر بھی) کئی بحروں کی ذیل میں پایا جاتا ہے۔ کچھ مثالیں ملاحظہ ہوں:

| | |
|---|---|
| ۱۔ متقارب اثرم | فیلن فیلن فیلن فیلن |
| متدارک مقطوع | فیلن فیلن فیلن فیلن |
| مقتضب مکسوف احذ محذوف | مفعولن فع مفعولن فع |
| ۲۔ مقتضب مطوی موقوف مقطوع | فاعلات مفعولن فاعلات مفعولن |
| ہزج اشتر | فاعلن مفاعیلن فاعلن مفاعیلن |
| ۳۔ بسیط مطوی | مفتعلن فاعلن مفتعلن فاعلن |
| منسرح مطوی مکسوف | مفتعلن فاعلن مفتعلن فاعلن |

ظاہر ہے کہ ہر وزن جو کئی بحروں میں مشترک ہے کسی ایک بحر سے زیادہ نزدیک ہے اور اسے بقیہ بحروں کی ذیل میں رکھنا غلط ہے۔ اسی کی مماثلت پر رباعی کے اوزان دیکھیے یہ متدارک سے نزدیک ہیں یا ہزج سے؟ ظاہر ہے کہ ان میں کا ہر وزن ہزج کی بہ نسبت متدارک مقطوع یا مخبون سے کہیں زیادہ مماثل ہے۔ اوزان رباعی کے واضع اصلی نے ان اوزان کی نشست بحر ہزج میں کر کے غلطی کی۔ اسے فاعلن، مفعولن، فعل، فع اور فاع ـــــ

جیسے فروع بکثرت استعمال کرنے پڑے جو بحر ہزج کے بقیہ اوزان میں نہیں تھے

کے برابر ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ متدارک مقطوع اور اس کے مماثلات کا عربی فارسی میں کوئی خاص رواج نہیں ہے۔ ہندی میں یہ بحر بڑی عام ہے جس کی وجہ سے اردو میں

بھی یہ بہت معقول ہے جب اردو میں اس کی مثمن شکل متدارک میں ہے تو مختصر بھی متدارک ہی کیوں نہ ہو خصوصاً جب اس کے اور متعدد امکانات بحر ہزج میں اس خوش اسلوبی سے نہیں بٹھائے جاسکتے جیسے بحر متدارک میں۔

میں نے بحر متدارک سے متعلق اپنے مضمون میں فعلن فعلن فعلن فعلن کے ہم وزن ۸۲ اوزان تحریر کیے ہیں اور پھر انھیں میں چار حروف کا اضافہ کر کے رباعی کے ۱۸۰ اوزان بر آمد کئے ہیں۔ اگر ان کے آخری حرف سے پہلے ایک الف کا اضافہ کیا جائے تو مزید ۱۸۰ اوزان بر آمد ہو جائینگے۔ میں ان اوزان کی تشکیل میں ایسے ارکان کا استعمال کرنا چاہتا تھا، جو وزن کے فطری آہنگ کو پوری طرح سے ابھار کر سامنے لائیں، لیکن زحافات کی یہ میرے مانع آتی ہے۔ متعدد اوزان کو ایک بحر کے تابع بنا کر اس کے ساتھ جوڑ دینے پر مجھے سخت اعتراض ہے۔ متبوع بحر کے ساتھ ان کا زبردستی کا رشتہ ظاہر کرنے کے لئے زحافات کی تخلیق کرنا پڑی۔ یہ زحافات ضرور کسی خشک دماغ کے بنائے ہوئے ہیں، اوران پر عبور پانے کی کوشش میں اختلال دماغ کا خدشہ ہے۔ عروض کو نامقبول بنانے کی واحد ذمہ داری ان زحافات کی ہے۔

نئے اوزان کی تشکیل کرتے وقت میرا مقصود اتنا ہے کہ مجھے موزوں ترین ارکان استعمال کرنے کی آزادی ہو لیکن زحافات میرے رستے میں حائل ہیں۔ چونکہ میں نے اوزانِ رباعی بحر متدارک سے منسوب کیے ہیں، اس لئے مجھ سے توقع کی جاتی ہے کہ میں صرف ان ارکان پر اکتفا کروں جو فاعلن سے اخذ کئے جاتے ہیں۔ مجھے یہ قید تسلیم نہیں۔ میں نے چار ایسے فروعات بھی استعمال کئے ہیں، جو کسی عروض کی کتاب میں فاعلن کی ذریات میں شامل نہیں ہوتے۔ یہ ہیں :

فعولن  مفاعلن  مفتعلن  مفعولن

علم عروض مجھے کسی بنیادی رکن سے کوئی بھی فرع اخذ کرنے کے لئے حسبِ ضرورت زحافات اختراع کر لینے کی اجازت دیتا ہے۔ عروض کے موجد اصلی کے بعد عرب اور ایران میں بارہا نئے زحافات وضع کئے گئے۔ اردو والے ایسے کم حوصلہ نکلے کہ انھوں نے فارسی سے در آمد کئے

عروض میں نہ کسی زحاف کا اضافہ کیا، نہ وزن کا۔ میں یہاں اہلِ اردو کے اسی اختیار کو استعمال کرتا ہوں جو عروض نے ہم سب کو عطا کیا ہے مولوی نجم الغنی کا قول ہے[9]:

"اصول محصور ہیں نہ فروع یعنی ارکان افاعیل دس سے زائد نہیں آسکتے اور جو رکن پایا جائیگا وہ انھی کی ترکیب وکمی بیشی وغیرہ سے پیدا ہوگا اور فروع کی شکلیں اور بحروں کے تغیرات محصور نہیں"

اب دیکھئے کہ میں فاعلن سے مندرجۂ بالا چار ارکان کیونکر اخذ کرتا ہوں:

فاعلن سے مخلّع ہے فعَل۔ اس پر ترفیل کا زحاف لگایا تو مخلع مرفّل فعولن برآمد ہوا۔ فاعلن سے مقطوع فِعلن ہے، ترفیل کے ذریعے مقطوع مرفّل مفعولن حاصل ہوا۔ اگر زحافات کے ذریعے فاعلن پر پورا سببِ خفیف لگاکر فاعلاتن تک اخذ کیا جاسکتا ہے، تو اس کے دونوں اجزا پر باری باری سے ایک ایک حرف کا اضافہ کیوں نہیں ہوسکتا! اس کے لئے میں دو نئے زحاف اختراع کرتا ہوں۔ پہلے کا نام میں نے "جمع" رکھا ہے۔ اس کے تحت فاعلن کے سببِ خفیف میں ایک حرف کا اضافہ کرکے اسے وتد میں بدل لیا جائیگا، یعنی مفاعلن اور اسے مجموع کہینگے۔ دوسرے زحاف کا نام میں نے 'طول' رکھا ہے۔ اس کے تحت فاعلن کے وتد کی ابتدا میں ایک حرف کا اضافہ کرکے مفتعلن برآمد کیا جائیگا جو مطول ہوگا۔

عام طور سے عروض کی کتابوں میں فاعلن کی فروع میں فِعل (فلع) نہیں دیا جاتا، اسے مذال اخذ کرسکتے ہیں، لیکن مقیاس الاشعار میں[10] اسے محقق کی تقلید میں مطموس کہا گیا ہے مطموس کی تفصیل معیار الاشعار میں[11] دی ہے۔ اس طرح میں اوزان رباعی کے لیے ذیل کے ارکان سے کام لونگا:

۱۔ فاعلن سالم۔ فعِلن مخبون۔ فعلاتن مخبون مرفّل۔ فِعلن مقطوع۔ مفعولن مقطوع مرفّل۔ فَعَل مخلع۔ فعولن مخلع مرفل۔ مفاعلن مجموع مفتعلن مطول۔ فع محذوذ:

---

۹۔ بحر الفصاحت۔ ص ۱۰۷: ۱۰۔ ایضاً ۲۷۰: ۱۱۔ زرکامل عیار ترجمۂ معیار الاشعار: ۱۰۱:

ب ۔ فاعلان مذال ۔ فعلان مخبون مذال ۔ فیلان مقطوع مذال ۔ مفعولان
مقطوع مرفل مسبّغ ۔ فعول مخلع مذال ۔ فعولان مخلّع مرفل مسبّغ ۔ مفاعلان
مجبوع مذال ۔ مفتعلان مطول مذال ۔ فیل مطموس :
گروہ میں سے فیل کے سوا بقیہ تمام ارکان صرف ان ثانوی اوزان میں استعمال کئے
جائیں گے جو اصل ۔ ۱۸۰ کے آخر میں ایک مزید ساکن حرف کے اضافے سے برآمد
ہونگے ۔
میں نے عروض سے متعلق اپنی سابقہ تحریروں میں کسی وزن کے شروع یا بیچ
میں ایسا رکن لانے پر احتجاج کیا ہے جس کے آخر میں دو ساکن حروف کا اجتماع
ہو اور دوسرے ساکن کو متحرک مان کر اگلے لفظ کی ابتدا میں جوڑنا پڑے لیکن میرے
وضع کردہ اوزان میں ذیل کے جوڑوں میں اس اصول کی خلاف ورزی کی گئی
ہے :

فیل فاعلن بجائے فاعلن فعل کے
فیل فعولن بجائے مفتعلن فع یا فع فعلان کے
فیل فعل بجائے فع فعلن کے

میں اگر ہر جوڑے کے موخر الذکر رکن کو لیتا تو اصول کے ساتھ بڑی استوار وفاداری
ہوتی لیکن ایک اور وفاداری نے میرا دامن کھینچ لیا ۔ انگریزی میں وزن کی بنا
لفظ کا اجزائی بل ( syllabic stress - ) ہے ۔ عام
خیال ہے کہ اردو وزن میں اس کو کوئی کارفرمائی نہیں ، لیکن میری دریافت ہے کہ
اردو کے بہت سے اوزان میں بل بڑی شدت سے اثرانداز ہوتا ہے خصوصاً میرے وضع کردہ
اوزان رباعی میں :
فاعلن فعل کے مقابلے میں فیل فاعلن اور زندگی میری کے مقابلے میں میرے سامنے کہیں
زیادہ رواں معلوم ہوتا ہے ۔ تفصیل کا یہ موقع نہیں ۔ مفتعلن فع اور فیل فعولن کے
بل میں بہت خفیف فرق ہے ۔ فیل فعل اور فع فعلن کا بل یکساں ہے لیکن ان دونوں

صورتوں میں ایک اور نکتہ میرے پیشِ نظر رہا ہے۔ ہندی میں فعلن کے وزن کے الفاظ بالعموم نہیں ہوتے۔ بول چال میں توان کا قطعاً رواج نہیں، چنانچہ عربی فارسی کے ایسے الفاظ کو بھی تسکینِ اوسط کے ساتھ بولتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مفتعلن فع کی بہ نسبت فیل فعولن اور فع فعلن کے مقابلے میں فیل فعل کہنا کہیں زیادہ آسان ہے۔ فعل فاعلن کی بہ نسبت مفاعیل فع قدرے زیادہ رواں ہے لیکن یہاں میں نے ایثار سے کام لیا۔ بحر متدارک میں مفاعیل لانے کے لیے ایک اور زحاف گھڑنا پڑتا ہے۔ بڑوں کے عتاب سے ڈرتا ہوں۔ میری جرأت بھی لامحدود نہیں ہے۔ کہا جائیگا*سوائے بقیہ تمام ارکان کسی نئے زحاف کی ایجاد کے بغیر دستیاب ہو سکتے تھے۔ میں نے بحر متدارک کو اس لئے ترجیح دی ہے کہ ان اوزان کا بنیادی ڈھانچہ بحر ہزج کا نہیں بلکہ اس بحر کا ہے جسے بے احتیاطی سے ہندی بحر کہا جاتا ہے۔ فیلن فیلن۔ فیل فاعلن۔ فعل فاعلن، فیل فعولن، فعل فعولن وغیرہ کو بحر ہزج میں رکھنا عروض کے ساتھ تشدد ہے:

ان اوزان میں فعلن بڑا ثقیل رکن ہے خصوصاً جب یہ وزن کی ابتدا میں آجائے فیل فعل فعلن فعلاتن فعلن جیسے وزن کو اگر فیل فعول فعول مفاعیل فعل لکھا جائے، تو حلق کے اندر تناؤ تو نہیں پیدا ہوگا، لیکن ریل گاڑی کے ڈبوں کی طرح ہر رکن کو لگے رکن کے ساتھ اتحاد دینے سے وزن کی نوعیت دھندلاسی جاتی ہے۔ دوسرے میں نے حتی الامکان ارکان کے ۸ حرفی مجموعوں کو ایک دوسرے میں گڈمڈ نہیں کیا۔ اوزان میں ارکان کی نشست کرتے وقت میرے سامنے متعدد تقاضے تھے: (۱) تمام رکنوں کو ایک دوسرے سے آزاد رکھنا، (۲) یہ ممکن نہ ہو، تو ۸ حرفی مجموعوں کی خارجی حیثیت برقرار رکھنا، (۳) فاصلۂ صغریٰ یعنی فعلن کو توڑنا، (۴) لفظ کے اجزائی بل کی متابعت کرنا، (۵) مختلف اوزان کے ڈھانچے میں مماثلت اور باضابطگی کی کوشش، (۶) ہر وزن کا پانچ ارکان پر مشتمل ہونا۔

میں نے ان گوناگوں تقاضوں میں مفاہمت سے کام لیا ہے۔ اگر مجھے اپنی مرضی کے مطابق ارکان استعمال کرنے کی کھلی چھٹی ہوتی، تو ان میں سے کئی اوزان بہتر اور بدلی ہوئی صورت میں پیش کئے جا سکتے تھے۔ اس سے مسلّمہ اصولوں کو اور زیادہ مجروح کرنا پڑتا: میں ایسا نہیں

* کہ ان اوزان کو متدارک کی بجائے ہزج ہی میں رہنے دیا جاتا تو فعلن اور مستفعلن کے

کر سکتا۔ لہٰذا اپنے ضمیر کی تسکین اور دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے بعض اوزان کے تحت بے اصول سہی، لیکن زیادہ رواں صورت کو میں قوسین میں درج کردونگا۔

ذیل کے نقشے کے اوزان کے آخر میں فعلن، فیلن، فاعلن، فعولن، مفاعلن، مفعولن، فعل فع کی جگہ بالترتیب فعلان۔ فیلان۔ فاعلان، فعولان مفاعلان، مفعولان، فعول، فیل لکھ دیا جائے تو ہمیں مزید ۱۸۰ اوزان مل جائینگی۔ طوالت سے بچنے کے لئے میں نے انھیں قلمبند نہیں کیا۔ ان ۳۶۰ اوزان میں رباعی کے مروجہ ۲۴ اوزان شامل ہیں۔ میں نے ان اوزان کو نظرانداز کر دیا ہے جو پڑھنے میں ان سے ہم آہنگ نہیں ہوتے تھے۔ اس تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں کہ میں ان اوزان تک کیونکر پہنچا اور ان کے مماثل کون کونسے اوزان میں نے مسترد کر دیئے ہیں۔ صرف ایک اصول کی طرف اشارہ کافی ہوگا۔ فعل کے وزن کے ٹکڑے (وتد مجموع) ہمیشہ جوڑوں میں آتے ہیں یعنی دو یا چار اور ہر جوڑے کی تکمیل کے لئے ایک سبب خفیف فع کی ضرورت ہوتی ہے مثلاً فعل فعولن، فعل فاعلن فیلن فاعلن (جو دراصل فاعلن فعل ہے) یہ سبب اکثر ان اوتاد سے متصل ہوتا ہے، ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ ان جوڑوں کا یہ ہمدم دیرینہ ان سے کچھ فاصلے پر رہ جائے۔ فیلن اور فعلن کے وقوع پر کوئی پابندی نہیں، یہ کہیں بھی اور کسی بھی تعداد میں آسکتے ہیں۔

یہ تسلیم کہ میرے مجوزہ اوزان میں سب ایک دوسرے سے اتنے گتھے ہوئے نہیں ہیں جتنے مروجہ اوزان ہیں۔ تعداد بڑھ جانے سے باہمی رشتہ بھی شاید کچھ ڈھیلا ہو گیا ہے، لیکن پھر بھی سب ایسے ہیں کہ انھیں ساتھ ساتھ استعمال کیا جائے، تو دولخت معلوم نہیں ہونگے۔ یہ ضرور ہے کہ ان میں کا ہر وزن بعض اوزان کی معیت زیادہ خوشی سے قبول کریگا۔ اور بعض کی صحبت اسے اتنی راس نہیں آئیگی۔ مجھے اس پر اصرار نہیں کہ یہ سب اوزان تسلیم ہی کئے جائیں، ان میں سے دس بیس خارج کر دیئے جائیں، تو انتخاب غالباً اور بہتر ہو جائیگا۔ ہر ایک شاعر کو ان میں سے زیادہ مترنم اوزان کو ترجیح دینی چاہیئے۔

تو اب ملاحظہ ہوں ایجاد بندہ رباعی کے ۳۶۰ اوزان۔ پانچ کے سوائے مثال کے سب مصرعے

بھی میرے خانہ ساز ہیں، لہٰذا ان کے شاعرانہ پہلو پر نہ جائیے:

| نمبر | وزن | مثال |
| --- | --- | --- |
| ۱ | فیلن فعلن فعلن فیلن فعلن (مفعول فعول فعولن فیل فعل) | سچ ہے، نہ خدا ہی ملا ہم کو نہ صنم |
| ۲ | فیلن فعلن فعلن فیلن فیلن (مفعول فعول فعولن مفعول) | محبوب نہیں نہ سہی، کیا پروا ہے |
| ۳ | فیلن فعلن فیلن فعلن فیلن | گل پیرہنی تیری مشہور ہوئی |
| ۴ | فیلن فعلن فیلن فعلن فیلن | کیوں روٹھ گئے، کیوں روٹھ گئے پیارے! |
| ۵ | فیلن فعلن فیلن فیلن فعلن | جو شیخ میں خوبی ہے، کافر میں نہیں |
| ۶ | فیلن فعلن فیلن فیلن فیلن | قانون تغیر کا جب تک باقی ہے |
| ۷ | فیلن فعلن فیلن فیلن فیلن | میں تیرے لئے دلوانہ کبھی نہ تھا |
| ۸ | فیلن فعلن فیلن فیل فعولن | ہم نے تیری دنیا میں چین نہ پایا |
| ۹ | فیلن فعلن فعل فاعلن فیلن | اک دن نہ رہا میرے باغ میں وہ گل |
| ۱۰ | فیلن فعلن فیل فاعلن فیلن | اے دوست میرے! دور دیس سے آجا |
| ۱۱ | فیلن فعلن فعل فعولن فعلن (فیلن فعلن مفاعلن فیل فعل) | ہے قید کوئی کہ تھا ہی خواہ وطن |
| ۱۲ | فیلن فعلن فعل فعولن فیلن | ظلمات میں آفتاب آئے جیسے |
| ۱۳ | فیلن فعلن فیل فعولن فعلن | ہاں اور چلے، اور چلے، اور چلے |
| ۱۴ | فیلن فعلن فیل فعولن فیلن | راحت کو تصور ہی تصور پایا |
| ۱۵ | فیلن فعلن فع فعلن مفاعلن (فیلن فعلن مفتعلن مفاعلن) | اے دوست، تری گل بدنی سدا رہے |
| ۱۶ | فیلن فیلن فعلن فعلن فعلن (فیلن مفعول فعول فعل) | اس کا ہر گھونٹ خمار شکن ہی سہی؟ |

۱۷ فیلن فیلن فعلن فعلن فیلن — جس کا ہر گھونٹ خمار شکن ہوگا

۱۸ فیلن فیلن فعلن فیلن فعلن — قرنوں سے قافلۂ ماضی ہے رواں

۱۹ فیلن فیلن فیلن فعلن فعلن — وہ مے جس کا ہر گھونٹ خمار شکن

(فیلن فیلن مفعول فعول فعل)

۲۰ فیلن فیلن فعلن فیلن فیلن — کب سے ہے قافلۂ ماضی جاری

۲۱ فیلن فیلن فیلن فیلن فعلن — تم نے ہم پر کتنے احسان کیے

۲۲ فیلن فیلن فیلن فعلن فیلن — وہ مے جس کا ہر گھونٹ حیات افزا

۲۳ فیلن فیلن فیلن فیلن فیلن — بستی بستی ہم پاگل کہلائیں (ناصر شہزاد)

۲۴ فیلن فیلن فیل فعولن فیلن — بنتی ہے نذر نوچیں برگ سمن (لاعلم)

۲۵ فیلن فیلن فیل فعولن فیلن — میں چلتا ہوں، جام اٹھالے ساقی!

۲۶ فیلن فیلن فعل فعولن فعلن — تو ہے قدرت کی سرنوشتوں سے پرے

(فیلن فیلن مفاعلن فیل فعل)

۲۷ فیلن فیلن فعل فعولن فیلن — کلیاں کھل جائینگی، سوا نہ ہوگا

۲۸ فیلن فیلن فعلن فیل فاعلن — غافل، پھر ڈھونڈ رہا ہے کوئی مجھے

۲۹ فیلن فیلن فیلن فیل فاعلن — دل کی شہرت پہنچی دور دور تک

۳۰ فیلن فیلن فعلن فعل فاعلن — کوئی مظلوم نہیں تیرے عہد میں

۳۱ فیلن فیلن فیلن فعل فاعلن — کب تک رہنا ہوگا دکھی دیس میں

۳۲ فیلن فیلن فعلن فعل فعولن — گل کو آرام نہیں ملا چمن میں

۳۳ فیلن فیلن فیلن فعل فعولن — اپنی صورت دیکھو دل حزیں میں

۳۴ فیلن فیلن فیلن فعل فعولن — چل اے دل! معبد میں دیپ جلائیں

۳۵ فیلن فیلن فعل فاعلن فیلن — کوئی بلبل نہ ہو باغ میں جیسے (ناصر شہزاد)

۳۶ فیلن فیلن فعل فاعلن فیلن — میرا دل بردور دیس سے آیا

۳۷ فیلن فیلن فعل مفاعلن فعل — دل کب کا دور دیس کو چلا گیا

٣٨ فعلن فعلن فع فعلن مفاعلن — پیارے، تیری گل بدنی سدا رہے
٣٩ فعلن فعل فعولن فعلن فعلن — یارو، اب کوئی حسرت دل میں نہ رہی
٤٠ فعلن فعل فعولن فعلن فعلن — گوری، کچھ تو بتا کس کی چاہت میں (نامِ شہزاد)
٤١ فعلن فعل فعولن فعل فعولن — کوئی پھول نہیں ہے مرے چمن میں
٤٢ فعلن فعل فعولن فعل فعولن — مجھ کو آپ یہاں کیوں چھوڑ گئے ہیں
٤٣ فعلن فعل فعولن فعل فاعلن — آؤ، سیر کرو اس گلستاں کی
٤٤ فعلن فعل فعولن فعل فاعلن — تیرے حسن کی شہرت دور دور رہے
٤٥ فعلن فعل فعل فعلاتن فعلن — تیرے غم کی نشانی، پیارے!
(فعلن فعل فعول فعولن فعلن)

---

٤٦ فعلن فعل فاعلن فعلن فعلن — آیا دور دیس کا رہنے والا
٤٧ فعلن فعل فاعلن فعل فعولن — پہنچی دور دور تک، میری محبت
٤٨ فعلن فعل فاعلن فعل فعولن — آیا دور دیس سے ایک مسافر
٤٩ فعلن فعل فاعلن فعل فاعلن — آیا دور دیس سے میرا ماہرو
٥٠ فعلن فعلن فاعلن فعل فاعلن — آیا دور دیس سے کوئی دل ربا

---

٥١ فعلن فعل فاعلن فعلن فعلن — وہ پھر مرے سامنے آکر بولا
٥٢ فعلن فعل فاعلن فعل فعولن — گویا میرے باغ میں بہار آئی
٥٣ فعلن فعل فاعلن فعل فعولن — جیسے میرے باغ میں کوئی نہیں ہے
٥٤ فعلن فعل فاعلن فعل فاعلن — آئے میرے سامنے کوئی مہ جبیں
٥٥ فعلن فعل فاعلن فعل فاعلن — آیا میرے سامنے کوئی مہ جبیں

---

٥٦ فعلن فعل فعولن فعلن فعلن — کوئی میری طرف آتا ہو جیسے

| | | |
|---|---|---|
| ۵۷ | فیلن فعل فعولن فِیل فعولن | پہنچا میرا تصور پاس تمہارے |
| ۵۸ | فیلن مفاعلن فعلن فع فعلن | کوئی مجھے پکار رہا ہے کہ نہیں |
| | (فیلن مفاعلات مفاعیل فعل) | |
| ۵۹ | فیلن مفاعلن فعلن فیلن فاع | ہم نے کہاں کہاں نہ تجھے ڈھونڈھا ہے |
| | (فیلن مفاعلان مفاعیلن فع) | |

---

| | | |
|---|---|---|
| ۶۰ | فعل فعولن فعلن فعلن فیلن | مدد کریںگے قدرے سخنے، یارو! |
| | (مفاعلن فِیل فعول مفاعیلن فع) | |
| ۶۱ | فعل فعولن فعلن فیلن فیلن | سدا رہے گل بدنی تیری قائم |
| ۶۲ | فعل فعولن فیلن فعلن فیلن | سدا رہے یوں ہی گل بدنی تیری |
| ۶۳ | فعل فعولن فیلن فیلن فعلن | ترے جہاں میں یارب، آرام نہیں |
| ۶۴ | فعل فعولن فیلن فیلن فیلن | گزر گیا جی سے کوئی دیوانہ |
| ۶۵ | فعل فعولن فیلن فعل فاعلن | نہیں ہے کوئی بلبل گلستاں میں |
| ۶۶ | فعل فعولن فیلن فِیل فاعلن | گیا مسافر اب تو دور دیس کو |
| ۶۷ | فعل فعولن فیلن فعل فعولن | نہیں ہے کوئی خواہش دلِ حزیں میں |
| ۶۸ | فعل فعولن فیلن فِیل فعولن. | ترے یہاں کوئی آرام نہیں ہے |
| ۶۹ | فعل فعولن فعل فعولن فعلن | مرا ستمگر مجھے کہاں چھوڑ گیا |
| | (مفاعلن فع مفاعلن فِیل فعل) | |
| ۷۰ | فعل فعولن فعل فعولن فیلن | دلِ حزیں میں نہیں ہے کوئی خواہش |
| ۷۱ | فعل فعولن فِیل فعولن فعلن | دلِ حزیں! آخر تو ہمیں چھوڑ گیا |
| | (فعل فعولن فِیل مفاعیل فعل) | |
| ۷۲ | فعل فعولن فِیل فعولن فیلن | پڑی ہے لاکھوں پہ یہی بپتا اکثر |
| ۷۳ | فعل فعولن فعل فاعلن فیلن | کوئی سمن بر میرے سامنے آئے |

| | | |
|---|---|---|
| ۷۴ | فعل فعولن فعیل فاعلن فعلن | سبق پڑھو اس گلستاں کا یارو |
| ۷۵ | فعل فعولن فعیل مفاعلن فعل | مرے صنم کی گل بدنی سدا رہے |
| | (فعل فعولن مفتعلن مفاعلن) | |
| ۷۶ | مفاعلن فعلن فعلن فعلن فع | کہاں گئی مری جانِ تمنا یارو |
| | (مفاعلان فعول فعولن فعلن) | |
| ۷۷ | مفاعلن فعلن فعلن فعلن فع | مجھے پکار رہا ہے جیون ساتھی |

---

| | | |
|---|---|---|
| ۷۸ | فعل فاعلن فعلن فعلن فعلن | رہے خوب گل بدنی تیری پیارے |
| ۷۹ | فعل فاعلن فعلن فعلن فعلن | رہے خوب تیری گل بدنی پیارے |
| ۸۰ | فعل فاعلن فعلن فعلن فعلن | ترے عہد میں کوئی مسرور نہیں |
| ۸۱ | فعل فاعلن فعلن فعلن فعلن | نئے دور کا رہنے والا آیا |
| ۸۲ | فعل فاعلن فعلن فعل فعولن | زرا دیکھ تو آکر دلِ حزیں کو |
| ۸۳ | فعل فاعلن فعلن فعیل فعولن | میرے باغ میں کوئی پھول نہیں ہے |
| ۸۴ | فعل فاعلن فعلن فعیل فاعلن | مرے باغ میں آؤ تم کبھی کبھی |
| ۸۵ | فعل فاعلن فعل فعولن فعل | کوئی آج پھر مرا چمن چھوڑ گیا |
| | (فعل فاعلن فعل فعولن فعلن) | |
| ۸۶ | فعل فاعلن فعل فعولن فعلن | کوئی ماہرو مرے چمن میں آیا |
| ۸۷ | فعل فاعلن فعل فاعلن فعلن | کوئی ماہرو مرے باغ میں آیا |
| ۸۸ | فعل فاعلن فعیل فاعلن فعلن | ترے پاس ہم پوچھ تاچھ کر پہنچے |
| ۸۹ | فعل فاعلن فعیل فعولن فعلن | ترے ہونٹ دل چوم رہا ہے کہ نہیں |
| | (مفاعیل مفعول مفاعیل فعل) | |
| ۹۰ | فعل فاعلن فعیل فعولن فعلن | ترے عہد میں چین نہ پایا ہم نے |
| ۹۱ | فعل فاعلن فعیل مفاعلن فعل | مرے دوست کی گل بدنی سدا رہے |

(فعل فاعلن مفتعلن مفاعلن)

---

| | | |
|---|---|---|
| ۹۲ | فیل فاعلن فیلن فیلن فعلن | اب کہاں گئی تیری گل پیرہنی |
| ۹۳ | فیل فاعلن فیلن فعلن فیلن | اب کہاں گئی گل پیرہنی تیری |
| ۹۴ | فیل فاعلن فیلن فیلن فیلن | دور دیس کا رہنے والا آیا |
| ۹۵ | فیل فاعلن فیلن فعل فاعلن | اصفہان شاید اک بڑا شہر ہے |
| ۹۶ | فیل فاعلن فیلن فیل فاعلن | میں ترے لئے دیوانہ بھی نہ تھا |
| ۹۷ | فیل فاعلن فیلن فعل فعولن | چند روز لہرا کر بکھر گیا گل |
| ۹۸ | فیل فاعلن فیلن فیل فعولن | دور دور تک کوئی پھول نہیں ہے |
| ۹۹ | فیل فاعلن فعل فعولن فعلن | کوئی آج پھر مرا چمن چھوڑ گیا |
| ۱۰۰ | فیل فاعلن فعل فعولن فیلن | کوئی آج پھر مرے چمن میں آیا |
| ۱۰۱ | فیل فاعلن فیل فعولن فعلن | عیش باغ میں پھول کہیں ہے کہ نہیں |
| ۱۰۲ | فیل فاعلن فیل فعولن فیلن | سات آسمان گھوم رہے ہوں جیسے |
| ۱۰۳ | فیل فاعلن فعل فاعلن فیلن | کوئی ماہ رُو مرے باغ میں آیا |
| ۱۰۴ | فیل فاعلن فیل فاعلن فیلن | دور دور تک دیکھ بھال کر پہنچے |
| ۱۰۵ | فیل فاعلن فیل مفاعلن فعل | میرے دوست کی گل بدنی سدا رہے |

(فیل فاعل مفتعلن مفاعلن)

---

| | | |
|---|---|---|
| ۱۰۶ | فیل فعولن فعلن فعلن فیلن | خلد نظر ہے تری گل بدنی، پیارے |
| ۱۰۷ | فیل فعولن فعلن فیلن فعلن | مجھ کو ملا خار کسی کو پھول ملا |
| ۱۰۸ | فیل فعولن فعلن فیلن فیلن | آپ کی گل پیرہنی سبحان اللہ! |
| ۱۰۹ | فیل فعولن فیلن فعلن فیلن | یونہی رہے تیری گل بدنی، پیارے! |
| ۱۱۰ | فیل فعولن فیلن فیلن فعلن | یونہی رہے پیارے، تیری گل بدنی |

| | | |
|---|---|---|
| ۱۱۱ | فیل فعولن فیلن فیلن فیلن | چاند نگر کا رہنے والا آیا |
| ۱۱۲ | فیل فعولن فعلن فعل فعولن | پھول نہیں خار نہیں میرے چمن میں |
| | (فیل فعل فیل فعل مفاعلن فع) | |
| ۱۱۳ | فیل فعولن فیلن فعل فعولن | کوئی نہیں دیوانہ تیرے لیے اب |
| ۱۱۴ | فیل فعولن فعلن فعل فاعلن | ہم کو فقط زخم ملے ترے پیار میں |
| | (فیل مفاعیل فعل مفاعیل فع) | |
| ۱۱۵ | فیل فعولن فیلن فعل فاعلن | کوئی نہیں پروانہ ترے حسن کا |
| ۱۱۶ | فیل فعولن فعلن فیل فاعلن | یار، تری گل بدنی اب کہاں گئی |
| ۱۱۷ | فیل فعولن فیلن فیل فاعلن | ہائے کسی کا کہنا: تم کہاں چلے؟ |
| ۱۱۸ | فیل فعولن فیلن فیل فعولن | آج کوئی میرا دل توڑ گیا ہے |
| ۱۱۹ | فیل فعولن فعل فعولن فیلن | چاند نگر کو چلا گیا وہ شاید |
| ۱۲۰ | فیل فعولن مفاعلن فعلن فع | چاند نگر سے میری نگاہ میں آؤ |
| ۱۲۱ | فیل فعولن فعل فاعلن فیلن | چاند نگر سے مرے شہر میں آؤ |
| ۱۲۲ | فیل فعولن فیل فاعلن فیلن | کوئی نہیں ہے دور دور تک پیارے! |
| ۱۲۳ | فیل فعولن فیل فعولن فعلن | کوئی نہیں الفت کا گنہگار یہاں |
| | (فیل فعولن فیل مفاعیل فعل) | |
| ۱۲۴ | فیل فعون فیل فعولن فیلن | ایک گھڑی آرام نہ پایا ہم نے |
| ۱۲۵ | فیل فعولن فیل فعولن فیلن | ہائے، تری گل پیرہنی کہاں گئی |
| | (فیل فعولن مفتعلن مفاعلن) | |

---

| | | |
|---|---|---|
| ۱۲۶ | فیل فعل فعلاتن فیلن فیلن | چاندنی رات میں آلھا اودل گائیں (ناصر شہزاد) |
| | (فیل فعول فعولن فیلن فیلن) | |
| ۱۲۷ | فیل فعل فعلاتن فعل فعولن | چاندنی رات میں آیا میرا ساجن بر |

۱۲۸ فیلن فعل فعلاتن فیلن فعولن — فصلِ بہار مرا دل توڑ گئی ہے

(فیلن فعول فعولن فیلن فعولن)

۱۲۹ فیلن فعل فعلاتن فعل فاعلن — ایک حسیں نہیں ہے مرے شہر میں

(فیلن فعول فعولن مفاعیل فع)

۱۳۰ فیلن فعل فعلاتن فیلن فاعلن — فصلِ بہار نہیں ہے دور دور تک

(فعول فعولن)

۱۳۱ فیلن فعل فعلن فعلاتن فعلن — صبحِ بہار پیالہ فگن ہے کہ نہیں

(فیلن فعول فعول مفاعیل فعل)

۱۳۲ فیلن فعل فعلن فعلاتن فیلن — صبحِ بہار پیالہ فگن ہے، غافل!

(فیلن فعول فعول فعولن فیلن)

۱۳۳ فیلن فعل فعل فعولن مفتعلن — چھوڑ گیا ہمیں ستمگر کس کے لئے

(مفتعلن مفاعلن مفعول فعل)

۱۳۴ فیلن فعل فعل فعولن مفعولن — چھوڑ گیا ہمیں ستمگر کاہے کو

۱۳۵ فیلن فعل فعل فاعلن مفتعلن — کوئی مرے دکھی دلیس کو چھوڑ گیا

(فیلن فعل مفاعیل مفعول فعل)

۱۳۶ فیلن فعل فعل فاعلن مفعولن — کوئی نہیں ترے حسن کا پروانہ

۱۳۷ فیلن فعل فعل فعل فاعلن مفاعلن — کوئی مرے دکھی دیس سے چلا گیا

(مفتعلن مفاعیل فع مفاعلن)

۱۳۸ فیلن مفاعلن فعل فعل فاعلن — چھوڑ گیا مرا صنم مرے شہر کو

۱۳۹ فیلن فع فعل فاعلن مفتعلن — ظالم! ہم ترے شہر کو چھوڑ چلے

(مفعولن مفاعیل فع مفاعلن)

۱۴۰ فیلن فع فعل فاعلن مفاعلن — پیارے ہم ترے عشق میں جوان رہے

(مفعولن مفاعیل فع مفاعلن)

| | | |
|---|---|---|
| ۱۴۱ | فع فعل فاعلن فَیلن مفتعلن | کیا مرے شہر میں اک محبوب نہیں |
| ۱۴۲ | فع فعل فاعلن فَیلن مفعولن | وہ مرے دیس میں آیا ہے، یارو! |

---

| | | |
|---|---|---|
| ۱۴۳ | فعلن فعلن فَیلن فعلن | میرے سامنے آ اک دن، اے جانِ غزل! |
| ۱۴۴ | فعلن فعلن فَیلن فَیلن فَیلن | ترے واسطے ہم بستی بستی گھومے |
| ۱۴۵ | فعلن فعلن فعل فعولن فعلن | مرا ہوش رُبا مجھے کہاں چھوڑ گیا |
| ۱۴۶ | فعلن فعلن فعل فعولن فَیلن | مرا ہوش رُبا کدھر گیا ہے، یارو؟ |
| ۱۴۷ | فعلن فعلن فَیل فعولن فعلن | مرا ہوش رُبا آج مجھے چھوڑ گیا |
| ۱۴۸ | فعلن فعلن فَیل فعولن فَیلن | مرا ہوش ربا ڈھونڈ رہا ہے مجھ کو |
| ۱۴۹ | فعلن فعلن فعل فاعلن فَیلن | مرا ہوش ربا میرے شہر میں آیا |

---

| | | |
|---|---|---|
| ۱۵۰ | فعلن فَیلن فعلن فَیلن فَیلن | وہ بتِ کافر نہ ملا صدق دل سے |
| ۱۵۱ | فعلن فَیلن فَیلن فعلن فَیلن | ہے رواں یوں ہی یہ قافلۂ ماضی |
| ۱۵۲ | فعلن فَیلن فَیلن فَیلن فعلن | مگر اس کو آخر ہم پہچان گئے |
| ۱۵۳ | فعلن فَیلن فَیلن فَیلن فَیلن | دل آوارہ بستی بستی گھوما |
| ۱۵۴ | فعلن فَیلن فعل فعولن فعلن | میرا مستقبل کسی کو معلوم نہیں |
| ۱۵۵ | فعلن فَیلن فعل فعولن فَیلن | نہ رہی بلبل ترے قفس میں گلچیں |
| ۱۵۶ | فعلن فَیلن فَیل فعولن فعلن | کوئی ہم کو مجبورِ فغاں چھوڑ گیا |
| ۱۵۷ | فعلن فَیلن فَیل فعولن فَیلن | تری دنیا میں چین نہ پایا ہم نے |
| ۱۵۸ | فعلن فَیلن فَیل فاعلن فَیلن | کوئی جاتا ہے دور دیس کو، یارو |
| ۱۵۹ | فعلن فَیلن فعل فاعلن فَیلن | کوئی آیا ہے بڑی دور سے، یارو |
| ۱۶۰ | فعلن فَیلن فَیلن فعل فعولن | نہ رہا کوئی غنچہ کسی چمن میں |
| ۱۶۱ | فعلن فَیلن فَیلن فعل فاعلن | دل ناداں عاشق ہے ترے ظلم کا |

۱۶۲ فعلن فیلن فیلن فیل فاعلن — کوئی دیوانہ مرتا ہے ترے لئے

---

۱۶۳ فعلن فیل فعل فعلاتن فعلن — کوئی گلفام نہیں جو چمن میں، یہی
(فعلن فیل فعول مفاعیل فعل)

۱۶۴ فعلن فیل فعل فعلاتن فیلن — کوئی گلفام نہیں ہے چمن میں، یارو!
(فعلن فیل فعول فعولن فیلن)

۱۶۵ فعلن فیل فعولن فیلن فیلن — نہ رہی اب کوئی حسرت دل میں باقی

۱۶۶ فعلن فیل فعولن فعل فعولن — نہ رہی کوئی تمنا دلِ حزیں میں

۱۶۷ فعلن فیل فعولن فعل فاعلن — نہ رہا کوئی شگوفہ میرے باغ میں

---

۱۶۸ فیلن فیل فاعلن فیلن فیلن — نہ رہا دور دور تک کوئی غنچہ

۱۶۹ فعلن فیل فاعلن فعل فعولن — نہ رہی کوئی آرزو دلِ حزیں میں!

۱۷۰ فعلن فیل فاعلن فیل فعولن — نہ رہا کوئی دلربا چاند نگر میں!

---

۱۷۱ فعلن فعل فاعلن فیلن فعلن — نہ رہو دکھی دیس میں یارو، نہ رہو
(فعلن مفاعیل مفعولن فعلن)

۱۷۲ فعلن فعل فاعلن فیلن فیلن — نہ رہا کسی چمن، باغ میں کوئی غنچہ

۱۷۳ فعلن فعل فاعلن فعل فعولن — نہ رہی کوئی آرزو، دل حزیں میں

۱۷۴ فعلن فعل فاعلن فیل فعولن — جو گرے مرے جسم پر برقِ تبسم

---

۱۷۵ فعلن فعل فعولن فیلن فیلن — کوئی پھر میری طرف آتا ہے، یارو!

۱۷۶ فعلن فعل فعولن فعل فعولن — کوئی پھر میری نظر میں سما گیا ہے

۱۷۷ فعلن فعل فعولن فیل فعولن — کوئی پھر میری نظر میں گھوم رہا ہے

۱۷۸ فعلن فعل فعولن فعل فعولن — نہ رہی دل حزیں میں کوئی آرزو

۱۷۹ فعلن مفاعلن فعلن فع فعلن — کوئی پھر مجھے پکار رہا ہے کہ تمہیں
(فعلن مفاعلان مفاعیل فعل)

۱۸۰ فعلن مفاعلن فعلن فیلن فع — کوئی پھر مجھے پکار رہا ہو جیسے
(فعلن مفاعلان فعولن فیلن)

---

ان میں سے ہر وزن کے آخری حرف سے پہلے ایک الف (فعل کی صورت میں 'و') کا اضافہ کر دیا جائے، تو مزید ۱۸۰ اوزان حاصل ہو سکینگے۔ اس تحریر کے شروع میں ناصر شہزاد کی جو غزل درج کی گئی ہے، اس کا ہر مصرع مندرجۂ بالا اوزان میں سے کسی ایک میں ہے۔

---

## کتابیات


بحر الفصاحت از مولوی محمد نجم الغنی خاں: نول کشور، لکھنو، ۱۹۱۷ء

چاندنی کی پتیاں از ناصر شہزاد: لاہور (بار اول)

زر کامل عیار ترجمہ معیار الاشعار از مظفر علی اسیر: نولکشور کانپور، ۱۹۰۵ء

سریلے بول از عظمت اللہ خاں: کراچی، ۱۹۵۹ء

شرح دیوان غالب از نظم طباطبائی: لکھنو، ۱۹۵۴ء

مقیاس الاشعار از مرزا محمد جعفر اوج: لکھنو، ۱۳۰۵ھ


●●

---

سید امیر حسین عابدی

# دیوانِ رضا — تعارف

رضا نام اور تخلص کے بہت سے شاعر گذرے ہیں۔ ان کے نام بھی ایک دوسرے سے اتنے ملتے ہیں کہ اگر ایک کا نام یا کلام دوسرے سے مخلوط ہو جائے، یا ہو گیا ہو، تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہوگی۔ مثلاً مختلف تذکروں میں مندرجۂ ذیل رضا کے نام ملتے ہیں۔

(۱) شیخ محمد رضا تتوی[۱]، شاگرد میر عبد الجلیل بلگرامی[۲] (۲) رضا لاہیجانی، (۳) محمد محسن متخلص بہ رضا[۳] (۴) رضا مشہدی[۴] (۵) ملا مرزا محمد رضا اصفہانی پسر ملا باقر مجلسی[۵] (۶) مرزا رضا[۶] (۷) مرزا محمد رضا قومشی (۸) میر محمد رضا المعروف بمیر محمد عظیم آبادی شاگرد ضیا شاہجہاں آبادی (۹) رضا جربادقانی (۱۰) مرزا سید رضا

---

۱۔ یہ اصلاً سیستانی تھے مگر ٹھٹھہ میں پیدا ہوئے اور بھکر کو اپنا وطن بنالیا تھا ۱۱۴۴ھ/۳۱-۱۷۳۰ء میں انتقال کیا۔

۲۔ ۱۰۷۱ھ تا ۱۱۳۸ھ/۶۱-۱۶۶۰ء تا ۲۶-۱۷۲۵ء

۳۔ یہ شیخ محمد شجاع دہلوی کی اولاد میں تھے۔ آخر میں فرخ آباد میں رہنے لگے تھے۔

۴۔ یہ ہندوستان آئے تھے۔

۵۔ متوفی ۱۱۱۰ھ/۱۶۹۹ء۔

۶۔ یہ قزوین کے اطراف کے رہنے والے اور شاہِ عباس کبیر (۹۸۵-۱۰۳۸ھ/۱۵۸۷-۱۶۲۹ء) کے مقربین میں تھے۔

۷۔ انھوں نے مرشد آباد میں جسے اپنا وطن بنالیا تھا ۱۲۰۶ھ/۹۲-۱۷۹۱ء میں انتقال کیا۔

۸۔ انھوں نے گیارھویں ہجری کے آخر میں انتقال کیا۔

(۱۱) میر محمد رضا (۱۲) شاہ رضا متخلص برضائی تہرانی[10] (۱۳) میرزا محمد رضا شیرازی (۱۴) آقا رضا گیلانی[11] (۱۵) میر محمد رضا خوانساری (۱۶) محمد رضا بیگ ہمدانی (۱۷) آقا رضا پاشا اصفہانی (۱۸) شاہ رضا کشمیر متخلص بہ چشم (۱۹) محمد رضا کنٹ کشمیری (۲۰) محمد رضا کشمیری، فرزند قاضی ابوالوفا (۲۱) خواجہ محمد رضا تربتی متخلص بہ رضا دوری (۲۲) رضا سمنانی (۲۳) شرف الدین رضا سبزواری (۲۴) محمد رضا بلگرامی (۲۵) مولانا مرزا محمد رضا جوینی[12] (۲۶) حکیم شاہ رضا اصفہانی[13] (۲۷) محمد رضا تبریزی اصفہانی متخلص بہ راضی (۲۸) مولانا محمد رضا کاشی (۲۹) میر رضا نیشاپوری (۳۰) قاضی میر محمد رضا ضوی (۳۱) مرزا شاہ رضا اصفہانی[14]

بمبئی ٹرسٹ کی جامع مسجد کی لائبریری میں دیوان رضا کے نام سے ایک قلمی نسخہ ہے[15]۔ مظفر حسین صبا نے ایک شاعر رضا شیرازی کا ذکر کیا ہے اور ان کے متعلق صرف اتنا تعارفی فقرہ لکھا ہے[16]۔ "رضا شیرازی خامہ اش را منصب جادو طرازی" اور اس کے یہ دو شعر دیئے ہیں، جو اس قلمی دیوان میں بھی موجود ہیں:

گر بصورت بجناب تو رہے نیست مرا — ہست دل را بدل از عالم معنے را ہے

آنجا کہ پائے تست مرا سر نمی رسد — دستم بدامن تو ستمگر! نمی رسد

۹۔ شاہ سلیمانی (۱۰۷۷ - ۱۱۰۵ھ/۱۶۶۷ - ۱۶۹۴ء) کے زمانے میں وہ قم کے وزیر تھے۔

۱۰۔ میر شاہ بہاء الدولہ کے بیٹے تھے۔

۱۱۔ انھوں نے افغانوں کے غلبے کے وقت انتقال کیا۔

۱۲۔ شاہ عباس ثانی کے عہد میں وہ مازندران کے وزیر تھے۔ نیز بادشاہ نے اپنی ایک کنیز سے ان کی شادی کرادی تھی۔

۱۳۔ یہ فارس کے علاقہ کے رہنے والے تھے۔ مگر مولف مخزن نے لکھا ہے کہ ممکن ہے یہ وہی مولانا رضا جوینی ہوں۔

۱۴۔ صاحب عرفات عاشقین کے زمانے میں یہ قلندر ہوکر ہندوستان آئے اور کشمیر میں انتقال کیا۔

۱۵۔ نمبر ۳۲۶۔

۱۶۔ روز روشن: ۲۴۶

اس سے خیال ہوتا ہے کہ اس دیوان کے مؤلف رضا شیرازی ہیں۔ مگر خود اس دیوان سے کچھ پتا نہیں چلتا کہ اس کے مصنف شیرازی ہیں یا ایران سے ان کا کوئی تعلق ہے۔ بھگوان داس نے ایک رضا شیرازی کا ذکر کیا ہے جن کا پورا نام مرزا محمد رضا لکھا ہے اور کہا ہے کہ وہ شیراز کے سادات میں سے تھے۔ نیز ان کے زہد و تقویٰ کی بڑی تعریف کی ہے اور لکھا ہے "بحسن سیرت و خلق و صفائی ذہن موصوف، بطاعات و عبادات مشغول بودہ"[۱۷] ان کے بیان کے مطابق وہ شاہ طہماسپ ثانی (ف ۱۷۳۱ء) کے حکم سے شہر لار کے حاکم مقرر ہوئے تھے۔ نیز لکھا ہے کہ وہ کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے۔ یہ سب باتیں ایسی ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ یہ کوئی اور رضا رہے ہونگے۔ اس لئے کہ اس دیوان کے مصنف شاہجہاں کے عہد میں ہندوستان میں موجود تھے۔ جب کہ شاہ طہماسپ ثانی کا زمانہ اس کے بعد ہے۔ نیز یہ کہ اس کے مصنف صاحب دیوان ہیں، جب کہ وہ رضا صرف کبھی کبھی شعر کہا کرتے تھے۔ مزید برآں دیوان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مصنف کوئی متقی اور زاہد شخص نہیں ہو سکتا۔

دیوان کے بعض اشعار سے شاعر کے والد کا نام جلالی ملتا ہے۔[۱۸] ان کے والد ہی نے ان کا نام جلال اور تخلص رضا رکھا تھا:

پدر کہ ہست جلالی تخلصش در شعر　　رضا تخلص من داد و نام کرد جلال

غالباً اس شعر میں بھی شاعر نے اپنے والد کی طرف اشارہ کیا ہے:

چوں رضا از جلالی شاہی　　شدہ ام من سخنورے کہ مپرس

---

۱۷۔ سفینۂ ہندی: ۹۱

۱۸۔ جلالی کے نام کے کئی شاعروں کا ذکر تذکروں میں ملتا ہے۔ مثلاً ایک جلالی ہمایوں بادشاہ کے معاصر تھے۔ دوسرے جلالی ابن جلال کاشانی ہیں۔ تیسرے وہ جلالی جو سلطان حسین مرزا (ف ۸۰۸ھ/۱۴۰۵-۶ء) کے زمانے کے بڑے شعرا میں سے تھے جو تھے جلال الدین محمد اردستانی متخلص بجلالی ہیں۔ ممکن ہے کہ یہاں ہمایوں کے ہم عصر جلالی مراد ہوں۔

بعض اشعار سے پتا چلتا ہے کہ شاعر پہلے آگرے میں تھا، جہاں اس کا معشوق رہا کرتا تھا۔ مگر وہاں سے مایوس ہوکر اسے گجرات جانا پڑا، یہ سفر اس پر بہت شاق گذرا تھا:

رضا اگر نہ بچشم تو آگرہ است آگرہ　　　چنیں کہ عازم گجرات گشتۂ خوب است

دریغ و درد کہ از کوئے یار خواہم رفت　　　زکوئے یار باحوال زار خواہم رفت

من غریب رضا بعد ازیں سوئے گجرات　　　اجازت ار بود از شہر یار خواہم رفت

رفتہ رفتہ رضا کو گجرات سے غیر معمولی عشق پیدا ہوگیا اور وہ اسے کشمیر اور کابل پر بھی ترجیح دینے لگا۔

رضا تا یافت ذوق اہل شور انگیز گجراتی　　　نمی آرد بخاطر میوۂ کشمیر و کابل را

لب بزلطی گجراتیاں رضا آموخت　　　نمی کشاد دل او سوئے سبزۂ کشمیر

آہستہ آہستہ گجرات سے دلچسپی پیدا ہوگئی اور وہ اسے اپنا وطن کہنے لگا۔ حسب ذیل مسلسل غزلوں میں اس نے بڑی وارفتگی سے اور والہانہ انداز میں گجرات اور اس کے حسین معشوقوں اور عام طور سے گجراتیوں کی تعریف و توصیف کی ہے۔

کار خوبان خطۂ گجرات　　　ہمہ ناز است و شوخی و حرکات

اندر و مہوشان نوش لباں　　　ہر یکے جانفزا چو آب حیات

ہمہ در حسن صاحبان نصاب　　　لیک کس را نمی دہند زکوٰۃ

لب چو آب حیات شان جانبخش　　　سبزۂ خط سبز خضر صفات

ہست حسن و جمال این خوباں　　　وجہ ذات و صفات را مرآت

کار من بر دبود در ہمہ حال　　　لیک در بزم شان شدم شہمات

وطن دل نشین تست رضا
شہر گجرات و بر نبی صلوات

برا تیاں ستمگر و شوخی شعار شاں    مکر و فریب و جور و جفا ہست کار شاں
ہر دم بغمزہ غارت صد ملک دل کنند    بر خانہ جنگی است و ستیزہ مدار شاں
حرف وفا نخواندہ ز دیوان دوستی    باشد ہمیشہ از سخن مہر عار شاں
وابستہ شاں بجور و جفا حسن راہبر    اندر پئے وفا نبود اصرار شاں
رضا مدام دل دردمند من    بادرد عشق کردہ وطن در دیار شاں

برا تیاں شکر لب و شیریں زبان شاں    شیریں تر از شکر سخن اندر دہان شاں
و جفا و ناز و ستم مے کنند و بس    سفے از دو تا بجز زالفت نشان شاں
زاہر از نگاہ شاں بدم ناز مے چکد    آب حیات از دو لب جانفشان شاں
از غمزہ می کشند و بعشوہ دہند جاں    باشد مدام از دو لب جانفشان شاں
ہنگام ناز و عشوہ و شوخی و دلبری    صد نکتہ سر زند ز دل نکتہ دان شاں
سرہائے سرکشاں بسبزہ بیفگنند    آں دم کہ ناز و عشوہ کند سرگران شاں
بے مہر و بے مروت و بے درد و سست عہد    من چوں رضا فتادہ ام اندر میان شاں

رضا کو حضرت علی سے نصیریوں جیسی عقیدت معلوم ہوتی ہے:

حیدر کہ بود وسیلۂ بخشایش    مارا نبود بغیر اورا رامش

ہمچو رضا نصیری شاہ نہٗ!    آگاہ ز سر شاہ باللہ نہٗ!
آں کہ تو از حقش جدا میدانی    واگرد ز راہ ما کہ ہمراہ نہٗ

رفتہ رفتہ اس پر تصوّف کا رنگ غالب آگیا اور گجرات کے مشہور صوفی شاہ عالم[1] ابن قطب عالم[2] کے مرید ہوگئے۔ اپنے پیر کا ذکر متعدد شعروں میں کیا ہے:

---

۱۔ سید محمد مخاطب بہ شاہ عالم ۲۹ ذی قعدہ ۸۱۷ھ/۱۵ /۱۴۱۴ء کو پیدا ہوئے اور ۲۰ جمادی الثانی ۸۸۰ھ/۱۴۷۵ء کو انتقال کیا احمد آباد کے محلہ رسول آباد میں مدفون ہوئے۔
۲۔ ابو محمد برہان الدین مخاطب بہ قطب عالم ابن شاہ محمد بن سید جلال مخدوم جہانیاں ۹۷۰ھ/۱۳۸۸ء میں پیدا ہوئے اور ۸۵۷ھ/۱۴۵۳ء میں انتقال کیا۔ آپ احمد آباد کے محلہ بتوہ میں مدفون ہیں۔

شاہِ عالم گنجِ حسن آرا بادل — لطفش باشد بجملہ عالم شامل
در چشمِ شہودم اوست دریجر وجود — آب و گہر و موج و حباب و ساحل

---

از دولتِ شاہِ عالم آں فخرِ امام — ز آغازِ مرا لطیف تر شد انجام
... بنظرِ مہر بدل لغمہ بگوش — در دستم جام و لعلِ محبوب بکام

---

ز الطافِ شاہ عالم در محبت — رضا من از محمد یادگارم!
سیّد محمد آنکہ بخلقِ محمدی — داد از کرم مکارمِ اخلاق و رواج
خود شاہِ عالم است کہ سیّد محمد است — در چشمِ راست بین رضا بر خلافِ کاج

رضا نے بادشاہِ وقت شاہجہاں کی بھی مدح کی ہے:—

اے رضا! تا آنکہ تختِ شاہِ جہاں (؟) — رونق افروز است اندر ملکِ ہند اسلام

ایک جگہ اس نے اپنے افلاس اور تنگدستی کا ذکر کیا ہے جس سے غالباً حسنِ طلب مقصد تھا:

نبود اندر درگہِ شاہِ جہاں — از رضا ہرگز کسے درویش تر

ایک قصیدہ کسی خان کی تعریف میں ہے۔ پتا نہیں چلتا کہ یہ کون تھے: اس کا پہلا مصرع یہ ہے:

اے خاکِ نیک محضر اے دہر از تو گلشن

شاعر اپنے عہد کا ترجمان ہوتا ہے۔ رضا بھی امرد پرستی میں دوسرے شاعروں سے پیچھے نہ تھے۔ ایک جگہ لکھتا ہے:

اے خسروِ خوباں چو تو شیریں پسرے نیست — در شہر شیرینی تو لبِ شکرے نیست

یہ پوری غزل کسی جوان محبوب کی تصویر کشی ہے:—

دوش در راہ جوانے دیدم — نہ جوان آفتِ جانے دیدم
از مژہ غمزۂ خوں ریزش را — زہر آلودہ سنانے دیدم

۱ بغم غنچۂ تنگ دہنش تنگ دل ماندہ جہانے دیدم
سوئے چشمش چو فگندم نظرے در وے از فتنہ نشانے دیدم
بُردم از نکتۂ باریک نشان ہچو مو ئیش میانے دیدم
مہر افزود بدل کاں مہ را کمتر از ذرہ دہانے دیدم
در فراقِ تو رضا راہ روم
چشمِ خونابہ فشانے دیدم

وہ بھی دوسرے شعرا کی طرح اپنے ہمعصروں اور اپنے زمانہ سے شکایت رکھتے تھے:
رضا! من خود نمی بینم ز خویشاں خوش نگہی راست میخواند سگ ہندوستانی خویش را

---

ں بر زمین بخیل شدہ است روزی بندگاں خلیل شدہ است
سلم و تحقیق در زمانہ نماند روز بازار قال و قیل شدہ است

یوان رضا کا یہ قلمی نسخہ شروع سے ناقص ہے، اس کے شروع میں قصیدے
یں، اس ناقص حصہ کے سب سے پہلے قصیدہ کا آخری شعر یہ ہے:
لطفِ تو رضا چو خبر داد در گذار در باغِ عشق بلبل بستاں سرا گشت
ں کے بعد دوسرے قصیدے ان مطلعوں سے شروع ہوتے ہیں:
کم گرفت خسرو گردوں جناب صبح بنمود چہرہ شاہد شرق از نقاب صبح

---

حرمی کہ دورت قبلہ گہ دل افتاد حرم کعبہ بمحراب تو مائل افتاد

---

بصبح رخت ہر کہ جہاں نمی گیرد چو آفتاب جمالت جہاں ہمی گیرد

---

نیب دلے کہ خانۂ از گل بنا کند از بہر یادگار نہ بہر ریا کند

---

علم خسروِ انجم زِ افق پیدا شد      ملکۂ شب بشبخون سحر یغما شد

قصیدہ کا حصہ آخر سے بھی ناقص ہے:۔

اس کے بعد ۲۹۴ رباعیاں ہیں چونکہ آخر سے یہ حصہ بھی ناقص ہے۔ اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ کتنی ضائع ہو گئیں۔ ایک رباعی بطور نمونہ پیش کی جاتی ہے:

تا کے بحسنِ باطن وظاہر باشی      دشنام دہندہ مظاہر باشی
با این ہمہ ناپاکی و بدگوئی خلق      حاشا کہ زحاندان طاہر باشی

رباعیوں کے بعد پھر قصیدے ہیں، جو شروع میں ناقص ہیں۔ سب سے پہلے (ناقص) کا آخری شعر یہ ہے:

رضا عشق و تولا عین ایمانست      دلِ خود را زِ غیرِ عشق واگیر

اس کے بعد کے قصیدے ان مطلعوں سے شروع ہوتے ہیں:

شاد باش اے نسیمِ طرۂ یار      مرحبا، مرحبا، بیا و بیار

دادگر خور دو ... حتاس      خیرہ شد دیدہ تیرہ گشت حواس

برخیزانِ غمِ جاناں، جاں ما حتسر است اے دل!      از خود چہ محل دار د سر در خطر است اے

چساں گویم نثار شاہِ عالم      سخن نبود سزائے شاہِ عالم

دل بستۂ روئے دل ستانیم      جساں خستہ خون آں جوانیم

اے خانِ نیک محضر اے دہر از تو گلشن      دولت ... چوں من .. چشم روشن

اے لطفت تو مفرح جانِ حزینِ من      مہرِ تو در ازل شدہ مہرِ نگینِ من

اگر گردشِ چرخِ مینا نبودے    چنیں پُر گل این باغ والا نبودے

روزِ عید است بدہ بادۂ عشرت ساقی!    کہ بوصلِ تو زحد رفت مرا اشتاقی
قصیدوں کے اس حصہ میں تقریباً ۲۱۰ شعر ہیں۔
اس کے بعد غزلوں کی باری آتی ہے، پہلی غزل کا مطلع ہے۔
ازازل بکشاد ساقی شیشۂ صہبا مرا    آشکارا ساخت سبزِ گنبدِ مینا مرا
غزلوں کا حصہ بھی ردیف ت میں ناقص ہے۔ بہر حال ان میں ۲۴۱۵ شعر سے کم نہیں؛ ایک غزل کا ہر پہلا مصرع فارسی اور دوسرا عربی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کو فارسی کے علاوہ عربی میں بھی قدرت حاصل تھی:-
ما ئیم و غم عشق تو اے دل بر رعنا!    مالہا؛ سوی الغم من القلب رفعنا
رضا کے اشعار عام طور سے متوسط درجہ کے ہیں۔ یہاں ان کے کچھ اچھے اور سلیس اشعار نقل کئے جاتے ہیں:-

بار دیگر بہار آمدہ است    باز ہنگام کار آمدہ است
باشکر لب بُتانِ شیریں لب    وقت بوس و کنار آمدہ است

موسم عید است مے بسیار می باید کشید    جام گلگوں بر رخِ دلدار می باید کشید
از سبک روحی ندارم طاقت بار گراں    تا بکے از جبہ و دستار می باید کشید
سب سے آخر میں قطعے ہیں جن کے اشعار کی تعداد تقریباً ۲۰۱ ہے۔ ان میں دو قطعے محمود بن بدا کی وفات پر کہے ہیں، جو شاہ محمود کی اولاد اور شاہ شیخ کی نسل میں تھے۔ یہ علم و عمل دونوں میں اتنے بلند پایہ تھے کہ ان کے والد نے انھیں اپنی زندگی ہی میں اپنا جانشین بنا دیا تھا۔ مگر وہ ان کے سامنے انتقال کر گئے۔ رضا نے ان کا قطعۂ تاریخ کہا ہے:
محمود بن بدا چو سوئے خلد شد رواں    محمود گشت عاقبت کارش از خدا

درآل شاہ محمود اوراست سروری (؟) درنسل شاہ شیخ باوبود اقتدا
ہم درحیات خود پدرش ساخت جانشیں     تا پیروی کنندہ باو اھل اھتدا
اور تاریخ وفات اس مصرع سے نکلتی ہے:

"تاریخ سال فوت زداغ دل بدا"
(۱۰۴۶)

دوسرے قطعے میں یہی تاریخ اس مصرع سے نکلتی ہے:

باد بروے رحمت حق جاودان
(۱۰۴۶)

ان تاریخوں سے یہ ثابت ہوگیا کہ رضا ۱۰۴۶ھ/۳۷-۱۶۳۶ء تک حتماً زندہ تھے۔

## کتابیات


۱- ابوالفضل : آئین اکبری، مشن پریس، کلکتہ ۱۸۷۲ء

۲- تقی اوحدی : عرفات عاشقین، نسخہ خطی شمارہ ۳۲/۱۵ ذخیرہ حبیب گنج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔

۳- ناظم تبریزی : نظم گزیدہ، نسخہ خطی شمارہ ۹۲۰/۲۳ " "

۴- سیف الدین محمد : فانوس خیال، نسخہ خطی شمارہ ۹۲۰/۲۵، حبیب گنج۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

۵- احمد علی ہاشمی سندیلوی : مخزن الغرائب، نسخہ خطی شمارہ ۵۱/۶، ذخیرۂ حبیب گنج " "

۶- بندرابن داس خوشگو : سفینۂ خوشگو، ادارۂ تحقیقات عربی و فارسی، پٹنہ، ۱۹۵۹ء

۷- بھگوان داس ہندی : سفینۂ ہندی، ادارۂ تحقیقات عربی و فارسی، پٹنہ، ۱۹۵۸ء

۸- سید علی حسن خان : صبح گلشن، مطبع فیض شاہجہانی، بھوپال

۹- مولوی مظفر حسین صبا : روز روشن، مطبع شاہجہانی، بھوپال

۱۰- نواب نور الحسن خان : نگارستان سخن، مطبع شاہجہانی، بھوپال، ۱۲۹۳ھ

۱۱- میرحسین دوست سنبھلی : تذکرۂ حسینی، مطبع نول کشور۔ لکھنؤ۔

۱۲- پیرغلام حسن کھویہامی : تاریخ حسن، محکمۂ تحقیقات و اشاعت، حکومت جموں و

کشمیر، سری نگر، ۱۹۶۱ء

۱۳- استانلی لین پول : طبقاتِ سلاطین اسلام، ترجمہ عباس اقبال، مطبع مہر ۱۳۱۲ شمسی۔

۱۴- محمد علی تبریزی : ریحانۃ الادب، چاپ خانہ شرکت، مطبع کتاب ۱۳۶۹ قمری۔

۱۵- محمد عبدالغنی خان : تذکرۃ الشعراء، مطبع انسٹی ٹیوٹ گزٹ۔ علی گڑھ۔

۱۶- رحم علی خاں ایمان : منتخب اللطائف، نسخہ خطی، دہلی یونی ورسٹی۔

••

محمد انصار اللہ نظر

# اشرف علی خاں فغاں

اشرف علی خاں نام، فغاں تخلص۔ تاریخ ولادت کا کسی تذکرہ نگار نے ذکر نہیں کیا لیکن چونکہ وہ احمد شاہ بادشاہ دہلی کے کوکہ تھے[1]۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ وہ بھی ۱۱۳۸ھ ۱۷۲۵ء کے قریب پیدا ہوئے ہونگے، جو احمد شاہ کا سالِ ولادت ہے[2]۔ ان کی ولادت احمد شاہ سے کچھ پہلے ہونا چاہیے جس سے احمد شاہ کی رضاعت ان کی والدہ کے سپرد ہوئی۔ غالباً یہی بات ان کی دربار میں رسائی اور جاہ و منصب پانے کا بھی وسیلہ بن گئی۔ احمد شاہ کے باپ محمد شاہ (ف ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء) کے عہد میں انھیں منصب عطا ہوا[3]۔ قیاس یہ ہے کہ یہ محمد شاہی دور کے آخری زمانے میں ہوا ہوگا: اس کی وفات کے وقت فغاں کی عمر بھی ۲۰ - ۲۱ برس کی ہوگی۔ جب احمد شاہ بادشاہ ہوا (۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء) تو ان کا ستارہ عروج پر پہنچا: یہ زمرۂ امرا میں داخل ہوئے[4]، پنج ہزاری منصب ملا اور کوکہ خاں خطاب عطا ہوا[5]، جب احمد شاہ ۱۱۶۷ھ/۱۷۵۴ء میں گرفتار ہو کر معزول ہوا، تو یہ دلّی چھوڑ کر

---

۱- گلشن سخن: ۱۰۹، دستور الفصاحت: ۶۴، تذکرہ مسرت افزا: ۱۵۰، مقالات الشعرا بحوالہ دستور الفصاحت: حاشیہ: ۶۴، تکملۃ الشعرا بحوالہ ایضاً: ۶۵

۲- اورنٹیل بایوگرافیکل ڈکشنری: ۲۸

۳- فص الکلمات بحوالہ دستور الفصاحت: حاشیہ: ۶۴

۴- نکات الشعرا: ۷۸، چمنستانِ شعرا: ۴۸۰

۵- تذکرۃ الشعرا بحوالہ دستور الفصاحت: حاشیہ: ۶۴: مخزن نکات: ۴۲

اپنے چچا ایرج خاں کے پاس مرشد آباد چلے گئے، جو وہاں صاحب اقتدار و رسوخ تھے[6]۔ غالباً کچھ دنوں کے بعد یہیں سے نواب شجاع الدولہ کے پاس فیض آباد پہنچے[7]۔ چونکہ شجاع الدولہ صفدر جنگ کی وفات پر ۱۷ ذی الحجہ ۱۱۶۷ھ اواخر ۱۱۶۷ھ/۱۷۵۴ء میں تخت نشین ہوا تھا، فغاں کا یہ نقلِ مکانی اس سے پہلے کا واقعہ نہیں ہو سکتا۔ پس مبتلا کا اسے اواخرِ عہد سلطنت احمد شاہ[9]، اور عاشقی کا اوائل عہد احمد شاہ مرحوم[10] کا واقعہ بیان کرنا درست نہیں ہو سکتا۔ جب تک احمد شاہ کا دور دورہ تھا، فغاں کو یہاں سے نکلنے کی ضرورت نہیں تھی، وہ اس کی بے دست و پائی کے بعد ہی ترکِ وطن پر مجبور ہوئے ہونگے۔ اور یہ ۱۱۶۸ھ/۱۷۵۴ء سے پہلے نہیں ہوا ہوگا۔

نواب شجاع الدولہ کے دربار میں ایک افسوس ناک حادثہ پیش آیا۔ مصحفی نے لکھا ہے[11] کہ ایک دن عالمِ اختلاط میں نواب کی بے پروائی سے ان کا ہاتھ جل گیا، اس نے گرم پیسہ ان کے ہاتھ پر رکھ دیا تھا۔ احمد علی یکتا نے بھی یہی لکھا ہے[12]۔ اس کے برعکس محمد حسین آزاد لکھتے ہیں[13] کہ کپڑا جل گیا تھا۔ دونوں میں سے کونسا بیان صحیح ہے، اس کا فیصلہ مشکل ہے۔ لیکن نفس واقعہ سے متعلق شبہ نہیں اور تقدمِ زمانی کے باعث مصحفی اور یکتا کا قول زیادہ قابلِ اعتماد ہے، بہرحال اس حادثے پر فغاں بددل ہو کر اودھ چھوڑ، ناظم بہار

---

۶۔ آب حیات : ۱۵۱ ، نیز مجموعہ نغز ، ۲ : ۴۳ ، تذکرہ مسرت افزا : ۱۵۲

۷۔ مقالات الشعرا بحوالہ دستور الفصاحت : حاشیہ ص ۶۴

۸۔ تاریخ اودھ ، ۱ : ۲۹۴

۹۔ گلشن سخن : ۱۷۹

۱۰۔ نشتر عشق بحوالہ دستور الفصاحت : حاشیہ ص ۶۵

۱۱۔ تذکرہ ہندی گویاں : ۱۶۰

۱۲۔ دستور الفصاحت : ۶۶

۱۳۔ آب حیات : ۱۵۲

راجہ شتاب رائے کے پاس عظیم آباد چلے گئے، یہ ۱۱۷۰ھ/۱۷۵۶ء کا واقعہ ہے۔[۱۴] شتاب رائے نے ان کی مناسب آؤ بھگت کی؛ خود ان کے متکفل ہو گئے اور ان کی ظرافت طبع اور بذلہ سنجی کے پیش نظر بادشاہ شاہ عالم ثانی کے ہاں سے "ظریف الملک" خطاب دلوایا۔[۱۵] دو تین گاؤں لمغا جاگیر میں ملے۔ اور یوں فارغ البالی اور خوشحالی سے بسر ہونے لگی۔[۱۶]

محمد حسین آزاد نے راجہ شتاب رائے سے ان کے بگاڑ کی عجیب و غریب وجہ بیان کی ہے:[۱۷]

> راجہ صاحب سے بھی شکر رنجی ہو گئی۔ اس کی بنیاد یہ ہوئی کہ احمد شاہ درانی نے جو سلطنت پر حملے کئے، ایک دن اس کی دست درازی اور بے اعتدالیوں کا ذکر ہو رہا تھا۔ خدا جانے، طنز سے یا سادہ مزاجی سے راجہ صاحب نے کہا کہ نواب صاحب! ملکۂ زمانی کو احمد شاہ درانی کیونکر لے گیا؟ انھیں یہ بات ناگوار ہوئی، افسردہ ہو کر بولے کہ مہاراج! جس طرح سیتا جی کو راون لے گیا تھا، اسی طرح وہ لے گیا۔ اس دن سے دربار میں جانا چھوڑ دیا:

کسی تذکرہ نگار نے اس واقعہ کا ذکر نہیں کیا، اس زمانے میں جو ادب آداب کے قاعدے تھے اور حفظ مراتب کا جتنا خیال رکھا جاتا تھا، انھیں دیکھتے ہوئے یہ بات باور نہیں کی جا سکتی کہ شتاب رائے نے شاہی خاندان کی کسی خاتون سے متعلق ایسی خفیف اور ناشائستہ بات کہی ہو۔ غالباً یہ محض افسانہ طرازی ہے اور اسے حقیقت سے کوئی سروکار نہیں ہے۔[۱۸]

---

۱۴۔ نشترِ عشق بحوالہ دستور الفصاحت حاشیہ: ۷۵

۱۵۔ شاہ عالم اپنی شاہزادگی کے زمانے میں (جب وہ صرف عالی گوہر تھا) ممالک شرقیہ میں پھرتا رہا تھا، اس نے یہیں مرشد آباد میں ۱۱۷۳ھ/۱۷۵۹ء میں اپنی بادشاہت کا اعلان کیا۔ قیاس ہے کہ شتاب رائے کے کہنے پر اس نے فغاں کو یہ خطاب اسی زمانے میں دیا ہو گا۔

۱۶۔ نشترِ عشق (حوالہ سابق)

۱۷۔ آبِ حیات: ۱۵۳

۱۸۔ آزاد بحیثیت محقق (از قاضی عبد الودود) نوائے ادب۔ جولائی ۱۹۵۹ء

آزاد لکھتے ہیں[19] کہ راجہ شتاب رائے سے ناچاقی کے بعد حکام فرنگ کے ہاں رسائی پیدا کر کے باقی عمر آرام و آسائش سے بسر کی۔ اس کی بھی کہیں اور سے تصدیق نہیں ہوتی۔ عاشقی نے صرف اتنا لکھا ہے[20] کہ راجہ شتاب رائے کے علاوہ دوسرے امرا و معززین شہر بھی فغاں سے سلوک و مراعات سے پیش آتے تھے، اور اس کی اولاد ہنوز عظیم آباد میں اسی وجہ معاش سے بافراغت رہتی ہے۔ چونکہ عاشقی مقامی آدمی ہے اور خود فغاں کی اولاد کے حال سے بھی واقف، اس لئے اس کا بیان قابلِ ترجیح ہے

فغاں نے ۱۱۸۶ھ/۱۷۷۲-۱۷۷۳ء میں عظیم آباد میں انتقال کیا اور وہیں دفن ہوئے۔[21] بعض تذکرہ نویسوں نے تاریخ وفات ۱۱۹۵ھ اور بعض نے ۱۱۹۶ھ بھی لکھی ہے لیکن مرجح ۱۱۸۶ھ ہی ہے:

فغاں نے شعر سے دلچسپی ورثے میں پائی تھی، اردو فارسی دونوں زبانوں میں کہتے تھے[22]: ان کے والد مرزا علی خاں بھی شاعر تھے، نکتہ تخلص تھا۔[22] ایسے ماحول میں شعر گوئی کا شوق پیدا ہو جانا تعجب کی بات نہیں، اصلاح مرزا علی قلی خاں ندیم سے کی۔[23] بیرنے قزلباش خاں امید کا نام بھی اس سلسلے میں لیا ہے[25] اور امیر اللہ نے اس کی تائید کی ہے۔[26] لیکن نساخ نے اسے غلط ٹھیرایا ہے۔[27] صحیح یہ ہے کہ اردو میں ندیم سے اور فارسی

۱۹۔ آب حیات: ۱۵۳

۲۰۔ نشترِ عشق (بحوالۂ سابق) - گلشن سخن: ۱۷۹

۲۱۔ گلشن سخن: ۱۷۹

۲۲۔ مقالات الشعرا، تکملۃ الشعرا بحوالہ دستور الفصاحت - حاشیہ ۶۴

۲۳۔ گلشن سخن۔

۲۴۔ گلشن سخن: ۱۷۹، دستور الفصاحت: ۶۶، تذکرہ ہندی گویاں: ۱۶۰

۲۵۔ نکات الشعرا: ۲۲۰

۲۶۔ تذکرہ مسرت افزا: ۱۵۲

۲۷۔ سخن شعرا: ۳۶۹

میں امید سے تلمذ تھا۔ ندیم کے تلمذ کا خود فغاں نے کئی شعروں میں اقرار کیا ہے۔ مثلاً[28]

هر چند اب ندیم کا شاگرد ہے فغاں
دو دن کے بعد دیکھنا۔ استاد ہووےگا

ندیم کی ایہام گوئی مشہور ہے[29] لیکن فغاں نے جلد ہی اس روش کو چھوڑ کر زبان کی صفائی پر توجہ کی۔ اردو اور فارسی کا منتخب دیوان چھپ چکا ہے۔ سید صباح الدین عبدالرحمن نے بسیط مقدمے کے ساتھ اسے مرتب کیا اور انجمن ترقی اردو، کراچی۔ نے ۱۹۵۰ء میں شائع کیا تھا۔

فغاں کی ظرافت اور خوش طبعی بے مثل تھی اور اس فن میں اسے درجۂ استادی حاصل تھا اس کی ہجو و ہزل سے اس کے معاصر ڈرتے تھے، لیکن اس کے باوجود اسکی سخنوری اور مجلس آرائی کے بھی سب قائل تھے۔ وہ خود کہتے ہیں کہ میں حاضر جوابی میں کبھی کسی سے بند نہیں ہوا، الا ایک مرتبہ کے۔ ہوا یہ کہ ایک جگہ مجلس آراستہ تھی، میں سخن لطیف و بذلۂ ظریف سے حاضرین کو مسرور و شاد کام کر رہا تھا کہ اچانک ایک طوائف جسے نہ خود آرائی کا سلیقہ تھا نہ سخن سرائی کا شعور، مجلس میں وارد ہوئی۔ لب فرش پہنچ کر اس نے جوتی اتارنا چاہی۔ اتفاق سے جوتی کا ایک پاؤں اس کے دامن میں الجھ کے قالین پر گر گیا۔ مجھے مذاق کی سوجھی، میں نے کہا: صاحبان! بی بی صاحب مجلس میں آتی ہیں جب بھی اپنے جفت کو الگ نہیں کرتیں، اسے اپنے ساتھ لاتی ہیں (جفت کے معنی جوتی کے علاوہ بیوی، شوہر کے بھی ہیں۔ اس پر وہ محجوب تو بہت ہوئی، لیکن فی البدیہہ کہا۔ ”سچ فرمایا سرکار نے، اس کنیز کا یہی شعار ہے۔ لیکن حضور جب کسی محفل میں رونق افروز ہوتے ہیں تو اپنے جفت کو خدمت گاروں اور خواصوں کے حوالے کر آتے ہیں۔ انصاف فرمایا جائے کہ حق بجانب کون ہے!“ میں اس کے اس جواب پر بہت شرمندہ ہوا، اور

---

۲۸- چمنستان شعرا: ۴۸۰

۲۹- دستور الفصاحت: ۶۶

آزاد لکھتے ہیں[19] کہ راجہ شتاب رائے سے ناچاقی کے بعد حکامِ فرنگ کے ہاں رسائی پیدا کر کے باقی عمر آرام و آسایش سے بسر کی۔ اس کی بھی کہیں اور سے تصدیق نہیں ہوتی۔ عاشقی نے صرف اتنا لکھا ہے[20] کہ راجہ شتاب رائے کے علاوہ دوسرے امرا و معززینِ شہر بھی فغاں سے سلوک و مراعات سے پیش آتے تھے، اور اس کی اولاد ہنوز عظیم آباد میں اسی وجہ معاش سے بافراغت رہتی ہے۔ چونکہ عاشقی مقامی آدمی ہے اور خود فغاں کی اولاد کے حال سے بھی واقف، اس لئے اس کا بیان قابلِ ترجیح ہے

فغاں نے ۱۱۸۶ھ/۱۷۷۲-۱۷۷۳ء میں عظیم آباد میں انتقال کیا اور وہیں دفن ہوئے[21]۔ بعض تذکرہ نویسوں نے تاریخ وفات ۱۱۹۵ھ اور بعض نے ۱۱۹۶ھ بھی لکھی ہے لیکن مرجح ۱۱۸۶ھ ہی ہے:

فغاں نے شعر سے دلچسپی ورثے میں پائی تھی، اردو فارسی دونوں زبانوں میں کہتے تھے[22]: ان کے والد مرزا علی خاں بھی شاعر تھے، نکتہ تخلص تھا[22]۔ ایسے ماحول میں شعر گوئی کا شوق پیدا ہو جانا تعجب کی بات نہیں، اصلاح مرزا علی قلی خاں ندیم سے کی[23]۔ میر نے قزلباش خاں امید کا نام بھی اس سلسلے میں لیا ہے[25] اور امیر اللہ نے اسکی تائید کی ہے[26]۔ لیکن نساخ نے اسے غلط ٹھیرایا ہے[27]۔ صحیح یہ ہے کہ اردو میں ندیم سے اور فارسی

---

۱۹- آبِ حیات: ۱۵۳

۲۰- نشترِ عشق (بحوالۂ سابق) - گلشنِ سخن: ۱۷۹

۲۱- گلشنِ سخن: ۱۷۹

۲۲- مقالات الشعراء، تکملۃ الشعراء بحوالہ دستور الفصاحت - حاشیہ ۶۴

۲۳- گلشنِ سخن۔

۲۴- گلشنِ سخن: ۱۷۹، دستور الفصاحت: ۶۶، تذکرہ ہندی گویاں: ۱۶۰

۲۵- نکات الشعراء: ۲۲۰

۲۶- تذکرہ مسرت افزا: ۱۵۲

۲۷- سخن شعرا: ۳۶۹

میں امید سے تلمذ تھا[28]۔ ندیم کے تلمذ کا خود فغاں نے کئی شعروں میں اقرار کیا ہے۔ مثلاً

ہر چند اب ندیم کا شاگرد ہے فغاں
دو دن کے بعد دیکھنا۔ استاد ہوویگا

ندیم کی ایہام گوئی مشہور[29] ہے لیکن فغاں نے جلد ہی اس روش کو چھوڑ کر زبان کی صفائی پر توجہ کی۔ اردو اور فارسی کا منتخب دیوان چھپ چکا ہے۔ سید صباح الدین عبدالرحمن نے بسیط مقدمے کے ساتھ اسے مرتب کیا اور انجمن ترقی اردو، کراچی نے ۱۹۵۰ء میں شائع کیا تھا۔

فغاں کی ظرافت اور خوش طبعی بے مثل تھی اور اس فن میں اسے درجۂ استادی حاصل تھا اس کی ہجو و ہزل سے اس کے معاصر ڈرتے تھے، لیکن اس کے باوجود اسکی سخنوری اور مجلس آرائی کے بھی سب قائل تھے۔ وہ خود کہتے ہیں کہ میں حاضر جوابی میں کبھی کسی سے بند نہیں ہوا، الّا ایک مرتبہ کے۔ ہوا یہ کہ ایک جگہ مجلس آراستہ تھی، میں سخن لطیف و بذلۂ ظریف سے حاضرین کو مسرور و شاد کام کر رہا تھا کہ اچانک ایک طوائف جسے نہ خود آرائی کا سلیقہ تھا نہ سخن سرائی کا شعور، مجلس میں وارد ہوئی۔ لب فرش پہنچ کر اس نے جوتی اتارنا چاہی۔ اتفاق سے جوتی کا ایک پاؤں اس کے دامن میں الجھ کے قالین پر گر گیا۔ مجھے مذاق کی سوجھی، میں نے کہا: صاحبان! بی بی صاحب مجلس میں آتی ہیں جب بھی اپنے جفت کو الگ نہیں کرتیں، اسے اپنے ساتھ لاتی ہیں (جفت کے معنی جوتی کے علاوہ بیوی، شوہر کے بھی ہیں۔ اس پر وہ محجوب تو بہت ہوئی، لیکن فی البدیہہ کہا۔ "سچ فرمایا سرکار نے، اس کنیز کا یہی شعار ہے۔ لیکن حضور جب کسی محفل میں رونق افروز ہوتے ہیں تو اپنے جفت کو خدمت گاروں اور خواصوں کے حوالے کر آتے ہیں۔ انصاف فرمایا جائے کہ حق بجانب کون ہے!" میں اس کے اس جواب پر بہت شرمندہ ہوا، اور

---

۲۸- چمنستان شعرا : ۳۸۰

۲۹- دستور الفصاحت : ۶۶

اشرف علی خاں فغاں

مجھے کچھ کہتے بن نہ آئی، لیکن انصاف کا جو تقاضا تھا، میں نے اس کی بدیہہ گوئی پر آفر کہی![30]

# کتابیات


آبِ حیات - محمد حسین آزاد - سرفراز پریس، لکھنو

اورینٹل بایوگرافیکل ڈکشنری از بیل - کلکتہ : ۱۸۸۱ء

تذکرہ مسرت افزا (مشمولہ معاصر، پٹنہ)

تذکرہ ہندی گویان - مصحفی (مرتبہ عبدالحق) دہلی: ۱۹۳۳ء

چمنستانِ شعرا - لچھمی نرائن شفیق (مرتبہ عبدالحق) اورنگ آباد : ۱۹۲۸ء

دستور الفصاحت - احمد علی یکتا (مرتبہ امتیاز علی عرشی) رامپور : ۱۹۴۳ء

دیوانِ فغاں - مرتبہ صباح الدین عبدالرحمن - کراچی : ۱۹۵۰ء

سخن شعرا - عبدالغفور نساخ - لکھنو : ۱۲۹۲ھ

گلشن سخن - مردان علی خاں مبتلا (مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب) لکھنو : ۱۹۶۵ء

گلشن ہند - مرزا علی لطف (مرتبہ شبلی و عبدالحق) لاہور : ۱۹۰۶ء

مجموعہ نغز - قدرت اللہ قاسم (مرتبہ محمود شیرانی) لاہور

مخزن نکات - محمد قائم قائم (مرتبہ عبدالحق) اورنگ آباد - ۱۹۲۹ء

نکات الشعرا - میر تقی میر (مرتبہ حبیب الرحمن خاں شروانی) اورنگ آباد - ۱۹۳۵ء


● ●

---

۳۰- تذکرہ مسرت افزا : ۱۵۱

# مکتوب پروفیسر محمد ابراہیم ڈار

## بنام

## قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی

[ولی گجراتی کے وطن کا مسئلہ مدتوں سے اہلِ علم کے درمیان موضوعِ نزاع بنا ہوا ہے ـــــ گجرات کے حضرات اسے احمد آبادی ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ اور حیدر آبادی، باشندہ دکن۔ ۱۹۴۵ء میں قاضی احمد میاں اختر جوناگڈھی نے ایک بسیط مقالہ لکھا، جو اسی سال "معارف" علی گڑھ کے اکتوبر کے شمارے میں "ولی گجراتی" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ بعد کو اعتراضوں سے متاثر ہوکر انھوں نے دو استدراک بھی لکھے تھے، یہ "معارف" ہی کے جولائی ۱۹۴۶ء، اکتوبر ۱۹۴۶ء اور جنوری ۱۹۴۷ء کے شماروں میں شائع ہوئے تھے۔ اس مسئلے پر مدتوں علمی حلقوں میں گفتگو ہوتی رہی۔ مرحوم ڈاکٹر محی الدین قادری زور حیدر آبادی نقطۂ نگاہ کے سب سے بڑے مؤید تھے۔ ان کی ایک دلیل جس کا ذکر انھوں نے مجھ سے کیا تھا اور جو وہ تحریر میں نہ لا سکے، یہ تھی کہ آخر کیا وجہ ہے کہ گجرات میں نہ ولی سے پہلے، نہ ولی کے بعد غزل کی کوئی روایت نہیں ملتی۔ ولی کا کلام بالکل ابتدائی دور کا نہیں کہا جا سکتا۔ گجرات میں اس سے پہلے کی ارتقائی کڑیاں کہاں گئیں؟ اور پھر اس کے بعد بھی یہ روایت قائم رہنا چاہیے تھی۔ جہاں یہ دونوں باتیں گجرات میں مفقود ہیں وہیں دکن (اورنگ آباد) میں موجود ہیں، اسی سے ولی کا دکن کا رشتہ ثابت اور استوار ہوتا ہے۔

علمی حلقے گجرات کالج احمد آباد کے پروفیسر محمد ابراہیم ڈار مرحوم کا نام نہیں بھولے ہونگے، وہ شیرانی مرحوم کے شاگرد، فارسی کے وسیع المطالعہ فاضل اور

مکتوب پروفیسر محمد ابراہیم ڈار

نکتہ بیں بصر و محقق تھے۔ افسوس، کہ موت نے انھیں فرصت نہ دی خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود۔ مئی ۱۹۵۳ء میں ان کا انتقال ہوا۔ مرحوم نے یہ خط اختر مرحوم کو ان کا مقالہ گذر چکا ہے۔ یقین ہے کہ وہ اس سے لطف اندوز ہونگے۔ مالک رام )

محترمی قاضی صاحب! سلام نیاز

چند روز ہوئے، ایک عریضہ خدمت گرامی میں ارسال کیا گیا تھا، مگر ابھی تک اس کے جواب سے محروم ہوں۔ رسالہ اسلامک کلچر، حیدر آباد کے شمارہ جولائی میں ہمارے فاضل دوست ڈاکٹر عنایت اللہ صاحب نے جس انداز میں آپ کی علمی فضیلت کا اعتراف اور آپ کی تازہ تصنیف ( studios islamic oriental کی تعریف کی ہے اس پر میری دلی مبارک باد قبول فرمائیں، آپ کی علمی فتوحات کا خاص دائرہ اسلامیات اور عربی ادب ہے اور اس میدان میں آپ کی تحقیقات نہایت قابل قدر اور مستحق ستائش ہیں

برادر محترم پروفیسر نجیب اشرف صاحب کی مہربانی سے آپ کا تازہ مقالہ دیکھا اور اسے کئی بار پڑھا، لیکن مجھے افسوس ہے کہ اس مضمون سے بھی الجھنیں دور نہیں ہوئیں، بلکہ بعض چیزیں اور بھی پیچیدہ ہوگئی ہیں، ولی کے گجراتی ہونے کے حق میں زبردست قرینے موجود ہیں، پھر ان کے ہوتے ہوئے ہم ایسے دلائل کا سہارا کیوں ڈھونڈھیں جو تحقیق و تدقیق کی کسوٹی پر پورے نہ اتر سکیں!

آپ کے مقالے کا لہجہ بہت سنجیدہ اور عالمانہ ہے اور مجھے یہ خوشی ہوئی کہ آپ نے کسی جگہ بھی تلخی پیدا ہونے نہیں دی اگرچہ مضمون کے ایک بڑے حصے میں روئے سخن میری طرف ہے اور صرف ایک موقع پر نجیب صاحب کا ذکر نکتہ سنج اور دقیقہ رس کی حیثیت سے کیا گیا ہے، میری گذارشات کی ضرورت اور اہمیت کو آپ یہ کہہ کر کم کرنا چاہتے ہیں کہ "ان میں سے اکثر تو اصل نقطۂ بحث سے غیر متعلق ہیں اور بعض

کا تعلق صرف جزئیات سے ہے۔" میری ناقص رائے میں یہ درست نہیں۔ میں نے مسئلہ کے جن پہلوؤں کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرائی ہے، انھیں جزئی اور ثانوی حیثیت دینا انصاف سے بعید ہے۔ بالخصوص جب کہ آپ کو خود اس بات کا اعتراف ہے کہ اس مسئلہ پر نا قابل تردید شہادت اور برہان قاطع ابھی تک آپ کی طرف سے پیش ہی نہیں کی گئی۔ میں نے اپنے پہلے خط میں مندرجہ ذیل پہلوؤں کے متعلق عرض کیا تھا:۔

صوبۂ گجرات پر دکن کا اطلاق؛ شاہ ولی اللہ اور ولی کا ایک ہونا؛ دکنی اور گجراتی الفاظ کا فرق؛ ولی کے احباب کا تذکرہ۔

ان میں سے کس چیز کو غیر متعلق یا جزئی کہا جا سکتا ہے؟ واقع یہ ہے کہ مسئلہ کے یہی اہم پہلو آپ کے مقالہ ولی کی جان ہیں اور انہی چیزوں پر آپ نے بحث کی ہے۔

(۱) طبقات محمود شاہی کا حوالہ نہ درست ہے اور نہ مفید مطلب، اس بارے میں پہلے بھی گذارش کر چکا ہوں، آپ کا ارشاد ہے کہ مندرجۂ ذیل عبارت ہے:۔
"مؤلف این کتاب فیض اللہ بن زین العابدین حسام بنبانی المخاطب بملک القضاۃ صدر جہاں . . . "، معلوم ہوتا ہے کہ طبقات محمود شاہی کا مصنف صدر جہاں نہیں ہے بلکہ ان کا پوتا فیض اللہ بنبانی ہے جو کتاب مجمع النوادر کا مصنف بھی ہے" حالانکہ اس عبارت سے یہ بھی مترشح ہو سکتا ہے کہ فیض اللہ کا خطاب بھی اپنے دادا کی طرح صدر جہاں ہو اور اسی بنا پر فرشتہ اپنی تاریخ میں مصنف کو صدر جہاں گجراتی کہہ کر پکارتا ہے اور برٹش میوزیم کے فارسی مخطوطات کی فہرست کے مرتب ریو کا بھی یہی قیاس ہے۔ یہاں اس بات کی صراحت کر دینی چاہیئے تھی کہ اس مضمون کی مدد سے جو مکرمی ڈاکٹر محمد اقبال مدظلہ نے مجمع النوادر پر اورینٹل کالج میگزین میں لکھا ہے، یہ عقدہ حل ہوا ہے کہ صدر جہاں فیض اللہ کا نہیں بلکہ اسکے دادا کا خطاب ہے۔ "خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ" (یا خلد اللہ سلطنتہ و ابد خلافتہ) کے دعائیہ الفاظ سے یہ قیاس کرنا کہ محمود شاہی کے پشاوری مخطوطہ کی کتابت محمود

مکتوب … کہ موت نے انھیں فرصت نہ دی خوش درخشید

نکتہ رس مبصر و محقق تھے … ۱۹۵۲ء میں ان کا انتقال ہوا۔ مرحوم نے یہ خط

دلے دولت مستعجل بود۔ مئی … ذر چکا ہے۔ یقین ہے کہ وہ اس سے لطف اندوز

اختر مرحوم کو ان کا مقالہ ۱

ہوں گے۔ مالک رام

سلام نیاز

محترمی قاضی صاحب! … آزاد … گرامی میں ارسال کیا گیا تھا، مگر ابھی تک اس کے

چند روز ہوئے، ایک عریضہ … اسلامک کلچر، حیدر آباد کے شمارہ جولائی میں ہمارے فاضل

جواب سے محروم ہوں۔ رسالہ … نے جس انداز میں آپ کی علمی فضیلت کا اعتراف

دوست ڈاکٹر عنایت اللہ صاحب … Studies Islamic orienta…

اور آپ کی تازہ تصنیف ( … بدلی مبارکباد قبول فرمائیں، آپ کی علمی فتوحات

کی تعریف کی ہے اس پر میری … عربی ادب ہے اور اس میدان میں آپ کی تحقیقات

کا خاص دائرہ اسلامیات اور … ستائش ہیں

نہایت قابل قدر اور مستحق … اشرف صاحب کی مہربانی سے آپ کا تازہ مقالہ دیکھا اور

برادر محترم پروفیسر نجیب … لیکن مجھے افسوس ہے کہ اس مضمون سے بھی الجھنیں دور نہیں

اور اسے کئی بار پڑھا۔ … چیزیں اور بھی پیچیدہ ہوگئی ہیں، ولی کے گجراتی ہونے کے حق میں زبردست

ہوئیں، بلکہ بعض … ہیں، پھر ان کے ہوتے ہوئے ہم ایسے دلائل کا سہارا کیوں ڈھونڈھیں

قرینے موجود … و تدقیق کی کسوٹی پر پورے نہ اتر سکیں!

جو تحقیق … آپ کے مقالے کا لہجہ بہت سنجیدہ اور عالمانہ ہے اور مجھے یہ خوشی ہوئی کہ آپ نے کسی

آ جگہ بھی تلخی پیدا ہونے نہیں دی اگرچہ مضمون کے ایک بڑے حصے میں روئے سخن

میری طرف ہے اور صرف ایک موقع پر نجیب صاحب کا ذکر نکتہ سنج اور فقیہ رس

کی حیثیت سے کیا گیا ہے، میری گذارشات کی ضرورت اور اہمیت کو آپ یہ کہہ کر کم

کرنا چاہتے ہیں کہ "ان میں سے اکثر تو اصل نقطۂ بحث سے غیر متعلق ہیں اور بعض

کا تعلق صرف جزئیات سے ہے"۔ میری ناقص رائے میں یہ درست نہیں۔ میں نے مسئلہ کے جن پہلوؤں کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرائی ہے، انھیں جزئی اور ثانوی حیثیت دینا انصاف سے بعید ہے۔ بالخصوص جب کہ آپ کو خود اس بات کا اعتراف ہو کہ اس مسئلہ پر نا قابل تردید شہادت اور برہانِ قاطع ابھی تک آپ کی طرف سے پیش ہی نہیں کی گئی۔ میں نے اپنے پہلے خط میں مندرجہ ذیل پہلوؤں کے متعلق عرض کیا تھا:-

صوبۂ گجرات پر دکن کا اطلاق؛ شاہ ولی اللہ اور ولی کا ایک ہونا؛ دکنی اور گجراتی الفاظ کا فرق؛ ولی کے احباب کا تذکرہ۔

ان میں سے کس چیز کو غیر متعلق یا جزئی کہا جا سکتا ہے؟ واقع یہ ہے کہ مسئلہ کے یہی اہم پہلو آپ کے مقالہ ولی کی جان ہیں اور انہی چیزوں پر آپ نے بحث کی ہے۔

(۱) طبقات محمود شاہی کا حوالہ نہ درست ہے اور نہ مفید مطلب، اس بارے میں پہلے بھی گذارش کر چکا ہوں، آپ کا ارشاد ہے کہ مندرجۂ ذیل عبارت ہے:-

" مؤلفِ ایں کتاب فیض اللہ بن زین العابدین حسام بنبانی المخاطب بملک القضاۃ صدر جہاں . . . "، معلوم ہوتا ہے کہ طبقاتِ محمود شاہی کا مصنف صدر جہاں نہیں ہے بلکہ ان کا پوتا فیض اللہ بنبانی ہے جو کتاب مجمع النوادر کا مصنف بھی ہے" حالانکہ اس عبارت سے یہ بھی مترشح ہو سکتا ہے کہ فیض اللہ کا خطاب بھی اپنے دادا کی طرح صدر جہاں ہو اور اسی بنا پر فرشتہ اپنی تاریخ میں مصنف کو صدر جہاں گجراتی کہہ کر پکارتا ہے اور برٹش میوزیم کے فارسی مخطوطات کی فہرست کے مرتب ریو کا بھی یہی قیاس ہے۔ یہاں اس بات کی صراحت کر دینی چاہیے تھی کہ اس مضمون کی مدد سے جو مکرمی ڈاکٹر محمد اقبال مدظلہ نے مجمع النوادر سر پرادر نٹیل کالج میگزین میں لکھا ہے، یہ عقدہ حل ہوا ہے کہ صدر جہاں فیض اللہ کا نہیں بلکہ اسکے دادا کا خطاب ہے۔ "خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ" (یا خلد اللہ سلطنتہ وابد خلافتہ) کے دعائیہ الفاظ سے یہ قیاس کرنا کہ محمود شاہی کے پشاوری مخطوطہ کی کتابت محمود

بیگڑہ کے عہد میں ہوئی ہوگی، کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔ مصنف سلطان کے حین حیات میں یہ کتاب تالیف کرتا ہے، اس کے لیے ناگزیر ہے کہ بادشاہ کے دوام سلطنت کے لیے دعا مانگے۔ یہاں یہ غلط فہمی اس وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ اس عبارت کو خاتمہ کی عبارت تصور کر لیا گیا ہے، حالانکہ یہ مخطوطہ کے ورق ۵۱۸ (الف) سے نقل کی گئی ہے، جہاں مصنف مغول کی تاریخ کے متعلق اپنے مآخذ کی قلت کا ذکر کرتا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ جب وہ گجرات واپس جائے گا تو اس باب میں اور اضافہ کریگا۔ "محمد آباد بدار گجرات" کی بے ربطی اب کسی مزید تشریح کی محتاج نہیں رہی؛

(۲) جامع الغموض، کافیہ کی شرح ہے، نہ کہ شرح ملا جامی کی" اس پر ایک کتاب" کی جگہ یہ چاہیے: "کافیہ کی ایک اور شرح جو فارسی زبان میں لکھی گئی ہے، جامع الغموض ہے۔"

(۳) پیر روشن ضمیر کے متعلق میں نے دو چیزیں عرض کی تھیں (افسوس ہے کہ آپ نے ان دونوں کو ملا دیا اور میری طرف ایک ایسی بات منسوب کی گئی جس کا میں کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا) اوّل، پیر روشن ضمیر سے علی رضا سرہندی ہی کیوں مراد ہوں جب کہ وَلی کے یہاں اس قسم کی کوئی تصریح نہیں پائی جاتی؛ دوم، وَلی کی بیعت کا سوال، یہ محض ایک استفسار تھا وَلی کی پیری مریدی کے سلسلے میں، میں نے اپنے جواب میں یہ بات صراحتًہ لکھ دی تھی کہ نور المعرفت کی بنا پر اسے مولانا نورالدین صدیقی کا مرید نہیں مانا جا سکتا۔ تعجب ہے کہ میری اس تصریح کے باوجود بھی یہ کہا گیا ہے کہ میرے نزدیک پیر روشن ضمیر سے مولانا نورالدین مراد ہیں، اور یہ کہ مولانا کی زبانی وَلی کو یہ رسالہ لکھنے کی تحریک ہوئی جو ایک قصیدہ کی شاعرانہ تمہید معلوم ہوتی ہے، دیباچہ کی رنگین اور شاندار عبارت کو ایک قصیدہ کی شاندار تمہید سے مشابہ کہا جا سکتا ہے، نہ کہ رسالہ کو۔ بہر حال یہ غلط فہمی تھی جس کا دور کیا جانا میرے نزدیک بہت ضروری ہے۔ اگر آپ فرمائیں، تو اپنے خطوط میں سے اصل عبارت نقل کر کے بھیج دوں۔

دیباچہ کی جو عبارت آپ نے نقل کی ہے، وہ جناب حسینی پیر صاحب کے مخطوطہ کی عبارت کے عین مطابق ہے، لیکن اس میں دو تین باتیں مجھے کھٹکتی ہیں: اوّل "دریں شہر فیض کہ مسمی باحمد آباد است" "شہر فیض" کے بعد اثر، آثار، آگیں یا کوئی اور اسی سے ملتا جلتا لفظ ہونا چاہیے۔ اس صورت میں 'فیض اثر' یا 'فیض آثار' کا لفظ شہر کی صفت ہوگا، ورنہ محض 'شہر فیض'، دلکشی اور لطافت سے خالی ہے۔ دوم، "بایضاح ازیں معنی پرداخت" کی جگہ "بایضاح ایں معنی پرداخت" زیادہ بہتر ہوگا۔ سوم: "وایں بیت برجستہ را باآواز بلند برخواند" میں برخواند کی جگہ برخوان چاہیے، جیسا کہ عبارت کے سیاق سے ظاہر ہے۔ اس سے پہلے فقرہ یہ ہے:۔ زبان را بچشمۂ آفتاب شست وشودہ (وایں بیت برجستہ را باآواز بلند برخوان) اس کے معنی یہ ہونگے کہ زبان کو چشمۂ آفتاب سے دھو اور یہ بیت برجستہ بلند آواز سے پڑھ۔

(۴) گجراتی الفاظ۔ قدیم دکنی زبان کا ذخیرۂ الفاظ کتنا ہی محدود ہو، اور اس کو گجراتیوں نے اپنی آمد و رفت دکن سے کتنا ہی پُر مایہ بنا دیا ہو، اس حقیقت کا آپ کو بھی اعتراف کرنا پڑا ہے کہ "دکنی زبان میں سینکڑوں الفاظ گوجری اردو کے اس قدر مل جل گئے ہیں کہ ایسے الفاظ دکنی مصنفین کے ہاں مستعمل ہونے سے ان میں امتیاز کرنا مشکل ہو گیا ہے" جب امر واقع بقول آپ کے یہ ہے، تو پھر ہمیں بعض الفاظ کو خالص گجراتی کہنے میں بہت احتیاط سے کام لینا چاہیے اور بیشتر اس کے کہ بعض الفاظ و محاورات کو گجراتی اردو یا گوجری کے لیے مخصوص کردیں، ہمارے لیے اس بات کا اطمینان کرلینا نہایت ضروری ہے کہ وہ دکنی، ہندی، پنجابی یا دوسری زبانوں میں تو نہیں پائے جاتے۔ اول تو ان میں سے بہت سے الفاظ ہندی الاصل ہیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان کی دوسری زبانوں نے بھی انھیں اپنا لیا ہے۔ برسبیل تنزل اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ بعض الفاظ کی اصلیت گجراتی ہے اور دکنی مصنفین نے گجراتیوں ہی سے لے کر ان کو استعمال کیا ہے تو یہ چیز بھی ہمارے لئے زیادہ مفید مطلب نہ ہوگی، اس لئے کہ ایک دکنی اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہ سکتا ہے کہ ان الفاظ کی گجراتی

اصلیت مسلم، لیکن اس کا کیا جواب کہ یہ لفظ ہمارے ہاں بھی مستعمل ہیں، اس بنا پر ولی کو کیونکر گجراتی ثابت کیا جا سکتا ہے؟ آپ کو نئی فہرست میں گول دستار کا لفظ بھی ملتا ہے ممکن ہے کہ ہندوستان بھر میں اس قسم کی پگڑی مشائخ گجرات ہی کا طغرائے امتیاز ہو، لیکن ایک دکنی کے نزدیک یہ پگڑی ولی کی وطنیت کے مسئلے پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہوتی۔ آخر اسے بھی اس بات سے کب انکار ہے کہ ولی سالہا سال تک صوبہ گجرات میں رہا اور اس قیام کے لیے عرصہ میں اس نے مشائخ کی گول دستار بارہا دیکھی ہوگی۔

بعض الفاظ اور محاورات کو گجراتی قرار دینے سے پیشتر ہمارے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ ہم اپنے دکنی اور دوسرے دوستوں سے پوری تشفی کر لیں، اور اگر یہ کسی طرح ممکن نہ ہو تو کم از کم اردو لغت کی کوئی کتاب اٹھا کر دیکھیں کہ کہیں یہ الفاظ اور محاورے گجرات کے علاوہ دوسرے صوبوں میں بھی بولے جاتے ہیں یا نہیں، آپ کی نئی فہرست کے یہ الفاظ:-

روسنا، جھڑنا، گھگھالنا: بقال، رام رام، منا ہی اور تانتا اردو لغت کی کتابوں میں ملتے ہیں، جس کے معنے یہی ہو سکتے ہیں کہ اور صوبے بھی گجرات کے ساتھ شرکت کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ پھر ان میں سے اکثر الفاظ دکنی میں بھی ملتے ہیں جیسا کہ میرے ایک دکنی دوست نے مجھے بتایا ہے" ولنا" گجرات کا ہی خاص لفظ نہیں، بلکہ پنجابی اور دکنی بھی اس عزت کے حق دار ہیں۔ بنیا بقال تو مشہور ہے ہی اور یہ آج سے نہیں، بلکہ اکبر کے زمانے تک اس کا سراغ لگایا جا سکتا ہے۔ ہیموی بقال کے ساتھ اس کی جنگ کسی بیان کی محتاج نہیں۔ ہندوستان والوں کا تصرف تو ملاحظہ ہو کہ بنیے کی بیوی کو بقالنی کہنے لگے۔ 'رام رام' ہندوؤں کا عام سلام ہے اور اسے کسی خاص صوبے سے مخصوص نہیں کیا جا سکتا۔ کشمیر کا مشہور صوبہ دار ظفر خاں احسن جس کی اصلاح و تربیت کا میرزا صائب جیسا نکتہ سنج بھی قائل ہے، اس طریقہ سلام سے رعایت لفظی کی ایک اچھی مثال پیدا کرتا ہے:

زربتانِ ہند چوں او دلبر خود کام نیست     'رام رامم' گرچہ می گوید ولیکن رام نیست

کلاہ بارانی' کو عموماً معمولی درجہ کے پرتگیزی عیسائی پہنتے ہیں۔ پرتگیزوں کا قیام گجرات میں بہت رہا ہے۔ اگر فارسی لغت کی ورق گردانی کی جائے تو ولی سے بہت پہلے یہ لفظ ملتا ہے۔ ایک قصیدہ میں جو خان خانان اور حکیم ابو الفتح گیلانی کی مدح میں ہے' عرفی کہتا ہے:

ہماں کہ ابرِ عطایش چو فتنہ بار شود     جہاں زحفظ تو جوید کلاہِ بارانی

اگر سُوراغ کے رشتہ کو ذرا دور تک پھیلایا جائے، تو کوئی تعجب نہیں کہ یہ چیز جیسوں کے ہاں بھی مل جائے۔ اس سلسلہ میں کہیں زیادہ مفید "شراب پرتگالی" رآئی: مناہی' عربی لفظ گجرات میں ممانعت کے معنوں میں مستعمل ہے، اگر گجرات کی جگہ ہندوستان لکھا جائے تو زیادہ درست ہوگا۔ اکثر اوقات آل انڈیا ریڈیو کے خبریں سنانے والے سے ہم یہ لفظ ممانعت کے معنے میں سنتے ہیں، پھر اس میں گجرات کی کیا خصوصیت رہی؟

(۵) یہ دیکھ کر میری حیرت و استعجاب کی کوئی انتہا نہ رہی کہ آپ نے بیچارے امین کو دکنیوں کے حوالے کر دیا؛ وہ صاف صاف اپنی زبان کو گوجری کہہ رہا ہے اور آپ کی رائے میں وہ دکنی میں لکھنے کے باوجود اس کو گوجری کہتا ہے۔ شاید، دکنی عنایت طباعت کی غلطی ہو اور اس کی جگہ آپ نے دکن لکھا ہو۔ امین کا شمار دکنی مصنفین کے زمرے میں کیا گیا ہے، حال آنکہ استاذِ محترم شیرانی صاحب مرحوم نے اپنے ایک مضمون میں جو "پنجاب میں اردو" کے چند سال بعد لکھا گیا ہے امین کو فقط گجراتی ہی تسلیم نہیں کیا، بلکہ یہ نظریہ بھی پیش کیا ہے کہ دکن کے جو مصنف اپنی زبان کو گوجری کہتے ہیں یا تو وہ خود گجرات کے رہنے والے ہیں یا ان کے آباؤ اجداد گجراتی ہیں۔

(۶) ولی کا نام۔ چونکہ آپ کے نظریے کی عمارت اس بنیاد پر قایم ہے، اگر اسے پوری بحث کی جان اور مغز سخن کہا جائے، تو شاید بیجا نہ ہوگا۔ تذکرہ نگاروں میں شروع سے ولی کے نام کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے، حمید خاں اورنگ آبادی جو ان میں

سب سے قدیم تر ہے ولی کا نام ولی محمد اور اس کا وطن احمد آباد بتاتا ہے، گردیزی اور شفیق محمد ولی لکھتے ہیں ان کے بعد کے تذکرہ نگار مثلاً میر حسن وغیرہ کے نزدیک شاہ ولی اللہ ہے اور آزاد اور صغیر بلگرامی نے ولی اللہ کے پہلے شمس کا اضافہ کر دیا ہے اب آپ حمید خاں کے قول کو نظر انداز کرتے ہوئے جو کہ قدیم ترین ہے، میر حسن اور ان کے ساتھیوں کو "متقدمین تذکرہ نویسان" ٹھہراتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ ان کا اندراج شاہ ولی اللہ ہی اصلی نام ہے اور ولی کے نام نسب نامہ میں بھی شاہ ولی اللہ ہی ہے' حالانکہ ابھی آپ کو یہ ثابت کرنا باقی ہے کہ نسب نامہ والے شاہ ولی اللہ اور ہمارے شاعر ولی ایک ہی بزرگوار ہیں۔

استاذی شیرانی صاحب نے بھی اپنے ایک مضمون میں جو ۱۹۳۱ء کے اورینٹل کالج میگزین میں شائع ہوا تھا ولی کا نام محمد ولی لکھا تھا، لیکن اس کے بعد اس مخطوطہ کی بنا پر جسے ثناء اللہ نے ۱۱۴۸ ہجری میں احمد آباد میں بیٹھ کر لکھا ہے اپنے ایک دوسرے مضمون بعنوان "تنقید بر آب حیات" میں ولی کا صحیح نام سید ولی محمد بتایا ہے، استاذ مرحوم کے اصلی الفاظ یہاں درج کئے دیتا ہوں:

> مخزن نکات، تذکرۂ گلزار ابراہیم و تذکرۂ گلشن ہند و تذکرہ شعرائے اردو میں شاہ ولی اللہ درج ہے مگر گردیزی، شفیق، مصحفی اور قدرت اللہ قاسم نے محمد ولی لکھا ہے ان سب سے قدیم سند ہمارے پاس ثناء اللہ فانی کی ہے، جو ۸ جلوس محمد شاہ میں ولی کے دیوان کی ایک نقل طیار کرتا ہے اور شاعر کا نام سید ولی محمد تحریر کرتا ہے ثناء اللہ فانی اپنا خاتمہ بدیں الفاظ لکھتا ہے:
>
> "دیوان اشعار ولی مسمّٰی سید ولی محمد مرحوم بتاریخ چہار دہم شہر محرم الحرام سنہ ۸ از جلوس میمنت مانوس محمد شاہ بادشاہ غازی خلد اللہ تعالیٰ ملکہٗ و سلطانہٗ روز چہار شنبہ وقت چاشت در بلدۂ خیر البلاد احمد آباد حمیت عن الفساد بخط فقیر حقیر اضعف العباد کلب محبوب سبحانی نمود بی بود ثناء اللہ فانی

سمت انجام و صورت اتمام پذیرفت "!

فانی کے بیان پر اشتباہ کرنے کی ہمیں کوئی وجہ معلوم نہیں، وہ ولی سے یقیناً واقف معلوم ہوتا ہے، اسے سید بھی لکھ رہا ہے اور مرحوم بھی جو لوگ ہمارے شاعر کو شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں، وہ شاید ایک اور شاعر شاہ ولی اللہ اشتیاق کے ساتھ التباس کر رہے ہیں "!

مرحوم شیرانی صاحب کے الفاظ میں نے من و عن نقل کر دیے ہیں، تاکہ کسی قسم کا اشتباہ نہ رہے۔ ثناء اللہ کی شہادت کو اس وقت تک نہیں ٹھکرایا جا سکتا جب تک ہمیں کوئی قدیم تر شہادت ہمیں نہ مل سکے؛ تذکرہ نگار یقیناً اس سے متاخر ہیں اور احمد آباد سے بہت دور بیٹھ کر اپنے اپنے تذکروں کی تالیف میں مصروف نظر آتے ہیں، اب فقط ایک ہی سوال رہ جاتا ہے، اور اسی ایک پر تمام بحث کا فیصلہ آ کے ٹھہرا ہے، اور وہ نسب نامہ کا معاملہ ہے بے شک دستاویزوں میں ایک شاہ ولی اللہ کے سخط موجود ہیں اور نسب نامہ میں بھی ایک شاہ ولی اللہ کا مذکور پایا جاتا ہے۔ لیکن اسکے لیے کونسا قرینہ ہمارے پاس موجود ہے کہ شاہ ولی اللہ ہی مشہور شاعر ولی ہیں، بالخصوص جب کہ ایک اعراس نامہ میں ولی محمد شاعر ہندی اور شاہ ولی اللہ کو دو الگ الگ شخصیتیں تسلیم کیا گیا ہے۔ یہ چیز آپ کے ملاحظہ سے بھی گذر چکی ہے جیسا کہ آپ نے عزیزی ظہیر[1] کے نام ایک خط میں تحریر فرمایا ہے۔ اب آپ ہی فرمائیے کہ اس صریح اور واضح شہادت کی موجودگی میں یہ بات کیونکر تسلیم کر لی جائے کہ دونوں ایک ہی بزرگوار ہیں۔ یہ سچ ہے کہ "ولی کے نام کے اختلاف اور اس سے مراد شاہ ولی اللہ العلوی ہونے پر آپ نے حیاتِ ولی میں مفصّل بحث کی ہے، جو ابھی زیرِ ترتیب ہے اور انشاء اللہ کچھ عرصے کے بعد شائع ہو گی" لیکن اس قسم کے وعدہ سے تشنگان علم کی پیاس کیونکر بجھ سکتی ہے؟

(۶) شاہ سراج۔ آپ کی تشریح کے باوجود مجھے اپنے دقیقہ سنج اور نکتہ رس بھائی کے ساتھ اتفاق ہے کہ سراج سے مراد شاہ سراج نہیں ہیں بلکہ یہ لفظ اپنی حقیقی معنی

---

[1] یعنی ڈاکٹر سید ظہیر الدین صاحب مدنی

میں استعمال کیا گیا ہے "فانوس دل میں شوق کا سراج بن جانا" آپ کی رائے میں کچھ بے جوڑ سی بات ہے، حال آنکہ یہ تشبیہ نہایت واضح ہے، دل کو فانوس سے تشبیہ دی گئی ہے اور شوق کو چراغ سے۔ اب مطلب بالکل صاف ہے، یعنی دل کے فانوس میں شوق کا چراغ روشن ہے۔ ایسی صورت میں آسمان سے چاند کیوں نہ پروانہ وار گر پڑے!

(۷) "اپنے کسی معتقد الیہ (کذا) حبیب اللہ گجراتی کی نسبت اشرف لکھتا ہے:

ملک گجرات میں حبیب اللہ　　تیری فرقت نے ہم کوں مارا ہے

ممکن ہے، یہ شاہ حبیب اللہ برادر ولی ہوں"

ابھی تو حبیب اللہ کا گجراتی ہونا معرض بحث میں ہے، پھر یہ کیونکر فرض کر لیا جا۔ وہ ولی کے بھائی شاہ حبیب اللہ ہونگے؟ مندرجہ بالا شعر سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جید کوئی غیر گجراتی صاحب ہیں جن کا فراق گجرات میں اشرف پر شاق گذر رہا ہے اس پر آپ دوبارہ غور فرمائیں!

(۸) زین البلاد الہند — اورنگ زیب کے زمانے سے بہت پہلے سے احمد آباد زین البلاد کے لقب سے ممتاز ہے لیکن اس مصرع

رشک ایراں رونق زین البلاد ہند ہے

کے بارے میں سیاق کی مدد سے اس بات کا اطمینان کر لینا چاہیئے کہ یہاں زین البلاد سے مراد احمد آباد ہی ہے نہ کہ کوئی اور جگہ؟ شاید اس شعر کے دوسرے مصرع سے اس بات پر کچھ روشنی پڑ سکے۔

محترم قاضی صاحب! آپ کو بار بار تکلیف دینے کے لئے معذرت چاہتا ہوں۔ امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

بندہ گنہگار

محمد ابراہیم ڈار

عابد رضا بیدار

# میر کا مطالعہ

میر نے اپنے ہم عصروں میں شاید سب سے زیادہ قطع مسافت کی، اور سب سے زیادہ اقسام (TYPES) کے لوگوں سے واسطہ پڑا۔ نوّے برس کی طویل عمر نے بھی اس میں مدد کی، اور سیاح جہاں گرد بننے نے بھی[1]۔ اور ایسا نہیں تھا، جیسا کہ ہمارے ناقدوں نے مشہور کر رکھا ہے کہ وہ دل کے داغوں کی بہار دیکھنے میں ہی لگے رہتے تھے جانوروں پر ان کی نظمیں (کتا، بلی مرغا وغیرہ) تیوہاروں پر ان کے مشاہدات (ہولی پر کئی نظمیں) اپنے مربیوں کے سفر، ان کے اشغال (شکار، مرغبازی وغیرہ) ان کی جنگوں وغیرہ سے ان کی دلچسپی (اگرچہ یہ پیسے کی خاطر ہی کیوں نہ ہوا) یہ سب چیزیں ان کی بے دماغی، سے زیادہ ان کے آدمی ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ ان کی وارستہ مزاجی اور قلندرانہ روش کو بھی اپنی بات بڑھانے کی خاطر خوب بڑھا گیا ہے۔ یہ ان کی پسندیدہ روش تھی، یہ ٹھیک ہے۔ لیکن عملی دنیا میں لوگ قلندر بن کر ایسی زندگی نہیں گزارتے جیسی میر نے گذاری۔ طفیلیوں کے گروہ میں (جیسا کہ اس عہد کے شعرا کا زندگی گزارنے کا انداز تھا) وہ خاصے عملی آدمی تھے۔ پیٹ سب کچھ سکھا دیتا ہے اور قلندروں کی بھی چول چول ہلا دیتا ہے، میر تو پھر خاصے دنیا ساز آدمی تھے، جس جگہ جس کا موقع ملا، گن گانے سے کبھی نہیں چوکے (مثلاً درد نے قصیدے نہیں لکھے، میر نے ایک سے زیادہ قصیدے لکھے ہیں) ان میں قلندری کی شاید ایک بھی صفت نہیں آپائی تھی: نہ توکل نہ قناعت نہ چشم سیری، نہ وارستگی، نہ خوشی اور

---

[1] خام رہتا ہے آدمی گھر میں پختہ کاری کے تئیں سفر ہے شرط۔

غم سے بے نیازی، نہ حالات زمانہ سے بے حسی، نہ خاکساری، نہ قوت برداشت، نہ عالی ظرفی، نہ استغنا، نہ وسیع النظری! (مجھے اس میں بھی شبہ ہے کہ میر صاحب میں مذہب و مسلک کی وسیع النظری بھی تھی!) دلّی کی اشراف گردی نے انھیں پریشان کیا تو اپنی قسمت آزمانے وہ اودھ کے نودولتوں کے سامنے جا جھکے۔ وہاں انھیں اپنے گوں کے لوگ نہ ملے تو دلّی یاد آنے لگی جس کی یاد اخیر دم تک آنکھوں میں چھپائے رہے اور آرزو کرتے رہے کہ کاش گردش ایام پیچھے کو پلٹ جائے![1] نوّے برس کی عمر، طویل عمر رحمت بھی ہوئی ہے زحمت بھی، اس کے لئے کافی تھی کہ اپنے سامنے یکے بعد دیگرے، بیسیوں شناساؤں اور دوستوں اور جگر یوں کے نام و نشان مٹتے دیکھیں، آسمانوں کو زمین اور تخت کو تختہ بنتے دیکھیں، محلوں کی جگہ کھنڈر اور قہقہوں کی جگہ آنسو![2]

---

۱- فرمایہ دلی کا ہر چند بہتر لکھنؤ سے تھا ‏ ‏ ‏ ‏ وہیں میں کاش مرجاتا سراسیمہ نہ آتا یاں

برسوں سے لکھنؤ میں اقامت ہے مجھ کو لیک ‏ ‏ ‏ ‏ یاں کے چلن سے رکھتا ہوں عزم سفر ہنوز

متاعِ ہنر پھیر کر لے چلو ‏ ‏ ‏ ‏ بہت لکھنؤ میں رہے، گھر چلو

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو الخ (قطعہ)

آباد اجڑا لکھنؤ چند دن سے اب ہوا ‏ ‏ ‏ ‏ مشکل ہے اس خرابے میں آدم کی بود و باش

۲- یا قافلہ در قافلہ ان رستوں میں تھے لوگ ‏ ‏ ‏ ‏ یا ایسے گئے یاں سے کہ پھر کھوج نہ پایا

دلّی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انھیں ‏ ‏ ‏ ‏ تھا کل تلک دماغ جنھیں تخت و تاج کا

بنے بڑے تھے گھر جن کے ہاں، آثار اُنکے یہ ہیں اب ‏ ‏ ‏ ‏ تبر شکستہ دروازے ہیں، گری پڑی دیواریں ہیں

ع۔ ہر گل ہے اس چمن میں ساغر بھرا لہو کا ۔۔۔ اور یہ مخمس "درحال لشکر"

(مشکل اپنی جو بود و باش ہوئی الخ)

بچپن میں بظاہر پڑھے لکھے باپ، چچا کے زیرِ عاطفت اور پھر دلی میں سوتیلے خالو خان آرزو سے، علوم مجلسی میں جو کچھ اپنی وارستہ مزاجی اور عشق پیشگی کے باوجود بھی وہ سیکھ سکتے تھے، اور یہ لوگ سکھا سکتے تھے، میر نے سیکھا۔ ان کے مصنفات میں طب، منطق، مسلکِ تصوف مذہب اثنا عشری، اور فنِ شعر و ادب سے واقفیت کے ثبوت ملتے ہیں۔ شعر کے فن پر تو واقفیت سے بڑھ کر، انھیں عبور حاصل تھا۔ فارسی شاعری کے شاہکار، ظاہرا، ان کی نظر سے گزر چکے تھے۔ مشاہیر شعرائے فارسی میں سعدی، حافظ، نظیری، فیضی، ملا قدسی، طغرئی، نظامی، ہلالی، شفائی، عبید زاکانی، محتشم کاشی اور محسن تاثیر کا کہیں عقیدت سے نام لیتے ہیں، اور کہیں ان کے اشعار کے ترجمے کرنے لگتے ہیں (اس قسم کے تراجم کی تعداد کم سے کم سو سے اوپر ہی ہوگی) یقیناً وہ بڑی شاعری کے معیاروں سے ناواقف نہ تھے۔

جھنجھلاہٹ میں کبھی کبھی علم کے خلاف ہو جانے کے باوجود[1] میر نے اپنی علمی استعداد سے فائدہ اٹھایا، جس کے نتائج ان کی شاعری کے علاوہ اردو شاعروں کے پہلے تذکرے (نکات الشعرا) اردو شاعر کی پہلی آپ بیتی (ذکرِ میر) اور قدما کی طرح اپنے بیٹے کو آدابِ زیست سکھانے کیلئے اردو شاعر کی مرتب کی ہوئی پہلی کتاب (فیض میر) کی صورت میں ہمارے سامنے ہیں۔ پھر فارسی کا ایک پورا دیوان اس بات کا ثبوت ہے کہ نثر کے علاوہ فارسی نظم پر بھی انھیں قدرت حاصل تھی۔

زندگی اور زمانے کے اتنے متنوع تجربات، قدما کے ایسے وسیع مطالعہ اور فارسی پر ایسی قدرت رکھنے والے سے ہم بجا طور پر امید کر سکتے ہیں کہ وہ پچھلوں کی روایات کو کچھ بڑھائے گا ہی!

لیکن ایک عظیم تہذیبی سرمایہ کا وارث، یہ شاعر اپنے غزل کے چھ دواوین ایک فارسی دیوان اور متعدد مراثی، مناقب، قصائد، رباعیات اور متفرقات کے اندر وہ نظر نہیں آتا جس کی توقع تھی۔ اس سے توقع تھی کہ اردو شاعری کو فارسی شاعری

---

۱؎ تحصیلِ علم کرنے سے دیکھا نہ کچھ حصول　　میں نے کتابیں رکھیں اٹھا گھر کے طاق میں

کی بہترین روایات سے آشنا کریگا؛ اس سے توقع تھی کہ فن میں حسن، سلیقہ اور چابکدستی کا ایسا معیار پیش کرے گا کہ اردو فارسی سے آنکھ ملانے لگے؛ اور فارسی شعر کی سی زندہ علامات، اسکے رموز، اس کے کنائے، یہ سب جیتے جاگتے اردو میں منتقل ہو جائیں گے۔ اور باتوں کو جانے دیجیے، صرف اتنی بات لے لیجیے کہ تیر میں یہ سکت ضرور تھی کہ کسی خصوصی تجربہ کو عمومی بناکر غزل کے شعر میں ڈھال دیں۔ بادشاہوں کی آنکھیں نکالنے کے واقعات کو جو شاعر اس طرح کہہ سکے:

شہاں کہ کحلِ جواہر تھی خاکِ پا جنکی
انھوں کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

اپنا گھر (دلی سمجھ لیجیے) چھوڑتے وقت جو غزل کے علائم کو اس طرح برت سکے:

جاتا ہے آسماں لئے کوچے سے یار کے
آتا ہے جی بھرا در و دیوار دیکھ کر

اور ——

جیسے حسرت لئے جاتا ہے جہاں سے کوئی
آہ یوں کوچۂ دلبر سے سفر ہم نے کیا

اجنبی ماحول میں رذیلوں کے ساتھ اپنی ساری عمر کی رچی لبسی عادتوں کو ترک کر کے زندگی بسر کرنے کے جبر کو جو ایسی نزاکت سے کہہ سکے:

ہائے ستم ناچار معیشت کرنی پڑی ہر خار کے ساتھ
جان عزیز گئی ہوتی کاشکے اب کی سال بہار کے ساتھ

زندگی کو اس کی ساری ہنگامہ خیزیوں کے ساتھ انگیز کرنے اور اس کے ساتھ پیار کرنے کی بات کو جو اس ڈھنگ سے پیش کر سکے:

ہم کو دیوانگی شہروں ہی راس آتی ہے
دشت میں قیس رہو، کوہ میں فرہاد رہو

اور شتر مرغ کی سی بنا ہیں بنانے والے (شتر مرغ جو اپنی چونچ آنکھیں اور سر ریت کے اندر کر کے اطمینان سے ہو جاتا ہے کہ اب چونکہ وہ دشمن کو نہیں دیکھ سکتا ہے، اس لئے وہ محفوظ ہے) یا اپنی محدود دنیا کو پوری کائنات سمجھ کر مطمئن ہو جانے والے کم حوصلہ اور پست ہمت لوگوں کو غزل کی زبان میں جو اس طرح آواز دے سکے کہ وہ آج بھی دلوں کے لئے مہمیز کا کام دے سکے:

بلبے آہوانِ کعبہ نہ اینڈو حرم کے گرد
کھاؤ کسو کی تیغ، کسو کے شکار رہو

یہ اردو شاعری کی کم نصیبی نہیں تو اور کیا ہے کہ ایسا شاعر اپنے کلیات کے ہزاروں شعروں میں شاید دس بیس میں بھی ان علائم کو، قیس و فرہاد کو، جنون و دیوانگی کو، کوچہ و یار کو، بلبل اور صیاد کو، گلچیں اور گلشن کو زندگی نہ دے سکے!
اور کیا ستم ہے، کہ جس شاعری کی پشت پر کم سے کم ایک ہزار سال کا تفکر ہو، اس کے یہاں فکر میں ڈوبی کم سے کم ایسی دس غزلیں بھی نہ نکل سکیں۔

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاجوری کا — کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا
آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت — اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا
زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی — اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا
لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام — آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا

---

شعور آرہا تھا جب میر کو اپنا وطن کس مپرسی، سچ مچ کس مپرسی کے عالم میں چھوڑنا پڑا۔ دلی نیا شہر تھا جس سے مانوس ہوتے ہوتے دن لگ گئے۔ لیکن پھر دلی سے بھی جس شدت کا پیار ہوگیا، کم شاعروں کو اپنے وطن سے ہوا ہوگا! پھر وہی شہر جس میں جوانی کھوئی، جس سے ہزاروں یادیں وابستہ ہوگئیں، جس کی ہر گلی ہفت اقلیم تھی بلکہ ورق مصور، "دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب"، اس دلی کو ساٹھ برس کی عمر میں جینے کی خاطر چھوڑنا پڑا۔ یہ کوئی معمولی داغ نہ تھا۔ اور اگلے سال جو انھوں نے لکھنو میں گزارے ان میں ان کے دل کے زخم ہرے ہی کار ہے۔

---

1- ہفت اقلیم ہر گلی ہے، کہیں — دلی سے بھی دیار ہوتے ہیں!!
دلی تھی طلسمات کہ ہر جا گہ میر — ان آنکھوں سے آہ ہم نے کیا کیا دیکھا
خاک دہلی سے جدا ہم کو کیا یکبارگی — آسماں کو تھی کدورت سو نکالا یوں غبار (۳۴ شعر کی پوری غزل)
اے صبا گر سوئے دہلی بگذری — ہم جو صرصر آہ مگذر سرسری
بوسہ دہ بر ہر قدم از سوئے من ——— الخ (ایک طویل فارسی مثنوی)

جوانی اور ادھیڑ عمر اس ادھیڑبن میں گزری کہ کسی طرح در محبوب تک رسائی ہو، دوسری طرف اپنے آپ کو جگت استاد منوانے کے چکر میں پڑے رہے جیسے خوش بختی سے سودا جیسے پائے کے استادوں نے بھی مان لیا، اور پھر اسی فن شعر کو اپنا فن قرار دے کر وہ اسی کے ذریعے اور اسی میں زلیست کرنے کے ذرائع تلاش کرتے رہے۔ شاعروں کا درجہ اس وقت کے سماج میں وقت گزارنے کے لئے ایک مصاحب کے درجہ سے آگے نہ تھا۔ پھر دربار میں جیسے بہت سے ہاتھی، اچھے گھوڑے، اور خزانے میں اعلیٰ درجہ کے لعل و جواہر، دوسروں پر سبقت لیجانے کی علامات تھیں، اسی طرح شاعر بھی گویا دربار کے لوازم میں سے تھا "یکے از آرائیشہا"! میرؔ صاحب بھی مختلف امراء کے یہاں پر رول ادا کرتے رہے۔ ان کی خود داری مجروح ہوتی رہی، نازک مزاجی کو ٹھیس پہنچتی رہی، اور زندگی اپنی قیمت وصول کرتی رہی۔ عالم یہ رہا کہ میر صاحب کو اس تمام عرصہ میں بے زری کا ماتم رہا، دردمندی کا غم ستاتا رہا۔ کبھی تصوف میں پناہ مل جاتی، کبھی شعر کہہ کر بھڑاس نکل جاتی، غرض کہ یہ بھی گزر گئی۔

جوانی سے پہلے لڑکپن اور جوانی کے موڑ پر، میر صاحب نے شدت سے کسی کو چاہا۔ پھر شاید ہمیشہ کے لئے اسے کھو دیا۔ انجام اتنا حسرتناک ہوا کہ بے دماغی تک نوبت پہنچ گئی۔

یہی زمانہ تھا جب باپ کی شفقت اور پھوپھا جیسی شفقت دینے والے باپ کے مرید کے سایہ سے محروم ہو کر میر نے اپنے سوتیلے خالو کو اپنی جائے پناہ بنایا جو بظاہر خاصے نستعلیق قسم کے آدمی تھے۔ میر کی عاشق منشی اور وارستہ مزاجی انہیں پسند نہ آئی ہوگی۔ انھوں نے انھیں اپنے یہاں سے جلد ہی رخصت کر دیا۔

جس شاعر مزاج نوجوان کو نہ گھر کی شفقت ملے، نہ عزیزوں کی محبت، نہ محبوب کا التفات، جو پیسوں کی طرف سے بھی کبھی ایسا با فراغت نہ ہو سکا کہ دماغ کو یک گونہ یکسوئی نصیب

---

۱۔ ہے نام مجلسوں میں مرا میرؔ بے دماغ      از بسکہ بے دماغی نے پایا ہے اشتہار
اور ـــــ "مثنوی خواب و خیال"

ہوتی ہو جسے صرف ایک آسودگی ملی، یعنی اس کی زندگی میں اس کی استادی اور کمال کا اعتراف (لیکن نری تعریف سے کیا ہوتا ہے جب نہ سادات کی قدر ہو نہ بیبیوں کی بارش) وہ بے کسی اور بے چارگی کا مرقع نہ بن جائے تو کیا ہو۔ پھر اصلی وطن شعور کی حالت میں چھوٹا! دلی کو بعد صعوبت وطن بنایا اور پچاس سال یہاں گزارے، بڑھاپے میں اس دوسرے وطن کو بھی چھوڑنا پڑا۔ یہ غم معمولی غم نہیں ہوتا۔ اس غم نے ان کی بے کسی میں اور رنگ بھر دیا اور لہجہ میں دلدوز کسک آگئی۔

میر صاحب کی زندگی میں (شاعری میں) خوشی کے ایسے لمحے کم آتے ہیں جب وہ اس انداز کے شعر کہنے لگتے ہیں:

یا ہاتھوں ہاتھ لو مجھے مانند جام مے — یا تھوڑی دور ساتھ چلو میں نشے میں ہوں

چلتے ہو تو چمن کو چلیے، سنتے ہیں کہ بہاراں ہے — پات ہرے ہیں پھول کھلے ہیں کم کم باد و باراں ہے

رنگ ہوا سے یوں ٹپکے ہے جیسے شراب چواتے ہیں

آگے ہو میخانے کے نکلو عہد بادہ گساراں ہے

ع۔ گردش میں وے مست آنکھیں ہیں جیسے بھرے پیمانے دو

ع۔ . . . . . . . . . . پھیلا عنبر سارا ہے

میر صاحب اپنے دل کو پگھلا پگھلا کے شعر بناتے رہے، اور پھر اسی کو اپنا فن سمجھ لیا۔ میر صاحب نے اس سے زیادہ کچھ کیا بھی نہیں! حرماں نصیبی مستقلاً جس قسمت کے (یا خود اپنے!) مارے کے حصے میں آگئی ہو وہ روئے اور رلائے نہیں تو اور کیا کرے، میر اپنے عہد، بلکہ اپنے عہد کے شاعروں میں کوئی غیر معمولی مزاج کے آدمی یقیناً نہیں ہوں گے، نہ انھیں ایسے اندوہناک حالات سے دوچار ہونا پڑا جو صرف انھیں کو پیش آئے، اور اس عہد میں کسی کو ان سے واسطہ نہ پڑا (نہ سوائے

---

٭ چلا اکبر آباد سے جس گھڑی — در و بام پر چشم حسرت پڑی!

کہ ترکِ وطن پہلے کیونکر کروں — مگر ہر قدم دل کو پتھر کروں!

پس از قطع رہ لائے دلی میں بخت — بہت کھینچے یاں میں نے آزار سخت

کو، نہ سودا کو، نہ مصحفی کو، نہ حسن کو!!!) لیکن میر صاحب، دوسروں کے مقابلہ میں اچھا خاصا روئے۔ اور رلانے کی کوشش میں لگے رہے۔

مسلک اثنا عشری (امامیہ) میں رونا اور ساتھ میں رلانا ایک مستحسن کام ہے یہ بات قابل لحاظ ہے کہ میر صاحب نے رونے رلانے کا جہاں جہاں ذکر کیا ہے وہاں ایک مخصوص شیعی لفظ مجلس یا متعلقات میں سے کوئی ایک (ماتم، مرثیہ، روضہ خواں، نوحہ، رونا، رُلانا) ضرور (اکثر) استعمال کیا ہے[1]۔ یہ الگ بات ہے کہ مجلس کی طرح باقی اور الفاظ بھی غزل کے ماحول میں اپنی اصلیت کھو بیٹھے ہیں۔ یہ بحث طول دینے کی نہیں، صرف اشارہ کرتا ہوں۔ یہ کہنے کی شاید ضرورت نہیں کہ میر صاحب صوفی صافی ہونے اور صلح کل کی باتیں کرنے کے باوجود اپنے مسلک میں خاصے کٹر تھے[2]۔

○

میر کی غزل کے تقریباً ساڑھے تیرہ ہزار اردو اور تقریباً دو ہزار فارسی اشعار میں، بڑی تعداد تو ایسے اشعار کی ہے جو اپنے مضامین کے اعتبار سے مکرّر، سہ کرّر سے بڑھ کر کئی جگہ "دہ کرّر" تک ہو گئے ہیں۔ بلکہ بعض جگہ تو صرف ردیف کی تبدیلی ہوئی ہے، قافیہ کی بھی نہیں۔ باقی مصرع کا مصرع اور شعر کا شعر ویسے ہی آگیا ہے[3]۔ ایسے اشعار کی تعداد کسی طرح چھ سات ہزار سے کم نہ ہوگی جن

---

۱۔ جب نالہ کش ہوا وہ تب مجلسیں رلائیں — تھا میر دل شکستہ یا کوئی نوحہ گر تھا!

مرنے پہ میر نے روز رلایا سبھوں کے تئیں — میری غزل پڑھی تھی شب اک روضہ خواں کی طرح

کوئی دم کل آئے تھے مجلس میں میر — بہت اس غزل پر رلایا ہمیں

ع ہے فرض عین رونا دل کا گداز واجب

سرکن اشعار ماتم دل میر — بر محزون واقعات مقبل ما

۲۔ ع جو حیدری نہیں اسے ایمان ہی نہیں

۳۔ ع لطف کیا احسان کیا انعام کیا اکرام کیا ؎ لطف گیا احسان گیا انعام گیا اکرام گیا

ں بار بار وہ اپنے آموختے دوہراتے رہتے ہیں! اس طرح کے اشعار کے مضامین پامال
ں، اور انداز بیان فرسودہ۔ ہزار کے لگ بھگ ایسے شعر ہونگے جن میں اردو
ے دوسرے شاعروں کی آواز سنائی دیتی ہے، وہ شاعر جو میر سے سینیئر ہیں،
تم، مظہر، سودا، اور کہیں کہیں ولی بھی! چند سو اشعار ایسے ہیں، جو فارسی کے
سط درجے کے شعروں کے سیدھے سادے ترجمے ہیں۔ میر کے اپنے شعر چار
نچ ہزار کے قریب بچتے ہیں جن میں ان کی اپنی شاعری ملتی ہے۔ اور اس حصے
ں معمولی درجے کے اشعار کو چھوڑ کر میں نے ایسے اشعار کی تلاش کی ہے جن میں
وشنی، دماغ جلاتی اور میر کی ہڈیوں کا جلنا محسوس ہوا؛ اور دوسرے: اس
انے میں ہندوستانی تہذیب کے ارتقا نے دلی کے سنجیدہ دماغوں کے لئے فکر و نظر
کے جو گوشے روشن کر دیے تھے، میر نے ہم تک اس میں سے کیا کیا پہنچایا ہے۔
میں نے میر کے ایسے اشعار انتخاب نہیں کیے جن میں انھوں نے لوگوں کو اپنے سرہانے بولنے
سے منع کیا ہے، یا جہاں وہ کسی دیوار کے سایے کے تلے پڑے ہوئے ہیں، یا بار بار محبوب
کی گلی میں پھیرے پھیرے ہو رہے ہیں، یا انھوں نے دل ستم زدہ کو تھام تھام لیا ہے۔
یا انکا رنگ زرد ہو رہا ہے، یا محبوب کے سامنے ان کے حواس کٹ جاتے ہیں، یا محبوب
کے لب گلاب کی پنکھڑی ہو رہے ہیں یا، خیر باقی چھوڑیے یوں سمجھیے کہ ایسے اکثر مشہور شعر
جو بار بار فخر کے ساتھ پیش کیے جاتے رہے ہیں، مگر جن میں سستے نشہ یا سطحی جذبے کے سوا
کچھ ہے نہیں۔ میں نے میر کے یہاں اس سطح کے شعر نکال کے صرف شدت جذبات اور
اسکے بھرپور اظہار کو سامنے رکھا ہے؛ اور دل کی ان باتوں کے ساتھ دماغ کی جو باتیں میر کر سکے
ہیں وہ بھی میں نے یہاں یکجا کرنے کی کوشش کی ہے:

---

ا۔ قافلہ قافلہ جاتے ہیں چلے کیا کیا لوگ میر غفلت زدہ حیران سے کیا بیٹھے ہیں
یا۔ فسانے والے والے شعر جنھیں سن کے نیند اڑ جاتی ہے۔ یا متصوفانہ اشعار ۔یا مجذوب
سامنے آجاتا ہے تو میر صاحب سے کچھ کہا نہیں جاتا وغیرہ۔

جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم ! سو اس عہد کو اب وفا کر چلے
خاک ہوئے، برباد ہوئے، پامال ہوئے سب کچھ ہوئے اور شدائدِ عشق کی راہ کے کیسے ہم ہموار کریں
اک وہم نہیں بیش مری ہستیِ موہوم اس پر بھی تری خاطرِ نازک پہ گراں ہوں
دل کس قدر شکستہ ہوا تھا کہ رات میر آئی جو بات لب پہ سو فریاد ہو گئی
آخر کے یہ سلوک ہم اب تیرے دیکھ کر کرتے ہیں یاد پہلی ملاقات کے تئیں
تمہیں بھی چاہئے ہے کچھ تو پاس چاہت کا ہم اپنی اور سے یوں کب تلک نباہ کریں
ترے فراق میں، جیسے خیالِ مفلس کا گئی ہے فکر پریشان کہاں کہاں میری
متصل روتے ہی رہیئے تو بجھے آتشِ دل ایک دو آنسو تو اور آگ لگا جاتے ہیں
سرزد ہم سے بے ادبی تو وحشت میں بھی کم ہی ہوئی کوسوں اس کی اور گئے اور سجدہ ہر ہر گام کیا
حرم میں میر جتنا بت پرستی پر ہے تو مائل خدا ہی ہے تو اتنا بتکدے میں برہمن
ہوتا ہے یاں جہاں میں ہر روز و شب تماشا دیکھا جو خوب، تو ہے دنیا عجب تما
یہ لوگ بھی غضب کے ہیں دل پر یہ اختیار شب موم کر لیا سحر آہن بہ
چشمِ خوں بستہ سے کل رات لہو پھر ٹپکا ہم نے جانا تھا کہ اے میر یہ آزار گیا
سہل مت بوجھ یہ طلسمِ جہاں ہر جگہ یاں خیال ہے کچھ اور
سرسری تم جہان سے گزرے ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا
جب تک کڑی اٹھائی گئی ہم کڑے رہے ایک ایک سخت بات پہ برسوں اڑے رہے
یہ غلط کہ میں پیا ہوں قدحِ شراب تجھ بن نہ گلے سے میرے اترا کبھو قطرہ آب تجھ بن
ایں نہ پنداری کہ مردن موجبِ آسودن ست مرگ ہم یک منزل ست از راہِ بے پایانِ ما
وجہ بیگانگی نہیں معلوم تم جہاں کے ہو واں کے ہم بھی ہیں
سخن کی نہ تکلیف ہم سے کرو لہو ٹپکے ہے اب شکایت کے بعد
اس کے فریبِ لطف پہ مت جا کہ ہم نشیں وہ دیر میرے حال پہ بھی مہرباں رہا[1]

---

۱۔ چند روز ہوئے ایک جدید شاعر کے یہاں میر اس رنگ میں نظر آئے۔
ساقی کی دوستی پہ نہ جاؤ کہ مے کشو ساقی سے دوستی تھی ہماری بھی کل تلک

بے تہی دریائے ہستی کی نہ پوچھ
یاں سے واں تک سو جگہ ساحل ہے یاں

میں پاشکستہ جا نہ سکا قافلے تلک
آتی اگرچہ دیر صدائے جرس رہی

اب جہاں آفتاب میں ہم ہیں
یاں کبھو سرو و گل کے سائے تھے

کیا سہل جی سے ہاتھ اٹھا بیٹھتے ہیں ہائے
یہ عشق پیشگاں ہیں الٰہی کہاں کے لوگ

پاؤں کے نیچے کی مٹی بھی نہ ہوگی ہم سی
کیا کہیں عمر کو اس طرح بسر ہم نے کی

الٰہی کیسے ہوتے ہیں جنھیں ہے بندگی خواہش
ہمیں تو شرم دامن گیر ہوتی ہے خدا ہوتے

سراپا آرزو ہونے نے بندہ کر دیا ہم کو
وگرنہ ہم خدا تھے گر دلِ بے مدعا ہوتے

کوئی رہنے والی ہے عمرِ عزیز
گئی گر نہ امروز، فردا گئی

لا نہ وضع برسوں اس شہر میں رہا ہوں
بھاگوں ہوں دور سب سے میں کس کا آشنا ہوں

کے جو کہنوں کا پیشہ ہوئے سیکڑوں ہوں تو ایک ہیں سب
کوہکن و مجنون و وامق، میرؔ ہمارے یار ہیں سب

ں نے میں کا شاید آیا، داغ جنوں کے سیاہ ہوئے
دل کھنچتا ہے جانبِ صحرا، جی نہیں لگتا گھر میں اب

ایسی معیشت کر لوگوں سے جیسی غمکش میرؔ نے کی
برسوں ہوئے ہیں اٹھ گئے اسکو، روتے ہیں ہمسائے ہنوز

پاسِ ناموسِ عشق تھا، ورنہ
کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

اب کی بہت ہے شورِ بہاراں ہم کو مت زنجیر کرو
دل کی ہوس کچھ ہم بھی نکالیں، دھومیں ہمیں مچانے دو

نہ بتکدہ ہے منزلِ مقصود، نہ کعبہ
جو کوئی تلاشی ہو ترا، آہ کدھر جائے

جس کو دیکھا ہم نے اس وحشت کدے میں دہر کے
یا سڑی، یا خبطی، یا مجنون، یا دیوانہ تھا

یہ توہم کا کارخانہ ہے
یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

دور بیٹھا غبارِ میرؔ اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

مجلسِ آفاق میں پروانہ ساں
میرؔ بھی شام اپنی سحر کر گیا

آزار بہت کھینچے، اب میرؔ توکل ہے
کھینچی نہ گئی ہم سے ہر ایک کی ترنائی

سب میرؔ کو دیتے ہیں جگہ آنکھوں میں اپنی
اس خاک رہِ عشق کا اعزاز تو دیکھو

یوں سر بکھیرے عشق میں پھرتے نہیں ہیں میرؔ
اظہار بھی کریں ہیں تو اظہار کی روش

میرؔ مل مل کے بہت خوش ہوئے تم سے پیارے
اس خرابے میں مری جان تم آباد رہو

بارے دنیا میں رہو غمزدہ یا شاد رہو — ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو
یارانِ رفتہ ایسے کہاں دور تر گئے ہیں — ٹک کر کے تیز گامی اس قافلے کو جا لو
کہتے ہیں اڑ بھی گئے جل کے پر پروانہ — کچھ سنی سوختگاں تم نے خبر پروانہ
آ پڑا آگ میں لے شمع یہیں سے تو سمجھ — کس قدر داغ ہوا تھا جگر پروانہ
کس گنہ کا ہے پس از مرگ یہ عذر جاں سوز — پاؤں پر شمع کے پاتے ہیں سر پروانہ
بزم دنیا کی تو دل سوزی سنی ہو گی میر — کس طرح شام ہوئی تھی سحر پروانہ
جی چاہے مل کسو سے، یا سب سے تو جدا رہ — پر ہو سکے تو پیارے ٹک دل کا آشنا رہ
ہر مشت خاک یاں کی چاہے ہے کچھ تامل — بن سوچے راہ مت چل، ہر گام پر کھڑا رہ
شاید کہ سر بلندی ہووے نصیب تیرے — جوں گردِ راہ سب کے پاؤں سے تو لگا رہ
من در نفس شماری و آں سرو خوش خرام — مستغنیانہ رفت کہ با خود حساب داشت
خوں گشت و داغ گشت، تمامی گداز گشت — لیکن تردد لیست ترا در وفائے دل
کنوں کہ وصل میسر شد است وے گیرم — دریں غمم کہ ندانم چہ آرزو دارم

---

ان اشعار میں، تہذیب عاشقی، تہذیب فن، شرافتِ اسلوب اور نسلوں کے تہذیبی ریاض کا رچاؤ ملتا ہے، جس سے محبت اور انسانیت پر ایمان میں شگفتگی آجاتی ہے۔ لیکن زبان اور بیان پر ایسی بے پناہ قدرت، خوبصورت شعر کہنے کا ایسا ملکہ، اور شاعری کے لئے اس قدر فرصت کے ساتھ اپنے ورثہ کے بہترین دماغوں سے اکتسابِ فن اور اکتسابِ فکر کے سارے مواقع میسر ہونے کے بعد، میر کو جتنے اچھے شعر، اور جتنی بڑی تعداد میں خوبصورت شعر کہنے چاہئے تھے، انھوں نے نہیں کہے۔

---

سخن کی خدائی کا منکر ہونے کا یہ مطلب یقیناً نہیں کہ اردو ادب کو میر کی جو واقعی دین ہے اسے نظر انداز کر دیا جائے:

میر نے عشق کا بڑا بلند تصور دیا ہے، اتنا بلند تصور جو شاید اقبال سے پہلے کسی اور اردو

شاعر کے یہاں اتنا واضح نہیں ملتا :

محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور　　نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور
محبت مسبب، محبت سبب　　محبت سے آتے ہیں کارِ عجب
محبت بن اس جا نہ آیا کوئی　　محبت سے خالی نہ پایا کوئی
محبت سے کس کو ہوا ہے فراغ　　محبت نے کیا کیا دکھائے ہیں داغ
محبت اگر کار پرداز ہو　　دلوں کے تئیں سوز سے ساز ہو
محبت لگاتی ہے پانی میں آگ　　محبت سے ہے تیغ و گردن میں لاگ
محبت سے پروانہ آتش بجاں　　محبت سے بلبل ہے گرمِ فغاں
اسی آگ سے شمع کو ہے گداز　　اسی کے لئے گل ہے سرگرمِ ناز
محبت ہی ہے تحت سے تا بہ فوق　　زمین آسمان سب ہیں سرگرمِ شوق...
محبت سے ہے انتظامِ جہاں　　محبت سے گردش میں ہے آسماں...
اس آتش سے گرمی ہے خورشید میں　　یہی ذرہ کی جان نومید میں

---

کب اس عشق نے تازہ کاری نہ کی　　کہاں خون سے غازہ کاری نہ کی

---

عشق ہی عشق ہے جہاں دیکھو　　سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق
عشق ہے طرز و طور، عشق کے تئیں　　کہیں بندہ، کہیں خدا ہے عشق
گر پرستش خدا کی ثابت کی　　کسو صورت میں ہو بھلا ہے عشق
دل کش ایسا کہاں ہے دشمنِ جاں　　مدعی ہے پہ مدعا ہے عشق

ارض و سما میں عشق ہے ساری، چاروں اُور بھرا ہے عشق
ہم ہیں جنابِ عشق کے بندے، نزدیک اپنے خدا ہے عشق

ظاہر و باطن، اوّل و آخر، پائیں بالا، عشق ہے سب
نور و ظلمت، معنی و صورت، سب کچھ آپ ہی ہوا ہے عشق

ایک طرف جبریل آتا ہے، ایک طرف لاتا ہے کتاب
ایک طرف پنہاں ہے دلوں میں، ایک طرف پیدا ہے عشق

ع:- کچھ کہتے ہیں سرِّ الٰہی، کچھ کہتے ہیں خدا ہے عشق

میر کے یہاں اسالیب کے تجربے، بڑے متنوع، دل آویز اور شعریت سے بھرپور، قیمتی تجربے، ملتے ہیں۔ میں اس جملے کی وضاحت کے لئے ایسے متنوع تجربات کے حامل اشعار پیش کرتا ہوں :

ہر چند میر بستی کے لوگوں سے ہے نفور
پر ہائے آدمی ہے وہ خانہ خراب بھی

عجب نہیں ہے، نہ جانے جو میر چاہ کی ریت
سنا نہیں ہے مگر یہ کہ جوگی کس کے میت

اشعار میر پر اب ہے ہائے وائے ہر سو
کچھ سحر تو نہیں ہے لیکن ہوا تو

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے، باغ تو سارا جانے ہے

آگے کسو کے کیا کریں دست طمع دراز
وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے

اردو کے مستند لغت کے لئے ایک اہم ماخذ کی حیثیت سے میر کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ عہد قدیم سے اب تک نظیر، انیس، جوش اور شاد عارفی کے سوا کسی شاعر نے اتنے سارے الفاظ کا احاطہ نہیں کیا ہے (اسی سلسلہ میں میر سے یہ بھی سیکھا جا سکتا ہے کہ اور، سمے، سانجھ، دوس، قسم کے سبک الفاظ کو اردو میں پھر سے رواج دیا جائے) تاہم کلیات کو پڑھتے وقت ایک بات یہ ذہن میں آئی کہ میر نے اگرچہ دلی کی گلیوں کی زبان ان کے محاورے، اور اس کی بول چال، کو اپنے کلام میں سمیٹ لیا ہے، لیکن لغت اردو کے لئے ایک اہم ماخذ ہوتے ہوئے بھی ان کے مستعملات کو من وعن نہیں مانا جا سکتا۔ الفاظ کی صحت کے لئے میر کو معیار آخری نہیں بنایا جا سکتا، جیسا کہ مثلاً سودا، درد اور قائم (یا قبل ازیں حاتم) کو بنایا جا سکتا ہے۔ (الفاظ کی صحت کے اعتبار سے وہ سوز کے ساتھ رکھے جا سکتے ہیں)

میر کی اثر اندازی کا اعتراف کرنا چاہئے۔ غالب اور اقبال ہمارے دو بڑے شاعر اس سے

متاثر ہوئے ہیں، اور ان کے بعد فیض بھی، شاید فراق بھی۔

میں میر کو سناؤں آپ غالب کو یاد کیجئے۔

مقصود کو دیکھیں پہنچیں کب تک ‏ گردش میں تو آسماں بہت ہے!

عالم عالم عشق و جنوں ہے دنیا دنیا تہمت ہے ‏ دریا دریا روتا ہوں میں صحرا صحرا وحشت ہے

جائے ہے جی نجات کے غم میں ‏ ایسی جنت گئی جہنم میں

اب کہیں جنگلوں میں ملتے نہیں ‏ حضرت خضر مر گئے شاید

۴:۔ بھتی خبر گرم ان کے آنے کی

اور ابن مریم ہوا کرے کوئی، قسم کی عہد اخیر کی سادہ و پرکار غزلوں پر تو پوری چھاپ اسی انداز سخن کی ہے۔ خود غالب کی نظم و نثر میں میر سے عقیدت کے اعترافات الگ رہے۔

اقبال اور میر کے تصور عشق میں حیرت انگیز یکسانیت سے قطع نظر بعض مضامین کی یکسانیت بھی قابل لحاظ ہے۔ مثلاً میر کے یہ اشعار:

ایک طرف جبریل آتا ہے ایک طرف لاتا ہے کتاب ‏ ایک طرف پنہاں ہے دلوں میں، ایک طرف پیدا ہے عشق

وے لوگ تم نے ایک ہی شوخی میں کھو دیے ‏ پیدا کئے تھے چرخ نے جو خاک چھان کر

کوئی ہو محرم شوخی ترا تو میں پوچھوں ‏ کہ بزم عیش جہاں کیا سمجھ کے برہم کی

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں ‏ تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

رہی نہفتہ مرے دل میں داستاں میری ‏ نہ اس دیار میں سمجھا کوئی زباں میری

اور فیض اور فراق کے یہاں ............ میر کے اسلوب کی پرچھائیاں میری طرح شاید آپ کو بھی مل جائیں:

کچھ تمہیں ملنے سے بیزار ......... ‏ دوستی ننگ نہیں، عیب نہیں، عار نہیں

چلتے ہو تو چمن کو چلئے، سنتے ہیں کہ بہاراں ہے ‏ پات ہرے ہیں پھول کھلے ہیں، کم کم باد و باراں ہے

رنگ ہوا سے یوں ٹپکے ہے جیسے شراب چواتے ہیں ‏ آگے ہو میخانے کے نکلو، عہد بادہ گساراں ہے

(ہم کو دیوانگی شہروں ہی راس آتی ہے ‏ دشت میں قیس رہو کوہ میں فرہاد رہو

ع۔ اک برگِ گُل نسیم ہماری طرف بھی لاؤ
ع۔ عشق میں چاہئے اسے پُھر تو
ع۔ پر ہائے آدمی ہے وہ خانہ خراب کیا
ع۔ ناز و غرور بہت ہے اس کا لطف نہیں ہے کم کم بھی
یہ سنا تھا میر ہم نے کہ فسانہ خواب لائے　　تری سرگزشت سُن کر گئے اور خواب یاراں

میر صاحب کچھ ایسے خوبصورت مصرعے نظم کر گئے ہیں کہ ان میں سے بعض ہمارے روز مرہ کا جزو بن گئے ہیں، اور باقی کو یہتی جانا ہے، ان میں سے دو ایک اپنی بے ساختگی روانی، اور تاثر کے پیش نظر جوں کے توں فلمی گیتوں کا حصہ بنا لیے گیے ہیں :

ع۔ یارو مجھے معاف رکھو میں نشہ میں ہوں : ع ... جائیں تو جائیں کہاں
ع۔ دور پہنچی ہیں مری رسوائیاں　ع۔ اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی
ع۔ اور بستی نہیں یہ دلّی ہے۔　ع۔ پھر ملیں گے اگر خدا لایا۔
ع۔ میں تو تقریب بھی کی، پر تو اسے یاد نہیں۔ ع۔ کفر کچھ چاہئے اسلام کی رونق کے لئے
(میر صاحب زمانہ نازک ہے)　　دونوں ہاتھوں سے تھامیئے دستار
ع۔ ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو : ع زمیں سخت ہے آسماں دُور ہے۔
ع۔ مجھے تو درد سے اک انس ہے خدا کی قسم ع۔ اب کہو اس شہر ناپرساں سے کیدھر جائیے
ع۔ ناکام اس لئے ہو کہ چاہو ہو سب کچھ آج۔ ع۔ یک جان و صد تمنا یک دل ہزار خواہش
ع۔ خانہ خراب میر بھی کتنا غیور تھا ع۔ ہے پیارے ہنوز دلّی دور۔
ع۔ دن آج کا بھی سانجھ ہوا انتظار میں　ع۔ تجھے میر سمجھا ہے یاں کم کسو نے
ع۔ عیب کرنے کو بھی ہنر ہے شرط ع۔ کبھو کے دن ہیں بڑے اور کبھو کی رات بڑی۔
ع۔ بے تابی ہے زیادہ صبر بہت کم کم ہے اب ع وحشت کرنا شیوہ ہے کیا اچھی آنکھوں والوں کا
(واعظ ناکس کی باتوں پر کوئی جاتا ہے میر)　　آؤ میخانے چلو تم کس کی باتوں پر گئے!
(میر وحشی کا دل ہے بے طاقت)　　چلتا پھرتا ہے پر اُداس اداس
دوسری آخری بات یہ کہ میر کا ایک خاص رنگ ہے جو پہچان لیا جاتا ہے :

ع-آہ و فغاں کے طور سے میرے، لوگ مجھے پہچان گئے

ا ہم محض پہچان عظمت کی دلیل نہیں، کچھ ان کی مخصوص بحروں کی المناکی، کچھ ان کے مضمون کی ل گرفتگی، کچھ لہجہ کی معصومیت[1] اور انداز بیان کی کسک، اور پھر اس سے ماورا ایک کیفیت ایک فضا، جو میر کی ان غزلوں میں بھی ہے جن میں ویسے کوئی خاص بات نہیں ہے — یہ سب مل کر میر کی پہچان بناتے ہیں، یہ میر کا رنگ ہے اور اس رنگ پر انکا سرتاپا عاشقانہ مزاج چھایا ہوا رہتا ہے:

وہ شخص جہاں شکوۂ ایام کریں گے
ہوگا ستم و جور سے تیرے ہی کنایہ

○

عمر بھر ہم رہے شرابی سے
دل پہ خون کی اک گلابی سے

لہنے والا، دل پر خون کی گلابی سے کچھ بھی نہ چھلکا سکا۔ میں اتنے کم کو "کچھ بھی نہیں" کہنے پر اصرار کرتا ہوں!

••

---

[1] لہجہ کی معصومیت کو بھی میر کی مقبولیت اور تعظیم میں بڑا دخل رہا ہے، اس حد تک کہ ہمارے بعض نوعمر شاعر اس معصومیت کو میر کا جزو اعظم سمجھ کر (بجا طور پر) اپنی شاعری میں بھی وہی معصوم لہجہ اور انداز لانے کی کوشش کرنے لگے حالانکہ یہ بڑی سیدھی سی بات ہے کہ اس دور کے میر کیا اور سودا، قائم، درد، اور سوز کیا، مصحفی اور حسن تک یہ معصومیت عام اور مشترک رہی ہے جو دراصل اس دور کی تہذیبی سادگی کا اظہار ہے جس میں نہ کوئی چھچھورا پن تھا نہ بناوٹ نہ الجھن!

نعیم احمد

# سیر المنازل مصنفہ سنگین بیگ

## تعارف اور تجزیہ

### (۱)

سید احمد خاں کی کتاب "آثار الصنادید" اپنی نوعیت کی اوّلین کتاب سمجھی جاتی ہے۔ اس کو لوز ایسی مقبولیت حاصل ہوئی۔ گارسین دتاسی نے اس کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا تھا ں کا انگریزی میں بھی ترجمہ ہو رہا تھا، جو غالباً نامکمل رہ گیا۔ سرسید کو اسی کتاب پر ایل ل، ڈی کی ڈگری ملی تھی اور رایل ایشیاٹک سوسائٹی کا اعزازی فیلو مقرر کیا گیا تھا۔

آثار الصنادید کا پہلا ایڈیشن ۱۸۴۷ء میں شائع ہوا۔ حالی کے بقول سرسید نے یہ کام ڈیڑھ برس میں مکمل کیا تھا۔[۱] اس کا مطلب یہ ہوا کہ انھوں نے اس کی ابتدا ۱۸۴۶ء میں کی ہوگی۔ لیکن اس موضوع پر یہ پہلی کتاب نہیں تھی۔ اس سے آٹھ دس برس قبل دلّی کے آثار اور گلی کوچوں پر ایک تحقیقی کتاب لکھی جا چکی تھی: اس کتاب کا نام سیر المنازل ہے اور اس کے مصنف سنگین بیگ بن علی اکبر بیگ کوئی شخص ہیں۔ ان کے حالات معلوم نہیں ہو سکے لیکن ان کے اپنے بیان سے اتنا پتا چلتا ہے کہ وہ دلی میں کمپنی کی سرکار میں نوکر تھے۔ انھیں منصب ان کی اسی تصنیف کی قدر و قیمت کے اعتراف میں دیا گیا تھا:

مصنف کے بقول اس نے شہر کی مسجدوں، مقبروں اور ویران عمارتوں کی تواریخ لکھی ہے اور ان کے کتبوں کا گہرا مطالعہ کر کے ان کی بعینہٖ نقلیں تیار کی ہیں۔ سرسید نے بھی آثار الصنادید میں یہی انداز اختیار کیا ہے۔ ممکن ہے انھوں نے اس کتاب سے استفادہ کیا ہو، اگرچہ انھوں نے کہیں اس کا ذکر نہیں کیا۔ یہاں اسی اہم اور قابلِ قدر کتاب کے دو مخطوطوں کا تعارف

۱۔ حیاتِ جاوید: ۱۱۴-۱۱۸۔

بنوایا جس میں ایک لاٹھ نصب کی ۔
سید خضر خاں نے خضر آباد کا قلعہ بنوایا جو گمٹی خضر کے نام سے مشہور ہے ۔
مبارک شاہ نے مبارک آباد کی بنیاد رکھی ۔
نصیر الدین ہمایوں نے قلعہ اندر پت کی از سر نو تعمیر اور اس میں ترمیم کی اور اس کا نام دین پناہ رکھا، یہ پرانے قلعہ کے نام سے معروف ہے ۔
شیر شاہ نے شیر منڈل کے نام سے ایک شہر آباد کیا ۔
سلیم شاہ نے قلعہ سلیم گڑھ بنوایا ۔
مرزا سنگین بیگ نے لال قلعہ کے بیان میں لکھا ہے کہ ۵ ذی الحجہ ۱۰۴۸ھ یعنی شاہجہاں کے بارہویں سال جلوس اس کی بنیاد رکھنے کا حکم صادر کیا گیا۔ محرم ۱۰۴۹ ہجری کو جمعہ دن پانچ ساعت اور بارہ دقیقے گذرنے پر اس کی تعمیر شروع ہوئی اور ۱۰۵۸ ہجری میں تقریباً ۹ برس بعد یہ مکمل ہو گیا۔ اس پر ۵۹ لاکھ اور ۹۵ ہزار روپیہ لاگت آئی۔ پھر قلعہ کی مختلف عمارتوں پر جتنا جتنا روپیہ صرف ہوا تھا، اس کا حساب درج ہے ۔
شاہ جہاں نے قلعہ میں جو عمارتیں اور باغ تیار کروائے تھے، ان میں سے بیشتر کا ۱۸۵۷ء میں نام و نشان مٹا دیا گیا کچھ ہنوز باقی ہیں۔ اس کتاب سے ان عمارتوں کا علم ہوتا ہے:
قلعے کے دہلی دروازہ کے بعد نومحلہ تھا (اکبر شاہ ثانی کے زمانے میں اس میں ناظر منظور علی خاں سلاطین اور اس بادشاہ کے اپنے بیٹوں کے مکانات تھے)
مہتاب محل (یہاں مرزا جہانگیر ولی عہد اور بادشاہ کے بھائی مرزا نیلی کے مکانات تھے)
ڈیوڑھی خواص پورہ، چوک، جلوخانہ، نقار خانہ۔ نقار خانے اور چھتہ لاہوری دروازے کے درمیان چوک میں فیض نہر جاری تھی
قلعہ کے لاہوری دروازے کے اوپر کپتان میکفاسن کا مکان تھا جو اس وقت قلعہ دار تھا۔ اسی جگہ شاہی ملازموں کے مکانات تھے ۔
نقار خانے میں دیوان عام تھا جہاں شاہجہاں سے شاہ عالم کے زمانے تک بادشاہوں کی تخت نشینی کی رسم ادا ہوتی تھی ۔

نقارخانے کے مشرق میں ڈیوڑھی زنانہ شاہی محل تھی جو ڈیوڑھی عدالت کے نام سے معروف تھی۔

دیوان عام کے قریب ایک دروازہ تھا جس کے متصل دیوان خاص تھا۔ اسی مقام پر وہ دروازہ تھا جس پر لال پردہ پڑا رہتا تھا۔ اس کے اندر محل معلی، مثمن برج، جلوس گاہ، موتی مسجد، ایک عدیم النظیر حمام (اس حمام کے پیچھے ایک جگہ تھی جہاں مرزا جہانگیر بیٹھتے تھے)، مہتی محل، شاہ برج، باغ حیات بخش معروف بہ ساون بھادوں، اس کے درمیان ایک بڑا حوض تھا۔ موتی محل کے دالان کے سامنے سنگ مرمر کے سالم ٹکڑے سے تراشا ایک ایسا حوض تھا جس میں کوئی جوڑ نہیں تھا۔ موتی محل کے پیچھے بھی ایک ایسا ہی حوض تھا اس محل کے دونوں طرف اژدہا پیکر نہریں جاری تھیں۔ شاہ برج کے قریب سنگ یشب سے ترشا ہوا مخصوص حوض تھا۔ مہتاب باغ میں عدالت وغیرہ کی عمارتیں تھیں۔ اس سے کچھ فاصلے پر چوبی مسجد تھی۔ اس کے جنوب میں ایک دروازہ تھا جس سے مرزا جہانگیر کی نو تعمیر شدہ حویلی کو راستہ جاتا تھا۔ مہتاب باغ کے عقب میں مرزا فرخندہ بخت، مرزا طفل، مرزا مغل کے مکانات، مرزا جہان بخت مرحوم کا حمام اور بادشاہی توپ خانہ کی عمارت تھی۔

مرزا سنگین نے دلی اور اس کے مضافات کے کوچوں، بازاروں، مسجدوں، مزاروں، مندروں، باغوں اور مکانوں وغیرہ کا لفظی نقشہ کھینچا ہے۔ چنانچہ لال قلعہ کو مرکز قرار دے کر اس کے باہر چوک سعد اللہ سے حوض قاضی تک، حوض قاضی سے ایک طرف کھڑکی فراشخانہ اور فصیل کے لاہوری دروازے، دوسری طرف ترکمان دروازہ اور وہاں سے خونی دروازے تک تمام آبادی اور قابل ذکر چیزوں کا بیان ہوا ہے۔ اسی طرح دلی کے مضافاتی علاقوں تریلہ، سونی پت، پانی پت، بادلی، موتیا کھان، کالا پہاڑ، بہادر گڑھ، دادری، سانپلہ، روہتک، ہانسی وغیرہ میں جو ایسی ہی چیزیں تھیں انہیں بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ یہ معلومات آثار الصنادید میں نہیں ہیں۔ اس لئے سیر المنازل واحد کتاب ہے جس سے ۱۸۵۷ء سے قبل کے دلی شہر کا حال معلوم ہوتا ہے۔ اسکے بعد انگریزوں نے کوچے کے کوچے اور محلے کے محلے نیست و نابود کر دیئے تھے اس سے

| ۱۔ محلہ، بازار، کوچہ، چوک، کٹرہ | ۲۔ حویلی، مکان | ۳۔ مسجد | ۴۔ متفرق |
|---|---|---|---|
| محلہ جٹواڑہ | حویلی شاہ پسند خاں | مسجد اکبرآبادی | مزار میر فتح علی شاہ |
| کوچہ پنڈت | مکان مرزا مینا بیگ خاں | ء نواب روشن الدولہ | مزار مرزا جان جاناں مظہر |
| کٹرہ منشیاں | نواب فتح اللہ بیگ خاں کا بالاخانہ | مسجد حکیم بوعلی خاں | |
| کوچہ بلی ماراں | حویلی نواب سہراب جنگ خاں قاسم | زینت المساجد | مدرسہ شاہ عبدالعزیز رح |
| کوچہ کھڑکی فراش خانہ | حویلی محمد خاں کرّوڑہ | مسجد قاضی | باغیچہ نواب تلند [illegible] |
| محلہ رودگراں | مکان تیر انداز خاں | مسجد سعداللہ | مزار حضرت [illegible] جہاں آبادی |
| کٹرہ شیخ چاند | حویلی نواب احمد بخش خاں | مسجد بوسعید خاں | |
| کوچہ [illegible] | دیوان خانہ نواب نصراللہ بیگ | مسجد نواب غازی الدین خاں | مقبرہ بھگو بیگم زوجہ محمد شاہ (المعروف بہ [illegible]) |
| کوچہ گوندنی | مکان نواب فتح اللہ بیگ خاں | مسجد شرف الدولہ | |
| کٹرہ بڑیاں | مکانات میر جملہ | مسجد حکیم شریف خاں | قبر حاجی حرمین |
| کوچہ کھاری باؤلی | مکان خواجہ بھکاری صاحب | مسجد فتحپوری | سرائے میاں صابر بخش |
| نیا بانس | حویلی کاکوال صاحب | مسجد شجاعت | شہر پناہ کا دہلی دروازہ |
| کوچہ پاتی رام | حویلی میر جملہ | مسجد سرہندی | سرائے محمد خاں کرّوڑہ |
| کوچہ پاٹ داس | مکانات حکیم ذکاء اللہ | عیدگاہ معروف بہ شاہ گنج | باغیچہ نواب بہادر علی خاں |
| کوچہ سیدی قاسم | مکان مولوی قطب الدین | نئی عیدگاہ | قلعہ کا لاہوری دروازہ |
| تکیہ [illegible] کا کوچہ | مکان میر حامد علی صاحب پٹہ باز | مسجد نواب معز الدولہ، بی بی ارجمند اور نواب کاظم خاں | فیل خانہ مرزا ولی عہد بہادر |
| بازار سیتا رام | حویلی نواب شہنواز خاں | | |
| کٹرہ جانی [illegible] | بنگلہ حافظ فدا | مسجد شاہ نظام الدین | فصیل کا لاہوری دروازہ |
| محلہ چوڑی گراں | حویلی دودھ دھاری | جامع مسجد (پرانے قلعہ میں) | امام باڑہ میر عسکری |

دلی کی وہ صورت مٹ گئی جس کا ہم تواریخی کتابوں اور نظموں میں ذکر پڑھتے ہیں۔ اس کتاب سے ہمیں شہر کی قدیم صورت سمجھنے میں بیش بہا مدد ملتی ہے۔

(۳)

مرزا سنگین بیگ نے جن عمارتوں، محلوں وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے، ان کی فہرست درج ذیل ہے:

| ۱۔ محلہ، بازار، کوچہ، چوک، کٹرہ | ۲۔ حویلی، مکان | ۳۔ مسجد | ۴۔ متفرق |
|---|---|---|---|
| چوک نواب سعد اللہ | امیر علی ہزاری کی حویلی | مسجد طلائی نواب بہادر خاں | فصیل کا اجگات کا دروازہ |
| کشمیری کٹرہ | عبد الرسول خاں کی حویلی | اکبری مسجد | |
| محلہ کشتی بانان | دار الشفا | مسجد خلیل اللہ خاں | شاہ بولہ |
| خانم کا کوچہ اور بازار | حویلی بہادر علی خاں | مسجد میاں خاں | حوض قاضی |
| بلاقی بیگم کا کوچہ | شاہ نظام الدین کی حویلی | مسجد کرہ آدینہ بیگ خاں | فصیل کا اجمیری دروازہ |
| چاوڑی بازار | حویلی قطبی بیگم | ” محمد خاں کروڑہ | چتلا دروازہ |
| چھتہ شاہ نظام الدین | بیگم کی حویلی | ” نواب سہراب جنگ خان قاسم | چاہ سبز |
| کوچہ شاہ نظام الدین | دار البقا | ” خلیفہ بختشو | لال کنواں |
| محلہ روشن پورہ | حویلی میر جبّو | مسجد فتح پوری | تھان پنج پیروں کا |
| کوچہ مائی واڑہ | حویلی راجہ کیدار ناتھ | مسجد تہور خاں | چاہ نورنگ رائے |
| کوچہ چھیپے والا | حویلی قمر الدین خاں | کلاں مسجد المعروف بہ کالی مسجد | باغیچہ تن سکھ رائے کا |
| کوچہ شاہ تارا | مکان کچہرہ کروڑ | مسجد شاہ حسین واعظ | حوض نوبہ مظفر خاں |
| کوچہ میر عاشق | مکان رائے جے سنگھ رائے | ” حکیم سید قدرت اللہ | حمام سبیل دار |
| کوچہ بتاشے والا | حویلی نواب شیر جنگ | ” حاجی عبد اللہ | ملو بلیہ تبتی خاں |
| کوچہ مرغان | حویلی عبد الرحمن خاں | دائی کی مسجد | مقبرہ حاجی شاہ حسن |
| محلہ املی | حویلی شادل خاں | مسجد نواب شرف الدولہ | درگاہ شمس العارفین شاہ ترکمان بیابانی |
| کٹرہ گاڑی بانان پنجابی | مکان نور اللہ خاں | طلائی مسجد نواب بہادر خاں خواجہ سرا | مرزا جیتا کی قبر |

# سیر المنازل

| | | | |
|---|---|---|---|
| کوچہ امام خاں | مکان گوردھن کشمیری | مسجد حضرت نظام الدین مح اولیاء | |
| ریاست جھلی داران | مکان میر خاں ٹنڈہ | مسجد محمد خاں کروڑہ | صاحبہ آباد باغ |
| بھوجلہ پہاڑی | مکان مرزا فتح اللہ بیگ چیلہ | مسجد سوٹھ | فیض نہر |
| محلہ بلبلی خانہ | حویلی مولوی فتح علی جاگیردار | مسجد کھڑکی | نہر سعادت خاں |
| چماروں کا چھتہ | حویلی لالہ بسنتی رام | | فصیل کا کابلی دروازہ |
| کوچہ حوض مظفر خاں | حویلی رائے شنبو ناتھ | | قلعہ کا لاہوری دروازہ |
| کوچہ امام | حویلی راجہ کیدار ناتھ | | خونی دروازہ |
| ٹلیا محل | بنگلہ شیدی فولاد خاں | | گھڑیال مرزا اشرف بیگ |
| چھتہ شاہ حاجی | حویلی میر مرزا | | باغ بیگم سمرو |
| کوچہ پہاڑی | مکان میر علی نقی | | باغ اختر لونی |
| محلہ کلیان پورہ | حویلی مرزا جبار بیگ | | گھاٹ کیدہ |
| گنج میر خاں | حویلی لالہ گوردھن داس | | طویلہ داراشکوہ |
| مسکن گڈریوں کا | حویلی عزیز اللہ خاں | | |
| ریاست بندوق سازاں | حویلی حسن علی خاں عرف میاں حسنو | | زیب النساء کی قبر |
| کوچہ چیلان | حویلی مرزا فتح علی شاہ | | پنجہ حضرت شاہ مرداں |
| ریاست نواب فیض محمد خاں | مکان روشن موچی | | چاہ پیپل |
| دہلی دروازے کا بازار | حویلی مولوی محمد خاں | | شہر کا کابلی دروازہ |
| بازار نواب میر خاں | حویلی حافظ خیراتی | | ریتی مہابت خاں |
| قصاب پورہ | مکان سید نور علی خاں | | تکیہ نکٹہ |
| تراہا نواب بیرم خاں | حویلی نواب سلیمان المعروف بہ میر چمکاری | | شاہ بڑے صاحب کا تکیہ |
| فیض بازار | حویلی شیخ منگو | | پیر غیب کا مزار |
| محلہ حکیم محسن خاں | حویلی نواب احمد علی خاں | | قدسیہ باغ |

# سیر المنازل

| | | |
|---|---|---|
| راہ حویلی مہدی قلی خاں | حویلی لال ہزارہ بیگ × | بھولو شاہ فقیر کا تکیہ |
| چھتہ لال میاں | حویلی عزیز آبادی بیگم | زیب النسا بیگم کا مقبرہ |
| کوچہ بازار خانم | مکان فیضو رکابدار | زوجہ محمد شاہ کی قبر |
| کٹڑہ منشی کنول نین | مکان نواب مرتضیٰ خاں | باغ شالامار |
| محلہ چاہ رہٹ | مکان میر محمدی | روشن آرا باغ |
| کوچہ استاد حامد | میر ہاشم کی حویلیاں | باغ جواہر خاں |
| کوچہ انار | مکان میاں آفاق پیرزادہ | باغ پٹنی مل |
| روشن پورہ | مکان حکیم سید قدرت اللہ | باغ کاکواں |
| محلہ مسجد کھجور | مکان حضرت غلام علی | سرائے بادلی |
| دریبہ | حویلی اعظم خاں | درگاہ امام ناصر الدین احمد |
| دریبہ کلاں | حویلی کلو خواص | (سونی پت میں) |
| کوچہ کٹڑہ کشمیری | مکان شاہ عبد العزیزؒ | مزار شیخ بو علی شاہ قلندرؒ |
| کوچہ نواب بہادر علی خاں | حویلی نواب مہدی قلی خاں | (سونی پت میں) |
| اردو بازار | مکان خواجہ میر درد | مقبرہ نواب مقرب خاں |
| قدیمی ترپولیہ | مکان عمر خاں بھرتیج | (سونی پت میں) |
| گل فروشوں کی منڈی | حویلی حکیم ثناء اللہ خاں | شمس الدولہ کا مقبرہ |
| ممتاز گنج | حویلی نامدار خاں و کامدار خاں | (سونی پت میں) |
| کاغذیوں کا محلہ | مکان عبد الرسول خاں | سرائے روح اللہ خاں |
| بازار کناری والا | مکان فیض طلب جاہ | قبر شاہ نظام الدین اولیاءؒ |
| جوہری بازار | رنگ محل | سیتلا کا مندر |
| نٹوں کا کوچہ | مکان غلام احمد خاں کوتوال معزول | جاں نثار خاں کی قبر |
| چاندنی چوک | مکان میر صفدر علی عطار | قبرستان اور قبر عبد الاحد خاں |
| کوچہ قابل عطار | نواب میر خاں کی حویلیاں | قبر نواب سلیمان خاں |

| | | |
|---|---|---|
| کٹڑہ نیل | حویلی مہدی قلی خاں | x مرزا شاہ عابد کی قبر |
| کوچہ بیج ناتھ | مکان مولوی رفیع الدین | درگاہ قدم شریف |
| کوچہ گوسائی رام | میر نجف علی خاں کی حویلیاں | تکیہ فقیہ |
| کوچہ چھیتہ جان نثار خاں | مکان سید امیر علی | تکیہ حسن رضا خاں |
| کوچہ گندی گلی | مکان مرزا مغل صاحب مختار | حضرت امام حسین کے پنجہ کی عمارت |
| کٹڑہ میوہ گراں | مکان شہزادہ مرزا سلیم بہادر | تکیہ ابو حسین فقیر |
| کوچہ حبش خاں | حویلی حکیم فیض علی خاں | رسول شاہی |
| کٹڑہ روغن زرد | لالہ سنت لال کی حویلیاں | مزار شاہ عبداللہ نمان |
| کٹڑہ گاڑی بانان | حویلی لالہ سکھ لال مہاجن | مدرسہ نواب غازی الدین خاں |
| کٹڑہ سعادت خاں | بالاخانہ شیخ بدرالدین مہرکن | مقبرہ نواب امین الدین خاں |
| کوچہ بلاقی بیگم | حویلی لالہ ننگت راے | درگاہ حضرت سید حسن |
| کوچہ چیلہ | کوٹھی سنساری مل | رسول نما |
| دریبہ خورد | حویلی لالہ بخشی رام گوبند لال | باغ محمد یار خاں |
| کٹڑہ مشروع | حویلی لالہ موہن لال | باغ کٹورہ بادشاہ |
| کوچہ بلی ماران | مکان مانس لال | مندر پارس ناتھ |
| کوچہ چوکیداران | حویلی نان دہ ران | مندر ہنومان جی |
| کوچہ انار | مکانات فیض محمد خاں | مکانات رصد جنتر منتر |
| محلہ چاہ رہٹ | مکانات ... بخش | مدرسہ مولوی فخر الدین |
| کوچہ مائی واڑہ | قاضی کا مکان | جنتر منتر کے قریب مندر |
| بزازوں کا کٹرہ | حویلی نواب سیف الدولہ | رکاب گنج میں سکھوں کا دہرہ |
| کٹڑہ آنند | مکانات نواب قمر الدین خاں | سرائے بسنت |
| کوچہ خان چند | مکانات محمد امین خاں | سرائے سہیل |
| کٹڑہ رائے مان | حویلی بو علی خاں | مقبرہ علی شاہ |

| | | |
|---|---|---|
| کوچہ نیچہ بندوں کا | مکان رائے پیران کشن | مقبرہ علی شاہ |
| کوچہ چوکی واڑہ | مکان لالہ گور پرشاد | مقبرہ خواجہ میر درد |
| کوچہ مالی واڑہ | کوٹھی نواب احمد بخش (؟ خان) | مزار خواجہ ناصر |
| کوچہ پیپل مہادیو | مکان کنور راج سنگھ | رجی کی باولی |
| چھتہ لالہ تن سکھ رائے | بلب گڑھ والا | برج محمد علی عرف بہ |
| ریاست گاڑی بانان | کوٹھی نواب فیض محمد خاں | مہندیان |
| کٹڑہ غلام محمد خاں | کوٹھی دیبی صاحب | قبرستان شاہ ولی اللہ مع |
| . . . . . | کوٹھی کپتان | مزارات مولوی رفیع الدین |
| کٹڑہ کونڈی | مکان بھاگ سنگھ | مولوی عبد القادر رح |
| کٹڑہ فتیح پری بیگم | کوٹھی زیب النساء بیگم سمرو | مکان تیل خانہ محبوسان |
| چھتہ بگم لود گھاٹ | حویلی دولت النساء بیگم | لال دروازہ دہلی قدیم کا |
| کٹڑہ بادل پورہ | مکان لالہ ہر نرائن فوطہ دار | مقبرہ شیخ محمد |
| نصیر گنج | حویلی بھوانی شنکر | سنہری گنبد (حقیقتاً |
| کٹڑہ تیجا بالی | لالہ ہر نرائن کے انگریزی طرز کے مکانات | شہزادوں کا مقبرہ) |
| محلہ دھوبی واڑہ | مکان احمد علی خاں | مزار نور الدین |
| مرزا امیر بیگ خاں کی گڑھی | حویلی خان جہاں خان | لال بنگلہ (مقبرہ |
| مغل پورہ | حویلی پوران تیار | بادشاہ زادیوں کا) |
| [illegible] | حویلی نواب شمس الدولہ | مزار حضرت نظام الدین اولیا |
| چوک نواب شمس الدولہ | مکان حکیم میر علی | اور امیر خسرو رح |
| (سو فی بیت میں) | حویلی نگر سیٹھ | مقبرہ شمس الدین محمد خاں |
| پہاڑی دھیرج | مکان راجہ ... کشن وکیل | چونسٹھ کھمبا میں قبر مرزا |
| تیلی واڑہ | شیش محل مرزا اشرف بیگ | عزیز کوکلتاش خاں |
| موتیا کھان | حویلی رکن الدین خاں | سرائے عرب |

جش پورہ
بڑکی چوکی
کالا پہاڑ
. . .
شاہ گنج معروف بہ
(پہاڑ گنج)
دریبہ پان
منڈی ٹھکر تری
منڈی صابن
منڈی قند سیاہ
محلہ بلبولہ
محلہ گبانی لدو
کٹرہ باسدیو
کٹرہ زنجبیل
پھاٹک مصری خاں
جے سنگھ پورہ
منڈی انگشت فروشوں کی
جہانگیر گنج
پان کی منڈی
رکاب گنج
محرم نگر
شدا لطہ گنج

مکان حکیم اجیت سنگھ ×
حویلی کپتان منویل
کوٹھی لالہ سوداگر مل
حویلی نجف علی خاں
. . .
حویلی عبدالرحمن خاں
حویلی غلام مرتضیٰ خاں
حویلی میر اعظم اللہ
حویلی کرنیل اسکنر
مکان عنایت اللہ خاں
حویلی حکیم غلام علی خاں
مکان نواب حسام الدین حیدر خاں
مکان حکیم عظیم اللہ خاں عرف میر خیراتی
حویلی حکیم شریف خاں
امام قلی بیگ خاں کی حویلیاں
مکان داروغہ قلندر بیگ
حویلی شیر افگن خاں
مکان منشی برکت علی خاں
حویلی بخشی بھوانی شنکر
مکان منشی ٹیک چند
حویلی صوفی اللہ یار خاں
حویلی راجہ جے سکھ رائے
حکیم بقا کے لڑکوں کے مکانات

مقبرہ ہمایوں بادشاہ
مزار سید نور محمد بدایونی
مقبرہ عبدالرحیم خاں
(خان خاناں)
باراں پلہ
چھوٹی سرائے
مزار سید محمود بہادر
مزار شیخ رکن الدین فردہ
سرائے مہتاب خاں
سرائے خیر اللہ
سرائے خواجہ
پل بڈھن
خواجہ قطب الدین میں باولی
کے قریب مندر
باغیچہ گروجی پنڈت
ڈھولا کنواں
باولی اور باغیچہ محمد خاں کروڑہ
باغ نبی خاں
مقبرہ صفدر جنگ
مقبرہ حور باغ
درگاہ حضرت شاہ مردان علی
مکان کربلا مرزا اشرف بیگ خاں
کا بنایا ہوا

× حویلی ہنگن بیگ طوائف
حویلی لالہ موہن لال
کوٹھی لالہ شگن چند
کوٹھی لالہ فقیر چند
مکان لالہ سکھ لال
حویلی شہزادہ داراشکوہ مخاطب بہ
شاہ بلاول خاں

حویلی نواب صفدر جنگ
مکان شاہ آبادانی صاحبؒ
کوٹھی گیسٹن صاحب
کوٹھی ریزیڈنٹ دارالخلافہ
حویلی نواب عبدالاحد خاں
کوٹھی ڈنڈی صاحب
حویلی نواب عبدالاحد خاں
حویلی صاحبہ محل
بنگلہ سید فیروز
مکان اسماعیل بیگ رسالدار
حویلی اسماعیل خاں
مکان سید رضی خاں
حویلی مہابت خاں
کوٹھی ڈاکٹر لہڈلو (لڈلو)
کوٹھی لنڈلی صاحب

× مقبرہ شاہ عارف علی
باغ نواب مبارک محل بیگم
مقبرہ نواب نجف خاں
درگاہ حضرت نصیرالدین
چراغ دہلی
مقبرہ بہلول شاہ
مقبرہ شیخ صلاح
مزار شاہ عبداللہ قریشی
مقبرہ غیاث الدین تغلق
مندر کالکاجی
مزار شیخ فرید
مقبرہ سید الرجال
درگاہ بی بی نور
مقبرہ فیروز شاہ
حوض خاص
مقبرہ میر خاں اور وزیر خاں
مندر جوگ مایاجی
مقبرہ ادہم خاں معروف
بہ بھول بھلیاں
درگاہ حضرت خواجہ
قطب الدین بختیار کاکیؒ
مزار حاجی حرمین
مزار قاضی حمید الدینؒ ناگوری

× خواجہ باسطی کی حویلیاں
حویلی مہابت خاں
مکان مرزا اشرف بیگ خاں
مکان مرزا سلیم بہادر

× قبر جواہر خاں
مقبرہ معتمد خاں
مقبرہ مراد بخش
قبر بہادر شاہ
مقبرہ خونخوار صاحب
لاڈو سرائے
مقبرہ مولانا جمالی
قبر قاضی عبداللہ نزدیک
قبر مولانا سماء الدین
مقبرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی
مقبرہ سلطان التمش جس میں سلطان کے علاوہ اس کے وزیر، بیٹی اور خواص کی قبریں

(۴)

مخطوطے کی ایک اور خصوصیت اہل حرفہ کی دکانوں کی نشان دہی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ:-

جامع مسجد کے عقب میں مغرب کی طرف دال فروشوں کی دکانیں اور مسکرات مثلاً افیون وغیرہ کے کوٹھے تھے۔

کوچہ چرخے والا میں کمہاروں کی دکانیں تھیں، جہاں مٹی اور برنجی ظروف فروخت ہوتے تھے۔

حوض قاضی کے پاس سرکی والوں کی دکانیں تھیں۔

حویلی راجہ کدارناتھ کی سمت بقالوں اور روپے والوں کی دکانیں تھیں۔

کوچہ پنڈت کے بالمقابل چوڑی گروں کی دکانیں تھیں۔
کوچہ بلی ماران میں آہن گروں کی دکانیں تھیں۔
حوض قاضی سے ترکمان دروازے کی طرف جاتے ہوئے ریوڑی اور بتاشے والوں کی دکانیں تھیں
ترکمان دروازے کے قریب ٹھٹیکوں کا کوچہ تھا۔
بھوجلہ پہاڑی کی طرف معماروں کا چھتہ تھا۔
جامع مسجد کی جنوبی سیڑھیوں کے نیچے بساطیوں، کپول بانس والوں، جفت فروشوں اور دیگر [illegible] دکانیں تھیں۔
[illegible] اور کوچہ بلبلی خانہ کے قریب بھی اہل حرفہ کی دکانیں تھیں۔
[illegible] خاں کے قریب جفت سازوں کا علاقہ اور منڈی چربینہ تھی۔
مسجد کی شمالی سیڑھیوں کے نیچے زرگران بھر یہ کی دکانیں تھیں جو قلعی اور جست کے برتن بناتے تھے۔ ان کے علاوہ پاپڑ والوں اور آتش بازوں کی دکانیں تھیں۔
کوچہ بازار خانم کی طرف اہل حرفہ مثلاً بساطیوں، جڑاؤ سازوں، مرصع کاروں، سادہ کاروں ملمچیوں اور جلا پردازوں کی دکانیں تھیں۔
کوچہ سعد اللہ سے جنوب کی طرف چڑی ماروں اور قصابوں کی دکانیں تھیں۔
شگن جیت رسا ہو کے ترولیہ میں گل فروشوں کی منڈی اور شراب خانہ تھا۔
کوچہ گندی گلی میں [illegible] کی دکانیں تھیں
دریبہ کلاں میں صرافوں کی دکانیں تھیں۔
خونی دروازے سے [illegible] کی جانب بساطیوں کی دکانیں تھیں۔
چبوترہ کوتوالی کے قریب جفت فروشوں کی دکانیں تھیں۔
دریبہ خورد میں حلوائیوں، علاقہ بندوں، بادلہ و ستارہ فروشوں کی دکانیں تھیں۔
چاندنی چوک میں آہن گروں، جفت فروشوں اور دیگر اہل حرفہ کی دکانیں تھیں۔
کوچہ رائے مان کے قریب پنساریوں، عطاروں، ابریشم فروشوں کی دکانیں اور رنگریزوں کا کوچہ تھا۔

کوچہ مالی واڑہ کے قریب چرخے والوں کی دکانیں تھیں۔
فتحپوری بیگم کے کٹڑے میں میدہ گروں، بتاشے والوں اور پنساریوں کی دکانیں تھیں۔
چھتہ نگم بودھ گھاٹ میں ملاحوں کی آبادی اور بانس بلی والوں کے مکانات تھے۔
نواب صفدر جنگ کی حویلی کے پیچھے کاغذیوں کے مکانات اور گھاس بیچنے والوں کی آبادی تھی۔
باغیچہ گروجی پنڈت (قطبیہ میں) کے قریب برف سازوں کی آبادی تھی۔

---

اس وقت دہلی میں کچھ ایسے اہل حرفہ بھی تھے جو تمام دہلی میں مشہور تھے اس تواریخی کتاب میں ذکر ان کی مقبولیت اور شہرت کی دلیل ہے۔ مرزا سنگی نے انکے نام اور مقام دونوں کی نشان دہی

| | | |
|---|---|---|
| میر خاں ٹنڈہ جو فن رقص میں یکتا ہے | + | مکان کوچہ سیدی میر قاسم میں۔ |
| روشن موچی | + | مکان بھوجلہ پہاڑی کی جانب |
| فتح جیو اور کریم دستار فروش | + | دکانیں جامع مسجد کے جنوبی زینے کے نیچے |
| فیضو رکابدار | + | مکان چھتہ شاہ جی کے قریب |
| پورن خیاط | + | حویلی کوچہ بلاقی بیگم کے قریب |
| شیخ بدر الدین مہرکن | + | بالاخانہ بازار خانم میں |
| گل بخش حلوائی | + | دکان بازار خانم میں |
| گنج بخش حلوائی، مٹھائی تمام شہر میں مشہور | + | دکان بازار دریبہ کلاں میں |
| گنجا لال صراف | + | مکان دریبہ خورد میں |
| جرائل بزاز | | . . . . . |
| حافظ الہی بخش بساطی | + | دکان کٹڑہ کونڈی میں |
| محمد امین عطار | + | دکان کٹڑہ فتحپوری بیگم میں |
| کشن چند صراف | + | پہاڑ گنج میں |
| ہینگن طوائف | + | کوچہ مالی واڑہ |
| لچھمی اور بی جان طوائفیں | + | دریبہ خورد میں |

جگن ناتھ آزاد

# اقبال اور فلسفۂ یونان

قدیم[۱] فلسفے اور تہذیب کا تعلق دنیا کے اکثر ملکوں سے رہا ہے اور ان میں ایران، مصر، چین اور یونان کا نام سرفہرست ہے، لیکن جہاں تک فلسفے کا تعلق یونان کی سرزمین فلسفے کے ساتھ کچھ اس طرح وابستہ ہوگئی ہے کہ اس کا نام ہی انسان کا خیال غیر ارادی طور پر اس کے فلسفیانہ کارناموں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، اور سقراط، افلاطون اور ارسطو کے فکری معرکے تصور کے افق پر ابھرنا شروع ہو جاتے ہیں، یہی نہیں یونان کا لفظ ہمارے شعر و ادب میں اس طرح فلسفے اور تفکر کی علامت بن گیا ہے۔ کہ کوئی دوسرا ملک اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ صحرائے نجد کے خیال سے دیوانگی کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ جوش ملیح آبادی نے اپنی نظم "فیضان" میں بڑے بلیغ انداز سے یونان کی اس فکری عظمت کی طرف اشارہ کیا ہے" "فیضان" کا تفصیلی ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

دیارِ عشق میں روشن ہوئیں جب عقل کی شمعیں
سرِ نجد افسرِ یونانیاں بخشا گیا ہم کو

یونانیوں کی اس فلسفہ دانی پر بحث کرتے ہوئے پروفیسر راناڈے لکھتے ہیں:

"مغرب میں فلسفے کی ابتدا کا سہرا یونانیوں کے سر ہے۔ اپنی بعض قومی خصوصیات کی بنا پر ایک آزادانہ اور دیانتدارانہ فلسفے کی ابتدا کرنے کے لئے یونانی ہی موزوں ترین لوگ تھے۔ ان قومی خصوصیات میں منصف مزاجی اور حقیقت پسندی

---

۱۔ زیرِ تصنیف کتاب اقبال اور مغربی مفکرین کا ایک باب۔

کا احساس یونانی دل و دماغ کا بہت بڑا سرمایہ ہے۔ اپنی منصف مزاجی کی بدولت یونانیوں نے ہر بنیادی سوال اور فلسفیانہ مسئلے کو ایک ٹھوس نظریے کی شکل دے دی اور حقیقت پسندی کے احساس کی بنا پر انھوں نے ہر بنیادی سوال یا فلسفیانہ مسئلے کو دیومالائی تصورات میں الجھانے کی بجائے اس کا سلجھا ہوا جواب تلاش کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے فلسفیانہ مسائل کو حل کرنے کے لئے بنیادی خیالات کی ایسی شاہراہیں پیدا کیں جن پر آج بھی مغربی فلسفے، سائنس اور مذہب کے قافلے سرگرم سفر نظر آ رہے ہیں۔"

آگے چل کر رانا ڈے کہتے ہیں کہ یونانیوں کے نظام فکر کا روبار زندگی میں دوسرے درجے کی اہمیت کے حامل نہیں ہیں، بلکہ انھیں درجۂ اول کی اہمیت حاصل ہے۔ انسان کی ذہنی نشوونما میں یونانی نظام فکر نے بڑا کام کیا ہے۔ استدلال اور منطق کو یونانی نظام نے بڑا کام کیا ہے۔ استدلال اور منطق کو یونانیوں نے بہت بلند مقام پر پہنچا دیا اور یہ مقام دو گونہ حیثیتوں کا حامل ہے۔ اہل یونان کے نزدیک حکمت کائنات کی محض خیالی تشریح کا نام نہیں ہے، بلکہ حکمت زندگی کا ایک قطعی اور عملی رُخ ہے۔ اس اعتبار سے پروفیسر رانا ڈے کو یونانی فلسفیوں اور ہندوستانی فلسفیوں میں گہری مماثلت نظر آتی ہے، اور وہ لکھتے ہیں کہ عظیم یونانی فلسفی صرف فلسفے کی تعلیم ہی نہیں دیتے تھے بلکہ خود متفکرانہ زندگی بسر کرتے تھے!

ان متفکرانہ زندگی بسر کرنے والے یونانی فلسفیوں میں سب سے بڑی شخصیت سقراط کی ہے۔ یونانی فلسفے کی تاریخ میں جو امتیازی مقام سقراط کو حاصل ہے، وہ کسی دوسرے متفکر کو نہیں مل سکا۔ حالانکہ اس وقت سقراط کی لکھی ہوئی کوئی کتاب ہمارے سامنے نہیں ہے اور یہی اس بات کا ثبوت ہے کہ شخصیت کتاب سے عظیم تر

---

۱۔ اسی متفکرانہ زندگی بسر کرنے کے عمل کو نیٹشے نے "فلسفیانہ زندگی کی جرأت مندانہ کشادہ دلی" کہا ہے۔ جدید فلسفیوں کے ہاں نیٹشے کو اسی کا فقدان نظر آتا تھا۔

ہوتی ہے۔ آج کسی تصنیف کے بغیر سقراط کا شمار دنیا کے عظیم ترین مفکرین میں ہوتا ہے اور یورپ کی دنیائے فلسفہ میں تو شاید سقراط سے زیادہ بلند شخصیت کا تصور ممکن ہی نہیں۔

سقراط زندگی بھر تلاش حق میں مصروف رہا اور جو کچھ اُسے دنیا کے سامنے رکھنا تھا، اسے وہ کاغذ اور قلم کے ذریعے سے نہیں، بلکہ گفتگو اور مکالمات کے ذریعے سے پیش کرتا رہا۔ مکالمات افلاطون کی حیثیت آج فلسفے کے اس شاہکار کی ہے جس کی تابانیوں سے ذہن انسانی جگمگا رہی ہے لیکن مکالمات افلاطون کی یہ ضوپاشی فکر سقراط ہی کی مرہونِ منت ہے۔

مجھے معلوم ہے اقبال کی شاعری میں سقراط کا ذکر براہ راست کہیں نہیں آیا۔ اقبال کی تقریریں "اسلام میں افکارِ الٰہیہ کی تشکیل جدید" اس کے ذکر سے خالی نہیں اس کتاب کے پہلے باب علم اور مذہبی تجربہ" میں لکھتے ہیں۔

"جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں، تاریخِ اسلام میں یونانی فلسفے نے ایک قوت کے طور پر کام کیا ہے۔ اس کے باوجود قرآن اور دینیات کے متکلمانہ پہلو کے اس با احتیاط مطالعے سے جو یونانی فلسفے کے زیر اثر کیا گیا، یہ اہم حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ جہاں یونانی فلسفے نے مسلمان مفکرین کے نظریے کو خاصی وسعت دی، وہیں بحیثیت مجموعی قرآن کے بارے میں ان کے تصور کو مبہم اور غیر واضح بنا دیا۔ سقراط نے اپنی ساری توجہ انسان پر مرکوز کر دی تھی اس کی نظر میں انسانی مطالعے سے مراد فقط انسان کا مطالعہ تھا، نہ کہ وہ دنیا بھی جو نباتات حشرات اور ستاروں سے آباد ہے۔ یہ مطالعہ قرآن کی روح کے منافی ہے، جو شہد کی ایک مکھی میں بھی ربانی فیضان جلوہ نما دیکھتا ہے اور قدم قدم پر قاری سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ لمحہ بلمحہ تبدیل ہونے والی ہواؤں

---

1- Reconstruction of Religious thought in Islam.

دن رات کی تشکیل، بادلوں، تاروں بھرے آسمانوں اور ان سیاروں کا مطالعہ
کرے، جو خلائے بیکراں میں سرگرمِ سفر ہیں!

لیکن مغربی فلسفے کے ساتھ اقبال کا یہ پہلا ٹکراؤ نہیں ہے۔ پہلا ٹکراؤ ہمیں ان کی پہلی شعری تصنیف مثنوی "اسرارِ خودی" میں نظر آتا ہے جو ۱۹۱۲ء میں چھپی اور جس میں

---

۱۔ یہاں سقراط کے بارے میں اقبال کے نظریہ پر بحث کئے بغیر اس امر کی نشاندہی مناسب معلوم ہوتی ہے کہ سقراط سے پہلے کے فلسفی مثلاً ہراقلیتوس، پرمینیڈیز، زینو، فیثاغورث وغیرہ ایک طرح سے طبعی فلسفی تھے اور انھوں نے عالم نباتات و جمادات کی ماہیت کے سمجھنے اور سمجھانے میں اپنا سارا زور صرف کر دیا۔ سقراط نے کہا کہ عالم نباتات کا مطالعہ بھی اپنی جگہ مستحسن ہے لیکن فلسفیوں کے لئے ان تمام شجر و حجر اور ستاروں سے زیادہ قابلِ توجہ بھی ایک موضوع ہے اور وہ ہے نفسِ انسان، چنانچہ اپنے پیش روؤں کی روش کے خلاف اس نے اپنی تمام توجہ ان سوالات پر مرکوز کر دی کہ انسان کیا ہے اور اس کی پہنچ کہاں تک ہے۔

اپنے اسی جذبے کی رو میں وہ عالم جمادات و نباتات سے بے نیاز ہو کر انسان کی روح میں اتر گیا اور کوئی مفروضہ ہو یا اعتقاد، اس کی چھان بین تو اس نے اپنا دستورِ حیات بنا لیا۔ جب کوئی انصاف کا ذکر کرتا تو وہ فوراً سوال کرتا کہ آخر ان خیالی قسم کے الفاظ کے معنی کیا ہیں، جن کی مدد سے تم زندگی اور موت کے مسائل حل کرنے نکلے ہو؟ عزت، نیکی، اخلاق، حب وطن — ان سے تم کیا مراد لیتے ہو؟ اس قسم کے اخلاقی اور نفسیاتی سوالات کرنے اور ان کا جواب تلاش کرنے میں اسے روحانی تسکین ملتی تھی۔ اس زمانے میں اکثر لوگ اس کے ان سوالوں سے پریشان ہو جاتے تھے۔ ان کا اعتراض یہ تھا کہ سقراط اتنا خود بتاتا نہیں ہے جتنا وہ پوچھتا چلا جاتا ہے۔ اس طرح وہ ہمارے دلوں میں کشمکش اور الجھن سی پیدا کر دیتا ہے۔ لیکن اس کا یہی طرزِ عمل تھا، جس کی بدولت وہ فلسفے کو ان دو انتہائی مشکل سوالات کا کہ نیکی سے کیا مراد ہے، اور بہترین ریاست کیسی ہے جواب دے گیا ہے۔

افلاطون اور اس کے مسئلہ اعیان (THEORY OF IDEAS) کا بھرپور ذکر ملتا ہے۔ "اسرارِ خودی" کے اس حصے کا عنوان ہے " در معنی این کہ افلاطون یونانی کہ تصوف و ادبیات اقوام اسلامیہ از افکارِ او اثر عظیم پذیرفتہ بمسلک گوسفندی رفتہ است و از تخیلات او پرہیز لازم است" شاعرانہ اعتبار سے اس حصے کی مثنوی "اسرار و رموز" میں ایک شاہکار کی حیثیت ہے۔ اس میں اقبال نے افلاطون کے نظریۂ اعیان اور اس پر اپنے اعتراضات کو جس کامیابی سے شاعرانہ انداز میں پیش کیا ہے، اس کی مثال کہیں اور مشکل ہی سے مل سکے گی۔

افلاطون سقراط کا شاگرد تھا اور ایسا شاگرد جسے استاد کا عظیم ترین کارنامہ کہا جا سکتا ہے، اگر سقراط کو افلاطون کا سا سعادت مند شاگرد نہ ملتا تو شاید دنیا کی نظر میں سقراط کی عظمت اوجھل ہو جاتی۔ افلاطون سقراط کے حلقۂ تلامذہ میں انتہائی خلوص اور عقیدت کے ساتھ داخل ہوا۔ خدا جانے، یہ اس خلوص اور عقیدت کا نتیجہ تھا یا استاد کی طلسمی شخصیت کا اثر کہ انجام کار افلاطون نے اپنے آپ کو استاد کی شخصیت میں گم کر دیا اور جو کچھ دنیا کے سامنے پیش کیا، استاد ہی کی زبان سے۔

اقبال، افلاطون کی فلسفیانہ عظمت کے قائل ہیں اور اس کے اکثر فلسفیانہ افکار کی انھوں نے تائید کی ہے۔ "اسلام میں افکارِ الٰہیہ کی تشکیل جدید" میں افلاطون کو خراج تحسین ادا کرتے ہیں:

> "قرآن بھی مذہب، ریاست، اخلاقیات اور سیاست میں اسی طرح ایک ربط باہمی بہت ضروری خیال کرتا ہے جس طرح افلاطون نے اپنی تصنیف "ریاست" میں بیان کیا ہے۔"

اس کے علاوہ اقبال کا عورت سے متعلق یہ شعر بھی افلاطون کی خدمت میں خراجِ تحسین سے کم نہیں ہے۔

مکالماتِ فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلے سے پھوٹا شرارِ افلاطوں

لیکن اس کے باوجود وہ افلاطون کے نظریۂ اعیان کو سمِ قاتل سے کم نہیں سمجھتے، اور انھوں نے قدم قدم پر اس کی تردید اور تغلیط کی ہے۔

افلاطون کا نظریۂ اعیان مختلف الفاظ میں یہ ہے کہ یہ دنیا جو ہمیں نظر آرہی ہے اصل دنیا نہیں ہے۔ بلکہ یہ اصل دنیا کا پرتو ہے یا مجاز ہے۔ اصل دنیا کو ہم اپنی ظاہری آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے، بلکہ اسے اپنے علم یا اعیان (Ideas) کے ذریعے سے دیکھ سکتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ افلاطون کے نزدیک صدر علمیہ یا اعیان ثابتہ ہی حقیقی وجود رکھتے ہیں، اور عالم محسوس ایک طرح سے طبیعہ مادی اس حقیقی عالم یعنی عالم اعیان کا محض عکس یا پرتو ہے۔ ظ نے میں اپنا سارا زور صرف کا یہ نظریہ اقبال کے فلسفۂ عمل سے متصادم ہے کیونکہ اگر یہ مادی سفیوں کے لئے ان تمام شج ے رہے ہیں، چل پھر رہے ہیں، محض عکس یا پرتو یا دھوکا ہے تو پس انسان، چنانچہ اپنے مثنوی کی جدوجہد بیکار ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اقبال اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کیا ہے اور اس کی افلاطون کی تردید کرتے ہیں، اسے راہب دیرینہ کہنے کے بعد کہتے ہیں

رخشِ او در ظلمتِ معقول گم ۔۔۔ در کہستانِ وجود افگندہ سُم (روح میں اتر گیا اور کوئی)

آں چناں افسونِ نامحسوس خورد ۔۔۔ اعتبار از دست و چشم و گوش برد (کا ذکر کرتا)

گفت سرِّ زندگی در مردن است ۔۔۔ شمع را صد جلوہ از افسردن است

بر تخیل ہائے ما فرماں رواست ۔۔۔ جامِ او خواب آورد گیتی رباست

گوسفندے در لباسِ آدم است ۔۔۔ حکمِ او بر جانِ صوفی محکم است

عقل خود را بر سرِ گردوں رساند ۔۔۔ عالمِ اسباب را افسانہ خواند

کارِ او تحلیلِ اجزائے حیات ۔۔۔ قطعِ شاخِ سروِ رعنائے حیات

فکرِ افلاطوں زیاں را سود گفت ۔۔۔ حکمتِ او بود را نابود گفت

فطرتش خوابید و خوابے آفرید ۔۔۔ چشمِ ہوشِ او سرابے آفرید

بسکہ از ذوقِ عمل محروم بود ۔۔۔ جانِ او وارفتۂ معدوم بود

منکرِ ہنگامۂ موجود گشت ۔۔۔ خالقِ اعیانِ نامشہود گشت

زندہ جاں را عالم امکاں خوش است
مردہ دل را عالم اعیاں خوش است
آہوش بے بہرہ از لطفِ خرام
لذتِ رفتار بر کبکش حرام
شبنمش از طاقتِ رم بے نصیب
طائرش را سینہ از دم بے نصیب
ذوقِ روئیدن ندارد دانہ اش
از طپیدن بے خبر پروانہ اش
راہبِ ما چارہ غیر از رم نداشت
طاقتِ غوغائے ایں عالم نداشت
دل بہ سوزِ شعلۂ افسردہ بست
نقشِ آں دنیائے افیون خوردہ بست
سوئے گردوں پر کشود
باز سوئے آشیاں نامد فرود
دوں خیال او گم است
من ندانم دُرد یا خشتِ خم است
قومہا از سکرِ او مسموم گشت
خفت و از ذوقِ عمل محروم گشت

ف افلاطون کے فلسفۂ اعیان پر ہے، کیونکہ زندگی کے بارے میں ۔۔۔ اقبال کا یہ نظریہ ہے کہ "زندگی جز قوتِ اعجاز نیست" جہاں کے باقی نظریات کا تعلق ہے، اقبال نے ان پر کوئی تنقید نہیں کی بلکہ بعض نظریات کی تائید بھی کی ہے۔

افلاطون کا فلسفۂ اعیان چونکہ ایک زمانہ سے زیر بحث چلا آ رہا ہے اس لئے اس کی کچھ وضاحت کر دی جائے۔ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی لکھتے ہیں۔

"کہا جاتا ہے کہ افلاطون کا نظریۂ اعیان اس کے فلسفے کی اصل روح ہے۔ سقراط کا خیال تھا کہ علم کا آغاز خواہ وہ کسی قسم کا ہو، اعیان کے تعین سے ہونا چاہئے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ فقط اعیان ہی سے صحیح علم حاصل ہو سکتا ہے، افلاطون پر فیثاغورث، پرمینڈیز، ہراقلیتوس اور سقراط کا اثر تھا۔ فیثاغورث کے اثر سے اس کے فلسفے میں وہ مذہبی رجحان پیدا ہوا جس کی وجہ سے اس کے لہجے میں ایک واعظ اور مذہبی معلم کا آہنگ سنائی دیتا ہے، اور شاید یہ بھی فیثاغورث ہی کا اثر تھا

کہ تعقل اور تصوف کے ساتھ ساتھ ریاضیات کو بھی افلاطون کے یہاں بہت اہمیت حاصل تھی۔ اس کے نظریۂ اعیان کے سلسلے میں جب ہم چھان بین کرتے ہیں، تو یہ پاتے ہیں کہ پرمینڈیز سے اس نے یہ سیکھا تھا کہ حقیقت ابدی ہے اور جو تغیرات ہم دیکھتے ہیں وہ نظر اور حواس کا دھوکا ہے۔ ہراقلیتوس کا یہ اثر اس نے قبول کیا تھا کہ محسوسات کی دنیا میں کوئی شے مستقل نہیں ہے۔ ان دونوں نقطہ ہائے نظر سے اس نے یہ نتیجہ نکالا کہ کسی چیز کا علم اگر صحیح صحیح ہو سکتا ہے تو فکر اور عقل سے ہو سکتا ہے۔ حواس فریب دیتے ہیں اور صداقت تک نہیں پہنچا سکتے۔ ایسی ہستی جو مستقل ہو، جس میں تناقض نہ ہو، جو آمیزشوں سے منزہ ہو فقط اعیان کی دنیا میں پائی جا سکتی ہے۔ افلاطون کے نزدیک تصویر اشیا یا صورت اشیاء جوہر اشیاء ہے جب ہم مختلف اشیاء کے لئے ایک ہی نام استعمال کرتے ہیں، تو وہ نام ان کے مشترک تصور یا حد کلی کو ظاہر کرتا ہے۔ اگر ہمیں صرف مخصوص اور جزئی چیزوں کا علم اور شعور ہو تو یہ تصور اور فکر ناممکن ہو جائے گا۔ جب ہم بہت سی چیزوں کو ان کی الگ الگ قسموں کے تحت ترتیب دیتے ہیں، اور ایک قسم کی چیزوں کو کسی عام نام سے ظاہر کرتے ہیں، تو ہم کہتے ہیں کہ یہ صحیح تفکر کا طریقہ ہے اور اسی سے اشیاء کے تصورات متعین ہوتے ہیں۔ انسان کا لفظ ہمارے ذہن میں تمام انسانوں کی مشترک خصوصیات کا ایک تصور یا "عین" قائم کرتا ہے اسی طرح دوسری چیزوں کا معاملہ ہے۔ یہ تصورات یا اعیان فکر کی دنیا میں ایک حقیقت رکھتے ہیں مثلاً اگر مثلث کی کوئی شکل نگاہوں کے سامنے نہ ہو، پھر بھی مثلث کا ایک تصور ہمارے ذہن میں ہے۔ وہ غیر متبدل ہے۔ ہمیشہ رہتا ہے، اور ہمیشہ رہے گا۔ دنیا سے آج تمام چیزیں نیست و نابود ہو جائیں، اور ہمارے حواس کی رسائی ان تک

نہ ہو تو بھی میز کا ایک تصور ہمارے ذہن میں قائم رہے گا، ہر مخصوص مثلث،
ہر مخصوص انسان، ایک نامکمل مثلث، میز یا انسان ہے۔ زود یا بدیر وہ
مٹ جاتا ہے، لیکن تمام مثلثوں، میزوں یا انسانوں کی ایک صورت
ہے جو باقی رہتی ہے۔ یہی حال نیک اور اچھے کاموں کا ہے۔ مخصوص
قسم کی ہر نیکی عارضی ہے۔ لیکن نیکی بذاتِ خود
ایک مستقل اور مطلق حقیقت بن کر فکر کی دنیا میں قائم و دائم رہتی
[illegible]ی کیا ہے، یہی صورت دوسرے انتزاعات (abstraction)
[illegible]ن سقراط کا اس لئے افلاطون کے نزدیک صحیح علم یا فلسفہ درحقیقت
[illegible]سکتا ہے، اگر سقراط علم کا نام ہے۔ یہ اعیان ان مخصوص اور انفرادی
سقراط کی عظمت ان سے بہرہ اندوز ہوتی ہیں، سرمدی نمونہ ہیں، لیکن
[illegible]وص اور عقیدت [illegible] ہیں، اور فقط عقل ہی ان کا ادراک کر سکتی ہے،
[illegible]ا یا استاد کی طلسمی لفظوں میں یہ کہ وہ کلیات جن پر علم کی بنیاد قایم ہے محض
شخصیت میں گم صورات نہیں رہتے، بلکہ اعیان یعنی اشیا کے کامل نمونے
اقبال، [illegible] بن جاتے ہیں، جو محض ہمارے ذہن میں داخلی وجود نہیں بلکہ عالمِ مثال
میں خارجی درجہ رکھتے ہیں۔ دنیا کی اشیا بذاتِ خود اعیان کی پرچھائیاں
ہیں۔ اور اسی حد تک اصلیت رکھتی ہیں جس حد تک ان میں اعیان
کی جھلک موجود ہے۔" [1]

اقبال کے متذکرہ بالا اشعار اسی نظریۂ اعیان کی تنقید ہیں۔ اقبال نے اس شعر

منکرِ ہنگامۂ موجود گشت    خالقِ اعیانِ نامشہود گشت

کے ساتھ مثنوی کے حاشیے میں یہ نوٹ دیا ہے:

"اس شعر میں افلاطون کے مشہور مسئلہ اعیان کی طرف اشارہ ہے،

---

[1] مکالمات افلاطون۔

جس پر ارسطو نے نہایت عمدہ تنقید کی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ فارابی نے جمع الجمعین میں ارسطو اور افلاطون کو ہم خیال ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، جو میرے نزدیک ناکام رہی ہے ۔"

اب اس ضمن میں اردشیر زنن جی وا دیا کے خیالات ملاحظہ ہوں ۔

"افلاطون کے بارے میں اکثر یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ خوابوں کی دنیا میں رہتا تھا اور حقائق زندگی پر اس کی فکری گرفت مضبوط نہیں تھی لے لیکن یہ اعتراض صحیح نہیں ہے کیونکہ اگر اسے صدر علیہ یا اعیان ثابتہ ہی میں صحیح اقدار نظر آتی تھیں، تو وہ ایک مشنیری کی طرح ان افکار و خیالات کو عملی صورت میں ظہور پذیر بھی دیکھنا چاہتا تھا۔ اگرچہ اس کے ہمعصروں نے اس کے نظریۂ اعیان کو کوئی خاص اہمیت نہ دی اور اس کے اپنے شاگرد ارسطو نے اس کے نظریۂ اعیان پر شدید ترین تنقید کی ہے، لیکن وقت نے اس کے نظریے کو ایک بار پھر اجاگر کر کے رکھ دیا ہے ۔ جب عیسائی یورپ نے اسے زیب طاق نسیاں بنا دیا، تو عربوں نے از سر نو دریافت کیا اور افلاطونی فلسفہ مدتوں تک مشرقی تمدن میں ایک زندگی بخش قوت کے طور پر کام کرتا رہا ۔ تاریخ فلسفہ میں آج عربوں کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ انھوں نے یونان کی یہ دولت گم گشتہ قادلیس اور قرطبہ کی یونیورسٹیوں کے ذریعہ سے پھر یورپ کو واپس لوٹائی ۔ یہ دراصل قادلیس اور قرطبہ کی یونیورسٹیوں ہی کا فیض ہے کہ افلاطون اور ارسطو دونوں کو آج تک فلسفے میں امیر کارواں کا مقام حاصل ہے ۔ شلر کا یہ قول کہ ہر شخص پیدائش کے وقت ہی سے یا افلاطونی ہوتا ہے یا ارسطوئی، آج تاریخ فلسفہ کا جزو بن چکا ہے ۔ لیکن یہ قول بھی حقیقت کو پوری طرح سے نمایاں نہیں کرتا ۔ اگرچہ ارسطو نے افلاطون

---

لے یہ زندگی ہے، نہیں ہے طلسم افلاطون (اقبال)

کے نظریات کو اپنی بے پناہ تنقید کا نشانہ بنایا ہے، لیکن دونوں کے افکار میں ایک بنیادی مماثلت موجود ہے: دونوں کا تضاد صرف طریق کار کا تضاد ہے۔ افلاطون اپنے فلسفے میں قوت متخیلہ، جرأت، خلاقی اور شاعری سے کام لیتا ہے، ارسطو زیادہ یا ضابطہ یا قاعدہ اور علمی طرز عمل کو ترجیح دیتا ہے۔ اس لئے اگر غور سے دیکھا جائے تو افلاطون اور ارسطو کا تضاد محض ان کے مزاج کے اختلاف تضاد کا نتیجہ ہے۔ افلاطون عینیت پسندی کو اپنا رہنما بناتا ہے اور ارسطو سائنسی یا علمی طریق کار کو۔ لیکن انسان جس کے اندر ایک کائنات بند ہے، نہ افلاطونیت کا اسیر ہوسکتا ہے، نہ معز ارسطوئیت کا۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان عینیت پرست یں اور عقید یت پرست ہوتے ہوئے بھی سائنسی اور علمی طریق کا یا اسناد کی طلسمی سکتا ہے۔ اگر کسی شخص کو افلاطون کا انداز نظر پسند نیست میں گم ر دوسرے کو ارسطو کا، تو اس کا سبب پسند کرنے والے ال، انا کی اپنی مزاجی کیفیت ہے، ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا فلسفیانہ انداز نظر نہیں ہے۔

دونوں کی تاریخی اہمیت سے قطع نظر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ افلاطون اور ارسطو میں سے کسی کی تعلیم کی اہمیت بھی عصر حاضر کے لئے کم نہیں ہوئی۔ اصل میں افلاطون کی تحریروں کا انداز آج ہمیں اتنا یونانی نظر نہیں آتا جتنا جدید نظر آتا ہے۔ افلاطون جدیدیت سے قبل ہی جدید تھا۔ جہاں تک اس کے فلسفے کی روح کا تعلق ہے۔ وہ ہمیں جدید یورپ کا کوئی فلسفی نظر آتا ہے، اور آج بھی جب کہ اس کے اور ہمارے درمیان تیئس صدیاں حائل ہوچکی ہیں، وہ تلاش حق کے بحر بے کراں میں ایک امیر البحر نظر آتا ہے۔ عورت،

جس پر ارسطو نے نہایت عمدہ تنقید کی ہے۔ فارابی نے جمع البحرین میں ارسطو اور افلاطون کو ہم خیال ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، جو میرے نزدیک ناکام رہی ہے۔"

اب اس ضمن میں اردشیر رتن جی وادیا کے خیالات ملاحظہ ہوں۔

"افلاطون کے بارے میں اکثر یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ خوابوں کی دنیا میں رہتا تھا اور حقائق زندگی پر اس کی فکری گرفت مضبوط نہیں تھی[1] لیکن یہ اعتراض صحیح نہیں ہے کیونکہ اگر اسے صدر علمیہ یا اعیان ثابتہ ہی میں صحیح اقدار نظر آتی تھیں، تو وہ ایک مشنری کی طرح ان افکار و خیالات کو عملی صورت میں ظہور پذیر بھی دیکھنا چاہتا تھا۔ اگرچہ اس کے ہمعصروں نے اس کے نظریۂ اعیان کو کوئی خاص اہمیت نہ دی اور اس کے اپنے شاگرد ارسطو نے اس کے نظریۂ اعیان پر شدید ترین تنقید کی ہے، لیکن وقت نے اس کے نظریے کو ایک بار پھر اجاگر کر کے رکھ دیا ہے۔ جب عیسائی یورپ نے اسے زیب طاق نسیاں بنا دیا، تو عربوں نے از سر نو دریافت کیا اور افلاطونی فلسفہ مدتوں تک مشرقی تمدن میں ایک زندگی بخش قوت کے طور پر کام کرتا رہا۔ تاریخ فلسفہ میں آج عربوں کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ انھوں نے یونان کی یہ دولت گم گشتہ قادلیس اور قرطبہ کی یونیورسٹیوں کے ذریعہ سے پھر یورپ کو واپس لوٹائی۔ یہ دراصل قادلیس اور قرطبہ کی یونیورسٹیوں ہی کا فیض ہے کہ افلاطون اور ارسطو دونوں کو آج تک فلسفے میں امیر کارواں کا مقام حاصل ہے۔ شلر کا یہ قول کہ ہر شخص پیدائش کے وقت ہی سے یا افلاطونی ہوتا ہے یا ارسطوئی، آج تاریخ فلسفہ کا جزو بن چکا ہے۔ لیکن یہ قول بھی حقیقت کو پوری طرح سے نمایاں نہیں کرتا۔ اگرچہ ارسطو نے افلاطون

---

[1] یہ زندگی ہے، نہیں ہے طلسم افلاطون (اقبال)

کے نظریات کو اپنی بے پناہ تنقید کا نشانہ بنایا ہے، لیکن دونوں کے افکار میں ایک بنیادی مماثلت موجود ہے: دونوں کا تضاد صرف طریق کار کا تضاد ہے۔ افلاطون اپنے فلسفے میں قوت متخیلہ، جرأت، خلاقی اور شاعری سے کام لیتا ہے، ارسطو زیادہ با ضابطہ یا قاعدہ اور علمی طرز عمل کو ترجیح دیتا ہے۔ اس لئے اگر غور سے دیکھا جائے تو افلاطون اور ارسطو کا تضاد محض ان کے مزاج کے اختلاف تضاد کا نتیجہ ہے۔ افلاطون عینیت پسندی کو اپنا رہنما بناتا ہے اور ارسطو سائنسی یا علمی طریق کار کو لیکن انسان جس کے اندر ایک کائنات بند ہے، نہ افلاطونیت کا اسیر ہو سکتا ہے، نہ ارسطوئیت کا۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان عینیت پرست یا تصوریت پرست ہوتے ہوئے بھی سائنسی اور علمی طریق کار کو اپنا سکتا ہے۔ اگر کسی شخص کو افلاطون کا انداز نظر پسند ہے اور دوسرے کو ارسطو کا، تو اس کا سبب پسند کرنے والے کی اپنی مزاجی کیفیت ہے، ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا فلسفیانہ انداز نظر نہیں ہے۔

دونوں کی تاریخی اہمیت سے قطع نظر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ افلاطون اور ارسطو میں سے کسی کی تعلیم کی اہمیت بھی عصر حاضر کے لئے کم نہیں ہوئی۔ اصل میں افلاطون کی تحریروں کا اندازہ آج ہمیں اتنا یونانی نظر نہیں آتا جتنا جدید نظر آتا ہے۔ افلاطون جدیدیت سے قبل ہی جدید تھا۔ جہاں تک اس کے فلسفے کی روح کا تعلق ہے، وہ ہمیں جدید یورپ کا کوئی فلسفی نظر آتا ہے، اور آج بھی جب کہ اس کے اور ہمارے درمیان تئیس صدیاں حائل ہو چکی ہیں، وہ تلاش حق کے بحر بے کراں میں ایک امیر البحر نظر آتا ہے۔ عورت،

سیاست، یا انسانیت کے بیان میں ہمیں وہ بالترتیب ایک نسوانی شخصیت، ایک استبداد پسند، ایک اشتراکی اور علم اصلاح نسل کا ایک محقق دکھائی دیتا ہے۔ پہنچ جاتا کے فلسفے کے کسی پہلو کو بھی بخوبی سمجھنے کے لئے یہ ناگزیر ہے کہ ہم اس کے نظریہ اعیان کو پوری طرح سمجھیں، جو اس کے فلسفے کی مکمل تصویر پیش کرتا ہے۔

افلاطون اور ارسطو کے بارے میں جن خیالات کا اظہار اردشیر رتن جی وادیا نے کیا ہے، قریب قریب ایسے ہی خیالات کا اظہار فارابی نے بھی کیا۔ لیکن اقبال، فارابی کے نظریے سے متفق نہیں اور اس کا اظہار وہ اسرار خودی کے ایک حاشیے میں کر چکے ہیں جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔

O

افلاطون کے فلسفۂ اعیان اور اس پر اقبال کی تنقید سے متعلق یہ ساری بحث مثنوی "اسرار خودی" کے پس منظر میں کی گئی ہے، لیکن افلاطون اور اس کے افکار کا ذکر اقبال کے یہاں مثنوی "اسرار خودی" سے کہیں پہلے ان کی نثری تصنیف "ایران میں مابعد الطبیعات کا ارتقاء" میں بھی ملتا ہے، اور کئی جگھوں پر بھی ہے۔ اگرچہ اس کتاب میں اقبال نے افلاطون کے مسئلہ اعیان کو کھل کر موضوع بحث کہیں نہیں بنایا۔ لیکن گمان غالب یہی ہے کہ افلاطون کے نظریۂ اعیان سے وہ اس وقت بھی بیزار تھے۔ اس کتاب میں افلاطون اور ارسطو کے فلسفے کا مختصر سا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:-

"لیوس اپنی سوانحی تاریخ فلسفہ میں کہتا ہے کہ عربوں نے ارسطو کے فلسفے کا تیز شوق سے اس لئے مطالعہ کیا کہ افلاطون کا فلسفہ ان تک پہنچا نہیں تھا۔ بہرحال میں اس خیال کی طرف مائل ہوں کہ عربوں کی ذہنیت بالکل ہی

تھی، اسی لئے افلاطون کا فلسفہ اگر یہ صحیح روشنی میں بھی ان کے سامنے پیش کیا جاتا جب بھی ان کے مذاق کے خلاف تھا۔"

یہ کتاب ارسطو کے ذکر سے بھی بھری پڑی ہے لیکن اس میں ارسطو پر اعتراضات نہیں ہیں، بلکہ فلسفۂ عجم نے ارسطو کی حکمت سے جو فیض اٹھایا ہے، اس کا ایک تاریخی ذکر ہے۔ جہاں اس قسم کی دو چار مثالیں پیش کی جائینگی۔ "ایران میں مابعد الطبیعیات کا ارتقاء" میں سب سے پہلے ہمیں ارسطو کا ذکر یونانی تنویت کے باب میں نظر آتا ہے اور اس میں اقبال نے دورِ اول کے مسلمان علماء کی لاعلمی کا جس طرح سے ذکر کیا ہے وہ دلچسپ بھی ہے اور اقبال کی عظمت کی دلیل بھی۔ لکھتے ہیں:

"یہ بات ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ یونانی حکمت حران اور شام سے ہوتی ہوئی اسلامی مشرق کی طرف آئی ہے۔ شامیوں نے یونانیوں کے آخری نظام فلسفہ یعنی نوافلاطونیت کو لے لیا اور اسے ارسطو کا اصل فلسفہ سمجھ کر مسلمانوں کے ہاتھ منتقل کر دیا۔ یہ کس قدر حیرت کی بات ہے کہ مسلمان فلاسفہ جن میں عرب اور ایرانی دونوں شامل ہیں، اس چیز پر جھگڑتے رہے جس کو وہ ارسطو اور افلاطون کی اصلی تعلیم خیال کرتے رہے، لیکن ان کو یہ بات کبھی نہ سوجھی کہ اس فلسفہ کو پوری طرح سمجھنے کے لئے یونانی زبان کا جاننا قطعی ناگزیر ہے۔ ان کی لاعلمی اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ انھوں نے فلاطینوس کی اینیڈس کے ایک ملخص ترجمے کو "ارسطو کی دینیات" سمجھ لیا۔ یونانی فلسفے کے ان دو زبردست اساتذہ کے متعلق واضح تصور حاصل کرنے کے لئے انھیں صدیاں لگ گئیں، پھر بھی یہ امر مشتبہ ہے کہ انھوں نے اسے پوری طرح سمجھا بھی یا نہیں۔ الفارابی اور ابن

---

۱۔ اقبال کی شعری تصانیف میں ارسطو کا ذکر مثنوی اسرار و رموز کے علاوہ اور غالباً صرف ایک ہی جگہ آیا ہے یعنی "گلشن راز جدید" میں، اس کا تفصیلی ذکر اس مقالے میں آگے چل کر آئیگا۔

مسکویہ کی بہ نسبت ابن سینا کے فکر میں زیادہ وضاحت اور اپچ پائی جاتی ہے۔ اگرچہ اندلسی فلسفی ابن رشد اپنے پیشروؤں کے مقابلے میں ارسطو سے زیادہ قریب ہے، تاہم ارسطو ہمہ جہتی اجزا فہم پر اسے بھی کامل دسترس نہیں ہے۔ پھر بھی ان پر تقلید ہمہ جہت کا الزام لگانا ناانصافی ہوگی۔ ان کی تاریخ فلاسفہ اس مجموعۂ خرافات میں سے عمل آہنگی ایک مسلسل کوشش ہے، یونانی فلسفے کے مترجمین کی بے پروائی کا نتیجہ تھا کہ انھیں ارسطو اور افلاطون کے نظام ہائے فلسفہ پر از سر نو فکر کرنا پڑا۔"

ابن مسکویہ (ف ۔ ۱۰۳۰ھ) کے بیان میں آپ انتہائی علت کے وجود پر بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں :-

"یہاں ابن مسکویہ نے ارسطو کی تقلید کی ہے اور اس کے استدلال کا اعادہ کیا ہے جو حرکتِ طبعی کے واقعے پر مبنی ہے، تمام اجسام میں حرکت کا لاینفک خاصہ ہے، جو تغیرات کی تمام صورتوں پر حاوی ہے اور یہ خود اجسام کی ذات سے ظہور پذیر نہیں ہوتی . . . ."

تصوریت اور عقلیت کے مابین تنازعِ اقبال کی کتاب "ایران میں بعد الطبیعات کا ارتقاء" بہت مشکل باب ہے۔ اس میں انھوں نے ارسطو کے مادہ اولیٰ پر نہایت دقیق بحث کی ہے۔ اس بحث کے دوران میں لکھتے ہیں :

"اشاعرہ نے ارسطو کے مادۂ اولیٰ کا جو ابطال کیا تھا اور زمان و مکان اور تعلیل کی ماہیت کے متعلق جو خیالات پیش کئے تھے، ان سے مناقشے کی ایک ایسی زبردست روح پیدا ہوگئی جس سے صدیوں تک مسلمان مفکرین کے طبقوں میں تفرقہ و اختلاف قایم رہا اور بالآخر اس نے اپنی قوت ان طبقوں کی محض لفظی نزاع میں زائل کردی۔ نجم الدین الکاتبی کی "حکمت العین" یا فلسفۂ جوہر کی اشاعت نے اس ذہنی پیکار و

تنازع میں اور شدت پیدا کر دی اور اس پہ اشاعرہ اور دوسرے معقدوری مفکرین کی طرف سے تنقیدیں ہونے لگیں ۔ ۔ ۔ "

جوہر کی ماہیت" (Nature of Essence) اس باب کا ایک بہت ہی نازک حصہ ہے ۔ اس میں اقبال نے مختلف اشیا کے انفرادی جواہر اور انتہائی علت کو موضوع بحث بنایا ہے ۔ اس بحث میں ارسطو کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے ۔

اشاعرہ کے نظریۂ علم نے انھیں یہ تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا تھا کہ مختلف اشیاً کے انفرادی جواہر ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور انتہائی علت یا خدا انھیں متعین کرتا ہے ۔ انھوں نے ایسے ابتدائی مادہ کے وجود سے انکار کر دیا جو ہمیشہ برقرار رہتا ہے اور تمام اشیاء میں مشترک ہے عقلیین کے خلاف ان کا یہ دعوٰی تھا کہ وجود ہی جوہر کی ماہیت ہے ۔ ان کے نزدیک جوہر اور وجود ایک دوسرے کی عین ہیں ۔ انھوں نے یہ استدلال کیا کہ یہ تصدیق کہ " انسان حیوان ہے " جبھی ممکن ہو سکتی ہے کہ موضوع اور محمول میں کوئی اساسی فرق ہو کیونکہ ان کی مماثلت اس تصدیق کو مہمل بنا دیگی اور ان کا اختلاف کلی محمول کو باطل کر دیگا ، لہٰذا یہ ضروری ہے کہ ایک ایسی خارجی علت فرض کی جائے ، جو وجود کی مختلف صورتوں کو متعین کرتی ہے ۔ بہر حال ان کے مخالفین وجود کی اس تحدید و تعین کو تسلیم کرتے ہیں لیکن وہ یہ دعوی کرتے ہیں کہ وجود کی مختلف صورتیں ایک دوسرے کی عین ہیں اور یہ سب ایک ابتدائی جوہر ہی کے تعینات ہیں ۔ محمول ترکیبی کے امکان سے جو دشواری پیدا ہو گئی تھی اسے رفع کرنے کو ارسطو کے پیرووں نے جواہر مرکبہ کے امکان کا نظریہ پیش کیا ۔ انھوں نے یہ دعوے کیا کہ یہ تصدیق کہ " انسان حیوان ہے " صحیح ہے کیونکہ انسان ایک جوہر ہے اور حیوانیت

---

؎ یہ ارسطو کا پیرو تھا ۔ اس کے شاگرد فلاسفہ کہلاتے تھے ، جو مدرسی متکلمین سے بالکل متاثر تھے ۔ (اقبال)

کے دو جوہروں سے مرکب ہے۔ اشاعرہ نے اس کا یہ جواب دیا کہ یہ خیال تنقید کی زد سے نہیں بچ سکتا۔ اگر تم یہ کہو گے کہ انسان اور حیوان کا جوہر ایک ہی ہے تو دوسرے الفاظ میں تم یہ یا [illegible] کل کا جوہر وہی ہے، جو جزو کا ہے۔ یہ قضیہ بالکل مہمل ہے، [illegible] کا بھی وہی جوہر ہو، جو اس کے اجزائے ترکیبی کا ہے، تو اس مرکب کو ایک ہی ہستی سمجھنا پڑیگا جس کے دو جواہر یا وجود ہیں"

جوہر کی بحث یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ بلکہ اقبال اس سے متعلق ایک اور سوال زیر بحث لائے ہیں۔ کیا اس کی کوئی علت بھی ہے یا یہ بلا علت کے موجود ہے، اس کے جواب میں خود ہی لکھتے ہیں :-

"ارسطو کے پیرو یا فلاسفہ نے جیسا کہ ان کے مخالفین نے عام طور پر ان کو یہ لقب دیا تھا، یہ دعویٰ کیا ہے کہ اشیاء کی تہ میں جو جوہر ہے وہ بلا علت کے ہے۔ اشاعرہ کا خیال اس کے خلاف ہے۔ ارسطا طالیسین کا خیال ہے کہ جوہر پہ کوئی خارجی عامل اثر و عمل نہیں کر سکتا۔ الکاتبی نے یہ بحث کی ہے کہ اگر انسانیت کا جوہر کسی خارجی فعلیت کے عمل و اثر کا نتیجہ ہوتا، تو اس بات میں شک کرنا ممکن تھا کہ آیا یہ انسانیت کا حقیقی جوہر بھی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم اس قسم کا شک ہی نہیں رکھتے۔ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ جوہر کسی ایسے عامل کی فعلیت کا نتیجہ نہیں جو اس سے باہر ہے۔ تصورین اپنی بحث کو حقیقیین کے جوہر و وجود کے امتیاز سے شروع کرکے یہ کہتے ہیں کہ حقیقیین کا طرز استدلال اس مہمل قضیے کی طرف لے جائیگا کہ انسان بلا علت کے موجود ہے کیونکہ اسس کو حقیقیین کے نقطۂ نظر کے مطابق دو ایسے جواہر وجود اور انسانیت کا مجموعہ سمجھنا پڑیگا، جو بلا علت کے موجود ہیں"

جوہر کی ماہیت کے بعد اقبال علم کی ماہیت پر بحث کرتے ہیں، لکھتے ہیں :-

"ارسطو کے پیرو اپنے اس نقطۂ نظر کے مطابق کہ جوہر ایک مستقل خارجی حقیقت ہے، علم کی یہ تعریف کرتے ہیں کہ "یہ اشیا کے خارجی وجود کی شبیہ یا تمثال کے حصول کا نام ہے" وہ بحث کرتے ہیں کہ کسی ایسی شے کو خیال میں لانا ممکن ہے جو خارجی حیثیت سے غیر حقیقی ہو اور اس کو دوسری صفات سے متصف کیا جا سکتا ہو لیکن جب ہم اس کو وجود کی صفت سے متصف کرتے ہیں تو واقعی وجود لازم ہو جاتا ہے کیونکہ کسی شے کی صفت کا اثبات خود اس شے کے اثبات کا ایک جزو ہے لہذا اگر کسی شے پر وجود کی صفت کو محمول کیا کیا جائے اور اس سے اس شے کا واقعی و خارجی وجود لازم نہ آئے تو ہم خارجیت سے انکار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں"

یہ کتاب جیسا کہ متذکرہ بالا اقتباسات سے ظاہر ہے، دقیق اور گہرے مباحث سے لبریز ہے۔ اقبال کی نظم جتنی سریع الہضم، دل کش اور دل نشین ہے اُن کی فلسفیانہ نثر اتنی ہی مشکل ہے اور بہ دقت سمجھ میں آتی ہے۔ خود انھیں بھی اس بات کا احساس تھا، چنانچہ وہ اپنی نظم و نثر کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ کہتے ہیں:-

من بہ طبعِ عصر خود گفتم دو حرف | کردہ ام بحرین را اندر دو ظرف
حرفِ پیچاپیچ و حرفِ نیشدار | تا کنم عقل و دلِ مرداں شکار

اگرچہ حرفِ پیچاپیچ سے اُن کی مراد "اسلام میں افکارِ الٰہیہ کی تشکیل جدید" سے ہے لیکن اس حرفِ پیچاپیچ کا اطلاق "براں میں مابعد الطبیعات کا ارتقاء" پر پوری طرح ہوتا ہے اس دقیق بحث کی ایک اور مثال دیکھئے جس میں ارسطو کا پھر ایک بار ذکر آیا ہے۔ زیرِ بحث موضوع ہے "حقیقت بحیثیت نور کے"۔ اس میں آپ لکھتے ہیں:-

"فلسفۂ اشراق کے بانی کی خصوصیات میں سے اس کی عقلی آزادی

اور وہ دقیق النظری زیادہ نمایاں ہے۔ . . . . . . . . . .
. . . . . . جس کی وجہ سے وہ معمولی مواد اور رسائے سے ایک
مکمل نظام کی تشکیل کرتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ اپنے ملک
کی فلسفیانہ روایات کے ساتھ وفاشعاری برتتا ہے۔ بہت سے
اساسی امور میں وہ افلاطون سے مختلف الرائے ہے اور ارسطو پر
بھی جس کے فلسفے کو وہ اپنے نظامِ فکر کا پیشرو سمجھتا ہے، آزادی
کے ساتھ تنقید کرتا ہے۔ کوئی چیز اس کی زد سے نہیں بچتی۔ حتیٰ کہ ارسطو
کی منطق کو بھی وہ دقیق النظری سے جانچتا ہے اور اس کے بعض نظریات
کے کھوکھلے پن کو ظاہر کر دیتا ہے۔ مثلاً ارسطو کے نزدیک منطقی تعریف جنس
وفصل کا اجتماع ہے لیکن الاشراقی کا دعویٰ ہے کہ جس شے کی تعریف
کی جاتی ہے ہم اس کی متمائز صفت سے جسے کسی دوسری شے پر
محمول نہیں کیا جا سکتا، اس شے کے علم تک نہیں پہنچ سکتے"۔

میں ارسطو کے بارے میں اقبال کی تحریروں کے اقتباسات سے اس مقالے کو بوجھل نہیں بنانا چاہتا، اور پھر اس کتاب میں کوئی مثال بھی نہیں ملتی جو ارسطو پر واضح تنقید کی ذیل میں آسکے۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، اقبال افلاطون سے خفا ہیں اور ارسطو سے خوش، کیونکہ اس نے ان کے خیال میں افلاطون کے فلسفۂ اعیان پر "نہایت عمدہ تنقید کی ہے"۔ اس کی ایک مثال اس کتاب میں بھی نظر آتی ہے۔ ملا ہادی کی اس تعلیم پر کہ عقل کے دو پہلو ہیں، ایک نظری، دوسرا عملی، بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"ملا ہادی اس تصور کی رہنمائی میں کہ قوتِ حقیقی ایک عامل ہے،
افلاطون کے سکونی تصورِ عالم میں ترمیم کرتے ہیں اور ارسطو کی تقلید
میں اس حقیقی قوت کو تمام حرکات کا ایک غیر متحرک ماخذ و منبع خیال
کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ "کائنات کی تمام اشیاء کو کمال سے عشق

ہے اور وہ اس آخری مقصد کی طرف حرکت کر رہی ہیں۔ مثلاً فلزات نباتات کی طرف، نباتات حیوانات کی طرف اور حیوانات انسان کی طرف بڑھ رہے ہیں"۔

کتاب ۱۹۰۹ء کی تصنیف ہے۔ جب ۱۹۲۷ء میں میر حسن الدین نے اس کا ترجمہ کرنے کی اجازت چاہی، تو انھوں نے اجازت دیتے ہوئے فرمایا کہ "یہ کتاب آج سے اٹھارہ سال پہلے لکھی گئی تھی۔ اس وقت سے نئے امور کا انکشاف ہوا ہے۔ اور خود میرے خیالات میں بھی بہت سا انقلاب آچکا ہے۔ جرمن زبان میں غزالی، طوسی وغیرہ پر علیحدہ کتابیں لکھی گئی ہیں، جو میری تحریر کے وقت موجود نہ تھیں۔ میرے خیال میں اب اس کتاب کا تھوڑا سا حصہ ہی ہے جو تنقید کی زد سے بچ سکے"۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس کتاب کی اشاعت کے بعد اقبال کے خیالات میں بڑی تبدیلی آچکی ہوگی لیکن افلاطون سے متعلق ان کے خیالات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی اور افلاطون کا مسئلہ اعیان ہمیشہ ان کی تنقید کا ہدف بنا رہا۔

اقبال نے افلاطون کے بارے میں جو کچھ لکھا، وہ اپنی جگہ پر لاکھ اہم سہی۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ آج دنیائے فلسفہ کی مثلث سقراط، افلاطون اور ارسطو ہی کے نام سے مکمل ہو رہی ہے، یہ استاد اور شاگرد ساری دنیا میں اپنی نظیر نہیں رکھتے ان تینوں میں کون عظیم ترین تھا، یا ان کی عظمت کا تعین کس معیار کو سامنے رکھ کر کیا جائے، یہ انتہائی مشکل سوالات ہیں۔ سقراط کی شخصیت کی بزرگی، افلاطون کے افکار کی وسعت اور ارسطو کی فکری بافنابطگی، ان کا آپس میں مقابلہ کس طرح کیا جائے، یہ تینوں ایک دوسرے سے کس قدر قریب تھے اور کس قدر دور، سقراط اگر منبع وجدان تھا، تو افلاطون نے اس وجدان کو ایک روایت بنا کے آنے والی نسلوں کے سامنے پیش کر دیا۔ فلسفہ اس کے ہاتھوں میں آکے ایک زندہ قوت بن گیا (نظریہ اعیان کے باوجود) ارسطو نے اس روایت کو علم بنا کے دنیا کے حوالے کیا۔

بعض ہندستانیوں کا یہ دعویٰ ہے کہ یونان میں فلسفے کی روشنی مشرق سے گئی. یونہی سہی لیکن اسے نظر انداز کرنا کہاں کی دانشمندی ہے کہ مشرق نے مغرب سے کیا کچھ سیکھا اور ابھی کیا کچھ سیکھنا باقی ہے. مغرب کو اگر مشرق سے سکونِ قلب کی دولت حاصل کرنا ہے، تو مشرق کو مغرب سے زندگی سے پیار کرنے کا فن سیکھنا ہے۔ افلاطون اور ارسطو نے "ریاست" کا جو خواب دیکھا تھا، اسے ابھی مشرق میں بھی شرمندۂ تعبیر ہونا ہے اور مغرب میں بھی، اور جب تک دونوں کا سوزِ دروں مشترک طور پر بروئے کار نہ آئے گا. دنیا اور اس میں بسنے والے انسان کی منزلِ مقصود محض ایک واہمہ ہی رہینگی. علم کی دنیا ایک اکائی ہے، یہ مشرق اور مغرب کی حد بندیوں میں منقسم نہیں ہے. اقبال اس راز سے صرف باخبر ہی نہیں ہیں، بلکہ یہ راز ایک تڑپ بن کے ان کے دل میں جاگزیں ہوگیا، "زبورِ عجم" کی یہ نظم اسی تڑپ کا ایک لطیف اظہار ہے:

خاور کہ آسماں بخیال کمند اوست ‏ ‏ ‏ ‏ از خویشتن گسستہ و بے سوز آرزوست
در تیرہ خاک او تب و تابِ حیات نیست ‏ ‏ ‏ ‏ جولانِ موج را نگراں از کنارِ جوست
بُت خانہ و حرم ہمہ افسردہ آتشے
پیرِ مغاں شراب ہوا خوردہ در سبوست
فکرِ فرنگ پیشِ مجاز آورد سجود ‏ ‏ ‏ ‏ بینائے کور و مست تماشائے رنگ و بوست
گردندہ تر ز چرخ و ربایندہ تر ز مرگ ‏ ‏ ‏ ‏ از دستِ او بدامنِ ما چاک بے رفوست
خاکی نہاد و خو ز سپہرِ کہن گرفت ‏ ‏ ‏ ‏ عیار و بے مدار و کلاں کار و تو بتوست
مشرق خراب و مغرب ازاں بیشتر خراب ‏ ‏ ‏ ‏ عالم تمام مردہ و بے ذوقِ جستجوست
ساقی بیار بادہ و بزمِ شبانہ ساز
ما را خراب یک نگہِ محرمانہ ساز

••

ظہیر احمد صدیقی

# تلامذۂ مومن

## تمہید

مومن کا زمانہ وہ ہے جب خیال سے زیادہ زبان اور مفہوم سے زیادہ پیرایۂ بیان پر زور دیا جاتا تھا۔ شاعر کو طبیعت آسمان سے ملتی ہے اور زبان زمین سے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ زبان اکتساب کے بغیر نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ استاد کی رہنمائی زندگی کا جزو اور شاعری کے لئے ناگزیر تھا۔ چنانچہ چند خوش گو شعرا کے نام تلامذۂ مومن میں نظر آتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ کچھ تو مومن کی آزادہ مزاجی کی وجہ سے اور کچھ اس لئے کہ انھوں نے اپنے دوسرے نامور معاصرین، ذوق و غالب سے عمر کم پائی اور ان سے پہلے سفر آخرت کیا، ان کا حلقۂ تلامذہ وسیع نہیں ہے۔ تذکروں میں متعدد شعرا کا نام ملتا ہے، جو اوّل مومن کے دائرۂ تلمذ میں داخل ہوئے اور ان کے انتقال کے بعد انھوں نے غالب کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا۔ مثلاً شیفتہ، سالک، بے تاب، ناظم، سروش وغیرہ۔ بہرحال مختلف قلمی اور مطبوعہ تذکروں سے تلاش کے بعد ہم جتنے تلامذۂ مومن کا سراغ لگا سکے ہیں، ان کے حالات زندگی اور نمونہ کلام پیش کر رہے ہیں، جی تو چاہتا تھا کہ مومن اسکول کی خصوصیات اور مومن کے اپنے شاگردوں پر اثر کا بھی ذکر کیا جائے، مگر اس کو سردست چھیڑنا نہیں چاہتے۔

---

# فہرست

| | | | |
|---|---|---|---|
| آشفتہ | حکیم منور علی | صغیر | میاں جان |
| آہی | سید عبدالرحمن | ظہور | ظہور علی صدیقی |
| اصغر | اصغر علی خاں | عظمت | عظمت اللہ |
| اکبر | اکبر علی خاں | عنایت | عنایت علی خاں |
| برق | قاضی نجم الدین | غربت | ہدایت علی خاں |
| بے تاب | عباس علی خاں | غریب | غریب اللہ |
| تسکین | میر حسین | غمگین | میر عبداللہ |
| تسکین | مرزا مظفر بیگ | غنی | عبدالغنی |
| تہور | مرزا غلام فخرالدین | قلق | مولا بخش |
| ثروت | محمد بخش | قیصر | مرزا خدا بخش |
| خورشید | خورشید احمد | کاظم | کاظم علی |
| راحت | مرزا محمود بیگ | کرم | غلام ضامن |
| راسخ | سعادت علی خاں | مسکین | عبدالواحد |
| سالک | قربان علی بیگ | مضطر | مرزا سنگین بیگ |
| سروش | عبدالوہاب خاں | ملال | میر حسین زیدی |
| سکندر | سکندر خاں | موجد | حشمت علی خاں |
| سمجھو | منشی غلام محمد | ناظم | یوسف علی خاں |
| شورش | غلام احمد | نسیم | اصغر علی خاں |
| شہرت | میر نثار علی | وحشت | غلام علی خاں |
| شیدا | میر چھبو جان | وحشی | عمر علی خاں |
| شیفتہ | مصطفیٰ خاں | وزیر | وزیر علی خاں |
| صاحب | امۃ الفاطمہ بیگم | یاس | حکیم خیر الدین |
| صبر | اجودھیا پرشاد | | |

## آشفتہ :-

حکیم منور علی۔ ولادت ۱۸۰۸ء۔ وفات ۱۸۴۸ء

حکیم منور علی خلف سید علی نواز رضوی خاندان سادات بارہ کے ممتاز چشم و چراغ تھے۔ ان کی ولادت شاہجہاں آباد (دہلی) میں ہوئی۔ مزاج میں آشفتہ سری اور طبیعت میں شوریدگی تھی یہی سبب تھا کہ تخلص بھی آشفتہ رکھا ابتداء سے طبابت کا ذوق تھا یہ انکی خوش قسمتی تھی کہ انہیں حکیم غلام حیدر خاں سے اکتساب فیض کا موقع حاصل ہوا۔ آخر صدر الصدور کے محکمے میں ڈگری نویسی[1] کے عہدہ ملا۔ خمخانۂ جاوید میں ہے کہ ۱۸۴۸ء میں ان کی عمر چالیس برس تھی اس اعتبار سے ان کا سال پیدائش ۱۸۰۸ء[2] ہے۔

آشفتہ اپنی شوریدہ مزاجی کے باوجود نہایت طباع اور ذہین تھے ان کے متعلق شیفتہ لکھتے ہیں

"درفن طب دستے بلند و پایۂ عالی دارد، استفادۂ ایں فن از خدمت حکیم غلام حیدر خاں کہ از مشاہیر اعیان دہلی ست نمودہ بہ تاثیر تخلص آشفتہ مزاج و شوریدہ طبع نمکے از سوز عشق در خمیرش افتادہ"

مومن کے بعد شیفتہ سے مشورۂ سخن کرتے رہے، ان کا دیوان نہیں ملتا۔ مختلف تذکروں میں جو کلام دستیاب ہوا، وہ پیش کیا جاتا ہے۔ ان کے شعر کا معیار خاصہ بلند ہے۔ کہیں کہیں مومن کی شوخی کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔

جو نامہ بر گیا، وہ گیا جان سے وہاں ۔۔۔ اب جی میں ہے، رقیب کو ہم نامہ بر کریں

آشفتہ! تیری گور میں تڑپے ہے سارے خلق ۔۔۔ ہے بے قرار آمدِ محشر کو حساب کر

---

[1] یہ بظاہر طبقات الشعرائے ہند (مطبوعہ ۱۸۴۸ء) کے بیان پر مبنی ہے لیکن مولوی کریم الدین نے اپنے اور آشفتہ کے ملنے کا تذکرہ طبقات شعرا میں ۱۸۴۷ء میں کیا ہے اور طبقات الشعرا کی تالیف کریم الدین نے ان کی عمر ... بتائی ہے لیکن کریم الدین نے عمروں کے سلسلے میں بہت فاش غلطیاں بھی کی ہیں اس لئے ان ... پر پورا اعتماد بھی نہیں کیا جا سکتا۔

تم غیر سے ملے میں کسی سے ملا نہیں — سچ ہے کہ بیوفا ہوں میں، تم بیوفا نہیں
عاشق کو لطف سے ہے فزوں لطف جور میں — یہ غیر کی سزا ہے، ہماری سزا نہیں
نے قتل کا خیال انھیں اور نہ موت کا — قسمت میں، کیا خدا! مرے مرنا لکھا نہیں
ہے وصل میں بھی فراق کا غم — ظاہر میں ہوں پاس، پر جدا ہوں
آوارہ ہوں آپ، پر جہاں کو — میں خضر کی طرح رہ نما ہوں
اللہ رے یاوریِ طالع — ٹھکرا کے چلے وہ میرے سر کو
دیکھیں آشفتہ ہمیں مر کے بھی راحت ہوگی — یار رہیگا یہ غم و رنج و الم جان کے ساتھ
حشر ہو ویگا ہم آشفتہ! تابِ رخِ جاں سے — پوچھیگا قیامت میں بیہوشوں سے کیا کوئی
ہے جلاد کی سادگی میں بھی، شوخی — مرے خوں کو رنگِ حنا جانتا ہے
سنا تھا ہم نے آشفتہ کہ کوئی دم کا ہے مہماں — کئی دن ہو گئے اس کو نہ مرتا ہے نہ جیتا ہے
گر سنے ناصح کہ دشمن سے نباہی کس طرح — ہے یقیں تو بھی کہے وہ بیوفا کہنے کو ہیں

[خمخانۂ جاوید حصہ ۱: ۷۲، جلوہ خضر: ۲۴۴، طبقات الشعرائے ہند ۳۵۸، گلشن بیخار ۱۴، طور کلیم: ۸، سخن شعرا: ۲۹، بزم سخن: ۶، گلستان سخن: ۱۲۲]

[1] اصغر:- صاحبزادہ اصغر علی خاں ولادت: ۱۲۳۵ھ وفات ۱۲۷۳ھ

نواب محمد عبداللہ خاں ظریف کے صاحبزادے تھے۔ باپ کا ذوق شعری ورثہ میں پایا۔ مزاج میں بذلہ سنجی اور خوش مزاجی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ان کا ذکر عام طور سے تذکروں میں نہیں ملتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے عمر زیادہ نہ پائی ۱۲۷۳ھ میں ۳۸ برس کی عمر تھی کہ عارضۂ خناق میں مبتلا ہو کر میرٹھ میں دنیا سے سفر کیا۔ میت کو دہلی لایا گیا اور درگاہ حضرت خواجہ باقی باللہ میں دفن کیا گیا۔ شاعری میں مضامین عاشقانہ سے خاص لگاؤ تھا، چنانچہ مومن کی طرح ان کے یہاں بھی تغزل کا خاص اہتمام ہے۔ امیر مینائی لکھتے ہیں:-

---

۱۔ مومن کا یہ شعر پڑھئے اور لطف اٹھائیے:-

رشکِ دشمن بہانہ تھا سچ ہے — میں نے ہی تم سے بیوفائی کی

"شاعرِ خوش مذاق ہیں۔ آفرینش مضامین عاشقانہ میں طاق ہیں۔ مومن خاں صاحب مرحوم دہلوی کے شاگردِ رشید۔ کلام ان کالائق دید وقابل شنید"

نمونۂ کلام یہ ہے:-

شکر جفا نے کام کیا لطف کا کہ اب
دشمن امیدوار ہے ان کے عتاب کا

اس عدو کی پرسش سے تو ہرگز نہ ٹوٹتا
اصغر! وفا کا عہد ہی ناپائیدار تھا

وہ وہ دعائیں رشک میں کی ہیں کہ اے خدا!
توبہ ہے گر قبول کا دروازہ باز ہو

وہ کہیں گے کہ ستم اٹھ نہ سکا
بعد مُردن یہ مصیبت ہوگی

کیوں نہ گھبرا کر اٹھے بالیں سے میرے وقتِ نزع
سچ ہے کب دیکھا کسی کو اپنے مرجاتے ہوئے

درد و غم نے سوا بھی اے اصغر!
کیا کہوں، میرے دل میں کیا کیا ہے

کب یہاں تھا گزر غیر جو رسوا ہوتے
تم نے کس واسطے دل میں مرے آنا چھوڑا

اختیار اپنی اجل پر تو مجھے دینا تھا
کردیا تھا مرے دشمن کو خدایا سب کچھ

زیست تو دشوار تھی مرنا بھی مشکل ہوگیا
کہہ گئے ہیں اپنے آنے کی وہ پھر جاتے ہوئے

(خمخانۂ جاوید ا: ۳۲۴، انتخاب یادگار: ۲۵)

**اکبر:-** نواب محمد اکبر علی خاں۔ ولادت ۱۸۱۵ء — وفات ۱۸۸۰ء

نواب اکبر علی خاں کا تعارف سر سید نے اس طرح کرایا ہے:-

"نواب اکبر علی خاں تعلقدار جہانگیر آباد اور شیفتہ کے چھوٹے بھائی تھے۔ زیادہ تر وقت دہلی میں گزرتا تھا، جہانگیر آباد بہت کم جاتے تھے آخر موت انھیں کھینچ کر راولپنڈی لے گئی اور ۱۸۸۰ء میں وہاں انتقال ہوگیا۔ خمخانۂ جاوید میں ان کی عمر انتقال کے وقت ۶۵ سال بتائی ہے"

---

۱ غالب کا شعر ہے:-

تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا
کبھی تو نہ توڑ سکتا، اگر استوار ہوتا

اکبر کو بھی اپنے بڑے بھائی کی طرح شعر و ادب سے خاص لگاؤ تھا۔ قدرت نے ذہن اور جودت طبع کا وافر حصہ عطا کیا تھا۔ شعر بہت کم کہتے تھے، مگر جو کچھ کہتے، نہایت خوب کہتے۔

مومن کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ اگر زندگی ساتھ دیتی تو غالباً استادانِ ادب کی صفِ اول میں ان کا نام ہوتا۔ ان کی اکثر غزلوں میں مومن کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔ لیکن انھوں نے استاد کے رنگ کو اپناتے ہوئے بھی، اپنی انفرادیت کو قائم رکھا ہے۔ مثلاً اکبر کے یہ اشعار مومن کے اشعار کے ساتھ پڑھیے؎

حنائے غیر ہیں گر لگے گا دل تیرا     مجھ کو بھی اور سے آتا ہے لگانا دل کا
ہوا نہ شوق سے اس کوچہ میں گزر اپنا     ہمیشہ پیچھے رہا ہم سے راہبر اپنا

اکبر کا رنگ ایک خاص قسم کا گنگا جمنی رنگ ہے اور اسی سے ان کی انفرادیت کا رنگ ابھرا ہے۔ ان کا دیوان نایاب ہے۔

جنون عشق کا درماں نہ ہو کسی سے کبھی     کہو علاج کرے جا کے چارہ گر اپنا
عدو کے ذکر سے واں ہوش جائے یا موت آئے     مزاج ان سے بھی نازک ہے کس قدر اپنا
نالۂ بےکس و مضطر میں اثر ہوتا ہے     بیوفا خوب نہیں دیکھ، ستانا دل کا
مرے جینے کی صورت ناصح! کوئی تدبیر وصال     حیف چارہ نہ کرے آپ ستانا دل کا
دوستی کی ہے جو اکبر کسی ہرجائی سے     ہو گیا دشمن جاں ایک زمانہ دل کا
اثر لیلیٰ کو کیا ہو جب تری فریاد نے مجنوں     جلایا پائے ناقہ کو، نہ دست ساربان چھو
دوش ملک پہ دیکھ کے نعش شہید عشق     حوروں کو یہ گماں ہے کہ عرش بریں نہ ہو
اکبر تباہ دیکھ کے دشمن کو ہنس دیا     اس بےوفا کو مجھ سے محبت کہیں نہ ہو

---

؎ ان کے ساتھ مومن کے یہ اشعار دیکھئے۔

(۱) اب اور سے لو لگائیں گے ہم     جوں شمع تجھے جلائیں گے ہم
(۲) رشک پیغام ہے عنان کش دل     نامہ بر راہبر نہ ہو جائے

کون رویا ہے ترے کوچہ میں رات　　کیوں سفیدی اڑ گئی دیوار کی !

ہم مر گئے اور اس نے نہ جانا کہ مر گئے　　ہر زخم پر جو ملتے تھے لب آفریں کے ساتھ

طوفانِ نوح گریۂ اکبر میں غرق ہے　　یعنی کہ آسمان کو ڈبو یا زمیں کے ساتھ

واں رسمِ اختلاط سے انکار و عذر تھا　　یاں جان ہی نکل گئی اپنی نہیں کے ساتھ

قتل کر لاشۂ اکبر کو چھپایا گھر میں　　بارے اسنے مجھے جانے نہ دیا اور کہیں

[آثارالصنادید (ایڈیشن دوم) ۱۱۴؛ خمخانۂ جاوید ۱: ۲۷۵؛ جلوۂ خضر: ۲۴۴؛ بیاض سخن؛ بزم سخن ۱۴۱؛ گلشن بے خار ۲۴۳؛ بطور کلیم: ۱۲؛ سخن شعرا: ۴۲؛ تذکرہ زیبا (قلمی) ۱۲۷۰؛ طبقات الشعرائے ہند: ۴۵۲]

## آہی ——— سید عبدالرحمٰن ——— متوفی ۱۸۷۵ء

سید عبدالرحمٰن نام تھا مومن کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ میر حسین تسکین کے بیٹے اور میر عبداللہ غمگین کے بھائی۔ مومن کو آہی سے بیحد محبت تھی، لہٰذا انھوں نے اپنی لڑکی کا عقد ان سے کر دیا۔ آہی نے زیادہ عمر نہ پائی، عین جوانی میں ۱۸۷۵ء میں دنیا سے کوچ کیا۔ باپ کا تعلق رام پور سے تھا، اس لئے انھیں بھی دربار رامپور سے ربط رہا اور یہ وہاں سے برابر وظیفہ پاتے رہے، مومن کا کلیات انھیں نے مرتب کیا تھا۔

عربی فارسی کی تحصیل خاص طور پر کی، چنانچہ اس سلسلے میں درسیہ کتابیں مولوی امام بخش صہبائی سے پڑھی تھیں۔ فنِ معمہ میں وہ مہارت بہم پہنچائی کہ اقران سے سبقت لے گئے۔ مزاج میں بیحد شگفتگی اور بذلہ سنجی تھی، شعر کو سمجھنے اور پرکھنے کی صلاحیت خداداد تھی۔ سیرت کے اعتبار سے بھی وہ ایک فردِ فرید تھے، چنانچہ خلق، مروت اور انکسار ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ عمر نے وفا نہ کی۔ کلیات تو کیا مرتب ہوتا، اپنے ذوق کے مطابق شعر بھی جی بھر کے نہ کہہ سکے۔ آہی کے کلام میں تسکین اور مومن کا رنگ نمایاں ہے۔ کلام میں بے ساختگی، شوخی اور آمد کی فراوانی ہے۔

تمہارے حسن میں گرمی کہاں ہے　　اگر ہوئے، تو دا بندِ قبا ہو

شکوہ کہاں کا، کیسا گلہ، جی نکل گیا　　شرما کے یار نے جو نہی نیچی نگاہ کی

مژدہ، اے شوقِ تپیدن، خلق میں ہے آج دھوم　　زہر میں خنجر کو وہ اپنے بجھا کر لے گئے

اٹھ کہیں، ہے آمد آمد اس ستمگر کی وہاں
اہل محشر مجھ کو یہ مژدہ سنا کر لے گئے

واعظا! خلد سے لاخانۂ خمار میں رکھ
قدر واں مے کی ہے جس جا کوئی میخوار رہے

کھل گیا دروازۂ جنت بھی اپنی گور میں
پر دل وحشی یہ کہتا ہے، بیاباں چاہیئے

دل لئے جاتی ہیں حوریں نزع میں اے ہمدمو!
سامنے رکھنی مرے تصویر جاناں چاہیئے

کچھ تمہیں بھی خبر ہے آہی کی
لوگ کہتے ہیں مر گئے کب کے

اور ذیل کے شعر تو بے پناہ کہ گئے ہیں، جن سے ان کا کمال فن آشکار ہے۔

سب کو خبر ہوئی مرے حال تباہ کی
اٹھ جائیگی جہاں سے اب رسم چاہ کی

ہے غلط دھوم کہ نکلا تھا وہ گھر سے باہر
شہر میں چاک کسی کا تو گریباں ہوتا

(خمخانۂ جاوید ا : ۱۱۶ ؛ جلوۂ خضر ۲ : ۲۴۴ ؛ سخن شعرا : ۵۸ ؛ بزم سخن : ۹ ؛ طور کلیم : ۸ ؛ گلستان سخن : ۱۲۸ ؛)

**برق** ——— قاضی نجم الدین، ولادت: ۱۸۲۷ء ——— وفات: ۱۸۹۹ء

ان کے والد کا نام قاضی سراج الدین تھا۔ سکندر آباد کے رہنے والے تھے۔ ان کے آبا و اجداد عہد قدیم سے اس قصبے کے قاضی تھے۔ اور اسی سبب سے یہ خاندان عہدۂ قضا پر مامور ہونے کے باعث بستی میں معزز اور ذی علم خیال کیا جاتا تھا۔ برق باپ اور ماں دونوں طرف سے قاضی تھے۔ شروع ہی میں دہلی چلے آئے۔ بچپن اور جوانی کے ایام سرزمین دہلی میں گزارے اور یہیں مومن کی صحبتیں میسر ہوئیں اور ان کی شاگردی اختیار کی۔ اس کے بعد مومن کے ایما سے اپنا کلام میر حسین تسکین کو دکھانے لگے۔

پیر میخانہ ہے تسکین، برق اس کا جرعہ کش
ہے مزا اس کے سخن میں بادۂ انگور کا

شروع میں الہ آباد اور آگرہ کی عدالتوں میں امین رہے۔ پنشن پانے کے بعد مراد آباد میں وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ اور زندگی کے آخری ایام تک وہیں رہے۔ ۱۸۹۹ء میں ۷۲ برس کی عمر میں دنیا سے انتقال کیا۔ چونکہ طبیعت میں بے پروائی اور بے نیازی تھی، اس لئے نہ کبھی دیوان یکجا کرنے کا خیال آیا اور نہ کبھی اس کی اشاعت کا خیال پیدا ہوا، چنانچہ بیشتر تلف ہو گیا۔ اب جو کچھ باقی ہے وہ متفرق اشعار میں ہے۔

ان کے کلام کا طویل انتخاب خمخانۂ جاوید میں ملتا ہے ورنہ دوسری جگہ بمشکل دو چار شعر دستیاب ہوتے ہیں ۔

برق کا کلام ان کے ابتدائی دور میں دہلی میں ہر شخص کی زبان پر تھا۔ تخلص کے اعتبار سے کلام میں بھی برق کی سی شوخی تھی۔ اشعار پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا، گویا، آسمان سے لاکر بجلیاں بھر دی ہیں ۔ اور پھر اس پر پڑھنے کا انداز وہ دل کش کہ محفل پر چھا جاتے تھے۔ ان کے کلام میں ترنم، شوخی، دل کشی وغرض ہر وہ شے تھی جو دل کو اپنی طرف متوجہ کرلے۔ کلام میں چونکہ ایک خاص قسم کا آہنگ تھا، اس لیے یہ موسیقی سے بہت قریب ہوگیا ہے۔

کلام میں ان کا اپنا مخصوص رنگ ہے، کہیں کہیں مومن کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ ان کے کلام میں دل آویزی اور دل پر اثر کرنے والی کیفیت ملتی ہے جس مشاعرہ میں یہ ہوتے، ارباب کمال کی نظریں ان ہی پر پڑتیں۔ مضامین کی عمدگی، بندشوں کی نفاست اور ترکیبوں کی لطافت نے مخالفوں سے بھی اعتراف عظمت کرالیا۔ اشعار ذیل سے کلام کا رنگ واضح ہوگا۔

رشک عدو و حسرت وصل آرزوئے مرگ — صدمہ ہے کونسا جو مری جان پر نہیں
وا جو گلشن میں ترا عقدۂ گیسو ہو جائے — غنچہ غنچہ گرہ نافۂ آہو ہو جائے
حرم و دیر کے جھگڑے ترے چھپنے سے پڑے — ورنہ تو پردہ اٹھا دے تو تو ہی تو ہو جائے
تو تو جس خاک کو چاہے وہ بنے بندۂ پاک — میں خدا کس کو بناؤں جو خفا تو ہو جائے
آج ارمان مرے دیدۂ تر کا نکلا! — کہ ہر اک اشک لئے لخت جگر کا نکلا
ہم تو کہتے تھے کہ جنت میں لگے گا کیا جی — بارے کچھ اس میں بھی نقشہ ترے گھر کا نکلا
خط پہ خط بھیجے اسے لیک یہ حسرت ہی رہی — کوئی قاصد نہ کبھی آن ادھر کا نکلا
عمر تو ساری کٹی کسب کمالات میں حق — یاں نہ پرساں ہی کوئی اہل ہنر کا نکلا
پوچھا جو اس نے آپ ہمیں چاہتے ہیں کیا — بے ساختہ زباں سے مری ہاں نکل گیا
مری خاطر پھر دکھا نا سالم رخ پُرنور کا — غش سے موسیٰ نے نہیں دیکھا ہی جلوہ طور کا
شب غیر میں اور ہم میں رہی یونہی لڑائی — دیکھا تو وہ بے دید ادھر تھا نہ ادھر تھا

کس واسطے خوش آئی مجھے دل کی خرابی — اے خانہ برانداز یہ تیرا ہی تو گھر تھا
وہاں جاکے چھپا کوئی جہاں جانے نہ پائے — اے برق یہ نالوں سے ترے غیر کو ڈر تھا
اب نہیں تاب تحمل، تو اٹھا لو رخ سے نقاب — اک فسانہ ہو گیا عالم میں جلوہ طور کا
پیر میخانہ سے ہے تسکین برق اسکا جو مے کش — بے مزہ اس کے صحن میں بادۂ انگور کا
کوئے جاناں سے نکلتے ہی یہ حالت ہو گئی — جس طرح ہارا تھکا آئے مسافر دور کا
بہت ہے مے کا قطرہ بھی جو دے ساقی محبت سے — غنیمت ہے جو گزرے کوئی دم غفلت میں حرمت سے

[دو نایاب بیاضیں ۴: ۱۰۴؛ خمخانۂ جاوید ا: ۵۶۳؛ جلوہ خضر: ۲۲۴؛ طبقات الشعراء: ۴۴۹؛ بیاض سخن؛ یادگار مشاعرہ ۲۰۸؛ گلستان سخن: ۱۵۰؛ سخن شعراء ۶۴؛ بزم سخن ۲۱؛ گلستان بیخزاں: ۴۹؛]

**بیتاب** ـــــ نواب عباس علی خاں ولادت ۱۸۰۹ء وفات ۱۸۸۳ء

بیتاب کا تعلق رامپور کے حکمراں خاندان سے ہے۔ ان کا شجرۂ نسب یہ ہے۔

نواب فیض اللہ خاں

نواب غلام محمد خاں

نواب عبدالرحمن خاں — نواب محمد سعید خاں — نواب عبداللہ خاں ظریف — نواب عبدالعلی خاں

نواب عبدالوہاب خاں — نواب یوسف علی خاں ناظم — نواب اصغر علیخاں اصغر

۱۔ نواب عباس علی خاں بیتاب ۲۔ صاحبزادہ عنایت علیخاں عنایت ۳۔ نواب ہدایت علیخاں غربت

امیر مینائی کے قول کے مطابق ان کا سال ولادت ۱۸۰۹ء ہے۔ ایک مدت دہلی میں رہنے کے بعد وہ لکھنؤ چلے گئے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد کم عمر رامپور بلائے گئے اور وفات تک اس شہر میں متمکن رہے۔ اپنے قیام دہلی کے زمانہ میں مومن سے اصلاح لیتے رہے۔ ۱۸۵۲ء میں جب مومن کا انتقال ہو گیا، تو عرصہ تک کسی سے مشورہ سخن نہ کیا۔ ۱۸۶۵ء میں جب غالب اپنے دوسرے سفر میں رام پور گئے، تو بیتاب نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ اور آخر تک غالب سے اصلاح لیتے رہے۔ ۶ جون ۱۸۸۳ء کو ظہر کے وقت انتقال کیا۔ ۷۴ برس کی عمر پائی۔ ان کا دیوان "گلدستۂ جناں" کے نام سے ۱۳۰۱ھ میں چھپا تھا، مگر اب نایاب ہے، انھوں نے دو مثنویاں "گلزار عشق" اور "بہار عشق" لکھیں جن کے

شائع ہونے کی نوبت نہیں آئی، مالک رام تلامذۂ غالب میں سراغ دیتے ہیں کہ یہ قلمی صورت میں کتب خانۂ رام پور میں موجود ہیں۔

بیتاب معاملاتِ حسن عشق کو خوب سمجھتے ہیں۔ ان کے کلام میں وارداتِ حسن وعشق کا بیان . . . . جس خوبی سے ہے، وہ انھیں کا حصہ ہے اور یہ خوبی ان میں مومن کے تتبع سے آئی۔ ان کا طرز ادا دلکش اور بندشیں نہایت چست ہوتی ہیں۔

بھا گیا ہے زلبس قتل کا ایمان مجھ کو
بعد مُردن بھی ہے مرنے کی تمنا مجھ کو

آخر فریب کھا کے کیا اس نے مجھ کو قتل
ہم نے کہا تھا تم سے اٹھائینگے مر کے ہاتھ

داد سے روزِ جزا کی بھی رہونگا محروم
یہ نظر آئے ہے طولِ شبِ ہجراں مجھ کو

معمور ہے خدا کی عنایت سے میکدہ
ساقی اگر نہیں نہ ہوئے سے کام ہے

بیتاب دیے ہیں تجھے بھی خدا نے ہاتھ
یہ خم ہے یہ سبو ہے، یہ شیشہ، یہ جام ہے

آج پیغامبر، نہ کچھ کہنا
ہیں وہ ہم پر بہت خفا بیٹھے

یہ بھی قدرت خدا کی اے بیتاب
تم بھی اب بن کے پارسا بیٹھے

کیا کہے جاتے ہو، کچھ وصل کی تدبیر بتاؤ
آپ عقبیٰ میں تو ناصح رہے کام آنے سے

مل گیا راہ میں بت خانہ کیے لے سے زاہد
کعبہ کو جا ہی چکے تھے ترے بہکانے سے

بیتاب کا بھی رندو معلوم ہے پتہ کچھ
ہم اس کو دیکھتے تھے، آخر اس انجمن میں

[انتخاب یادگار: ۷۶؛ خمخانہ ۱: ۶۳۵؛ جلوۂ خضر: ۲۴۴؛ تلامذۂ غالب: ۵۰؛ طبقات الشعرائے ہند: ۴۹۸؛ بزم سخن: ۴۴؛ یادگار مشاعرہ ۵۰؛ گلشن بیخار: ۳۴؛ طور کلیم: ۱۹؛ گلستان بےخزاں: ۴۰؛ سخن شعرا: ۲۰؛ گلستان سخن: ۱۵۹؛ تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا (قلمی) (خدا بخش لائبریری پٹنہ) ۲۲۰؛]

**تسکین —— میر حسین ولادت ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء —— وفات ۱۲۶۸ھ/۱۸۵۲ء**

سپاہی زادہ تھے، والد کا نام میر حسن تھا جو میرن صاحب کے نام سے مشہور ہوئے، ان کا سلسلہ میر حیدر قاتل وزیر فرخ سیر تک پہنچتا ہے۔ دلی میں پیدا ہوئے اور سپاہی زادہ ہونے کے باوجود طبیعت "شمشیر و سناں" کی بجائے "طاؤس و رباب" کی طرف مائل ہوئی۔ شعر و سخن سے ازلی مناسبت تھی اور اس فن میں وہ ملکہ بہم پہنچایا کہ مومن

اپنے جب کسی شاگرد کو مشورۂ سخن کے لئے فرماتے، تو کہتے کہ میر حسین تسکین کے پاس جاؤ۔ ابتدا میں مولوی امام بخش صہبائی سے درسی کتابیں پڑھی تھیں، اپنا فارسی کلام بھی صہبائی کو اور اردو کلام شاہ نصیر کو دکھلانے لگے۔ اس کے بعد جب مومن سے تلمذ ہوا تو آخر عمر تک اس آستانہ سے جدا نہ ہوئے۔ انھوں نے مومن کے دیوان کو یک جا کرنا شروع کیا جس کو بعد میں مکمل صورت میں ان کے صاحبزادے آہی نے مرتب کیا[1]۔ مومن کے شاگردوں میں امتیازی حیثیت کے مالک تھے۔ یہاں تک کہ مومن نے ان کے صاحبزادے عبدالرحمٰن آہی کو اپنی فرزندی میں لے لیا۔ تسکین نے دہلی میں معاش کی کوئی صورت نہ دیکھی، تو لکھنؤ اور اس کے بعد میرٹھ چلے گئے۔ جب دونوں جگہ کامیابی نہ ہوئی، تو رامپور کا رخ کیا۔ وہاں نواب یوسف علی خاں ناظم نے ان کی ایسی قدردانی کی کہ تسکین ہمیشہ کے لئے رامپور سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۲۶۸ھ میں وہیں وفات پائی۔ اتفاق دیکھئے کہ جس سال استاد کا انتقال ہوا اسی سال تسکین نے بھی اپنی جان جان آفریں کے سپرد کی، قربان علی بیگ نے تاریخ کہی۔

برس دن میں مرے یہ تین شاعر | کہ جو تھے حضرت دہلی کے ساکن
نہ ہاتھ آئی کوئی تاریخ رحلت | رہی فکر اس کی سالک کو بہت دن
کہا دل نے کہ داخل ہو گئے سب | ارم میں عارف و تسکین و مومن

"نواب احمد علی خاں کے مقبرے کے قریب مدفون ہوئے۔" عمر صرف پچاس برس کی پائی عمر میں مومن خاں سے تین برس چھوٹے تھے انھوں نے مومن کے رنگ اور شخصیت کو خاص طور پر اپنایا، اگر دونوں کے کلام کو ملا دیا جائے، تو یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو جائے گا۔ کہ کونسا کلام کس کا ہے۔ انداز بیان میں دلکشی اور خیالات میں شوخی ہے۔

---

۱۔ محمد حسین آزاد لکھتے ہیں کہ شاہ نصیر کا دیوان تسکین نے مرتب کیا تھا، مگر خمخانۂ جاوید کی تحقیق یہ ہے کہ شاہ نصیر کے شاگرد منشی مہاراج سنگھ بہادر نے ترتیب دیا۔ (ص ۵۹)

یوں تو تسکین کے کلام میں رنگا رنگ کے مضامین ہیں مگر ان کا طرزِ عاشقانہ شاعری کی جان ہے۔ زبان کی صفائی و شیرینی اور بندشوں کی چستی نے ان کو ہم عصر شعرا پر ممتاز کر دیا ہے۔ استاد سے ان کو معاملہ بندی اور شوخی ورثہ میں ملی، مگر اس معاملہ بندی اور شوخی کے باوجود انھوں نے روزمرہ، سادگی اور صفائی کا سلیقہ بھی خوب بہم پہنچایا۔ جہاں ایک طرف تسکین کو طرزِ مومن پر ناز ہے وہیں خود مومن کے بعض شاگرد تسکین کے انداز کو اپنانے پر فخر کرتے ہیں، چنانچہ برق کا یہ شعر مشہور ہے۔

ہے مزہ اس کے سخن میں بادۂ انگور کا
پیرِ میخانہ ہے لیکن برق اس کا جرعہ کش

لطف یہ ہے کہ تسکین جہاں مضامین کی ندرت اور نازک خیالی کا اہتمام کرتے ہیں وہیں زبان اور بیان کی طرف سے مومن کی طرح سے بے پروا اور بیگانہ نظر آتے ہیں، چنانچہ تسکین کے یہاں وہ محاسن نظر آتے ہیں، جو مومن کی شاعری میں بدرجۂ اتم ہیں، تو وہ کمزوریاں بھی نظر آتی ہیں، جو مومن کی شاعری پر بدنما داغ ہیں۔

تسکین کا مجموعہ کلام نایاب ہے۔ ایک مختصر سا مجموعہ کتب خانہ رامپور میں موجود ہے، جسے ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے اردو ادب، علی گڑھ میں چھپوا دیا ہے۔ تسکین کے کلام کا رنگ یہ ہے۔

کبھی کہتا ہوں وصل مشکل ہے
کبھی کہتا ہوں کچھ محال نہیں

تھا میری طرح غیر کو بھی دعوی الفت
ناصح تو اسے دینے کو الزام نہ آیا

تسکین کروں کیا دلِ مضطر کا علاج اب
کم بخت کو مر کر بھی تو آرام نہ آیا

یہ کہہ کے شبِ ہجر، میں کرتا ہوں تسلی
جو رنج و مصیبت ہے سو انسان کے لئے ہے

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے!
کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی

اے چشمِ سرمگیں! تری گردش نے کیا کیا
راحت پذیر تھے ستمِ آسماں سے ہم

ہر صبح ڈھونڈے ہے کوئی تازہ حنیدا
صورت مری ہر روز بدل جائے تو اچھا

کہتے ہیں رنجش ظاہر میں، مزہ آتا ہے
یونہی تم مجھ سے ذرا ہو کے خفا مل جانا

ہزاروں مرگئے دیکھا جو عالم سوگ میں اس کا
لباس آیا تھا وہ کافر پہن کر میرے ماتم کا

حق کے کہنے سے نہیں ملتی ہے سولی منصورؔ — تو نے دعوی کہیں الفت کا کیا ہووےگا
ساکنانِ نہ فلک پر دیکھئے کیسی بنے — نالۂ سوزاں کا ہے اب کے ارادہ دور کا
میں نے رکھا جو پاؤں پر سر کو — بولے وہ ناز سے کہ بس سر کو
دل دینے کی قتل ہی سزا ہو — قائل ہیں تمہاری منصفی کے
کیا کچھ سا دکھا دیا ہے بدخو! — کیوں ٹکڑے کئے ہیں آرسی کے
اب یہ حالت ہے کہ ان سا بیدرد — میرے بچنے کی دعا مانگے ہے
جان ٹھیری نہ اس ابروئے خمدار کے آگے — سچ ہے نہیں ٹھمتا کوئی تلوار کے آگے
شور یہ برپا کیا اس کے خرامِ ناز نے — داورِ محشر کا سارا کھیل ابتر ہوگیا
تھے جن سے گمان دوستی کے — دشمن وہ ہوئے ہمارے جی کے
ایک خلق ہے تلخ کام سن کر — کیا شور ہیں اپنی بے کسی کے[1]

(۱- بہار بےخزاں (قلمی): ۶۲ (آزاد لائبریری علی گڑھ)؛ گلستان بےخزاں: ۵۵؛ انتخاب یادگار: ۹۰؛ خمخانۂ جاوید: ۵۹؛ گلشن بیخار: ۴۴؛ طور کلیم: ۲۱؛ گل رعنا: ۳۲۲؛ طبقات الشعرائے ہند: ۳۷۱؛ تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا (قلمی): ۳۲۰۰؛ سخن شعرا: ۸۵؛ یادگار مشاعرہ: ۷۲؛ بزم سخن: ۲۹؛ گلستان سخن: ۱۷۰؛ طور کلیم: ۱۲)

## تسکین ——— مرزا مظفر بیگ

ان کا ذکر کسی تذکرے میں نظر سے نہیں گزرا۔ خمخانۂ جاوید نے اس قدر لکھا ہے کہ شاید میر حسن اور مظفر بیگ ایک ہی شخصیت ہیں۔ خمخانۂ جاوید نے جو نمونہ کلام دیا ہے، وہی پیش ہے۔

سر چڑھائے یا کہ رکھے ہم کو مار کے — بندھے ہیں بال باندھے ہوئے زلفِ یار کے
افسوس، پر نکلتے ہی کنجِ قفس ملا — دیکھے نہ دن خزاں کے، نہ ہم نے بہار کے
بےخود شبِ وصال، تو گریاں بروزِ ہجر — یکساں ہیں دل، خزاں کے ہیں اور بہار کے
بربادیاں نہ اپنی پس مرگ بھی گئیں — بن بن بگولے پھرتے ہیں میرے غبار کے

مظفر بیگ تسکین دہلوی شاگرد مومن دہلوی کے نام سے گلدستہ بہارِ سخن بابت ماہ ستمبر، اکتوبر ۱۸۸۸ء میں دو غزلیں طبع ہوئی ہیں، یہ گلدستہ کسی ذخیرہ میں سے

ملا ہے اس کا سرورق نہیں ہے جس کی وجہ سے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس کا ایڈیٹر کون تھا، اور یہ رسالہ کہاں سے نکلتا تھا۔

جو دام زلفِ تار میں دل کو پھنسا چکے — تا حشر اس بلا سے رہائی وہ پا چکے
فرہاد و قیس اپنے ٹھکانوں پہ جا چکے — اک ہم رہے، ہزار مصیبت اٹھا چکے
کیا خاک ہاتھ آئے حیا کہ سب رقیب — پہلے ہی میری خاک کا خاکہ اڑا چکے
آئینہ رکھ کے بوسے لئے ان کے دور سے — ہم ہجر میں بھی وصل کی لذت اٹھا چکے
تسکیں! بہاؤ اشک نہ سوزِ جگر پہ تم — وہ آگ کیوں بجھاؤ، جو خود ہی لگا چکے

---

اپنی اپنی ہے ترے دور میں قسمت ساقی — مے کا قطرہ بھی ہمارے لئے ساغر میں نہیں
پھل دیے آگ لگا جسم و جگر میں غم کی — گھر پڑا جلتا ہے اور حضرت دل گھر میں نہیں
جائیں جنت میں مسلمان، سقر میں کافر — ہم سے رندوں کا ٹھکانا کہیں محشر میں نہیں[۵]

(خمخانۂ جاوید: ۶۴)

تہور —— مرزا غلام فخر الدین —— وفات ۱۸۴۷ء

یہ مومن کے پر گو تلامذہ میں سے ہیں۔ مصنف خمخانۂ جاوید کے مطابق غدر سے دس سال قبل عین عنفوانِ شباب میں انتقال کیا۔ یہ شہزادہ مرزا صابر بخش صابر کے بھائی تھے۔ ان کا دیوان غدر کے ہنگامے میں تلف ہو گیا۔ حافظ عبدالرحمان احسان اور مومن خاں کو کلام دکھایا۔ نمونۂ کلام یہ ہے:

سنتے ہی نامِ غیر، تہور بھی ہے غضب — اس جنگ جو سے لڑنے کو تیار ہو گیا
ناصحا پند و نصیحت کو نہ کر محفل میں — کہ مرے ساتھ کوئی اور بھی رسوا ہو گا
اب ہے کیا باقی جو ہے کاوش تری دستِ جنوں — چاک دامن ہو گیا ٹکڑے گریباں ہو گیا
پھر خدا لائے اسے، یادش بخیر — کیا تہور بے تکلف یار تھا

---

۵ یہ معلومات اور غزلیں تمکین کاظمی مرحوم سے دستیاب ہوئی تھیں۔

رشکِ دشمن کا سبب عشق میں کیا ہے، ناصح  امتحان کیجیۓ مشفق! کہیں شیدا ہو کر
لے آئے میرے خط کا جواب اس سے کسی ڈھب  افسوس کہ قاصد سے اب اتنا نہیں ہوتا
تجھ سے کیا شکوہ ہے، جی میں یہی آتا ہے کہ میں  دل سے سمجھوں کہ تجھے اس نے دیا کیا سمجھا
آیا نہ ترے گوہرِ دنداں کے مقابل  شہرہ ہی سنا کرتے تھے ہم دُرِ عدن کا
گر تجھ کو نہیں شوقِ شہادت، قاتل!  کیوں ترے آگے جھکائے ہوئے گردن آیا

[خمخانۂ جاوید، ۲: ۱۵۹؛ جلوۂ خضر، ۱: ۲۲۴؛ سخن شعرا: ۹۴؛ بزمِ سخن: ۳۲؛ گلستانِ سخن: ۱۷۹]

## ثروت ـــــ محمد بخش

ان کے والد احمد بخش، بریلی کے رہنے والے تھے یہ مومن خاں کے شاگرد تھے۔ ان کا ذکر جلوۂ خضر اور سخن شعرا میں ملتا ہے، ورنہ عام طور سے تذکرے ان کے بارے میں خاموش ہیں۔ صرف ایک شعر دستیاب ہوا۔

بھولی صورت پہ نہ جا ثروت بتانِ ہند کی  نرم گو ظاہر میں ہیں لیکن دل ان کا سنگ ہے

[جلوۂ خضر: ۲۴۴؛ سخن شعرا: ۹۸؛ گلستانِ سخن ۱۸۲]

## خورشید ـــــ خورشید احمد۔

خورشید احمد نام شاہ شکور احمد کے بیٹے تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت مجدّد الفِ ثانی سرہندی تک پہنچتا ہے۔ یادگارِ انتخاب کی تصنیف کے وقت ان کی عمر ۵۰ سال کی بتائی گئی ہے اس اعتبار سے ۱۲۶۵ھ میں ولادت ہونی چاہیۓ۔

ان کی ولادت لکھنؤ میں ہوئی۔ لیکن طبیعت میں سیر و سیاحت کا بہت شوق تھا، اس لئے خراسان اور ماوراءالنہر، فرغانہ، سمرقند، فارس، بخارا، بلخ کی خوب سیر کی، اس زمانے میں جبکہ آمد و رفت کی اس قدر آسانیاں نہ تھیں، ان کا یہ اقدام لائقِ ستائش ہے۔ آخر میں دہلی آکر رہ بسے۔ خورشید نے اپنے چچازاد بھائی شاہ رؤف احمد رافت سے بیعت کی تھی۔ ناسخ کا بیان ہے کہ ابتدا میں رافت سے اصلاح بھی لی ان کے بعد مومن اور غالب کے شاگرد ہوئے۔

خورشید نے اردو اور فارسی دونوں میں شعر کہے ہیں اپنے رنگ میں خوب کہتے ہیں۔

---

خمخانۂ جاوید کا بیان ہے کہ خورشید کی پیدائش دہلی میں ہوئی (ص ۶۸) مگر تلامذۂ غالب (ص ۱۴۳) اور سخن شعرا (ص ۱۵۵) کا بیان ہے کہ ان کی ولادت لکھنؤ میں ہوئی۔

نداز سخن ان اشعار میں مل جائیگا:

نوید وصل یہ مانا کہ جھوٹ ہے خورشید
کسی طرح کوئی تسکین اضطراب تو دے

یہاں پہلو میں دل خورشید ! جس کو ہم تسلی دیں
جو کچھ تھا آنسوؤں کے ساتھ خوں ہو کر نکل آیا

جاتا نہیں آنکھوں سے تصور کبھی خورشید
موجود ہے ہر وقت وہ گویا مرے آگے

بتوں کے عشق سے باز آتے ہی نہیں خورشید
ملا ہے تم کو محبت میں کیا مزا کہئے

پھاڑنے کو اور کیا باقی رہا، دستِ جنوں!
چاک دامن ہو گیا، پیرہن گریباں ہو گیا

تو اب وخیال میں اسے آنا محال ہے
نازک ہیں اس قدر مرے نازک بدن کے پاؤں

[خمخانۂ جاوید ۱: ۷۸ ؛ جلوۂ خضر ۱: ۳۴۴ ؛ تلامذۂ غالب : ۱۰۳ ؛ انتخاب یادگار : ۱۴۰ ؛
سخن شعرا: ۱۵۴ ؛ گلستان سخن : ۲۱۲ ]

راحت :- مرزا محمود بیگ

ان کے والد کا نام مرزا احمد بیگ تھا۔ آباؤ اجداد اپنے وطن روم سے ترک سکونت کر کے ہندوستان آئے اور دہلی کو وطن بنا لیا۔ مرزا محمود بیگ سپاہی پیشہ آدمی تھے۔ مگر غدر سے کچھ عرصہ قبل، فوجی ملازمت ترک کر کے خانہ نشین ہو گئے۔

فن شعر اور فوج کی ملازمت میں ایک قسم کا تضاد محسوس ہوتا ہے مگر راحت نے اس تضاد کو دور کر دیا۔ پھر تربیت کے لئے استاد ملا، تو کامل۔ ان کی مثنوی "وحشتِ عدل" اور ایک واسوخت اور غزلیات کا مجموعہ ان سے یادگار ہے، مگر یہ سب نایاب ہیں اشعار سے ان کے پاکیزہ اور شستہ ذوق کا اندازہ ہوتا ہے:-

کچھ جان سی آتی ہے مری جان میں قاتل
باقی ترے خنجر میں ہے کیا آب بقا کا

کھلایا مجھے غم پلایا مجھے خوں!
ہوا جب میں ناکام مہمان تمہارا

غیروں سے جو اشارے محفل میں ہیں تمہارے
سمجھیں وہ یا نہ سمجھیں پر یہ غلام سمجھے

اشک آنکھوں سے نکل کر زیرِ مژگاں تھم گیا
دم نہ لے سایہ میں کیونکر تھا مسافر دور کا

ہم سے وہ بھی چھوٹے، اور یہ دل شیدا چھوٹا
یاد کس کس کو کریں، غیر تو چھوٹا، حبیب چھوٹا

لے گیا رات کو باتوں میں لگا کر ان کو
کیونکہ قائل نہ ہوں راحت تری القریہ کے ہم

اجل پہلے آوے کہ وہ پہلے آویں
یہی راہ مدت سے ہم دیکھتے ہیں

روئے قاتل سے خجالت کیوں نہ ہو روز جزا — ساتھ میرے ایک عالم ہو لیا فریاد کو
آنکھیں بھر آئیں مہر سے اس رشک ماہ کی — سینہ پہ رکھ کے ہاتھ جو اک میں نے آہ کی
قاتل تو ایک بوسہ مجھے دے کے قتل کر — لازم ہے کچھ تو دینی دیت بیگناہ کی
صبر و قرار، تاب و تواں رفتہ رفتہ سب — آجائیں گے کہیں سے دل رفتہ گر ملا
یہ چپا بیٹا ہوں کہ رازِ نہاں نہ افشا ہو — ترے دہن سے زیادہ مرا دہن بن جائے

(خمخانۂ جاوید ۲: ۳۰۷؛ جلوۂ خضر ۲: ۳۴۲؛ طور کلیم، ۳۴؛ سخن شعرا: ۱۶۵؛
بزم سخن ۶۳؛ گلستان سخن: ۲۲۶؛)

(۱۳۷) سعادت علی خاں:

مومن خاں کے تلامذہ میں؛ دہلی کے رہنے والے تھے۔ بقول مصنف خمخانۂ جاوید ''نیک طبیعت خلیق اور ذیارع نوجوان تھے؛ غدر سے پہلے زندہ و سلامت تھے۔ نہ ان کی زندگی کے حالات ملتے ہیں، نہ کلام۔ دو شعر تذکروں میں ملے ہیں، جو درج ہیں:

میں بنائے جہاں سہی لیکن — جب کہ ناپائیدار ہوں کیا ہوں
ہوں تو آنکھوں میں پر نہیں یہ خبر — سرمہ ہوں یا غبار ہوں کیا ہوں

(خمخانۂ جاوید ۲: ۳۴۳؛ بزم سخن: ۵۳؛ جلوۂ خضر ۲: ۳۴۴؛ سخن شعرا: ۱۰۲؛
گلستان سخن: ۲۴۰؛

سالک:- قربان علی بیگ ولادت ۱۲۲۶ھ؛

مرزا قربان علی بیگ ۱۲۲۷ھ میں حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ بعض تذکرہ نگاروں نے ان کا مولد دہلی بتایا ہے[1] جو محل نظر ہے۔ ان کا حلیہ دیکھنا ہو تو مرزا فرحت اللہ بیگ کی زبانی سنئے۔

---

[1] صاحب قاموس المشاہیر (حصہ اول) نے ان کو دہلوی لکھا ہے (ص ۲۷۰) غالباً ان کے دہلوی لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ سالک کے باپ دادا کا وطن دہلی تھا۔ جب وہ تلاش روزگار میں حیدر آباد آئے، تو سالک کی پیدائش وہاں ہوئی، اور پھر جب ان کے والد دہلی واپس آگئے، تو سالک بھی ان کے ساتھ یہاں آگئے اور ان کی نشو و نما بھی اسی شہر میں ہوئی۔ تلامذہ غالب ص ۱۳۱ و ۱۳۲۔

"چھوٹا سا قد۔ دبلے پتلے ہاتھ پاؤں موٹی سی ناک چھوٹی چھوٹی آنکھیں، موٹی جلد۔ گندمی رنگ۔ اس پر چیچک کے داغ۔ چھدری چھوٹی سی داڑھی کلّوں پر کم ٹھوڑی پر زیادہ۔ سر پر خشخاشی بال۔ بس بخارا کے ترک معلوم ہوتے تھے۔"

لباس کا نقشہ بھی سن لیجئے:۔

"نیچی چولی کا انگرکھا۔ تنگ مُہری کا پائجامہ۔ سر پر سفید گول ٹوپی۔ ہاتھ میں سفید سینڈ کا رومال۔"

قربان علی بیگ کے والد کا نام مرزا عالم بیگ تھا، جو عاشور علی بیگ کے بیٹے تھے حیدر آباد وطن ہونے کے باوجود قربان علی بیگ کی سکونت دہلی میں رہی اور زندگی کا بڑا حصہ اسی سرزمین میں گزرا۔ بچپن سے اسی شہر میں تعلیم و تربیت حاصل کرتے رہے۔ طبیعت شعر کی طرف مائل تھی اور پھر خوبیِ قسمت یہ کہ ان کو مومن و غالب کی دلی ملی اس لئے ذوق سخن کو سہارا مل گیا۔ مومن کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ اور قربان تخلص اختیار کیا۔ مومن کے انتقال کے بعد غالب کے شاگرد ہوئے، تو مرزا کے ایما سے سالک تخلص اختیار کیا۔ جب غدر کے ہنگامے شروع ہوئے، تو دلی چھوڑنا پڑ گیا اور الور میں جاکر پناہ گزین ہوئے اور وہاں وکالت کرتے رہے مگر کچھ عرصے کے بعد وطن یاد آیا اور حیدر آباد میں ایک رسالہ "مخزن الفوائد" کے نام سے نواب عماد الملک کی سرپرستی میں نکلتا تھا۔ سالک کو اسکا ایڈیٹر مقرر کیا گیا کچھ عرصے حیدر آباد میں سررشتہ دار کے عہدے پر فائز بھی رہے آخر دہیں ۱۲۹۷ھ میں انتقال کیا۔ قدر بلگرامی نے تاریخ وفات لکھی ۔ "نواب قربان علی سالک ہزار افسوس مرد" سالک کے دیوان "میخانۂ سالک" اور "بہار سالک" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔

سالک کو شطرنج کا بھی بہت شوق تھا چنانچہ نواب علاء الدین خاں کے قائم کردہ

---

ف تلامذۂ غالب : ۱۴۱؛

"جلسۂ شطرنج" میں وہ دہلی کے خاص رکن تھے۔

شعر سے یک گونہ قدرتی مناسبت تھی، اس پر مومن اور غالب کے سے باکمال استاد ملے۔ جن کی توجہ سے کچھ ہی عرصہ میں اپنے معاصرین میں ممتاز ہو گئے۔ اگرچہ ان کے یہاں مومن کا رنگ بھی موجود ہے، تاہم یہ حقیقت ہے کہ ان کے کلام میں پختگی اور گہرائی غالب کی شاگردی کے بعد پیدا ہوئی۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ مومن کی شاگردی کے وقت سالک کا تقلیدی دور تھا۔ سالک کے دیوان کو اٹھائیے، نازک خیالی، مضمون آفرینی، فصاحت اور بلاغت ان کے کلام کے قابلِ ذکر جوہر ہیں۔

سالک اردو اور فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے اور انھیں جملہ اصنافِ سخن پر قدرت حاصل تھی۔ چنانچہ دلی کی تباہی پر ان کا "شہر آشوب" اور استاد (غالب) کی رحلت پر مرثیہ بجا طور پر اردو کی یادگار نظموں میں شمار ہوتی ہیں۔ سالک نے غالب اور مومن دونوں کے رنگ کو بڑی کامیابی کے ساتھ اپنایا ہے۔ ان کے ہاں مومن کی معاملہ بندی اور نازک خیالی، غالب کی گہرائی اور گیرائی دونوں کا حسین امتزاج ملتا ہے جس طرح تسکین کو یہ فخر حاصل تھا کہ مومن کے اکثر تلامذہ نے ان کی شاگردی اختیار کی۔ اس طرح غالب کی وفات کے بعد ان کے بہت سے شاگردوں نے سالک کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا۔ سالک کا رنگِ شاعری یہ ہے۔

دل وہ کافر ہے کہ مجھ کو نہ دیا چین کبھی
بے وفا تو بھی اسے دے کے پشیماں ہوا

تم غیر کے ہوئے تو ہوا کیا جہاں میں
گویا ہمارے واسطے کچھ بھی بنا نہ تھا

کچھ ہو پر ان کو جانب اغیار دیکھنا
اک بار منع کیجیے تو سو بار دیکھنا

گرتے ہیں چشمِ خلق سے خاک میں ہم
ستم سے تم نے کیا کس طرح جہان اپنا

اب تک بھی میرے ہوش ٹھکانے نہیں ہوئے
سالک کا حال رات کو ایسا سنا کہ بس

تم آ گئے تو ہوش کہاں میزبان ہے کون
آج آپ اپنے گھر میں ہیں کچھ مہمان سے ہم

پھرتے ہیں داد خواہ ترے حشر میں خراب
تو پوچھتا نہیں تو کوئی پوچھتا نہیں

تنگدستی اگر نہ ہو سالک
تندرستی ہزار نعمت ہے

راز کھلتے گئے زمانے پر !! | جس قدر اس نے خود نمائی کی!
سالک صنم کدہ سے نکالے گئے کہیں | حضرت ارادہ رکھتے ہیں کیوں خانقاہ کا
سالک جو کوئی عشق میں مجھ کو برا کہے | کہتا ہوں منہ کو اور یہ کہتا ہوں ہاں درست
چپ چپ پڑے ہوئے تھے ابھی خانقاہ میں | کچھ کچھ کھلے ہیں بیعت پیر مغاں سے ہم
کب دیکھئے قفس سے رہائی نصیب ہو | کیا آمد بہار کی ہم آرزو کریں!
ہم سے جو پیار کر گیا روتا ہوا سالک ابھی | کیا ارادہ ہے خدا جانے کدھر جاتے ہوئے

(خمخانۂ جاوید، ۴: ۳۷؛ تلامذۂ غالب: ۱۳۰؛ گل رعنا: ۴۷۵؛ بزم سخن: ۶۵؛
بیاض سخن؛ یادگار مشاعرہ: ۸۷؛ طور کلیم: ۴۹؛ سخن شعرا: ۲۰۳؛ گلستان سخن ۱: ۲)

**سرخوش :- عبدالوہاب خاں ——— ولادت : ۱۲۳۸ھ**

صاحبزادہ عبدالوہاب خاں المتخلص بہ سرخوش کا سلسلہ رامپور کے خاندان حکمران سے ملتا ہے۔ یہ صاحبزادہ عبدالرحمٰن خاں خلف نواب غلام محمد خاں کے فرزند تھے۔ سرخوش ۱۲۳۸ھ[1] میں پیدا ہوئے۔ آدمی خلیق اور ملنسار تھے۔ ابتدا میں مومن سے مشورہ رہا۔ ان کے بعد غالب کے شاگرد ہوئے؛ اور غالب کے انتقال کے بعد خوش وقت علی خاں خورشید سے استفادہ کیا۔ ان کا ذکر عام طور سے تذکروں میں نہیں ملتا۔ نمونہ کلام مختصراً پیش ہے۔

تھا منع دل کو کہ آنکھوں کو نہ رونے دیتا | ایک میں جھگڑے ہزاروں کہو کیا کیا کرتا!
قتل عالم کو کیا ایک نظر میں تو نے | کون باقی ہے ستمگر جو پرساں ہوگا
سچ تو یہ ہے لاکھ سر مارا کرو، ماتھا گھسو | کچھ کرو، لکھا نہیں ملتا کبھی تقدیر کا
شکل آئینہ جو خالق مجھے پیدا کرتا | وہ مجھے دیکھتے اور میں انھیں دیکھا کرتا
ہیہات بیکلی ہے وہ اب ہاتھ دل پہ ہے | رہتی تھی جس میں ان کی کلائی تمام رات
سرکاؤ سر اپنا مرے زانو پہ نہ رکھو | سو بھی رہو جاکے وہیں جاگے ہو جہاں رات

[انتخاب یادگار: ۱۷۲؛ خمخانۂ جاوید ۴: ۱۸۵؛ تلامذۂ غالب: ۱۵۲]

---

(۱) انتخاب یادگار کی تالیف (۱۲۹۰ھ) کے وقت ان کی عمر باون برس تھی (انتخاب یادگار: ۱۷۲)

## سکندر:۔ سکندر خان

ان کے تفصیلی حالات نہیں ملتے۔ خمخانۂ جاوید نے ان کو دہلوی لکھا ہے مگر سخن شعرا میں انھیں شاہجہاں پور کا باشندہ بیان کیا گیا ہے۔ مومن کے تلامذہ میں سے تھے۔ قادربخش صابر کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ مومن سے اس شعر کی اصلاح پر اختلاف ہو گیا:

دم لینے میں ہے مجھ کو تو آئینہ کا لحاظ
اور یار یہ سمجھتے ہیں مجھ میں ہی دم نہیں

بات بڑھ گئی، اس پر سکندر نے مومن سے ترکِ مشورہ کر دیا۔ گلستانِ سخن میں ان کے یہ شعر ملے۔

ہوش کھوئے ترے نظارہ نے ایسے کہ سحر
آئینہ اپنی بھی حیرانی پہ حیران نہ ہوا

کس کا نام اسکی زباں پر ہے کہ اس لفظ پہ
حرفِ ناصح سے دماغ اپنا پریشاں نہ ہوا

ہے وہ کیا قتلِ سکندر کہ خجل ہو اس سے
جب کہ خونریزیٔ اعدا سے پشیماں نہ ہوا

[خمخانۂ جاوید ۴: ۲۲۲؛ سخن شعرا، ؛ گلستان سخن: ۲۶۷]

## سمجھو:۔ منشی غلام محمد ــــــ وفات ۱۲۷۲ ھ

دراصل سمجھو ان کا عرف تھا، کثرتِ استعمال سے یہی تخلص قرار پایا۔ سورت کے رہنے والے تھے۔ مرزا جہاں خلف اکبر شاہ ثانی کے سفرِ حجاز کی واپسی پر سورت بندر سے دہلی آ گئے۔ یہاں سے حیدرآباد پہنچے اور راجہ چندولال کے ہاں زمرۂ شعرا میں داخل ہو گئے۔ چند سے بعد اپنے وطن واپس چلے گئے تھے اور غالباً وہیں انتقال ہوا۔ پرانے طرز کا پختہ کلام ہے۔

ویرانۂ عالم کی ذرا خاک جو چھانی
ہر گرد میں اک لیلیٰ کا محمل نظر آیا

دنیا ماہتابی پہ آیا تو ہوتا!!
وہ مہتاب سامنہ دکھایا تو ہوتا!

بد دعا غیر کو بھی میں تو نہ دونگا سمجھو!
قید گیسو سے کہیں اس کے ہو آزاد رقیب

ابرو سے دل بچا، تو مژہ سے جگر چھدا
روکی ادھر کی چوٹ تو کھائی ادھر کی چوٹ

نکلتا ہے یہ قصۂ سوز دروں، میں ڈرتا ہوں
ہوائے بالِ کبوتر سے بھڑک نہ اٹھے

میں بھی سمجھاؤں جو مانے بات اے پردہ نشیں
ہاں بدلنا ہی اگر منظور یہ گھر ہے تجھے!

[خمخانۂ جاوید ۳: ۲۶۲]

**شورش :- غلام احمد**

غلام احمد شورش کے والد کا نام محمد اکبر تھا۔ اصل وطن کشمیر تھا، مگر پھر دہلی کو وطن بنا لیا یہاں کتابت کا پیشہ کرتے تھے۔ جب معاش نے زیادہ پریشان کیا، تو الور چلے گئے اور وہاں راجہ بنے سنگھ والی الور کے یہاں ملازم ہو گئے۔ مرض استسقا سے ۴۵ سال کی عمر میں رحلت کی۔ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے دوستوں میں تھے۔ نمونہ کلام حسب ذیل ہے:

تا خواب میں بھی جلوہ فروزاں کے نہ ہو تو — ہم کوچہ اغیار میں فریاد کریں گے
کیا جانے عدو خونِ جگر پینے کی لذت — شورش سے مزہ پوچھیں گے تلخابِ الم کا
کیا قیامت ہے کہ روز حشر ہے ہر روز ہجر — تھا قیامت کے لئے یارب مقرر ایک دن
ہمدم! شب ہجراں میں اجل بھی تو نہیں ہے — حال اپنا کہیں کیا در و دیوار سے آگے
نامہ جو بنا لایا ہے قاصد تو صنم کا — ایمان نہ کھونا کسی مایوس کرم کا
کھو رہے گا مجھ کو میرا دیدۂ تر ایک دن — شمع ساں گھل جائیگا یہ جسم لاغر ایک دن
جب وہ بیخواب غم دوری اغیار سے ہو — شکوہ پھر کیوں نہ مجھے طالع بیدار سے ہو
چشم عاشق سے جو دریا کو کوئی دے تشبیہ — بس وہیں رونے کا ہو جائے بہانہ مجھ کو

ترجیع بند میں ان کا لکھا ہوا مرثیہ ہے۔

عالم میں ایک شورِ قیامت بپا ہوا — لو آسمان ٹوٹ پڑا، ہائے کیا ہوا؟
ہر گھر سے کیوں ہے نالۂ واحسرتا بلند — عشرت کدہ جہان کا کیوں غم سرا ہوا؟
تھمتی نہیں ہے اشک مسلسل کی کیوں جھڑی — کیوں چشم خونفشاں ہے؟ یہ کیا ماجرا ہوا؟
مرنے کے بعد رونے کی جن سے امید تھی — افسوس ہے، انھیں کا ہمیں پیٹنا ہوا؟
کیوں قطرہ ہائے اشک نہیں زیب آستیں — لختِ جگر ہے آنکھ میں شاید رکا ہوا؟

(خمخانۂ جاوید: ۳۴۷؛ جلوۂ خضر ۲: ۳۴۴؛ طبقات الشعرائے ہند: ۳۶۰؛
گلشن بیخار: ۱۱۳؛ طور کلیم: ۵۰؛ سخن شعرا: ۲۵۴؛ خوش معرکۂ زیبا (قلمی))

**شہرت :- میر نثار علی**

میر نثار علی نام، شہرت تخلص۔ والد کا نام منشی حسین علی تھا۔ خاندان تیموریہ کے چشم و چراغ

تھے اور دہلی میں سکونت تھی۔ ان کے والد منشی حسین علی صاحب تصنیف تھے، ان کی تصانیف میں ام التواریخ اور موجد التواریخ ہیں۔ وہ شاہ ظفر شاہ دہلی کے داماد مرزا قمر طالع اور ان کی لڑکی کے استاد تھے۔ اس لئے شہرت کا بھی قلعہ معلی میں آنا جانا رہتا تھا۔

میر نثار علی ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیمات ریاست جموں وکشمیر تھے یہ بھی مصنف تھے چنانچہ ان کی تصنیفات میں عبیر ہندی اور مشک ہندی ہیں۔ اول الذکر کتاب کا موضوع لغات واصطلاحات نسواں ہے! اس کتاب کے لکھنے کا سبب انھوں نے یوں بیان کیا ہے۔

"میں پنجاب بمبئی۔ مدراس میں دیکھتا ہوں کہ اردو زبان اچھی طرح استعمال نہیں کی جاتی اور عورتیں بہت کم اردو جانتی ہیں اور زنانہ زبان تو جانتی ہی نہیں جو دہلی کی شاہزادیوں اور امیرزادیوں کی زبان ہے جس پر سے فصاحت اور بلاغت تصدق رہتی ہے۔"

موخرالذکر کتاب راقم الحروف کی نظر سے نہیں گذری، مگر عبیر ہندی کے ایک اعلان سے پتا چلتا ہے کہ اس کا موضوع بھی یہی ہے اور یہ عبیر ہندی کی گویا دوسری جلد ہے

شہرت کا ذکر عام طور سے تذکروں میں نہیں ملتا۔ ان کی مومن سے شاگردی کا حال بھی عبیر ہندی ہی کے سرورق سے معلوم ہوا۔ جہاں لکھا ہے:

"عالی جناب میر نثار علی صاحب شہرت فخر شعرائے ہند دہلوی شاگرد خلد آشیاں مومن خاں صاحب مومن دہلوی"

شہرت کے بارے میں اس کتاب کی تقریظ سے مزید معلومات ملتی ہیں جن سے ان کی حیثیت اور اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

"یہ وہی میر نثار علی صاحب شہرت دہلوی ہیں جنھوں نے ۱۸۷۲ء میں قوم کو جتایا تھا کہ اگر ہماری زبانیں مٹ گئیں تو ہمارے مذہب بھی مٹ جائینگے۔ صاحب ممدوح کی بانی نے گورنمنٹ کے حضور میں عرضی پیش کی تو پھر اورنٹیل کالج بنا جو عربی۔ فارسی سنسکرت کو زندہ کر رہا ہے"

ان کی تعلیمی سرگرمیوں کی مدح کرتے ہوئے.... ناشر نے مزید لکھا ہے۔

"یہ وہی میر نثار علی صاحب شہرت ہیں کہ جب جاپان ترقی کر رہا تھا تو انھوں نے اور ان کے دوستوں نے زور دیا کہ لاہور میں ایسی یونیورسٹی قائم کی جائے جو علوم و فنون وغیرہ کا ترجمہ دیسی زبانوں میں کرے جس سے آنریبل سید سے پانچ برس تک بحث ہوئی اور آخر کار پنجاب یونیورسٹی کو اختیار ملے۔ یہ یونیورسٹی ملک کے روپیہ سے بنی ہے۔ یہ وہی نثار علی صاحب شہرت ہیں کہ انھوں نے اور ان کے دوستوں نے زور دیا کہ ہماری تعلیم ہمارے ہاتھ میں رہے چنانچہ انجمن حمایت الاسلام لاہور بنی۔"

ان دو کتابوں کے علاوہ انھوں نے داغ کی سوانح عمری بھی "آئینہ داغ" کے عنوان سے لکھی تھی، جو چھپ چکی ہے۔ شہرت کا کوئی دیوان یا کلام دستیاب نہ ہو سکا۔ البتہ کچھ اشعار عبیر ہندی میں حمد، نعت اور زبان اردو کے عنوان سے ملتے ہیں۔ نمونے کے طور پر ان میں سے چند پیش کئے جاتے ہیں یہ بہت ہلکے اور پھیکے ہیں۔ ان میں شعریت ہے نہ کوئی گہرائی۔

حمد:-

کُن سے ہوئی ہے شگوفہ کاری — لازم ہے بشر کو حمد باری
کُن سے ہوئے ہیں ہزار عالم — یوں کہئے کہ بے شمار عالم
ان میں سے بس اک جہاں میں ہیں ہم — اس کو بھی تو جانتے ہیں ہم کم

نعت:-

احمد ہیں جہاں میں فخر عالم — ان کی بھی صفت نہ کر سکیں ہم
حق پاس جو آسماں پہ پہنچے — حیران ہیں سب کہاں یہ پہنچے
اندھیر ہٹایا کیا اجالا — ظلمت کو جہاں سے نکالا

زبان اردو:-

ہے اردو زبان کا بول بالا — جس نے کئی سوکنوں کو ٹالا
کل ہند میں سکہ اس کا جاری — خوش قسمتی ہے مگر ہماری
پنجاب میں اس کے حسن کی دھوم — پہنچی ہے یہ کابل اور تا روم

(عبیر ہندی۔ دار الاشاعت نسواں، لاہور)

**شیدا: میر مجبو جان**

تذکروں میں ان کے نام میں اختلاف ہے، لیکن صحیح غالباً "مجبو جان" ہوگا جیسا کہ انشائے مومن میں ملتا ہے۔ مومن کے شاگردوں اور شیفتہ کے دوستوں میں تھے۔ ۱۲۷۰ھ میں بعالم شباب وفات پائی۔ کلام میں صفائی اور بندش میں چستی ہے۔ انھوں نے استاد کا رنگ اور انداز قائم رکھا۔ جو مختصر کلام تذکروں میں ملتا ہے۔ وہی پیش ہے:

ناشکر ہم نہیں ہیں ادھر کو نگاہ ہے　　　پر وہ نگاہ، جس سے عنایت عیاں نہیں
وہ نہیں دل جو کسی کے لئے بے تاب نہیں　　　وہ نہیں چشم جو آلودۂ خونناب نہیں
تیرے رخسار کو کس چیز سے دیجئے تشبیہ　　　گل میں یہ آب نہیں، شمع میں تاب نہیں
دریا یہیں کہیں، کہیں مژگاں بھی تر نہ ہو　　　مرجائے کوئی، اور کسی کو خبر نہ ہو
وہ دشمنی میں پورے ہوں، یہ بات بھی نہیں　　　کہتے ہیں زہر دے کے، الٰہی! اثر نہ ہو
کہتے ہیں اس کے کوچے میں مارا گیا کوئی　　　مجھ کو یہ خوف ہے کہ میرا نامہ بر نہ ہو
کہیں وہی نہ ہو شیدا کہ اس کے کوچے میں　　　نظر پڑا تھا کل اک مضطرب غبار مجھے
مگر عدو سے ہے وعدہ کہ خود بخود شیدا　　　کچھ اضطراب میں ہیں دل کے اضطراب سے ہم

[جلوۂ خضر: ۲۲۳؛ طور کلیم: ۹۰؛ سخن شعرا: ۲۶۴؛ خمخانۂ جاوید ۲: ۱۳۹]

**شیفتہؔ:- نواب مصطفیٰ خاں ـــــ ولادت ۱۸۰۶ء ـــ وفات: ۱۸۶۹ء**

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ خلف عظیم الدولہ سرفراز الملک نواب مرتضیٰ خاں بہادر خلف دلی دار خاں۔ شیفتہ کی والدہ جرنیل اسمٰعیل بیگ ہمدانی کی صاحبزادی اکبری بیگم تھیں جب دلی کی سلطنت میں خانہ جنگی اور بدامنی شروع ہوئی تو مرتضیٰ خاں ہلکر کے لشکر میں شامل ہوگئے۔ جب لارڈ لیک ہلکر کے مقابلے پر آیا، تو نواب مرتضیٰ خاں نے اپنے حسن سعی سے دونوں میں صلح کرادی، جس سے دونوں فوجیں بڑی خونریزی سے محفوظ رہیں۔ ان خدمات کے لئے لارڈ لیک نے ان کو ہوڈل اور پلول (ضلع گوڑگاؤں) کی جاگیر عنایت کی۔ اس زمانہ میں جہانگیر آباد (ضلع میرٹھ) کا علاقہ نیلام ہو رہا تھا، تو نواب مرتضیٰ خاں نے اسے بھی خرید لیا، چونکہ ہوڈل اور پلول کا علاقہ نواب مرتضیٰ خاں کی زندگی تک کے

[1] تلامذۂ غالب۔ مالک رام ۱۷۰۔

لئے دیا گیا تھا، لہذا ان کے مرنے بعد انگریزوں نے اسے واپس لے لیا مگر قدیم خدمات کی بنا پر بیس ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا البتہ جہانگیر آباد چونکہ خود ان کا اپنا خریدا ہوا تھا، اس لئے اس سے تعرض نہیں کیا۔

نواب مصطفیٰ خاں ۱۸۰۶ء میں دہلی میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم مشہور اساتذہ سے حاصل کی اور جلد عربی اور فارسی میں دستگاہ کامل بہم پہنچائی۔ جب شیفتہ حج کو گئے تو علمائے حرمین و شریفین سے حدیث کے سبق اور سند حاصل کی، ان کے اساتذہ میں میاں جی مالا مال، حاجی محمد نور، شیخ عبداللہ سراج حنفی اور شیخ محمد عابد سندھی جیسی باکمال شخصیتیں تھیں۔

شیفتہ کی زندگی کے دو رخ ہیں: ابتدائی زمانہ جو عیش و عشرت اور لہو و لعب میں گذرا۔ جسے ایک امیرزادہ یا جاگیردار کی زندگی کہا جا سکتا ہے۔ شعر و شراب و شاہدان کا محبوب مشغلہ تھا۔ چنانچہ اس زمانہ کی مشہور طوائف نارنول والی رجو سے ان کے تعلقات زبان زد خاص و عام تھے[1]

دوسرا رخ وہ ہے جب ہدایت غیبی نے دستگیری کی اور داعیہ باطنی نے دل کھینچا اور ہر قسم کی خرافات سے نہ صرف توبہ کر لی، بلکہ پھر ایسی پاک صاف زندگی گزاری کہ اس پر ملائکہ کو بھی رشک آتا ہوگا۔ انھوں نے پھر اپنی گزشتہ بے راہروی کا کفارہ ادا کرنے کے لئے حج و زیارت کا قصد کیا اور ۱۸۳۹ء میں عازم حجاز ہوئے مذہبی تعلیم کے زیر اثر انھیں بزرگانِ دین سے کمال عقیدت اور محبت تھی چنانچہ سب سے پہلے شاہ عبدالعزیزؒ کے نواسے شاہ محمد اسحٰق سے بیعت کی۔ ان کے وصال کے بعد شاہ ابوسعید اور شاہ احمد سعید کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے اور آخر میں شاہ عبد الغنی مجددی سے تکمیل سلوک کے بعد سند خلافت لی۔

۱۸۵۷ کا ہنگامہ جیسا کچھ قیامت خیز تھا، وہ ظاہر ہے۔ امیر فقیر، باعزت

---

[1] تلامذہ غالب۔ مالک رام۔ ۱۷۸۔

[2] ″ ″ ″ ″ ″ ۔

بے عزت، اور شریف رذیل ہوگئے۔ اس آگ کی لپیٹ میں چھوٹے بڑے سب آگئے، شیفتہ بھی نہ بچ سکے۔ ہے یہ کہ جب انھوں نے دیکھا کہ جہانگیر آباد غیر محفوظ ہے، تو وہ اپنے گھر بار کے ساتھ خاں پور چلے گئے۔ ان کی عدم موجودگی میں باغیوں نے جاگیر میں آگ لگا دی اور ہر چیز کو تباہ و برباد کر دیا۔ مگر اتفاق سے رامپور کی فوج جو تلنگوں کی سرکوبی کے لئے جا رہی تھی، ادھر آنکلی اور اس نے نجات دلائی۔ ہنگامہ فرو ہونے کے بعد جاگیر کو غیر محفوظ چھوڑ دینے کے جرم میں شیفتہ پر مقدمہ چلا اور سات سال کی قید کا حکم سنایا گیا۔ اپیل میں رہائی تو ہو گئی جائداد اگر ضبط کر لی گئی۔ بعد کو نواب صدیق حسن خاں (بھوپال) کی کوشش سے آدھی شیفتہ کو ... سے دستبرداشت ہوئی۔

ور یادگار تصانیف میں "کلیات شیفتہ و حسرتی" ہے جو نظامی پریس بدایوں سے شائع ہو چکا ہے۔ اس میں ان کا اردو اور فارسی کلام شامل ہے۔ مالک رام "تلامذہ غالب" میں گارسین دتاسی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ شیفتہ نے علامہ ابن جوزی کے مواعظ کا بھی عربی سے اردو میں ترجمہ لیا تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے سفر حجاز کا سفرنامہ "رہ آورد" بھی لکھا ہے، مگر ان کا شاہکار ان کا اردو شاعروں کا فارسی تذکرہ "گلشن بیخار" ہے۔ یہ تذکرہ انھوں نے ۱۸۳۴ء میں لکھا تھا۔ "گلدستہ گلستان سخن" تاریخ ہے۔ جب کہ ان کی عمر صرف تیس سال کی تھی۔ اس تذکرے کی خوبی یہ ہے جس شاعر کی نسبت، جو رائے انھوں نے اس وقت لکھی تھی وہ نقطۂ نظر اور معیار کلام بدل جانے کے باوجود آج بھی ناقدین فن کے یہاں بہت حد تک تسلیم کی جاتی ہے۔

شیفتہ نے دو عقد کئے۔ پہلی بیگم سے محمد علی خاں رشکی ہوئے اور دوسری سے دو بیٹے مصطفٰی خاں اور اسحٰق خاں اور دو صاحبزادیاں ہوئیں۔ شیفتہ نے ۱۸۶۹ء میں بعمر ۶۳ سال انتقال کیا۔ حالی نے تاریخ وفات "وَجَزَاهُمْ بِمَا صَبَرُوا جَنَّةً وَحَرِيرًا" سے نکالی۔ یہی لوح مزار پر کندہ ہوئی تھی۔ سلطان جی میں اپنی ... سپرد خاک ہوئے تھے، لیکن اب قبر بڑی خستہ حالت میں ہے۔

شیفتہ نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ شعر و ادب کا زمانہ تھا اس وقت کی دلی غالب،

مومن، ذوق، آزردہ، صہبائی اور نیر کی دلی تھی۔ ان لوگوں کی صحبت اور اس پر شیفتہ کی طباعی اور خداداد سخن دانی جس پر حالی کو کہنا پڑا تھا کہ انھیں غالب سے وہ فیض حاصل نہیں ہوا، جو شیفتہ کی صحبت سے ملا۔

یہ اپنے زمانہ کے صف اول کے استادوں میں شمار ہونے لگے، ایک طرف فارسی اور اردو شاعری میں ان کا ذوق بلند دوسری طرف تنقید و شعر میں ان کا پایہ ارجمند، یہی وجوہ تھے کہ تمام اہل علم ان کا احترام کرتے تھے۔

شیفتہ اول مومن کے شاگرد تھے ان کو مومن سے خاص عقیدت اور محبت تھی جیسا کہ گلشن بیخار کی عبارت سے ظاہر ہے ان کے انتقال کے بعد غالب سے اصلاح سخن لی، شیفتہ ان شاگردوں میں تھے جن پر استاد کو ناز تھا۔ غالب کہتے ہیں:۔

غالب ز حسرتی چہ سرائی کہ در غزل　　چوں او تلاش معنی و مضمون نکردہ کس

شیفتہ کے معیار شعر کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے:۔

شیفتہ کیسے ہی معنی ہوں، مگر نامقبول　　اگر اسلوب عبارت میں متانت کم ہو
وہ طرز سخن ہم کو خوش آتی ہے، شیفتہ　　معنی شگفتہ، لفظ خوش اندازِ صاف ہو

اپنے دیوان سے متعلق لکھتے ہیں۔

یہ بات تو غلط ہے کہ دیوانِ شیفتہ　　ہے نسخۂ معارف، مجموعۂ کمال
لیکن مبالغہ تو ہے البتہ اس میں کم　　ہاں ذکر جعبہ و فنال اگر ہے تو خال خال

اب ان کے کلام کا ایک اور نمونہ ہدیۂ ناظرین ہے۔ دیوان مطبوعہ موجود ہے۔

شاید اسی کا نام محبت ہے، شیفتہ　　اک آگ سی ہے سینہ کے اندر لگی ہوئی

مرنے کا مرے نہ ذکر کرنا　　قاصد! وہ بہت الم کریں گے
ہائے وہ شیفتہ کی بے تابی　　تھام اپنا وہ تیرے محمل کو
زندگانی سے خفا ہوں اپنی　　پھر کہو تم کو سناؤں کیونکر
آرام سے ہے کون جہانِ خراب میں　　گل سینہ چاک اور صبا اضطراب میں
شوخی نے تیری لطف نہ رکھا حجاب میں　　جلوے نے تیرے آگ لگائی نقاب میں

اے شیفتہ! ہم جب سے کہ آئے ہیں حرم سے
شوقِ صنم و خواہش صہبا نہیں رکھتے

عجیب ہی شہر ہے دلی بھی شیفتہ! ہرگز
میں روم و شام نہ لوں اس دیار کے بدلے

اے مرگ! آگہ میری بھی رہ جائے آبرو
لکھا ہے اس نے سوگ عدو کی وفات کا

گھبرائے اور غیر کے پہلو سے لگ گئے
دیکھا اثر یہ نالۂ بے اختیار کا

طوفانِ نوح لانے سے اے چشم فائدہ
دو اشک بھی بہت ہیں، اگر کچھ اثر کریں

تنگ اتنا نہ کر اے شوق ہم آغوش کر وہ
ڈھونڈھتے ہیں چلے جانے کو بہانہ شبِ وصل

آمد آمد میں اس قدر شورش
دیکھئے کیا کریں بہار میں ہم

یاد نے جس کی بھلایا سب کو
اس کی میں یاد بھلاؤں کیونکر

(آثار الصنادید (ایڈیشن دوم)، ۱۱۰۱؛ قاموس المشاہیر (حصہ دوم): ۳۳؛ خمخانۂ جاوید: ۱۵۵؛ جلوۂ خضر ۳۳۹؛ گل رعنا، ۲۲۷؛ تلامذۂ غالب: ۱۷۷؛ بزم سخن: ۷۱؛ طبقات الشعرائے ہند: ۲۰۰؛ بیاض سخن، ۱۱؛ تلعۂ منتخب: ۱۲؛ طور کلیم ۶۰ کلیات شیفتہ (مقدمہ)؛ یادگار شاعرہ: ۹۷؛ گلشن بیخار: ۱۱۷؛ سخن شعرا: ۲۶۷؛ تذکرہ خوش معرکہ زیبا (قلمی)؛ : ۱۲۲۰؛ بہار بے خزاں (قلمی)؛ اردوئے معلیٰ (رسالہ) جنوری ۱۹۳۲ء؛ گلستان سخن ۳۰۳)

صاحب :- امۃ الفاطمہ بیگم :

امۃ الفاطمہ لکھنؤ کی رہنے والی ایک پردہ نشین طوائف تھی، جو صاحب جی کے نام سے مشہور ہوئی۔ سیر و سیاحت کے لئے دہلی آئی تھی کہ یہاں پہنچ کر بیمار ہو گئی۔ اتفاق دیکھئے کہ علاج کے لئے جس معالج کا نام تجویز ہوا، وہ حکیم مومن خاں تھے۔ وہ کچھ ایسی ساعت تھی کہ طبیب خود مریض بن گیا، اس کا اعتراف خود مومن کو بھی ہے۔

نہ کچھ آشفتہ سری نے مارا
کہ مجھے چارہ گری نے مارا

ہو گیا نبض شناسی سے جنوں
سنو، حال دل دیوانہ کہوں

فصیح الدین رنج اپنے تذکرہ بہارستان ناز میں تحریر کرتے ہیں کہ "حکیم مومن نے علاج کیا۔ صحت پاکر ایک سال تک حکیم صاحب مرحوم کے ہم پہلو رہی"۔

شیفتہ گلشن بیخار میں لکھتے ہیں کہ:-

در بتقریب مداوا با مومن خاں کارش افتاد۔"

ان بیانات اور مومن کی حسن پرست طبیعت سے اندازہ ہوتا ہے کہ صاحب جی حسن و جمال میں ممتاز ہوگی۔ غرض مومن نے علاج کیا، صحت یاب ہو جانے کے بعد ایک سال تک مومن کے ساتھ رہی اور انھیں کی صحبت میں رہ کر شعر و سخن سے دلچسپی ہوگئی اور خود بھی شعر کہنے لگی۔ جو کچھ کہتی اسے مومن کو دکھاتی۔

"القصہ بہ فیض صحبت شاں دلش بشعر و شاعری میل کرد۔ از موزونی طبع گرائیدہ، واز آرائش زلف پریشاں بموشگافی اشعار عجیبہ"

لیکن قطب الدین باطن کو اس سے انکار ہے۔ اس کا خیال ہے کہ شعر خود مومن کہہ کر صاحب سے منسوب کر دیتے تھے۔

جب ایک سال کے بعد یہ لکھنو واپس چلی گئی، تو مومن کو اس کے جانے کا غم رہا۔ مثنوی "قول غمیں" اسی موقع پر لکھی تھی۔ اور جب ہجر نے زیادہ بے قرار کیا تو فراق یار میں دلی سے نکل کھڑے ہوئے:۔

اِک خداوند شوخ کے غم میں ۔۔۔ قابل رحم ہوگیا ہوں میں

مجھے پہنچا دو میرے صاحب تک ۔۔۔ کہ غلام گریز پا ہوں میں

اور یہ غالباً گلشن بیخار سے نقل ہوتے آئے ہیں۔ اگرچہ صاحب کا ذکر تقریباً ہر تذکرے میں ملتا ہے، مگر اس کے اشعار صرف چھ دستیاب ہوئے ہیں:۔

رقیبوں کا جلنا کہاں دیکھتا تو ۔۔۔ سماں میرے گھر میں یہ آیا، تو دیکھا

---

(۱)۔ صاحب گلشن بیخزاں (قطب الدین باطن) کو یہ ماننے میں تامل ہے کہ صاحب کوئی شاعرہ بھی تھی، انکا خیال ہے کہ مومن خاں اس کو لکھ کر دیدیتے تھے چنانچہ ان کے الفاظ یہ ہیں: "بھلا ایسے مبالغہ سے کیا، یہ تقریر لاحاصل، مدت قلیل کی صحبت میں ملکہ شعر گوئی کا حاصل، شاعری بغل میں سونا اور مضمون پیدا کرنے کے قابل ہونا۔ مبتدی سے شعر کہلوانا مشکل۔ یہ دقیقہ استادوں کی فہم کے قابل۔۔۔۔ تحریر عبارت سے یہ مفہوم ہوا کہ موی الیہ نے یہ شعر نہیں کہے بلکہ خانصاحب نے بالیقین کہے۔ ص ۱۳۸

گنہ کیا صنم کے نظارہ میں زاہد یہ جلوہ خدا نے دکھایا تو دیکھا
کھولے ہیں اس نے پیرہن یوسفی کے بند تکرار کیجے نسیم سے کہہ دو، قبائے گل
نظر ہے جانب اغیار، دیکھئے کیا ہو بھری ہے کچھ نگہِ یار، دیکھئے کیا ہو
تو خط نہیں کا مرے کاتب ہے، اسی کو دکھلا تو مرا نامۂ اعمال الٰہی!
صاحب جو بنایا ہے تو مانند زلیخا یوسف سا غلام اک مجھے دے ڈال الٰہی!

[خمخانۂ جاوید: ۲۰۱؛ طبقات الشعرائے ہند: ۳۷۱؛ گلستانِ بیخزاں: ۱۲۸؛ گلزار: ۱۲۳؛ تذکرۃ الخواتین: ۱۰۵؛ بہار بیخزاں: ۵۰؛ شمیم سخن: ۱۰۰؛ بہارستان ناز: ۶۲؛ گلشن ناز: ۲۵؛ خوش معرکۂ زیبا: ۱۱۳۰۰]

صبر :- اجودھیا پرشاد۔

اجودھیا پرشاد نام، صبر تخلص۔ دہلی کے رہنے والے اور قوم کے کایستھ تھے۔ منشی بسنت سنگھ نشاط اور شاہ نصیر کو کلام دکھایا کرتے تھے۔ اور آخر میں مومن خاں کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہو گئے۔[1] ان کے ذکر سے عام طور پر تذکرے خاموش ہیں نمونہ کلام یہ ہے۔

زیست کم حسرت بہت کس کس کا شکوہ کیجئے
طالع خوابیدہ کا یا دیدۂ بیدار کا

ہمیں گماں کہ وہ آئے ہمارے قابو میں انھیں یقیں کہ مرے ہاتھ اک شکار آیا
دل لگانے کو بتاتا ہے تو مشکل ناصح تیرے نزدیک چھڑانا مگر آساں ہوگا
بد نامیاں ہیں باعث نام آوری یہاں ہم جانتے تھے عشق میں کچھ عز و شاں نہیں
خزاں کے روز تو رو رو کے باغ میں کاٹے پھنسے قفس میں جو اب موسم بہار آیا
صبر کیوں دیتے تھے ہم اس کا کل بیچارے کو آپ سے مانگا تو پھر موقع نہ تھا انکار کا
زاہد تجھے خبر ہی نہیں یہ بتان دہر ملتے ہیں اس سے جس پہ خدا کا کرم ہوا

---

[1] خمخانۂ جاوید، ۵۲۔ ۳۷۴؛ بزم سخن (ص ۷۷) میں نواب صدیق حسن خاں نے انھیں شاہ نصیر کا شاگرد لکھا ہے مگر صاحب گلستان سخن نے انھیں شاہ نصیر کے بعد مومن خاں کا شاگرد بتایا ہے۔ ص ۲۱۷۔

[خمخانۂ جاوید، ۴: ۲۷۲؛ بزم سخن: ۵۷؛ گلستان سخن: ۳۱۷]

**صفیر:۔ میاں جان ——— وفات: ۱۲۹۰ھ**

میاں جان صفیر دہلی کے رہنے والے تھے انھوں نے وہ مشاعرے دیکھے تھے جن میں مومن اور غالب نے اپنا کلام سنایا۔ ایک عرصے تک مہاراجہ پٹیالہ کے دربار میں بزمرۂ شعراء ملازم رہے آخر ۱۲۹۰ھ میں وفات پائی۔ نمونہ کلام کے چند اشعار تذکروں میں ملتے ہیں

کہتے ہو، جان جائے تری اور تمھیں ہو جان
ہے ہے، خدانخواستہ یہ تم نے کیا کہا!

نہ تم سے ترک جفا، اور نہ ہم سے ترک وفا
نہ اختیار تمہارا، نہ اختیار اپنا

کیا خبر تھی کہ اسی در پہ پڑے گا جاکر
بار دعا دیتے نہ، گھر غیر کا ویراں ہوتا

چڑھتے ہیں ہزاروں گل تربت پہ صفیر اپنے
مرنا مرا، بلبل کی قسمت میں لکھا ہوتا

مرکر بھی جستجو نہیں جاتی ہے یار کی
مٹی خراب ہے مری مشتِ غبار کی

ہوا ہو سہو، تو پھر خوب یاد کر لیجئے
کہ رہ نہ جائے کوئی جور، امتحان کے لئے

[خمخانۂ جاوید ۵: ۲۳۷؛ جلوۂ خضر: ۲۴۵؛ طور کلیم: ۶۶؛ سخن شعراء: ۲۶۴؛ گلستان سخن: ۳۲۲]

**ظہور:۔ ظہور علی صدیقی ——— ولادت: ۱۲۲۱ھ ——— وفات: ۱۲۸۶ھ**

مولوی ظہور علی خلف مولوی فتح علی۔ مولد ہریانہ، مسکن دہلی تھا۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت ابوبکر صدیق تک پہنچتا ہے۔ مولوی فتح علی سرکار انگریزی میں جاگیر دار تھے۔ ظہور ۱۲۲۱ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ کتب درسیہ مفتی صدر الدین آزردہ سے پڑھیں۔ خوش نویسی میں بھی خاص ملکہ بہم پہنچایا، ۱۸۵۷ء تک تھانیداری کے فرائض انجام دیتے رہے، مگر پولیس کی نوکری اور شعر و ادب کا ذوق، دونوں ساتھ نہ چل سکے۔ بالآخر پولیس کی نوکری ترک کر دی اور سر رشتۂ تعلیم میں فارسی کے مدرس ہو گئے۔ اپنی ادبی کاوشوں کے لئے اکثر حکومت سے انعام اور صلہ پاتے رہتے تھے۔ بہادر شاہ ظفر سے انھیں شمس الشعراء کا خطاب عطا کیا تھا۔ آخر بعمر ۶۵ سال ۱۲۸۶ھ میں دنیا سے رحلت کی۔

ظہور کو فن معمہ سے خاص دلچسپی تھی اور اس میں بڑا کمال حاصل تھا انھوں نے ایک منظوم رسالہ جس میں معمہ حل کرنے کے قاعدے درج تھے، مرتب کیا تھا جس کو

مرزا قادر بخش صابر گورگانی نے اسے طبع کرایا تھا، مگر غدر کے زمانہ میں تلف ہوگیا۔ غزلوں کے علاوہ انھوں نے قصیدے اور مرثیے بھی لکھے۔ تاریخ گوئی میں بھی خاص ملکہ تھا۔ دیوان ظہور کا نسخہ ڈھاکہ میں ڈاکٹر عندلیب شادانی کے پاس ہے۔

ظہور کے مزاج میں شگفتگی اور مزاح کافی تھا۔ ان کے اس طرح کے متعدد قصے مشہور ہیں۔

ایک دن ایک دوست سے ملنے کو گئے۔ پہنچے اور دروازہ پر دستک دی۔ صاحب خانہ گھر پر موجود نہیں ہے۔ ماما بے التفاتی سے پیش آئی۔ واپسی میں دوست سے ملاقات ہوئی۔ دوست نے شکایت کی کہ "وا حضرت آپ مکان پر ٹھہرتے .... آپ نے جواب دیا کہ حضرت میں تو ضرور حاضر رہتا مگر آپ کی نعمی مگر نے جینے ہی نہ دیا۔"

ایک شخص نے اپنے کسی دوست سے پوچھا کہ آپ چشتیہ خاندان میں مرید ہیں یا قادریہ میں۔ ظہور نے جو موجود تھے کہا کہ آپ زوجیہ خاندان میں مرید ہیں۔

ان کے جو اشعار ملتے ہیں ان سے فکر بلند اور مضامین دل پسند کا پتا چلتا ہے۔ ان کے کلام میں روزمرہ کی چستی اور برجستگی کا مزہ ہے۔ کہیں کہیں اس دور کی سیاسی کشمکش کا بھی سراغ ملتا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

ہوا برباد کیا اے ہم صفیر و آشیاں اپنا — کہ گلشن میں رہا باقی نہ کچھ نام و نشاں اپنا

نہیں کچھ بود و نابود جہاں جائے غم و شادی — کہ یاں اسباب دنیا کو نہ ہرگز دیر پا دیکھا

گدا کو اے ظہور! اک دم میں دیکھا یاں غنی ہوتے — غنی کو ایک لمحہ میں یہاں ہوتے گدا دیکھا

حیران ہوں دیکھ کر سر مژگاں پہ اشک کو — کیوں طفل بے گناہ کو کھینچا ہے دار پر

گردش ہے مجھے چشم کی مانند ہمیشہ — آوارہ میں گھر میں ہوں مسافر ہوں وطن میں

دلوں میں حب سے ہے فرق دلبر، ادھر ہمارے، ادھر تمہارے

جہاں میں چرچے یہی ہیں گھر گھر، ادھر ہمارے، ادھر تمہارے

ہے چار طرف جس کی جس کے یہ تجلی — وہ شاہد یکتا نہیں، معلوم، کدھر ہے

اے اشک! میرے دیدۂ نمناک سے باہر — جاتا ہے کدھر، تو تو مرا لخت جگر ہے

[خمخانۂ جاوید، ۵: ۷۹۴؛ سخن شعرا: ۳۱۱؛ بزم سخن: ۸۳؛ معاصر (پٹنہ) نمبر ۱۷: ۹۲-۹۷]

**عظمت :- عظمت اللہ۔**

میر عظمت اللہ پیرزادوں کے خاندان سے تھے۔ ان کے والد میر عزت اللہ خاں بھی شعر کہتے اور مجذوب تخلص کرتے تھے۔ عظمت بریلی میں پیدا ہوئے اور بچپن ہی میں باپ کے ہمراہ بلخ، بخارا اور کشمیر کی سیر کی۔ اخیر میں دہلی میں مستقل قیام کیا۔ شیفتہ سے دوستانہ تعلقات تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کم کہتے تھے۔ تمام تذکروں میں ان کا صرف ایک شعر ملتا ہے جو درج ذیل ہے۔

نام عظمت ہے، نہ شوکت، نہ شکوہ — کیا ہی اس نام سے گھبراتا ہوں

[جلوۂ خضر: ۳۵۰؛ طبقات الشعرائے ہند: ۳۷۶؛ گلشن بیخار ۱۳۶؛ خوش معرکۂ زیبا قلمی ۱۴۲؛
سخن شعرا: ۳۳۳؛ بزم سخن: ۸۷]

**عنایت :- عنایت علی خاں ولادت: ۱۲۲۹ھ وفات: ۱۲۶۴ھ**

عنایت علی خاں بھی رام پور کے حکمراں خاندان کے فرد تھے۔ یہ صاحبزادہ عباس علی خاں بیتاب کے چھوٹے بھائی تھے۔ جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ یہ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے بقول مولوی کریم الدین۔ فارسی کلام امام بخش صہبائی کو اور اردو میر حسن تسکین کو دکھایا کرتے تھے۔ مگر امیر مینائی کا بیان ہے کہ مومن سے بھی اصلاح لیتے تھے۔ امیر مینائی لکھتے ہیں کہ ۱۲۶۴ھ میں بعمر پینتیس سال رحلت کی؛ اس اعتبار سے ان کی پیدائش ۱۲۲۹ھ کی ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دہلی کے ایک باورچی کو ان سے عداوت تھی۔ ایک دن موقعہ پا کر اس نے زہر کھلا دیا۔ درگاہ باقی باللہ میں جگہ پائی۔ عنایت کے اوصاف انتخاب یادگار میں امیر مینائی کی زبانی سنئے۔

"مرد کامل الوجود اور جوان خوشرو تھے۔ زور و طاقت کی بدولت پہلوانوں کے قوت بازو تھے۔ خوش نویس بے بدل، خط شکست و شفیعا میں ضرب المثل . . . . . الغرض ایسے اہل کمال نہ دید نہ شنید۔ جناب مستطاب نواب محمد سعید خاں صاحب بہادر جنت آرامگاہ کے عہد میں اپنے والد ماجد کی جگہ کار نیابت نظم و نسق ریاست میں مصروف رہتے تھے۔"

کلام کبھی یکجا نہیں کیا، اور بیشتر ضائع ہوگیا۔

مجھ سے آنکھیں مری لے لو کہ یہ کام آئینگی
میں نہ ہونگا، تو بہت آپ کو رونا ہوگا

غیر کو مجھ سے ملاتے ہو، مری خاطر سے
آپ اپنے لئے رہنے دیں یہ احسان اپنا

یار سے کس کی عنایت نہیں بگڑی ہوگی
تونے کیا حال بنایا ہے یہ ناداں اپنا

کس شوق سے جاتا عنایت سوئے مقتل
زندان سے نکلنے کا تجھے غم نہ ہوا حیف

یہ سینہ پیٹتا آئے جو در تک
غضب ہے جائے وہ دشمن کے گھر تک

اٹھائے رنج تہمت وہ جو کوئی
رہے بیٹھا ترے عزم سفر تک

سرِ شب اٹھیگا تو انجمن سے
جلایا شمع سے مجھ کو سحر تک

عنایت شام سے اتنا تڑپنا
ترا احوال کیا ہوگا سحر تک

ہوتی نہیں مقبول کریں لاکھ دعا ہم
اللہ! طلب کرتے ہیں کیا جانیئے، کیا ہم

مجھ سا تو بیکس ہے، کوئی نہیں خانماں خراب
پر مجھ کو آب کون سے دن اپنے گھر ملے؟

موت سے روز وعدے کرتا ہوں
صاف کہہ دو اگر نہیں آتے

اے اجل! تو وصال میں آئے
اس طرح بے خبر نہیں آئے

اے شب ہجر ہم ترے ہاتھوں
آج بچے نظر نہیں آتے

لب تلک اب تو ناتوانی سے
نالۂ بے اثر نہیں آتے

[انتخاب یادگار: ۲۲۳؛ تلامذۂ غالب: ۵۰۰؛ طبقات الشعرائے ہند: ۴۷۲؛ گلشن بیخار: ۱۴۷؛ سخن شعرا: ۴۳۷]

**غمگین:۔** میر عبداللہ وفات: ۱۲۶۶ھ

یہ میر حسین تسکین کے بیٹے اور آہی کے بھائی تھے۔ عرصے تک رامپور میں بسلسلۂ ملازمت مقیم رہے۔ عین عنفوانِ شباب میں بعمر ۲۳ سال ۱۲۶۶ھ میں انتقال کیا۔ مقبرہ نواب احمد علی خاں میں دفن ہوئے نمونہ کلام یہ ہے:۔

کی مری مٹی عزیزوں نے خراب
ہائے، لاکر خانۂ خمار سے

آتے ذرا نہ اور، تو مر ہی چلے تھے ہم
تم نے تو کہہ دیا کہ، ہمیں کچھ خبر نہیں

کمی کریں جگر و دل، تو کیا کروں یارب! — کچھ اور دے مجھے مژگانِ خونفشاں کے لئے
امتِ نوحؑ پہ طوفان ہی آیا، یارو! — شکر، یہ ہے کہ مرا دیدۂ خونبار نہ تھا
اب آ یوں ہی مرے سینہ سے لگ جا — گرہ وا ہو چکی بندِ قبا کی!
مجھے تو روزِ ہجراں کی مصیبت یاد ہے واعظ — کچھ ایسا ہو کہ تیرے دل سے دھڑکا حشر کا نکلے
کیا منکر و نکیر پہ بنتی ہے دیکھیئے — ہمراہ میری گور میں تصویرِ یار ہے

(انتخاب یادگار: ۱۷۷، ۲؛ طور کلیم: ۵۷؛ سخن: ۱: ۳۵۳؛ بزم سخن: ۸۹؛ گلستان سخن: ۳۸۱)

**عزت: ہدایت علی خاں ــــ ولادت ۱۲۲۷ھ**

صاحب زادہ ہدایت علی خاں خلف نواب عبد العلی خاں، یہ بیتاب اور عنایت کے بھائی تھے جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ امیر مینائی نے ان کے خوش صفات اور جامع کمالات، اکثر فنون میں شوق اور صنائع میں ایجاد کے ذوق کا ذکر کیا ہے۔

یہ اپنے دونوں بھائیوں کی طرح حکیم مؤمن خاں کے شاگرد ہوئے اور ان کے بعد مہاری علی ذکی مراد آبادی سے مشورہ کرتے رہتے۔ چونکہ انتخاب یادگار کی تالیف کے وقت ۱۲۹۰ھ میں کی عمر ۶۳ برس کی تھی، ولادت ۱۲۲۷ھ کی ہوگی۔ کلام میں کوئی خاص ندرت نظر نہیں آئی، البتہ اندازِ سخن صاف ہے۔

سینکڑوں سجدے کئے اس در پہ تب تسکین ہوئی!
گھس گئی ساری جبیں جب دردِ سر کچھ کم ہوا

جلوہ دکھلا کے نہ تم بام سے اترو صاحب — دیکھو، دل اور ہمارا تہ و بالا ہوگا
شاید ترے مریض کے ہاتھ آ گئی تھی نبض — عرش بریں پر آج دماغِ حکیم تھا
کیں کاوشیں تو ناخنِ تدبیر نے بہت — عقدہ نہ ایک بھی مری مشکل کا وا ہوا
غرورِ حسن کا نشہ کبھی جو رخصت دے — تو اپنے بےخبروں کی بھی کچھ خبر لینا
ثابت رہا نہ عالمِ وحشت میں پیرہن — دامن سیا جو ہم نے، گریباں نکل گیا
تن ہوا سوکھ کے کانٹا تو ہوا، کیا غم ہے! — خوش ہوں اب بھی نہ ترا گوشۂ داماں چھوٹا
کیا کہوں ہو کے گرفتار جو پایا ہے مزہ — مر ہی جاؤں گا، اگر خانۂ زنداں چھوٹا

اگر وہ نصف شب ہو جلوہ فرما ماہ تابی پر — شب تاریک میں ہو یک بیک نورِ سحر پیدا

(انتخاب یادگار: ۲۶۴)

غریب :- عزیب اللہ

شاہ آباد کے رہنے والے۔ مومن کے تلامذہ میں تھے۔ سخن شعرا میں ان کو انگریزی پلٹن کا منشی لکھا ہے۔ ان کے صرف تین شعر ملے۔

ان کو دل دے کے کوئی کیا خوش ہو! — دل ربا دلبری نہیں کرتے

خضر و عیسیٰ و جام آبِ حیات — لب سے کچھ ہمسری نہیں کرتے

سفت میں پامالِ اعدا ہو گیا تو اے غریب — ہم تو سمجھاتے تھے، کوئے دلربا میں تو نہ جا

(گلستانِ سخن: ۳۷۸؛ جلوۂ خضر: ۲۴۵؛ سخن شعرا: ۳۵۰)

غنی :- مولوی عبد الغنی ——— وفات ۱۹۰۴ء

مولوی عبدالغنی[1]، مولوی شاہ رفیع الدین کے بیٹے اور مومن کی صاحبزادی محمدی بیگم کے شوہر تھے۔ ابتدا میں غازی پور میں وکالت کرتے رہے اور بعد کو مستقل طور پر سیتاپور میں مقیم ہو گئے۔ لیکن اپنے پیشہ سے زیادہ لگاؤ نہ تھا، اس لئے کبھی کامیاب وکیل نہ بن سکے۔ جب یہ سیتاپور گئے ہیں، تو ان کی پہلی بیوی (یعنی دخترِ مومن) محمدی بیگم ان کے ساتھ تھیں۔ یہاں ان کے کئی اولادیں ہوئیں۔ محمدی بیگم نے ۱۲۹۷ھ میں وفات پائی، تو اس کے بعد مولوی صاحب نے غالباً دو شادیاں اور کیں۔

محمدی بیگم کا مزار سیتاپور میں عیدگاہ کے قبرستان میں ہے؛ قبر پر عبدالغنی کا قطعہ تاریخ نصب تھا، جس کا آخری شعر تھا۔

اے غنی مصرعِ تاریخ سرِ قبر نویس — بہ سوئے ملکِ عدم ہم نفس و ہمدم رفت

---

۱:- مولوی عبدالغنی کے بارے میں تمام تفصیلات: یادگار مومن، شائع کردہ اردو مجلس حیدرآباد کے ایک مضمون، "مومن کے پس ماندگان" از نادم سیتاپوری سے دستیاب ہوئیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اس امر میں کہ وہ مومن کے شاگرد تھے اور ان کا کوئی کلام بھی موجود نہیں جو عام طور سے تذکرے خاموش ہیں۔ البتہ یہ تعجب خیز ہے کہ نادم صاحب نے ان کے شاگرد مومن ہونے کا حوالہ نہیں دیا۔ غالباً محض ان کے مومن کا داماد ہونے سے یہ قیاس کر لیا۔

آج اسی قبر کے نزدیک خود عبدالغنی بھی مدفون ہیں :-

عبدالغنی کی سیرت کے بارے میں مولوی عبدالماجد دریا بادی اپنے ایک خط میں تحریر کرتے ہیں ۔

"مولوی عبدالغنی مرحوم کو اپنے بچپن میں بارہا دیکھا ۔ والد مرحوم (مولوی عبدالقادر صاحب ڈپٹی کلکٹر سیتاپور) سے ملنے اکثر تشریف لاتے رہتے خود بھی ایک آدھ بار ان کے یہاں جاکر دعوت کھانے کا اتفاق ہوا: اتنا ہوش اس وقت کہاں تھا کہ ان کے کلام وغیرہ کو کچھ سمجھ سکتا ۔ صرف اتنا یاد ہے کہ ان کی نیکی، خدا ترسی اور عبادت گذاری کی شہرت عام تھی ۔ قد لانبا تھا ۔ کثیر الاولاد تھے ۔ چہرے پر نورانیت تھی ۔ ضعیفی کا زمانہ شروع ہوچکا تھا ۔ ڈاڑھی کے بال کھچڑی ہو چکے تھے ۔ مرحوم کا تخمینی سال وفات ۴-۱۹۰۳ء کہہ سکتا ہوں ۔
یقیناً ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۸ء کے درمیان "

مولوی صاحب موصوف غنی تخلص کرتے تھے ۔ مومن کے شاگردوں میں تھے انھوں نے اپنا شعری میدان حمد اور نعت تک محدود رکھا ۔ ان کا ایک اردو منظوم میلاد نامہ نادم سیتاپوری صاحب کے کتابخانے میں موجود ہے ۔ ممکن ہے کہ کوئی مجموعہ غزلیات بھی ہو مگر کہیں دیکھنے یا سننے میں نہیں آیا ۔ اسی صفحات پر مشتمل یہ میلاد نامہ، ضیاء الابصار فی ولادت سید الابرار، ۱۸۷۷ء میں سیتاپور سے شائع ہوا تھا ۔

( یادگار مومن )

قلق :- مولا بخش :

حکیم مولا بخش قلق کا اصلی وطن میرٹھ تھا ۔ لیکن چونکہ تحصیل علم کا شوق تھا کسب کمال کے لئے وطن ترک کیا اور آکر دلی میں بس گئے اور یہاں مختلف علما سے اکتساب علم کیا ۔ فارسی مولوی امام بخش صہبائی سے، اور صرف ونحو اور منطق وغیرہ مولوی انتظام علی سہارنپوری سے پڑھی اور طب میں حکیم نقشبند خاں کے شاگرد ہوئے ۔

تو دیکھو قلق بہرے مراتب حکما، میں | کچھ شعر مرا فخر نہ کچھ ناز غزل

۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں جہاں اور بہت سے لوگ آوارۂ وطن ہوئے قلق کو بھی دلی؟ میرٹھ واپس جانے کے علاوہ کوئی چارہ کار نظر نہ آیا۔ پھر بقیہ عمر وہیں گزار دی۔ ۱۲۹۷ میں انتقال کیا۔ گلاب سنگھ مشتاق نے تاریخ کہی۔

"ہائے استاد من کجا رفتہ"

قلق کا کلیات ان کے چھوٹے بھائی نے مرتب کیا اس پر مقدمہ مولانا حالی نے لکھا ہے اس میں غزلیات کے علاوہ ۱۶۲ رباعیاں، ۹ مخمس ۸ قصائد۔ ایک واسوخت متعدد قطعات، ترجیع بند، ترکیب بند اور ۱۸۶ بند کا طویل مرثیہ ہے خود ان کے شاگردوں میں منشی گلاب سنگھ مشتاق مشہور ہیں۔

خدا نے طبیعت میں قناعت پسندی اور بے نیازی دی تھی، جب میرٹھ واپس آئے تو زندگی کا بقیہ حصہ طلبہ کو فارسی کا درس دیتے میں گذرا، اس سے جو قلیل آمدنی ہو جاتی اس پر توکل سے بسر اوقات کرتے رہے۔

قلق نے اکثر غزلیں مومن کی دشوار زمینوں میں لکھی کہی ہیں۔ جہاں ان سے ان کی قادر الکلامی ظاہر ہوتی ہے، وہیں۔ ......... اس رنگ شاعری نے ان کے کلام میں بے کیفی بھی پیدا کر دی۔ حسرت کی رائے میں "قوی الفاظ، رنگین ترکیب وشادابی مضمون ان کے کلام کی جان ہے۔ مومن کے کلام میں جو ترکیبیں ملتی ہیں وہ قلق کے یہاں بھی موجود ہیں۔" تو ان کی خامیوں میں بھی برابر کے شریک نظر آتے ہیں۔ مشکل پسندی غرابت الفاظ، ترکیب کی کثرت، کلیات قلق میں بھی برابر ملتی ہیں۔ یہاں تک کہ جگہ جگہ بندشوں کی کمزوری اور صحت الفاظ کی طرف سے بے توجہی تک برتی گئی ہے۔

جبین پارسا کو دیکھ کر ایمان لرزتا ہے | معاذ اللہ! کیا انجام ہے اس پارسائی کا!

نہ ہو آرزو کچھ، یہی آرزو ہے! | فقط میں ہی میں ہوں، تو پھر تو ہی تو ہے

محبت میں کہاں شرکت گوارا | اٹھائے ناز کیوں تہمت اثر کی!!

دیکھو ستم ظریفی دودِ دل وجگر کی | اک آسماں کو پھونکا، اک آسماں بنایا

فصل بہار اپنی گزری ہے یونہی ساری
یاں آشیاں بنایا، واں آشیاں بنایا

کچھ تماشا ہے، کھیل ہے، کیا ہے؟
اِک زمانے کو قتل کر بیٹھے!

پڑتی ہے آنکھ اس کی مرے حالِ زار پر
لو، میں بھی چڑھ گیا نظرِ روزگار پر

جیتے رہے ہیں مُردنِ دشوار کے لئے
مرتے رہے ہیں عمر بھر اندازِ یار پر

وہ حال میرا دیکھ کے کچھ سر خرو ہوئے
کیا جانے کیا بنی نگہِ شرمسار پر

خلش جائے تو کیا جائے کہ ظلمان اور بلائی ہے
بچایا آبلہ پائی سے میرے خارِ ماہی کو

قلق کیوں چھوڑتا دہلی کو کیوں میرٹھ میں آ رہتا
گدائی کے بھروسے لٹایا بادشاہی کو

کس کی نظر سے سیکھے انداز یہ قلق نے
اس سادہ رو کو کس نے جادو بیاں بنایا

ہے ہمیں ضبطِ قلق کا ماتم
آہ بھی اے دلِ ناچار! نہ کھینچ

ربط اے پردہ نشیں! سب سے رہا تیرے لئے
زندگی اپنی کٹی صرف اشارہ ہو کر

اقبالِ شہ کو بزم گدا سے اٹھا دیا
کتنا ہمیں بھی عجز پہ اپنے غرور تھا

موسےٰ کا کیا قصور ہے پوچھ اپنے شوق کی
وعدہ کا تیرے تجھ سے تقاضا ضرور تھا

دیرینہ رفیق تھا قلق کا، ہائے!
وہ کیا ہے مرا کہ مر گئے ہم

اور بھی اب مزاجِ دل بگڑا
وہ جو پہلو میں آن کر بیٹھے

مرثیہ کا ایک بند سنئے۔

جب صبحِ کربلا میں وہم کی ہوئی نمود!
جائے شفق فلک سے عیاں تھا ہجومِ دود

گرنا نگاہ نور سے تھا مہر کا صعود!
ہر ذرّہ خیر سے تھا خالِ رخِ ہنود

تھا نور دور مہر سے اور مہر نور سے
خود کو ٹٹولتا تھا ہر اک قرب و دُور سے

(جلوۂ خضر: ۲۴۵؛ سخن شعرا: ۳۵۰؛ اردوئے معلی حسرت موہانی جنوری ۱۹۱۱ء
گلستانِ سخن: ۳۹۸؛)

**قیصر**:- مرزا خدا بخش؛

مرزا خدا بخش قیصر شاہ عالم بادشاہ کے نواسے، اور مصنف گلستانِ سخن مرزا قادر بخش صابر کے ماموں تھے۔ خاندانِ شاہی سے تعلق کے باوجود مزاج میں انکسار اور فروتنی

تھی. مشاعرے کرنے کا خاص شوق تھا، چنانچہ جب تک ہوش و حواس قائم رہے، مشاعروں کا اہتمام کرتے رہے خاندان شاہی کا عام طور سے رجحان ذوق کی طرف تھا مگر قیصر نے اس روایت کے خلاف مومن کی شاگردی اختیار کی۔ غدر میں بچاس برس اور معمر ہو چکے تھے۔ عمر کی اس منزل میں اندیں بغاوت میں کسی قسم کی شرکت کا شبہ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، لیکن ان غریب کو بھی انگریزوں نے سازش کے جرم میں پھانسی دیدی۔

کریں گر کلفت دل کا بیاں ہم ملادیں خاک میں ہفت آسماں ہم
اس کو میں خاک ہونے کا جرچا ہے جا بجا نام اپنا جب ہوا کہ رہا، کچھ نشاں نہیں
ہوس غیر سے عشق اپنا اسے یاد آیا کیا نئی طرح سے ہم دل میں گذر کرتے ہیں
تو لطف کرے یا نہ کرے. خوش ہو کہ ناخوش اس بات پہ مرتا ہوں کہ عاشق ہوں ترا میں
جنوں میں بھی مری شوکت نہیں جاتی ہے اے قیصر جہاں جاتا ہوں ہمراہ ساتھ اب لڑکوں کا لشکر ہے
نبھیگی خاک محبت کر نام سے قیصر وہ اپنے زعم میں سمجھے ہیں مالدار مجھے

[طور کلیم: ۸۲؛ سخن شعرا: ۳۹۴؛ گلستان سخن: ۳۰۵]

کاظم :- کاظم علی۔

کاظم علی کاظم سنڈا ور ضلع بجنور کے رہنے والے مومن کے قدیم تلامذہ میں سے تھے، عام طور پر ان کے حالات تذکروں میں نہیں ملتے۔ نہ کچھ کلام ہی دستیاب ہوتا ہے

اے طفل اشک! ہم تجھے آنکھوں میں کیوں رکھیں اور تو ہمارے راز کو لوں پر ملا کرے
شبنم رخ گل پر نہیں کاظم! یہ سحر کو پھوٹا ہے کوئی پائے عنادل کا پھپھولا

[بزم سخن: ۹۸؛ جلوۂ خضر ۱: ۲۴۵؛ حیات مومن: ۷۷؛ گلستان سخن: ۳۰۶]

کرم :- غلام ضامن۔

اگرچہ بعض لوگوں نے انھیں دہلوی اور گوپا موی لکھا ہے، لیکن دراصل یہ کوتانہ کے رہنے والے تھے اور مستقل سکونت دلی میں اختیار کر لی تھی، حیدر آباد میں بھی طویل زمانہ تک رہے، اردو فارسی دونوں زبانوں میں کلام کہتے اور مومن سے مشورہ کرتے تھے مسائل نظم

پر پوری قدرت حاصل تھی۔ طبیعت میں بہت ظرافت اور مزاح تھا، جو آخر عمر تک قائم رہا۔ بڑی لمبی عمر پائی۔ بھوپال میں انتقال ہوا۔

فرہاد و قیس عشق میں سرگرم لاف تھے
خاموش ہو گئے جو مرا نام آگیا

نام کب آسودہ جاں لیں نالہ ہائے زار کا
مرمرِ آواز ہے سایہ تری دیوار کا

اے طفلِ اشک ! دیکھ کے برباد کیجیو
ہر پارۂ جگر ورق انتخاب ہے

گر وہاں بیٹھوں، تو اٹھے وہ میری تعظیم کو
خوف ہے شاید کہ صحبت کا اثر ہونے لگے

وائے قسمت اور اخفا ہی ہوا افشائے راز
رو کتے ہی اشک کے لختِ جگر آنے لگے

اس کو شہرت کی تمنا، مجھے رسوائی کی
ہر کوئی آرزوئے نشو و نما رکھتا ہے

کیا ہی برہم ہوئی زلف اس نے جو پوچھا مجھ سے
اے کرم ! کس نے کیا حال پریشاں ترا

میرا نشو و نما ہے اس خرام لاابالی سے
غبار ناتواں کو سرکشی ہے پائمالی سے

نسبت ہے مرے داغ سے کیا عندلیب کو
گو آہ سرد و بادِ سحر دونوں ایک ہیں!

(جلوۂ خضر: ۲۴۵؛ طبقات الشعرائے ہند: ۳۸۱؛ گلشن بیخار: ۱۷۱؛ سخن شعرا: ۳۹۷؛ گلستان بیخزاں: ۱۹۶؛ بزم سخن: ۹۸؛ خوش معرکۂ زیبا (قلمی): ۱۲۲۰۰؛ طور کلیم: ۸۲؛ نگار (۱۹۲۸) مومن نمبر)

**مسکین:۔ سید عبدالواحد خاں ـــــ وفات: ۱۲۷۱ھ**

سخن شعرا میں انھیں خیر آبادی لکھا ہے اور آثار الشعرا میں اختیاراً اکبر آبادی بتایا گیا ہے۔ وطن چھوڑ کر انھوں نے دہلی میں قیام کیا اور مومن خاں کی شاگردوں میں شامل ہو گئے۔ آخر کار بھوپال چلے گئے۔ وہیں ۱۲۷۱ھ میں انتقال ہوا اور تکیہ دلاوا شاہ واقع سواد بھوپال میں دفن ہوئے۔ نساخ نے لکھا ہے کہ انھوں نے ایک دیوان اور ایک مثنوی چشمۂ شیریں یادگار چھوڑی۔ اب صرف یہ چند شعر دستیاب ہوتے ہیں۔

کیوں نہ اٹھنا بیٹھنا مشکل ہو اس رنجور کا
جس کو از خود رفتگی سے اک سفر ہے دور کا

لے گئی چھین کے دل ساقی سرشار کی آنکھ
آگئی دیکھ جسے نرگس بیمار کی آنکھ

سر بسر لاتی ہے میری جان پر لاکھوں وبال
خواب میں بھی اس کی گر زلف پریشاں دیکھیے

[طبقات الشعرا: ۳۵۵؛ گلشن بیخار: ۱۷۰؛ سخن شعرا: ۴۳۳؛ آثار الشعرا: ۲۰۶
خوش معرکۂ زیبا (قلمی): ۱۳۲۰۰]

**مضطر:- مرزا سنگین بیگ،**

مرزا سنگین بیگ، دہلی کے باشندے اور خاندان تیموریہ کے چشم و چراغ تھے۔ شیفتہ نے ان کی ذہانت اور خوش اختلاطی کی تعریف کی ہے

مضطر کے کبھی خون کا دعوی نہ کرینگے	تھا خود وہ تڑپنے سے خجالت زدہ، ہم تو
میں تو خوش تھا کہ کفن میں بھی گریباں ہے	کیا کیا دست جنوں! یہ تری بیجانی نے

[جلوۂ خضر: ۲۴۵؛ طبقات الشعرائے ہند: ۳۸۶؛ گلشن بیخار: ۱۸۲؛
سخن شعرا: ۴۴۳؛ گلستان سخن: ۴۲۸]

**ملال:- محمد حسین زیدی —— وفات: ۱۳۲۰ھ**

سید محمد حسین زیدی نام ملال تخلص۔ درسیہ کتب اپنے والد سید فیاض علی سے پڑھیں اور حدیث کا درس اس زمانے کے مشہور محدث مولوی نذیر حسین صاحب سے لیا جب خاندان درد سے تعلق پیدا ہوا، تو سلوک مجددیہ نقشبندیہ کو اپنے خسر میر امام الدین ناصری سے حاصل کیا۔ خط نستعلیق کا فن اپنے والد اور والد کے استاد میر پنجہ کش سے سیکھا۔ فن موسیقی میں اس زمانے کے مشہور استاد میر ناصر احمد کی شاگردی اختیار کی اور اس میں وہ ملکہ بہم پہنچایا کہ اس زمانے کے مشہور بین بجانے والے گنے جاتے فارسی اور اردو میں شعر کہتے تھے۔ فارسی کلام اپنے والد ماجد سید فیاض علی کو اور اردو کلام حکیم مومن خاں کو دکھاتے۔ خواجہ میر درد کی رعایت سے اپنا تخلص ملال رکھا۔ غدر سے قبل دو دیوان (فارسی اور اردو) کے مرتب کئے تھے، جو غدر کے ہنگامے میں برباد ہو گئے۔ اس کے بعد شعر گوئی ترک کر دی۔ اگر کوئی اصرار کرتا تو کہتے کہ "شعر و شاعری کا لطف لال قلعہ اور شہر کی آبادی کے ساتھ گیا۔ کہاں جا کر غزل پڑھیں اور کسے سنائیں؟" آخر یکم رجب ۱۳۲۰ھ میں رحلت فرمائی۔

[بیت لذۂ درد: ۲۳۰ تا ۲۳۲]

## موجد: حشمت علی خاں ـــــ ولادت: ۱۲۵۰ھ

حشمت علی خاں ولد محمد سعادت علی خاں ریاست رامپور میں عہدہ ہائے جلیلہ پر فائز رہے۔ انتخاب یادگار کے وقت ان کی عمر چالیس برس کی تھی جس سے ظاہر ہے کہ ولادت ۱۲۵۰ھ میں ہوئی ہوگی۔ بقول امیر مینائی "مرد خوش رو اور جوان خوش خو ہیں۔ مذاق عاشقانہ ہے۔ ہر مضمون یگانہ ہے۔" نمونہ کلام یہ ہے۔ بہار کی صفت میں لکھتے ہیں۔

ہے اب کے سال یہ فصل بہار عالم پر — کہ خود بخود ہے نواسنج بلبل تصویر
ہر اک روش روش کہکشاں ہے رونق خیز — ہر اک چمن چمن باغ خلد کی ہے نظیر

رسول اکرم ؐ کی شان میں لکھتے ہیں:-

خدا نے بخشی ہے در کو اسی کے یہ تاثیر — کہ خاک وہاں سے اٹھا لیجئے، تو ہو اکسیر
کہاں یہ علم، کہاں یہ فصاحت تقریر — کہ نظم سحر ہے اس کی تو نثر ہے تسخیر

غزل کے اشعار ہیں:-

کل تو حیلہ حنا کا ہاتھ آیا — عذر آنے میں آج کیا ہوگا
ہائے بیترے مریض کا کہنا — اب وہ آئیں گے بھی تو کیا ہوگا
کبھی کہتے ہیں، عبث جان گئی موجد کی — کبھی کہتے ہیں، مرا ناز اٹھایا نہ گیا
ان کے چلمن میں لگائیں، ہائے خس کی تیلیاں — کیوں نہ بنوائیں مری تار نفس کی تیلیاں
ولولوں کی یہ ترقی، یہ ہجوم خواہش — اک بوسہ پہ ہو کس طرح قناعت مجھ کو
اپنی الفت پہ ناز ہے ہم کو — کہ انھیں بھی وفا کئے ہی بنی
ہوا یہ حوصلہ موجد کو بھی، خدا کی شان — گئے ہیں آج وہاں عرض مدعا کے لئے
کہاں میں، اور کہاں ترک محبت — نصیحت کی بھی ناصح نے، تو کیا کی!
چشم تر کا بھی ہو رہے گا علاج — پہلے کر فکر چارہ جو دل کی
بے پردہ وہ بیٹھے ہیں، اٹھوائے ہوئے چلمن — اے حسرت دیدار! کچھ اس کی بھی خبر ہے
اتنی بھی دعا میں مرے تاثیر ہوئی یارب! — جتنا کہ ہر اک بات میں دشمن کی اثر ہے

(انتخاب یادگار: ۳۶۷)

**ناظم**:- نواب یوسف علی خاں ـــــ ولادت ۱۸۱۴ء ـــ وفات ۱۸۶۵ء
شعروادب کے سلسلہ میں جو خدمات رامپور کی ہیں، وہ کم ریاستوں کے حصے میں آئی ہیں، شعروادب کی ترقی میں خود والیان ریاست نے جو حصہ لیا، وہ بھی شاید ہی کسی اور ریاست کو میسّر ہوا ہو۔ خاندان شاہی (ریاست) کے متعدد افراد شاعر اور اساتذۂ وقت کے شاگرد ہوئے۔ اس سلسلے کی اہم کڑی نواب یوسف علی خاں ناظم ہیں، جو شعر کہنے کے علاوہ "نکتہ داں، نکتہ سنج، نکتہ شناس" بھی تھے۔ انھوں نے شعرا اور ادبا کی سرپرستی کی۔ غدر کے ہنگاموں میں جب لکھنؤ اور دلی کی بساط الٹ گئی، تو رامپور میں اہل علم وفضل کا وہ اجتماع ہوگیا، کہ ایک دفعہ پھر دلّی کی فضا رامپور میں پیدا ہوگئی۔ یہاں دلی اور لکھنو کے ارباب علم وفن مدتوں دادِ کمال دیتے رہے۔

نواب یوسف علی خاں ۱۲۳۰ھ مطابق ۱۸۱۴ء میں پیدا ہوئے اور اپنے والد نواب محمد سعید خاں کے انتقال کے بعد ۱۲۷۱ھ میں جلوس کیا۔ انھیں کے زمانے میں ۱۸۵۷ء کا مشہور ہنگامہ پیش آیا۔ اس زمانہ میں انھوں نے ہر طرح سے انگریزوں کی حمایت کی اس سے انھیں سرکار انگلشیہ میں خاص رسوخ حاصل ہوگیا جب دوبارہ امن وامان قائم ہوا۔ تو سرکار انگریزی نے انھیں صلۂ خیر خواہی میں ایک لاکھ روپے کی مزید جاگیر اور ستارۂ ہند کے خطاب سے سرفراز کیا۔

ناظم کو علوم وفنون سے خاص رغبت تھی۔ ہمیشہ کاملوں اور عالموں سے صحبت رہتی۔ علوم عقلیہ اور نقلیہ، منطق وحکمت میں خاصی دستگاہ تھی، ان کے استادوں میں مولانا فضل حق خیرآبادی، مولانا صدر الدین آزردہ۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب۔ اور ملا غیاث الدین (مؤلف غیاث اللغات) تھے، مردانہ صفات کا نمونہ، اور بہت خوبصورت جوان تھے۔ پستول کا نشانہ بہت اچھا لگاتے تھے۔

ناظم کی شاگردی کے سلسلہ میں نہایت دلچسپ قسم کے اختلافات ملتے ہیں۔ مثلاً
٭ مولانا امتیاز علی خاں عرشی کا خیال ہے کہ ناظم صرف غالب اور اسیر کے شاگرد تھے، وہ اپنے دعوے کی دلیل میں ناظم کا خط جو انھوں نے مرزا غالب کو لکھا تھا پیش

کرتے ہیں۔ یہ خط "مکاتیب غالب" مرتبہ عرشی میں موجود ہے۔ ۵ر فروری ۱۸۵۷ء کو غالب کو لکھتے ہیں :-

"مشفقا! ہر چند کہ کاتب را اتفاقِ موزونیت یک مصرعہ ہم نشدہ بود، لیکن محض بجہت ساعتِ کلام سامی زبانی مولوی صاحب صدر الوصف دلم خواست کہ طریقۂ رسل و رسائل جاری شود۔ چوں بسیلے بہ ازیں بنظرم نرسید۔ لہٰذا چند ابیات واہیات موزوں نمودہ۔ بہ قصد اصلاح پیش آں یگانۂ آفاق مرسل گشت، چشم داشت کہ بعد اصلاح غزلہائے مذکور مع کدام طرح جدید لطف فرمودہ شوند"

(مکاتیب غالب : ۳)

امیر مینائی کا قول اس کے خلاف ہے وہ لکھتے ہیں :-

"سخن گوئی کا ذوق، اردو شعر فرمانے کا شوق تھا۔ پہلے مومن خاں صاحب سے مشورہ رہا، پھر میرزا اسد اللہ خاں غالب سے تلمذ ہوا۔ آخر بوضع استادانِ لکھنو موزوں فرمانے لگے، منشی مظفر علی صاحب کو کہ آج لکھنؤ میں سحبان عصر، یکتائے دہر ہیں، کلام دکھانے لگے۔

(انتخاب یادگار : ۱۷)

یہ دونوں بیان ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔ ناظم کا یہ کہنا کہ "ہر چند کہ کاتب را اتفاقِ موزونیت یک مصرعہ ہم نشدہ بود" اور امیر مینائی کا یہ بیان کہ "پہلے مومن خاں صاحب سے مشورہ رہا" اشتباہ میں ڈالتے ہیں۔ ناظم کے شاگردِ مومن نہ ہونے کی تائید میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ناظم نے شاگردِ غالب ہونے کا ذکر تو اپنے کلام میں کیا ہے، مگر مومن کا ذکر نہیں کیا، لیکن راقم کے نزدیک یہ درست نہیں معلوم ہوتا ہے۔ وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ امیر مینائی خود اس زمانے میں موجود ہیں، جو زمانہ نواب یوسف علی خاں کا ہے اور وہ ایک ثقہ اور معتبر آدمی ہیں۔ تذکروں کے سلسلہ میں ان کے انتخابِ یادگار کو مستند خیال کیا جاتا ہے۔

۱۸۵۷ء میں غالب کے شاگرد ہوتے ہیں۔ اور اس کے چار سال بعد ۱۸۶۱ء میں ان کا دیوان غالب کی اصلاح کے ساتھ شائع ہوتا ہے۔ اس چار سال میں ایک دیوان کا مکمل ہو جانا اور پھر انداز بیان میں کافی حد تک پختگی کا ہونا ذہن میں دو سوال پیدا کرتا ہے۔ اول یہ کہ یا تو وہ کلام ناظم کا نہیں، بلکہ غالب نے ان کو دے دیا مگر اس شبہ کا بطلان اس بات سے ہوتا ہے کہ کتب خانہ رام پور میں غالب کا اصلاح شدہ دیوان ناظم موجود ہے اور جو اشعار مرزا کو پسند آئے ہیں ان پر نشان (م) بنا ہوا ہے پھر دوسرا سوال رہ جاتا ہے کہ اس قلیل مدت میں اتنا وافر ذخیرہ کیونکر تیار ہو گیا۔ اس کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ وہ غالب کے تلمذ سے پیشتر بھی شعر کہتے تھے۔ اور ان کا یہ فقرہ کہ میں نے پہلے کبھی ایک مصرعہ تک موزوں نہیں کیا، محض انکسار پر مبنی تھا۔"

۳۔ غالب مرزا غوث بے خبر کو ۱۸۶۰ء میں لکھتے ہیں "۱۸۵۵ء میں نواب یوسف علی خاں بہادر والی رام پور کہ میرے آشنائے قدیم ہیں، اس سال (یعنی ۱۸۵۵ء میں) میرے شاگرد ہوئے۔ ناظم ان کو تخلص دیا گیا۔ بیس پچیس غزلیں اردو کی بھیجے ہیں۔ میں اصلاح دے کر بھیج دیتا ہوں (اردوئے معلیٰ: ۵۴۶)

اس خط سے اندازہ یہ ہوتا ہے کہ ناظم کے پاس پہلے سے غزلیں موجود ہیں اور "مصرعہ موزوں" نہ کرنے کی بات محض "انداز بیان" پر محمول کی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ ۱۸۵۷ء اور ۱۸۵۵ء کا تضاد بھی ملحوظ رہے۔

ہماری اوپر کی بحث سے یہ ثابت ہو گیا کہ ناظم پہلے سے شعر کہتے تھے اب اس دعوے کو امیر مینائی کے قول کی روشنی میں پرکھئے۔

"پہلے مومن خاں سے مشورہ رہا، پھر مرزا اسد اللہ خاں غالب سے تلمذ ہوا۔"

میر مینائی کے علاوہ گل رعنا اور تاریخ ادب اردو نے بھی ناظم کو مومن کا شاگرد تسلیم

کیا ہے اگرچہ مولانا عرشی نے ان کو صرف غالب اور اسیر کا شاگرد مانا ہے۔ ناظم نے غالب کی شاگردی کا اعتراف اپنے اکثر اشعار میں کیا ہے۔

ناظم ہیں تتبع غالبؔ پہ ناز ہے !! ۔۔۔ ہوگا کسی کو پیروی میر پر گھمنڈ

کیوں نہ غالبؔ کے ہوں اشراق کا قائل ناظمؔ ۔۔۔ دوسرے جس نے سکھایا۔ مجھے ایسا کہنا

ناظمؔ کا دیوان پہلی مرتبہ ۱۲۷۸ھ میں غالب کی اصلاح کے بعد شائع ہوا۔ اس کے بعد دوسرے ایڈیشن میں اسیر کا دیکھا ہوا کلام بھی شامل کر دیا گیا۔

ناظم کے کلام میں لطیف استعارے، رنگین تشبیہیں اور نازک خیالات ہیں غالبؔ اور اسیر کی اصلاح نے اور چار چاند لگا دیئے۔ ناظم کے کلام پر غالبؔ کا رنگ نمایاں ہے، مگر زیادہ چھاپ لکھنؤ کی معلوم ہوتی ہے

ناظمؔ کا انتقال مرض سرطان سے ۱۸۶۵ء میں ہوا۔ امیر مینائی نے تاریخ نکالی۔

ع :- مسند آرائے جناں شد یوسفِ دورانِ من

نمونہ کلام یہ ہے :-

غصہ میں کہا ہوگا کہ ہم کچھ نہ کہینگے ۔۔۔ گر آپ سنینگے تو میں سو بار کہونگا

میں نے کہا کہ دعویٰ الفت، مگر غلط ۔۔۔ کہنے لگے کہ ہاں غلط اور کس قدر غلط

ہاں، سینہ سے نمائش داغِ دروں، دروغ ۔۔۔ ہاں، آنکھ سے تراوشِ خونِ جگر، غلط

سوزِ جگر سے ہونٹ پہ تبخالہ، افترا ۔۔۔ شورِ فغاں سے جنبش دیوار و در، غلط

ہے یہ ساقی کی کرامت کہ نہیں جام کے پاؤں ۔۔۔ اور پھر بزم میں سب نے اسے چلتا دیکھا

واعظ و شیخ بھی خوب ہیں، کیا بتلاؤں ۔۔۔ میں نے میخانہ سے کس کس کو نکلتے دیکھا

کیوں آکے کہو در پہ کہ، وہ گھر میں نہیں ہیں ۔۔۔ کیا ہم نہیں پہچانتے سرکار کی آواز

، گھر وہ آئے ناظمؔ! تو یہ اضطراب کیا ہے ۔۔۔ کوئی بادشاہ آیا، کوئی شہریار آیا

، ہو کہ ہم غیر کو آنے نہیں دیتے ۔۔۔ سچ ہو یہی، پر میں نے سنا اور ہی کچھ ہے

ں تم ہو وہی خنجر ہے پر انصاف کرو ۔۔۔ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے ہو کیا میرے بعد

(انتخاب یادگار: ۷۰؛ اخبار الصنادید: ۴۲۴؛ تلامذہ غالب: ۲۷۱؛ مکاتب غالب (مرتبہ مولانا عرشی رامپوری) مقدمہ صفحہ ۴۳)

بیاضِ سخن ؛ گلِ رعنا: ۳۱۳ ؛ بزمِ سخن: ۱۱۱؛ مکاتیبِ غالب (دیباچہ)۷۲؛
تاریخ ادب اردو ۴۱۱ ]

**نسیم، اصغر علی خاں ـــــ ولادت ۱۷۹۹ء ـــــ وفات ۱۴ رمضان ۱۲۸۲ھ**

اصغر علی خاں نام تھا اور نسیم تخلص۔ ان کی ولادت دہلی میں ۱۷۹۹ء میں ہوئی۔ نسیم کے والد کا نام نواب آقا علی خاں تھا اور ان کا شمار دہلی کے رؤساء میں ہوتا تھا۔ والد کے انتقال کے بعد بھائیوں سے نا اتفاقی ہوگئی اور نسیم نے دہلی سے لکھنو کا رخ کیا اور پھر وہیں کے ہوکر رہ گئے۔ نسیم نے تعلیم و تربیت دلی میں پائی۔ اور جب شعر کہنے لگے تو حکیم مومن خاں کے شاگرد ہوئے اور اصغر تخلص رکھا، بعد کو اسے بدل کر نسیم اختیار کیا۔ اپنے دہلی کے قیام کے زمانے میں، بہت خوشحالی اور فراغت سے گزاری تھی، لیکن جب لکھنو آئے تو کافی عسرت کا سامنا کرنا پڑا، اس پر بھی خودداری اور غیرت کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ حسرت موہانی سے روایت ہے کہ نسیم اکثر احباب کے ساتھ چوک کی طرف سے گذرا کرتے تھے۔ ایک دن خلاف معمول راستہ گلیوں میں سے اختیار کیا۔ لوگوں نے اس کا سبب دریافت کیا، تو بڑے اصرار کے بعد بتایا کہ میری جیب کئی روز سے خالی ہے۔ خیال ہوا کہ اگر چوک کی طرف سے گذرا اور کسی ضرورت مند نے دست سوال دراز کیا، تو میں کیا جواب دونگا۔

بھائیوں کو ان کے لکھنؤ جانے کے بعد اپنی غلطی کا احساس ہوا، تو معذرت کے ساتھ پانچ سو روپیہ روانہ کیا کہ واپس آجائیں۔ مگر جو قدم ایک دفعہ اٹھ چکے تھے، واپس نہ آئے اور قاصد روپیہ کے ساتھ بے نیل مرام واپس آیا۔

نسیم نے عربی اور فارسی کا بہت اچھا مطالعہ کیا تھا خوش نویسی کے ماہر تھے۔ وہ بہت وسیع المطالعہ اور وسیع النظر تھے مشہور ہے کہ مومن کے پاس ایک بیاض تھی جس میں عروض کے اقتباسات اور اپنی شاعری کے متعلق بڑے نکات درج تھے۔ ایک مرتبہ موقع پاکر نسیم نے وہ بیاض چوری سے نقل کی مومن خاں سے معذرت کرلی۔ امیر اللہ تسلیم نے بارہا درخواست

مومن کا شاگرد تسلیم

دیکھنے کی اجازت دے دی جائے، مگر ہمیشہ یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اول لیاقت پیدا پیدا کرلو، پھر یہ تمہارے لئے ہے۔

کسی گلدستہ میں غالب نے ان کی ایک غزل پڑھ کر منشی نول کشور سے ان کے حالات اور کلام منگوایا۔ جب یہ معلوم ہوا کہ نسیم دہلوی ہیں تو لکھتے ہیں: "کہربا جستم و عقیق یافتم"

نسیم مومن خاں کے ان شاگردوں میں سے ہیں، جن سے ان کا سلسلۂ شاعری آگے چلا۔ وہ اگرچہ لکھنو چلے گئے تھے اور وہاں کی محفلوں اور مشاعروں میں شریک ہوتے تھے، لیکن انھوں نے رنگ دہلی کو ہمیشہ قائم رکھا۔ انشاء و جرأت نے لکھنؤ کی فضا میں پہنچ کر اپنا رنگ شاعری تبدیل کر لیا لیکن یہ امتیاز نسیم کو حاصل ہے کہ انھوں نے لکھنؤ میں رہ کر دہلویت کی آن برقرار رکھی۔ اہل لکھنو اور اہل دہلی سے ہمیشہ معاصرانہ چشمک رہی ہے۔ اس کے باوجود لکھنؤ کے متعدد شاعروں نے نسیم کے لکھنو کے پہنچنے پر ان کے سامنے زانوے شاگردی تہ کیا۔ ان کے تلامذہ کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ حسرت موہانی ان کی شاعری کے متعلق لکھتے ہیں۔

> "دلفریبی خیال اور رنگینیِ بیان، شاعری کے دو خاص جوہر نسیم کو مؤمن خاں سے بحیثیت میراثِ استاد حاصل ہوئے تھے جن کو انھوں نے باضافۂ تجدید زبان خوب سے خوب تر بنا کر دنیائے شاعری میں اس آن بان کے ساتھ پیش کیا کہ لکھنوی لفظ پرستوں نے بھی داد دی اور اظہار پسندیدگی سے نہ رہ سکے۔ لکھنؤ کے بیان اور دہلی کی زبان کی پسندیدہ اور معتدل ترکیب کا جیسا جلوہ مرزا نسیم کی شاعری میں نظر آتا ہے، اس کی مثال کسی دوسرے شاعر کے کلام میں نہیں مل سکتی"

ٹھہرو۔ ہو کر ہم گئے ... منشی نول کشور نے الف لیلہ نظم کرنے کی خدمت ان کے سپرد کی۔ یہ کام ابھی ادھورا تمام ہو ... موصوف کی طرف سے اسے جلد مکمل کرنے پر اصرار ہوا۔ نسیم کو یہ (انتخاب یادگار) ... وہ اس خدمت سے دست بردار ہو گئے۔ اس کے بعد بقیہ مکاتب غالب (مرتبہ مولا...)

کتاب منشی طوطا رام شایاں نے پوری کی۔ شایاں نے اس کی نشاندہی کی ہے:۔

لکھا یاں تک نسیم دہلوی نے　　لکھا ہے یاں سے طوطا رام جی نے

نسیم کی طبیعت میں آشفتہ سری اور لاابالیانہ انداز بہت تھا۔ جو کچھ لکھا اس کی نقل کبھی پاس نہیں رکھی۔ اس سے ان کا معتدبہ کلام تلف ہو گیا۔ شاگردوں نے ان کا کلام جمع کر کے ان کو دکھایا تو کمزور شعروں پر خارج کرنے کے لئے نشان بنا دیا؛ آخر میں جب دیکھا تو پورے دیوان پر نشان تنسیخ (×) بن چکا تھا۔ شاگردوں کو خیال ہوا کہ اگر ان پر چھوڑا گیا تو دیوان کبھی شائع نہیں ہوگا۔ اس لئے اسے جوں کا توں شائع کرا دیا۔ الف لیلہ کا جو منظوم ترجمہ کیا تھا اس کا نمونہ یہ ہے۔

سنبھل ساقی کہ وقت اب اور آیا　　رہوں بیہوش، پھر وہ دور آیا
مزا رکھتا نہیں بے کیف جینا　　تمنا ہے کہ برسے ابرِ مینا
ہر اک قطرہ لہو بن بن کے ٹپکے　　مرے دامن سے نے چھن چھن کے ٹپکے
طبیعت صورتِ نے جوش میں ہے　　تمنائے بزم نوشا نوش میں ہے،
نظر آئے کنارِ جامِ گلگوں　　لب شاعر سے ٹپکے لطفِ مضموں
وفورِ شوق وقفِ گفتگو ہو　　سخن افسانہ ریزِ آرزو ہو
گلے مل مل کے لفظوں سے معانی　　دکھائیں گفتگو کی نوجوانی
طبیعت محو ہو عرضِ سخن میں　　فسانہ یوں بیاں ہو انجمن میں

غزل کا رنگ یہ ہے:۔

بہت مشکل ہے رہنا پاکدامن لوث دنیا سے　　الجھ کر رہ گیا جو اس وادیِ پرخار میں آیا
کہے دیتی ہیں کفنیں یہ نیچی نگاہیں　　کہ بالائے زمیں کیا کیا نہ ہوگا
نام سنتے ہی مرا شرما گئے　　تم نے تو خود آپ کو رسوا کیا
آنکھوں میں ہے لحاظ تبسم فزا ہیں لب　　شکر خدا کہ آج جو کچھ راہ پر ہیں آپ
شوقِ شراب و خواہشِ جام و سبو نہیں　　ہے سب حرام جب سے کہ پہلو میں تو نہیں

ہوئی تھی صلح کس مشکل سے پھر جھگڑا نکل آیا  گلے میں بخت کے ان کا بھی کچھ قصہ نکل آیا

[جلوہ خضر: ۲۶۵؛ گل رعنا: ۳۸۹؛ آب حیات: ۴۱۵؛ بیاض سخن؛ سخن شعرا: ۵۱۰؛
دلی کا دبستان شاعری: ۲۶۲؛ بہار بیخزاں (قلمی)؛ بزم سخن: ۱۱۲؛ لکھنؤ کا
دبستان شاعری: ۳۶۰؛ خوش معرکۂ زیبا (قلمی)؛ طور کلیم: ۱۱۶]

وحشت :۔ غلام علی خاں۔

سید غلام علی خاں تخلص وحشت، خلف میر وحت اللہ خاں رئیس شاہجہاں آباد مراد آباد کے رہنے والے تھے مگر ان کی نشو و نما بنارس اور مرزا پور اور دہلی میں ہوئی۔ عربی فارسی کی تحصیل کے ساتھ ساتھ انگریزی تعلیم بھی حاصل کی۔ اسی لئے بلند شہر میں ایک ممتاز عہدے پر فائز ہوئے۔

حالی نے لکھا ہے کہ جب وحشت مومن کے مرنے کے بعد غالب سے ملنے جاتے تو غالب ان سے لپٹ کر کہتے کہ بھئی وحشت! زندگی سے وحشت ہو رہی ہے اب وقت ہے۔ غالب کے اس شعر

وحشت و شیفتہ اب مرثیہ کہویں شاید
مر گیا غالب آشفتہ نوا کہتے ہیں

میں وحشت یہی سید غلام علی خاں مراد ہیں۔ اسی سے ان کے پایۂ شاعری کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ شیفتہ نے بھی ان کے کلام اور فن کی بہت ستایش کی ہے۔ ان کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

آیتیں حرمتِ صہبا کی سناتا ہوں اسے  ذکر سن سن کے رقیبوں کی مے آشامی کا
سارے عالم سے صفائی ہوئی اپنی، وحشت!  کیا مکدر کہیں وہ آئینہ رخسار کا ہوا
میرے مرنے کی خبر غیر کو یوں دیتے ہیں  مر گیا وحشت جانباز، تری جان سے دور
مجھ کو کثرت نے گناہوں کے بچایا کہ وہاں  ایسے مجرم کی مقرر کوئی تعزیر نہیں
بے تکلف آئے وہ، بہر تماشا، وقتِ نزع  کام آساں ہو گیا یاں مردن دشوار سے
ناز و شوخی دیکھنا، کرتا ہے صرفِ بزم سوگ  وہ ستمگر لے کے میرا خون بہا اغیار سے

کیوں نہ باطل سمجھوں اقرارِ وفا
سحر ٹپکے ہے تری گفتار سے

اے دل آسان نہیں جورِ اٹھانے اسکے
نوجواں یار ہے، وہ کچھ فلکِ پیر نہیں

جو نہ جاتا ہو کہیں کوچۂ جاناں کے سوا
ایسے دیوانے کو کچھ حاجتِ زنجیر نہیں

دل میں عدو کے بڑھ گئی کیا الفت آپ کی
کچھ ان دنوں میں پہلے سے لطف و کرم نہیں

سن سن کے مجھ سے شکوۂ لطفِ عدو کہا
ان کو تو کچھ بھی رشکِ جفا و ستم نہیں

ناصح یہی تو عین محبت کی بات ہے
ان کو جو میرے مرنے کا ہجراں میں غم نہیں

پھرے وحشت مرے دن، پھر کے جو دیکھا اسنے
گردشِ چشم ہوئی گردشِ دوراں مجھ کو

سوگند ہے اس کی خفامت ہو بینگے
گالی سے ان لبوں سے جو آیا مزا مجھے

گزرا اس اعتمادِ محبت سے میں خدا
مجھ سے چھپائیں کاش وہ الفت رقیب کی

کہیں موردِ جفائے یار کے ہم ہوں تب اسکے
مر سے جانے کا اغیار کو اس واسطے غم ہے

اس پائے حنائی پر رکھتا ہوں جو میں سر کو
کس ناز سے وہ ہنسکر کہتا ہے کہ، بس سر کو

کتنا کا ہے منزلوں کا، یا پیام یاس لاتا ہے
الٰہی خیر کیجو، نامہ بر کچھ سست آتا ہے

ہے گرفتاری سے مری سارے عالم کی نجات
شورِ نالہ سے مرے ہر شخص شب بیدار ہے

[ جلوۂ خضر: ۲۴۵؛ گلشن بیخار: ۲۳۴؛ طبقات الشعرائے ہند: ۴۵۰؛ سخن شعرا: ۵۴۱؛ تذکرہ خوش معرکۂ زیبا (قلمی): ۱۱۲؛ بہار بےخزاں (قلمی): ۱۶۶؛ گلستان بےخزاں: ۲۷۹؛ بزمِ سخن: ۱۱۸؛ گلستانِ سخن: ۴۷۱؛ طور کلیم: ۱۲۵؛ ]

وزیر :- وزیر علی خاں        وفات ۱۸۸۶ء

قطب الدین باطن نے ان کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے :-

وزیر علی خاں خلف کپتان حسن علی خاں رام پور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی زندگی میں دہلی گئے اور وہاں، مومن کے شاگرد ہوئے۔ پھر واپس وطن (رام پور) آئے۔ نواب یوسف علی خاں ناظم کے عہد میں ملازم سرکار رہو گئے۔ ۱۸۸۶ء میں ۴۲ سال کی عمر میں وفات پائی۔ دیوان ترتیب نہیں پایا۔

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:-

## نعت

اب درِ حضرت سے شفا ہوتی ہے اس کو — جس دردکی عیسیٰ سے دوا بن نہیں پڑتی

## رباعی

شیشہ میں نہیں شراب، مدّت گذری — میخانہ ہوا خراب، مدّت گذری
توبہ کے عوض وذیبو توڑا دل کو — ساقی کو دیا جواب، مدّت گذری

●

رمان نکال لوں دلِ فرقت نصیب کا — دو دن کو دے خدا جو مقدر رقیب کا
لے گئے رخ دکھا کے تاب و تواں — لٹ گیا دن کو قافلہ دل کا
وہ آئیں نعش پہ، ہم جیب پڑے ہوں منہ ڈھانکے
اجل نے ہم کو بہت ان سے شرمسار کیا
بیٹھ کر پاس میرے جب وہ اٹھا شوخی سے — بیقراری سے کئی بار میں بیٹھا اٹھا
ایک صلاح غیر پر لاکھوں ستم — پوچھنا تھا اور بھی دو چار سے

[ یادگار انتخاب: ۳۹۳؛ گلستان بےخزاں: ۲۸۰ ]

### وحشی:۔ نواب عمر علی خاں

ان کے بارے میں تفصیلات نہیں ملتیں، البتہ ستارۂ ہند میں ان کا ذکر موجود ہے۔ یہ مؤمن کے شاگرد تھے۔ انھوں نے ۱۲۸۹ھ میں انوار سہیلی کا ملخص اردو ترجمہ کیا تھا۔ اس کے سببِ تالیف میں لکھتے ہیں۔

> "اہلِ مذاق کے نزدیک میر امّن دہلوی کی چار درویش کی زبان جن کو بکثرت صرف زبان دانی کے خیال سے پڑھتے ہیں، اکثر جگہ متروک سمجھی گئی ہے۔"

[ ستارۂ ہند (مطبع محب کشور ہند میرٹھ) ۱۸۷۲ء ]

### س:۔ حکیم خیر الدین

ہم خیر الدین دہلی کے باشندے، پیشہ طبابت کرتے تھے۔ ان کا نام تقریباً ہر تذکرے

میں ملتا ہے، لیکن تفصیلی حالات کہیں نہیں ہیں۔ مومن کے علاوہ ذوق سے بھی مشورہ کرتے رہے۔ ممکن ہے، یہ مومن کی وفات (۱۸۵۲ء) کے بعد کیا ہوا۔
کلام کا نمونہ یہ ہے۔ کسی تذکرے میں ان کے دیوان یا مجموعۂ اشعار کا ذکر نہیں ملتا۔

ہوں وہ ثابت رہِ الفت میں کہ جوں نقشِ قدم
جب تلک سٹ نہیں لیتا، نہیں اصلاً ہلتا

زانوئے پاس کہاں، اور سرِ دلدار کہاں
ہم نشیں بات وہ کر جس کا ہو کچھ بھی سر و پا

شربت وصل نہ پینے دو، نہ سم کھانے دو
کیا قیامت ہے، نہ جینے دو، نہ مرجانے دو

عشوہ و ناز و ادا طعنہ سے کہتے ہیں مجھے
ایک دل رکھتے ہو کس کس کو دیا چاہتے ہو

رہتا ہے عاشقوں سے ازبس ہجوم در پر
ہو جائیگا گھر اس کا بازار رفتہ رفتہ

اسی طرف کو دیکھتا بھی ہے تو شرمایا ہوا
اب تلک ہے آنکھ میں شب کا سماں چھایا ہوا

ہے ستم، میرا وہ بیتابی سے در پر جانا
اور تیرا ناز سے کہنا، اسے مت آنے دو

(طبقات الشعرا: ۳۹۵؛ گلشن بیخار: ۲۴۲؛ سخن شعرا: ۵۶۷؛ تذکرہ خوش معرکہ زیبا (قلمی) ۱۱۲۰۰؛ بہار بےخزاں؛ گلستان بےخزاں: ۲۸۶؛ گلستان سخن ۱۸۴؛ طور کلیم: ۱۲۸؛)

● ●

# بحث ونظر

قاضی عبدالودود :-

حسب وعدہ تحریر کے شمارۂ اول کے متعلق اپنی رائے پیش کرتا ہوں؛ اسی شمارۂ دوم میں شائع ہونا ہے اس لئے اس کا وقت نہیں کہ زیادہ کتابوں کی طرف رجوع کرسکوں، اس صورت میں کچھ باتوں کا یک قلم نظرانداز ہوجانا، اور بہت سے امور کا مجمل رہ جانا ناگزیر ہے۔
اردو میں ایک ایسے رسالے کی جو "صرف تحقیقی موضوع کے لئے وقف" ہو شدید ضرورت تھی، میں تحریر کے اجرا پر علمی مجلس کو مبارکباد دیتا ہوں، شمارۂ اول بحیثیت مجموعی قابل تعریف ہے۔ لفظ "تماہی" کی نسبت ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے جو کچھ لکھا تھا، وہ میری نظر سے گزر چکا ہے؛ میں اس سے مطمئن نہیں، اور سہ ماہی پر اسے ترجیح دینے کی کوئی معقول وجہ نہیں۔ نام سرورق میں بالکسر چھپا ہے، اور انگریزی اس طرح ہے کہ کسرہ تا پر مشعر ہے۔ اس کے علاوہ اغلاط طباعت بھی ہیں، امید ہے کہ آئندہ کاپی اور پروف کی بہتر تصحیح کا انتظام ہوسکیگا۔
کرم علی مرثیہ گو :-

۱۔ "فضل علی فضلی؛ چھوٹے بھائی کرم علی" د ظاہرا اس کی بنیاد کرم علی کی یہ عبارت ہے "بعد واقعۂ برادر مغفور فضل علی خاں مرحوم در استدعائے آمرزش . . ." ہے۔ اس سے خردی بزرگی کا حال نہیں معلوم ہوتا، اگر کوئی اور بات اس پر دلالت کرتی ہے تو اس کا ذکر ضروری تھا۔ ظاہرا جناب ادیب کرم علی کو فضلی کا عینی، علاتی یا اخیافی بھائی سمجھتے ہیں۔ مگر لفظ برادر انگریزی لفظ [illegible] کا ترجمہ [illegible] مقام نہیں، جن لوگوں سے دور کا بھی رشتہ ہو، یا جن سے گہری دوستی ہو، ان کے لئے بھی اردو فارسی میں یہ لفظ مستعمل ہے

جدید مرثیے کے بانی ضمیر لکھنوی۔

۱۔ضمیر کا "تعلق خواجہ باسط کے خانوادے سے ہے، خواجہ باسط صاحبزادے تھے خواجہ مظفر کے مؤخر الذکر محمد شاہ کے وزیر صمصام الدولہ کے بڑے بھائی تھے"(بحوالۂ مکتوب جناب ارشا
خواجہ باسط خواجہ مظفر نہیں، خواجہ جعفر کے بیٹے تھے؛ اور خواجہ مظفر صمصام الدولہ کے بڑے نہیں۔ چھوٹے بھائی تھے۔ صمصام الدولہ وزیر نہیں، میر بخشی تھے۔ محمد شاہ کے وزیر حسب ذیل اصحاب ہوئے: قطب الملک سید عبداللہ خاں، محمد امین خاں نظام الملک اعتماد الدولہ قمرالدین خاں۔

خواجہ باسط اپنے عہد کے اکابر میں تھے، اور کسی شاعر کا ان سے نسبی تعلق رہا ہے، تو تذکرہ نے اسے قلم انداز نہیں کیا، ضمیر کا ان سے اس نوع کا تعلق ہوتا تو تذکرہ نگار اس کا کرتے۔ جناب ارشاد کی معلومات کی کیفیت سطور بالا سے ظاہر ہے محض ان کی شہادت پر دعویٰ کہ ضمیر خانوادہ خواجہ باسط سے تھے، قبول نہیں کیا جا سکتا۔

۲۔ نادر کا نام ۱۵ و ۱۶ میں کلب علی خاں مرقوم ہے صحیح کلب حسین خاں ہے۔

۳۔ فیض آباد کی جگہ لکھنو ۱۱۸۷ھ میں دارالحکومت ہوا ۱۶ اسی صفحے میں چند سطور کے بعد اس کا زمانہ ۱۱۸۷-۱۱۸۸ھ درج ہے۔ یہ تفاوت کیوں؟ مزید یہ کہ واقعہ ۱۱۸۹ھ یا اس کے کچھ بعد کا ہے۔

۴۔ ثابت ہمارے زمانے کے مصنف ہیں لیکن روایات کی جانچ پڑتال ان کے بس کا نہیں، کچھ تعجب نہیں اگر وہ پاسداری سے بھی کام لیتے ہوں، خود مقالہ نگار نے ان سے جا بجا کیا ہے۔ ان کی دو کتابوں حیات دبیر اور ... اور ایک دوسرے مصنف کی کتاب لکھنو کا دبستان شاعری کے حوالے سے مقالے میں مرقوم ہے کہ "۱۱۸۷ھ میں ... نادر (پدر ضمیر) بھی ضمیر کو ساتھ لے کر لکھنؤ چلے آئے، اور یہیں رہ پڑے" ۱۶۔ مقالہ نگار کو اس اتفاق ہے لیکن ... میں وہ لکھتے ہیں:

"ثابت کا یہ قول یقیناً غلط ہے کہ ضمیر نے فیض آباد ہی میں شاعری شروع کر دی تھی، انھو تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ فیض آباد میں ضمیر کی ایسی شہرت ہو چکی تھی کہ وہ مرثیہ گو

مانے جاتے تھے، جیسا کہ لکھ چکا ہوں ضمیر بہت ہی کم سنی میں فیض آباد سے لکھنؤ چلے آئے تھے۔ وہاں شاعری شروع کرنے یا دس برس کے سن تک وہیں مقیم رہنے کا سوال نہیں پیدا ہوتا، استاد مرثیہ گو ہونا بڑی بات ہے"۔

اس سلسلے میں امور ذیل توجہ طلب ہیں: (الف) مقالے میں ثابت یا مصنف لکھنؤ کا دبستان شاعری کی کوئی عبارت جو ۱۱۸۸ھ یا ۱۱۸۹ھ میں ضمیر کے فیض آباد سے لکھنؤ جانے پر مشتمل ہو نقل نہیں ہوئی۔ اگر واقعی ایسی عبارت موجود ہے، تو اس وقت استاد مرثیہ گو ہونے کے لئے کم از کم انھیں سی سالہ ہونا چاہیے اور اس حساب سے سال ولادت ۱۱۶۰ھ سے بھی قبل قرار پاتا ہے جو کسی طرح قابل قبول نہیں (ب) ضمیر کے بعض اشعار سے جو نقل ہوئے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ دس برس کے تھے کہ شعر گوئی شروع کی۔

۵۔ "ہم یہ مان بھی لیں کہ فیض آباد سے لکھنؤ آتے وقت ضمیر گود کے بچے تھے۔ تب بھی کم از کم ۱۱۸۷ھ کو ان کی ولادت کا سال ماننا پڑیگا"۔ ص۱۶۔ میں کم از کم کی قید لگا دی ہے، اور یہ مان کر کہ ۱۱۹۷ھ میں دہ سالہ تھے، ۱۱۸۷ھ کو بے چون و چرا سال ولادت تسلیم کر لیا ہے۔

۶۔ مصحفی نے ریاض الفصحا (زمانۂ تصنیف ۱۲۲۱ تا ۱۲۳۶ھ) میں وقت تحریر ترجمہ ضمیر کی تخمینی عمر ۳۰ سال بتائی ہے۔ مقالہ میں مراد قاضی عبدالودود کا، یہ قول نقل ہوا ہے کہ ترجمہ ۱۲۲۷ھ کے آس پاس سپرد قلم ہوا۔ مقالہ نگار کو اس سے اختلاف ہے، اور ان کا خیال ہے کہ ۱۲۲۱ھ میں قلمبند ہوا ہوگا، لیکن، وہ مصحفی کی تخمین کو غلط سمجھتے ہیں (۱۶-۱۷)۔ میں نے کیا لکھا تھا، اور ثابت کی بہاں کیا ہے، وہ اس وقت پیش نظر نہیں اور قلت وقت کی وجہ سے معاصر اور ثابت کی کتابوں کی طرف رجوع ممکن نہیں۔ میں کچھ دنوں کے بعد اس سوال سے بحث کروں گا کہ قیاس کس سال ولادت کا مؤید ہے۔

۷۔ مقالہ نگار کو قول کے مطابق ۵۶ برس کی عمر تک ضمیر کے اشعار کی تعداد ... سے اوپر پہنچ گئی تھی، وہ لکھتے ہیں کہ اس کے بعد ۲۸ برس اور زندہ رہے اور مرثیہ گوئی میں مصروف رہے۔ انھوں نے یقیناً لاکھوں اشعار مرثیوں کے کہے ہوں گے۔ یہ سمجھنے کی میرے نزدیک کوئی ... [illegible]

جدید مرثیے کے بانی ضمیر لکھنوی :-

۱۔ضمیر کا "تعلق خواجہ باسط کی خانوادے سے ہے، خواجہ باسط صاحبزادے تھے خواجہ مظفر کے اور مؤخر الذکر محمد شاہ کے وزیر صمصام الدولہ کے بڑے بھائی تھے" (بحوالۂ مکتوب جناب ارشاد)
خواجہ باسط خواجہ مظفر نہیں، خواجہ جعفر کے بیٹے تھے :اور خواجہ مظفر صمصام الدولہ کے بڑے بھائی نہیں. چھوٹے بھائی تھے۔ صمصام الدولہ وزیر نہیں، میر بخشی تھے۔ محمد شاہ کے وزیر علی الترتیب حسب ذیل اصحاب ہوئے: قطب الملک سید عبداللہ خاں، محمد امین خاں نظام الملک، اعتماد الدولہ قمر الدین خاں ۔

خواجہ باسط اپنے عہد کے اکابر میں تھے، اور کسی شاعر کا ان سے نسبی تعلق رہا ہے، تو تذکرہ نگاروں نے اسے قلم انداز نہیں کیا، ضمیر کا ان سے اس نوع کا تعلق ہوتا تو تذکرہ نگاروں کا ذکر کرتے۔ جناب ارشاد کی معلومات کی کیفیت سطور بالا سے ظاہر ہے محض ان کی شہادت پر یہ دعویٰ کہ ضمیر خانوادہ خواجہ باسط سے تھے، قبول نہیں کیا جا سکتا۔

۲۔ نادر کا نام ۱۵ و ۱۶ میں کلب علی خاں مرقوم ہے، صحیح کلب حسین خاں ہے۔

۳۔ فیض آباد کی جگہ لکھنؤ ۱۱۸۷ھ میں دارالحکومت ہوا ۱۶ اسی صفحے میں چند سطور کے بعد اس کا زمانہ ۱۱۸۷-۱۱۸۸ھ درج ہے۔ یہ تفاوت کیوں؟ مزید یہ کہ واقعہ ۱۱۸۹ھ یا اس کے بھی کچھ بعد کا ہے۔

۴۔ ثابت ہمارے زمانے کے مصنف ہیں، لیکن روایات کی جانچ پڑتال ان کے بس کا روگ نہیں، کچھ تعجب نہیں اگر وہ پاسداری سے بھی کام لیتے ہوں، خود مقالہ نگار نے ان سے جا بجا [illegible] کیا ہے۔ ان کی دو کتابوں، حیات دبیر و دربار حسین اور ایک دوسرے مصنف کی کتاب لکھنؤ کا دبستان شاعری کے حوالے سے مقالے میں مرقوم ہے کہ "۱۱۸۷ھ میں .. قادر حسین (پدر ضمیر) بھی ضمیر کو ساتھ لے کر لکھنؤ چلے آئے، اور یہیں رہ پڑے" ۱۶۔ مقالہ نگار کو اس سے اتفاق ہے لیکن مشہ میں وہ لکھتے ہیں:۔

"ثابت کا یہ قول یقیناً غلط ہے کہ ضمیر نے فیض آباد ہی میں شاعری شروع کر دی تھی، انھوں نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ فیض آباد میں ضمیر کی ایسی شہرت ہو چکی تھی کہ وہ مرثیہ گوئی

نے جاتے تھے، جیسا کہ لکھ چکا ہوں ضمیر بہت ہی کم سنی میں فیض آباد سے لکھنؤ چلے آئے
تھے۔ وہاں شاعری شروع کرنے یا دس برس کی سن تک وہیں مقیم رہنے کا سوال نہیں پیدا
ہوتا، استاد مرثیہ گو ہونا بڑی بات ہے"۔

اس سلسلے میں امور ذیل توجہ طلب ہیں: (الف) مقالے میں ثابت یا مصنفِ لکھنؤ کا
دبستانِ شاعری کی کوئی عبارت جو ۱۱۸۶ھ یا ۱۱۸۸ھ میں ضمیر کے فیض آباد سے لکھنؤ جانے پر تصریح
ہو نقل نہیں ہوئی۔ اگر واقعی ایسی عبارت موجود ہے، تو اس وقت استاد مرثیہ گو ہونے کے
لئے کم از کم انھیں سی سالہ ہونا چاہیے اور اس حساب سے سالِ ولادت ۱۱۶۰ھ سے بھی قبل قرار
پاتا ہے جو کسی طرح قابلِ قبول نہیں (ب) ضمیر کے بعض اشعار سے جو نقل ہوئے ہیں، معلوم
ہوتا ہے کہ دس برس کی تھے کہ شعر گوئی شروع کی۔

۵۔ ہم یہ مان بھی لیں کہ فیض آباد سے لکھنؤ آتے وقت ضمیر گود کے بچے تھے۔ تب بھی
کم از کم ۱۱۸۷ھ کو ان کی ولادت کا سال ماننا پڑیگا۔ ص ۱۶ میں کم از کم کی قید اڑا دی
ہے، اور یہ مان کر کہ ۱۱۹۷ھ میں دہ سالہ تھے، ۱۱۸۷ھ کو بے چون و چرا سالِ ولادت
تسلیم کر لیا ہے۔

۶۔ مصحفی نے ریاض الفصحا (زمانۂ تصنیف ۱۲۲۱ تا ۱۲۳۶ھ) میں وقتِ تحریر ترجمۂ ضمیر
کی تخمینی عمر ۳۰ سال بتائی ہے۔ مقالہ میں مراد قاضی عبدالودود کا یہ قول نقل ہوا ہے
کہ ترجمہ ۱۲۲۷ھ کے آس پاس سپردِ قلم ہوا۔ مقالہ نگار کو اس سے اختلاف ہے، اور ان کا خیال
ہے کہ ۱۲۲۱ھ میں قلم بند ہوا ہوگا، لیکن، وہ مصحفی کی تخمین کو غلط سمجھتے ہیں (۱۶-۱۷)
میں نے کیا لکھا تھا، اور ثابت کے یہاں کیا ہے، وہ اس وقت پیشِ نظر نہیں اور قلتِ وقت
کی وجہ سے معاند اور ثابت کی کتابوں کی طرف رجوع ممکن نہیں۔ میں کچھ دنوں کے
بعد اس سوال سے بحث کرونگا کہ قیاس کس سالِ ولادت کا مؤید ہے۔

۷۔ مقالہ نگار کے قول کے مطابق ۵۶ برس کی عمر تک ضمیر کے اشعار کی تعداد ۱۱ لاکھ سے اوپر پہونچ
چکی، وہ لکھتے ہیں کہ اس کے بعد ۲۸ برس اور زندہ رہے اور مرثیہ گوئی میں مصروف رہے۔
انھوں نے یقیناً لاکھوں اشعار مرثیوں کے کہے ہونگے"۔ یہ بھی کی میری نظر سے کوئی مقبول وجہ

## بحث و نظر

مقالے میں مراثی مطبوعہ و غیر مطبوعہ کے ابتدائی مصرعے درج ہیں، لیکن یہ نہیں کہ اشعار مراثی کی مجموعی تعداد کیا ہے۔

۸۔ ضمیر کا دستیاب شدہ متغزلانہ کلام ۲۷-۲۸ میں درج ہے۔ تذکرہ ناصر (نسخہ کتب خانہ خدابخش) سے اس میں اشعار ذیل کا اضافہ کیا جاتا ہے:

تربت پہ چڑھائی کو تری سوختگاں کی — لے کر پر پروانہ نسیم سحر آئی
قسمت تو دیکھیے کہ صبا نے پس از وفات — سوکھے مرے مزار پہ لا کر چڑھائے گل
ہے یہ جگہ ادب کی تو آہستہ چل صبا — شمع سر مزار مری ہو نہ جائے گل
اس کو نہ چشم ہی ہے نہ ابرو ہی نہ ادا — بلبل تو کیا سمجھ کے ہوئی مبتلائے گل
ہے ہم میں اور ان کی محبت میں فرق یار — ہیں نہ جگر پہ اوروں نے ہاتھوں پہ کھائے گل
... زن بھی تو چرخ کی گردش میں آگئے — دیکھو تو ٹکڑے ٹکڑے ہے ساری قبائے گل
آیا ہوں سننے نالۂ مرغ چمن ضمیر — لائی نہیں ہے باغ میں مجھ کو ہوائے گل
تب ملیسر مجھے اک بوسۂ جانانہ ہوا — جب کہ میں خاک ہوا خاک سے پیمانہ ہوا

۹۔ ایک چہار مصرعی قطعے کو جس کا مصرع اول یہ ہے: "کسی کا کندہ نگینے پہ نام ہوتا ہے" ۲۰ رباعی کہا ہے۔

۱۰۔ ایک رباعی کو جس کی بیت اول درج ذیل ہے، قطعہ کہا ہے: ۵۹:

آفاق سے استاد یگانہ اٹھا — مضمون سے جوہر کا خزانہ اٹھا

۱۱۔ بارہ سے انیس تک ... ہجر ... کے' ۴۱۔ 'بارہ' سے قبل 'سن' چاہیے جو ۴۴ میں

۱۲۔ اُس طرز میں جو جو کہے شاگرد ہے میرا ۴۱۔ یہ مصرع ص ۴۴ میں دو جگہ یوں مرقوم: 'اُس طرز میں جو کہوے سو شاگرد ہے میرا'۔ کیا ضمیر کے یہاں اس کی دو شکلیں ہیں؟

۱۳۔ ص ۸۰ میں ثابت کا قول بلا اظہار اختلاف نقل کیا ہے کہ دبیر ۱۲۲۹ یا ۱۲۳۰ھ میں شاگرد ہوئے۔ یہ زمانہ بعید از قیاس ہے۔

۱۴۔ میر انشا کا بیان تھا کہ میر حسن کے انتقال کے بعد کچھ زمانہ میر خلیق پر خاصی تنگی کا گزرا ... خیال فیض آباد میں تھے۔ خلیق لکھنؤ آتے، بیٹھے اور ... مال بھر میں تین چار سو ...

شعرائے اردو کے تذکرہ کا کچھ ڈھنگ ڈالا تھا غرض اس نے جو صورت پکڑلی تھی
(۱۲۰۱ھ ہجری و ۱۷۸۶ء ۱۷۸۶ء) میں حیات مستعار باقی نہ رہی اور یہ مسودہ امام بخ
کشمیری کے ہاتھ لگ گیا اس نے بے خوف وخطر اپنے نام سے مشہور کیا۔
تذکرہ امام بخش کشمیری ۱۲۰۱ھ اس تذکرہ کا بیان فقط مصحفی کے تـ
میں دیکھنے میں آیا اور اس سے بھی نہ کچھ تذکرہ نہ مصنف کی کیفیت حقیقت اچھی طر
معلوم ہوئی۔ مصحفی فقط یہ لکھتا ہے کہ امام بخش نے فقط جہاں دار ہی کی تصنیف
سے سرقہ نہیں کیا بلکہ میری تصنیفات سے بھی اس نے بہت کچھ چرایا ہے۔ مصحف

---

* مجموعۂ سخن دو حصے لکھنو میں چھپے ہیں پہلے حصے میں ۱۰۸ صفحے دوسرے کے ۸۸ صفحے۔

مجموعۂ واسوخت معروف بہ شعلۂ جوالہ۔ دو جلدیں ضخیم منشی نول کشور نے چھاپا ہے۔

سخن شعرا[۳۲] عبدالغفور خاں نساخ۔

قطعۂ منتخب۔ نساخ نے قطعات جمع کئے ہیں ۱۰۶ صفحے پر چھپا ہے۔

۱۲۷۱ھ
گلشن ہمیشہ بہار[۳۳]

بزم سخن۔ [۳۴]

نگارستان سخن[۳۵] ۲۰۸ (صفحے)

۱۲۹۰ھ
شمع انجمن[۳۶] ۱۲۹۹ (۵۴۰ صفحے)

طور کلیم۔ ۱۵-۱۲۴ (کذا) (۱۰۱ صفحے)

صبح گلشن[۳۷] (۶۴۲ صفحے)

روز روشن[۳۸] (۸۶۸ صفحے)

شعرائے ہنود[۳۹] تذکرہ ہنود۔ بشاش (۲۰۰ صفحے)

تذکرہ صنیم[۴۰] ۱۳۰۳ حیدرآبادی (۵۰ صفحے)

تذکرہ غنچہ ارم[۴۱] ـ بخت علی ۸۰ مطبوع کلکتہ

آب حیات[۴۲] مولانا آزاد ۵۶۰ صفحے

۱۲۹۰
انتخاب یادگار[۴۳] منشی امیر احمد ۱۲۸۷ شعرائے رام پور کے حال میں ہے

۱۷۔ مقالے میں ہر سبب بروزن مرثیہ ہے ۳۰۔ اس صورت میں بالفتح ہونا چاہیے، لیکن میرا حافظہ دھوکا نہیں دیتا تو جناب مسعود حسین رضوی، ادیب نے یہ بتایا تھا، [illegible] بالکسر ہے۔

۱۸۔ مقالہ زیر بحث کے مصنف جناب علی جواد زیدی کو میر ببر سے متعلق ایک مستقل کتاب لکھنی چاہیے جس میں ان کے مراثی وغیرہ کا وافر انتخاب بھی ہو۔

غبار خاطر:

۱۔ غبار خاطر سے متعلق جو مقالہ تحریر میں چھپا ہے وہ بطور مقدمہ اس کتاب کے تازہ ایڈیشن [illegible] بھی شامل ہے۔ کتاب اور رسالہ دونوں کا زمانۂ اشاعت ایک ہے، اس لحاظ سے میرا خیال ہے کہ اس کا تحریر میں شمول ٹھیک نہیں۔

۲۔ [illegible] میں [illegible] کی حیثیت بادشاہ گر کی ہو گئی تھی، مقالہ میں کسی ایک [illegible] نام نہیں۔

۳۔ "غبار خاطر کی نثر [illegible] تلی ہے اور یہاں الفاظ کا استعمال اس حد تک افراط و تفریط سے بری ہے کہ اس سے زیادہ خیال میں بھی نہیں آ سکتا۔" (۶۴) اس سے اتفاق ممکن نہیں۔

۴۔ معمولی سفر کا بیان ہو کہ پرندوں کا کسی جنگ کا ذکر ہو کہ علم موسیقی کا، وہ اسے پند و موعظت اور دائمی صداقتوں اور ابدی اقدار سے الگ کر کے دیکھ نہیں سکتے۔ وہ اسے فوراً کسی کلیہ کی شکل دے دیتے ہیں اور فطرت کے عالمگیر قوانین کے بالمقابل دیکھتے۔ (۷۶) ابوالکلام آزاد سے قبل بھی کہنے والے کہہ گئے ہیں۔ [۵]

نگویند از سر بازیچہ حرفے — کزو پندے نگیرد صاحب ہوش

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار — ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

لیکن ہر بات کا ایک محل ہوتا ہے، غبار خاطر میں اس نوع کے مساعی زیادہ کامیاب نہیں، علی الخصوص وہ مقامات جہاں اپنی ذات سے تعلق پیدا کیا گیا ہے وہ تو

---

[۵] یہ دعویٰ بھی نہیں کیا گیا تھا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کو اس معاملہ میں اولیت حاصل ہے۔ (مدیر)

سراسر آورد معلوم ہوتا ہے۔

۷۔ اغلاط املا کی بحث میں معمہ و تقاضا کا ذکر نہ ہونا حیرت انگیز ہے۔ اور بیستون کو بے ستون کیوں لکھا ہے؟ یہ درست ہے تو بمبئی کی جگہ بم بئی بھی لکھا جا سکتا ہے۔

## مصحفی کا مطالعہ

۱۔ "اتنے اشعار اردو کے کسی شاعر نے نہیں کہے جتنے مصحفی نے" ۸۳۔ انیس و دبیر دونوں نے مصحفی سے زیادہ اشعار کہے۔

۲۔ "میر و قائم کے سوا (ہمارے عہد سے پہلے) اردو کے بڑے شاعروں میں مصحفی کی اس خصوصیت میں کوئی شریک نہیں کہ وہ ایک نقاد شاعر ہیں۔ خوش ذوق سخن فہم ہونے کے ثبوت۔۔ شعرا کے تذکروں کی شکل میں چھوڑ گئے ہیں" ۸۴۔ تذکرہ نگاری نقادی کا ثبوت نہیں، مصحفی کی جو ناقدانہ رائیں تذکروں میں ظاہر کی ہیں، یا جو کلام منتخب کیا ہے اس سے ہرگز مقالہ نگار کے دعوی کو تقویت نہیں پہنچتی۔ اس سلسلے میں دو باتیں قابل ... ہیں: تذکرہ نگاری ہی نقادی کا واحد ثبوت نہیں پہنچتی۔ اگر اسے مان لیا جائے تو غالب، مومن وغیرہ کو نقادوں کی جماعت سے خارج کرنا پڑے گا۔ مصنف سحر البیان نے بھی تذکرہ لکھا ہے، اور اس کا شمار بھی اکابر شعرائے اردو میں ہوتا ہے۔

۳۔ "مصحفی نے اردو شعرا کے ۲ تذکرے لکھے" ۸۵۔ یہ قول غلط فہمی کا باعث ہو سکتا ہے۔ دو تذکروں میں سے ایک ریاض الفصحا میں ریختہ گویوں کے ساتھ ساتھ فارسی گویوں کے بھی تراجم اور منتخب اشعار ہیں۔

۴۔ ۸۵ میں مصحفی کے ایک دیوان فارسی کا ذکر ہے اور ۸۶ میں ہے کہ "ابتدا میں شعر فارسی میں بھی شاعری کی" ایک مکمل دیوان رضا لائبریری میں ہے ایک اور فارسی نسخہ جس پر میرا ایک مقالہ ابھی حال میں رسالہ اردو نے شائع کیا، مصحفی کا ایک دیوان دیوان نظیری کے جواب میں ہے، اس کے متعلق پروفیسر سید احتشام حسین کا مقالہ رسالہ اردو میں چھپا ہے۔ ایک مجموعہ اشعار فارسی کتب خانہ دانش گاہ ڈھاکہ میں ہے، اس میں کچھ کلام ایسا ضرور ہے جو نسخہ مذکورہ بالا میں نہیں۔ مصحفی نے تذکرہ ہندی

حق میں اس کے موا نظیری آج، پھولوں کی چھڑی جس کے ہاتھوں سے نہ اٹھتی ۹۶،
کہ فن ریختہ میں بھی ہے وہ برابر زور۷.۱، دگر ہو پھر شرارت شروع ہوں میں بھی شریر۱۰۸۔
عوض دوشالے کے خلعت بشکل نقش بدیر، ہے زلف سے یوں انقباض عارض کو۱۱۳،
شیخ الحرم مؤذن دونوں چلن کے بد ہیں ۱۱۵، کہ ہے سائیس بیمار اور نہ ہتی نہ کھر یرا ہے۱۲۳۔
باغ زمانہ یار وہاں تک نو کم قضا ہے۔۱۲۶۔

۱۲۔ "شاہ عالم۔۔ جو از دہلی تا پالم حکمراں رہ گئے تھے" ۹۲ از دہلی تا پالم کا شاہ عالم (پدر اکبر ثانی) سے کچھ تعلق نہیں، یہ اس سے قدیم تر کہاوت ہے۔

۱۳۔ کنویں اور نل بری حالت میں تھے ۹۲۔ کیا شاہ عالم کے زمانے میں نل تھے؟

۱۴۔ آصف الدولہ کا دور مقالہ نگار کی رائے میں ۱۲۱۱ھ میں ختم ہوتا ہے ۹۳ صحیح ۱۲۱۲ھ ہے۔

۱۵۔ مصحفی کے دو قریبی دوست تھے قتیل اور جرأت، ان کے سہارے کچھ اچھی گزر جاتی تھی" ۹۴ اس کی بنا بظاہر شعر ذیل پر ہے جس کے مصرع آخر کے نیچے مقالہ نگار نے لفظ 'جرأت' لکھا ہے (...):

ایک تو میں تھا مرے ساتھ مرا یار قتیل    دوسرا رات کے رہتے میں شریک اس کے وہاں

مصرع آخر کا جرأت سے مطلقاً سروکار نہیں: جرأت سے کچھ دن دوستی رہی تھی، لیکن مصحفی کی نظم و نثر یا کسی معاصر کے قول سے بالکل ثابت نہیں کہ جرأت کے سہارے گزرتی تھی۔

۱۶۔ "لکھنؤ میں تو انشا اور رنگین کی شاعری چل رہی تھی اور انھیں کا دور دورہ تھا" ۹۵۔ اگر اس عبارت میں اس زمانے سے بحث ہے جب مصحفی ۱۱۹۸ھ (یہ سنہ مقالے میں نہیں) میں لکھنؤ آکر اقامت پذیر ہیں، تو یہ ہرگز صحیح نہیں کہ اس وقت انشا و رنگین کا دور دورہ تھا۔ انشا قبل اس کے کہ خاص شہرت حاصل کریں غالباً ۱۱۹۴ھ میں دہلی چلے گئے تھے، اور ۱۱۹۸ھ کے کئی برس بعد لکھنؤ پہنچے تھے۔ رنگین کا پہلی بار لکھنؤ آنا بھی اس سنہ کے کئی برس بعد ہوا۔ ۱۱۹۸ھ میں جس شاعر کا واقعی دور دورہ تھا وہ جرأت ہے۔

۱۷۔ نصیری فرقے کا غالباً اودھ میں کوئی خاص وجود نہ تھا" ۱۰۹ یہ دعویٰ محض مصحفی

میں ایک ضائع شدہ دیوان بطرز جلال اسیر کا ذکر کیا ہے۔

۵۔ مقالے میں فاخر مکین، دیوانہ، منت اور قتیل کو ان شعرائے اردو میں شمار کیا ہے جن کے مصحفی قائل تھے، ۸۔ مکین کا ایک اردو مصرع موجود نہیں۔ مقالہ نگار کے سوا کسی نے انھیں ریختہ گو کہا بھی نہیں۔ دیوانہ اردو کہتے تھے، مگر مصحفی کے لکھنو آنے سے قبل ان کی شہرت زیادہ تر ان کے فارسی کلام کی بدولت تھی۔ منت وقتیل نے اردو میں بہت کم شعر کہے، ان کی شہرت کا مدار بھی فارسی کلام پر تھا۔

۶۔ مصحفی "شعرائے فارسی میں سعدی، نسبتی، عرفی، سلیم و کلیم الوری ونظیری کے قائل تھے، یہ فہرست نامکمل ہے۔

۷۔ مقالہ نگار کے نزدیک مصحفی کے عہد میں سودا سابقین میں اور سوز شعرائے معاصر میں محسوب تھے ۸۔ حالانکہ سوز ایک سال عمر میں سودا سے بڑے تھے (تذکرۂ کمال)

۸۔ مصحفی جن اردو گویوں کے قائل تھے ان کی فہرست ص ۸۷ میں قائم کا نام نہ ہونا حیرت انگیز ہے۔

۹۔ ۱۲۴۰-۱۸۲۴ء ۹۷ عموماً ہجری وعیسوی سنین کی مطابقت ماہ و تاریخ معلوم نہ ہو، تو دوستوں سے کی جاتی ہے۔ ۱۲۴۰ھ مصحفی کا زمانۂ وفات ہے، اور یہ علم نہیں کہ کس ماہ کی کس تاریخ میں موت ہوئی تھی۔ ۱۲۴۰ھ مستثنیٰ سنین میں نہیں تو اس کی مطابقت دو عیسوی سنین سے ہوگی۔

مقالہ نگار کی [illegible] میں موت کے وقت مصحفی کی عمر ۸۰ سے دو تین برس زیادہ تھی، یہ [illegible] میں ہے، ص [illegible] میں ان کے عہد کا آغاز ۱۱۵۶ھ سے بتایا گیا ہے۔ تفاوت ظاہر ہے اس سے قطع نظر، خود مصحفی کا قول ہے کہ میری ولادت عہد احمد شاہ میں ہوئی، چونکہ اس کی ابتدا ۱۱۶۱ھ سے ہوتی ہے، یہ ممکن ہی نہیں، کہ ان کی عمر ۸۰ سے زیادہ ہو، اور ان کے عہد کا آغاز کسی طرح ۱۱۵۶ھ سے نہیں ہو سکتا۔

۱۱۔ اس مقالے میں بکثرت مصرع غلط ہیں، ازاں جملہ: مصحفی دل تو لگا مصحف تفسیر میں تھا، ۸۷؛ شعر غزل میں اب کی کرے بے حساب ہے ۸۸، کیا کیا ہر ایک شعر میں ہے اس کے شاعری، مصحفی کیم میر میر ہی ہے ۸۹، صنعت میں ریختے کی سودا ہیں بے یقیں ہم،

کے بعض اشعار کی بنا پر نہیں کیا جا سکتا۔

۱۸- کچھ باتیں اس مقالے میں سمجھ میں نہ آئیں: (الف) خاص خاص اشعار خلا بین یا قوسین کے درمیان کیوں ہیں؟

(ب) گئے وہ دن کہ رہتے تھے جہاں آباد میں ہم بھی
خرابی شہر کی صحرا کے آواروں سے مت پوچھو

ص۱۰۰، مصحفی کے دیوان میں اس شعر سے قبل شعر ذیل ہے جو مقالے کے ص۹۵ میں منقول ہے۔

حسن کا شعر ہے میاں مصحفی اپنی — سنو تم اس کو ہم سے خانمانداروں سے مت پوچھو

ظاہر ہے کہ گئے وہ الخ مصحفی کا نہیں، میر حسن کا شعر ہے (دیوان میر حسن میں موجود) یہ اشعار مصحفی کے ذیل میں کیوں نقل ہوا، اور ہوا تھا تو یہ کیوں بتایا نہ گیا کہ مصحفی نے اس کی تضمین کی ہے۔

(ج) ص۱۱۲ میں ایک شعر کے دو مصرع یکے بعد دیگرے درج ہیں اور دونوں مصرعوں کی ابتدا میں ع (بہ معنی مصرع) مرقوم ہے۔ پڑھنے والا اس سے یہ سمجھ سکتا ہے کہ یہ مصرعے ایک دوسرے سے تعلق نہیں رکھتے، لیکن یہی دو مصرعے ایک شعر کے طور پر ص۱۱۸ میں موجود ہیں، فرق صرف یہ کہ مصرع آخر اس جگہ 'کا' پر ختم ہو جاتا ہے، اور 'ہو' جو اس جزو لازم ہے قلم انداز ہو گیا ہے۔

ع۔ یہ بھی قدرت ہے خدا کی اسے بارہ آویں — ع منتظر عشق کی جو سر میں جو اک لوکا ہو

(د) کئی الفاظ، ارگن ۱۱۶ سراپ ۱۱۹ وغیرہ ع کے بعد درج ہیں، اور ایک ایک لفظ نے ایک ایک سطر لی ہے۔ کیا ایسے الفاظ ایک جگہ نقل نہیں کئے جا سکتے تھے؟

(ہ) [لباس؛ شب برات کی جشن میں استعمال میں آنے والی اشیاء] ۱۱۲ [لباس کی مختلف چیزیں، شب برات کے جشن میں استعمال میں آنے والی اشیاء] ۱۱۴ مقالے میں یہ دو جگہ ہیں، لیکن وہ اشیا کیا ہیں، اس کا ذکر نہیں۔

(و) مقالہ نگار نے کسی لفظ، کسی شعر یا مصرع کے متعلق یہ اطلاع نہیں دی کہ مصحفی کے کس دیوان میں ہیں، صفحہ یا ورق کا تو سوال ہی نہیں۔

۱۹۔ "گلزار ابراہیم، میں بیشتر شعرا نے اپنے انتخابات خود بھیجے تھے (غالباً مصحفی نے بھی)" ۱۱۱۔ اس بیان میں بڑا مبالغہ ہے۔ مصحفی کے جو اشعار اس تذکرے میں ہیں وہ سب تذکرۂ میر حسن میں بھی ہیں۔ اور یقین ہے کہ وہیں سے لئے ہیں۔ مصحفی نے اگر اپنے اشعار خود بھیجے ہوتے تو صاحب تذکرہ اپنے دستور کے مطابق اس کا ذکر کرتے۔

۲۰۔ زرالے مصحفی ان لکھنؤ والوں سے بھٹیارہ

تو تو ہے بے شہر اور یہاں دَور ہے نادان شہریوں کا

ص۱۶۱۔ "بھیٹارہ" "بُچپنارہ" ہوگا۔ تو تو کی جگہ 'تو' چاہیئے۔

## ساحر کاکوروی

۱۔ علما و فضلا کا ایک بہت بڑا مرکز کاکوری رہا ہے، ۱۲۹۔ میرا گمان ہے کہ 'بہت بڑا' محض آرائش گفتار کے لئے ہے، کاکوری کو 'مرکز' تو کہہ سکتے ہیں 'بہت بڑا مرکز' کہنے کی وجہ جواز نہیں۔

۲۔ صفحات ۱۳۰ و ۱۳۱ میں مفتون و محی الدین خاں ذوق اور حیدر بیگ کاکوروی کو ساحر کے "مشہور اور قابل" شاگردوں میں شمار کیا ہے۔ یہ گمنام لوگ ہیں، بعض تذکروں میں نام ملنا شہرت کا ثبوت نہیں ہو سکتا، رہی قابلیت تو مقالہ نگار کو اس کا حال کس طرح معلوم ہوا؟

۳۔ میں مقالہ نگار کا نہایت ممنون ہوں کہ انھوں نے امیر حسن بسمل سے متعلق میری ایک غلطی کی نشان دہی کی ہے۔ کلیات نظم غالب کی طرف رجوع کیا تو واقعی ایک نہیں، دو رباعیاں مدح بسمل میں نکلیں، یہ ایک دوسرے کے بعد ایک ہی صفحہ میں بلافصل درج ہیں۔ رباعیوں کا مدح بسمل میں ہونا اس قدر واضح ہے کہ اس کے متعلق غلط فہمی کا امکان ہی نہیں۔ ایک یا تو میرا سہو قلم ہے یا چھاپے کی غلطی علی گڈھ میگزین کے غالب نمبر میں میری تحریریں حد درجہ غلط چھپی تھیں، اور اسکے مدیر نے اس کا اقرار بھی کیا تھا۔

۴- "آمد بزبان مصرعۂ تاریخ وفاتش ۱۳۲" سر خوشم کرد باین مصرعۂ انداز حزیں ۱۴۱- دونوں مصرعوں میں مصرعہ کی جگہ مصرع چاہئے۔

۵- ص۱۳۱ میں ایک مصرع دو جگہ مرقوم ہے اور اختلاف کے ساتھ "سواد سنبل خط شد بہار مرا"، "سواد سنبل خط شد سیہ بہار مرا" میرا خیال ہے کہ صحیح شکل یہ ہے "سواد سنبل خط شد سیہ بہار مرا"

۶- دیوان ساحر کا ایک نسخہ کتاب خانہ خدا بخش میں بھی ہے، اس کے متعلق آئندہ لکھوں گا۔

۷- مقالہ نگار نے ساحر کے استاد مصحفی کے تذکرۂ ریاض الفصحا (زمانہ تصنیف ۱۲۲۱ تا ۱۲۳۶ھ) سے کام نہیں لیا۔ ذیل میں اس تذکرے سے ساحر کا ترجمہ بعض غیر ضروری الفاظ کے حذف کے بعد نقل کیا جاتا ہے: "شیخ فضل حق عرف غلام امام متوطن کاکوری جوان صلاحیت شعار است، پیش ازیں خود را مصروف نثر نویسی میداشت وانہ عہدۂ آن بطور استادان ملف خوب می برآمد۔ بایمائے فقیر خیال موزوں کردن سفر فارسی در دلش گذشت، وآنچہ موزوں کرد در مشاعرہ ہا خواند و آں را از نظر فقیر گذراند بطور حزیں ... دریں بیابان دشوار گزار پا میگذارد و مورد تحسین و آفرین میشود۔ اگر زمانہ فرصت داد دریں فن شریف ... یکی از بے نظیران روزگار خواہد شد عمرش بیست و پنج سالہ خواہد بود" مصحفی نے جو شاعر کے منتخب اشعار دیے ہیں ان میں عجب نہیں کہ ایسے اشعار بھی ہوں جو نسخۂ دہلی میں نہیں ہیں۔

## کلام نصیر کے ماخذ

۱- نصیر کی "سیکڑوں شاگرد تھے" ۱۴۵۔ یہ بڑا مبالغہ ہے، سو کے وجود کا ثبوت بنا بھی مشکل ہوگا۔

۲- دیوان نصیر کے ایک نسخہ کے بارے میں بعض اصحاب نے لکھا ہے کہ اس میں ان کے استاد مائل کی اصلاحیں ہیں۔ مقالہ نگار کا خیال ہے کہ یہ "بہت مشکوک" ہے۔ یہ نسخہ میں نے بھی دیکھا ہے یہ وہم بھی نہیں ہونا چاہیے کہ اس نسخے کا کسی قسم کا تعلق مائل سے ہے۔

## بحث و نظر

کچھ باتیں جن کی طرف توجہ منعطف کرائی گئی ہے، محض جزئی ہیں، اس کا مجھے اعتراف ہے، لیکن میں یہ تسلیم کرنے کو آمادہ نہیں کہ تحقیق میں جزئی باتیں نظرانداز کرنے کے قابل ہیں۔

عبد الماجد (دریا آبادی)

تحریر کا یہ نمبر (۲) تو پہلے سے بڑھ کر نکلا ـــــ صحیح معنی میں نقشِ ثانی ہے۔
اور آپ کے یہ علی جواد زیدی صاحب تو خوب چیز نکلے۔ 'نعت گوئی' کے مضمون نے دنگ کر دیا۔ خیال نہ تھا کہ اس بحر کے ایسے شناور نکلیںگے، ماشاءاللہ۔ دو ایک باتیں بطور تتمے کے عرض ہیں:

ص ۱۷۹ - نمبر ۴۴: بدر صاحب کا نام بدر الحسن تھا: بی اے (علیگ) جلالی انتساب ان کے والد ماسٹر جلال الدین جلالی کی جانب ہے جو علی گڈھ میں مدتوں جغرافیہ کے ٹیچر رہے اور اپنی مزاحیہ شاعری اور نثر کے لئے مشہور۔
بدر جلالی مدتوں مدینہ (بجنور) کے ایڈیٹر رہے، پھر کچھ روز روزنامہ خلافت بمبئی کے ایڈیٹر رہے۔ بڑے پُرجوش مسلمان تھے۔

ص ۱۸۰ - نمبر ۵۴: بہزاد ولد سجاد حسین لکھنوی، مشہور نعت گو ہیں مدت ہوئی پاکستان چلے گئے ہیں۔ غالباً کسی ریڈیو اسٹیشن سے منسلک ہیں، پہلے دہلی ریڈیو میں تھے۔

ص ۱۸۲ - جوش ملیح آبادی نمبر کم سے کم ایک طویل نعتیہ نظم تو بڑی موثر اور دلکش ہے۔

ص ۱۹۵ - نمبر ۱۶۰: تخلص فریاد نہیں، فرہاد- ایم اے، پی ایچ ڈی۔ سابق استاد عربی لکھنو یونی ورسٹی۔ حیات ہیں۔

ص ۱۹۵ - نمبر ۱۶۳: فضلی کا کئی سال ہوئے انتقال ہو چکا ہے۔ سن وفات نمونۂ کلام وغیرہ ان کے لڑکے ڈاکٹر احمد الرحمٰن، کاکوری کوٹھی، خیالی گنج لکھنو سے مل سکتا ہے۔ وفات سے چند سال قبل بجز نعت کے اور سب کچھ کہنا چھوڑ دیا تھا۔

---

ہ مراد آباد کے قاضی گھرانے کے ممتاز فرد تھے۔

**محمد اکبرالدین صدیقی (حیدرآباد)**

زیدی صاحب نے اپنے مضمون (اتر پردیش کے نعت گو) پر کافی محنت کی ہے۔ ان کی فہرست میں بے نظیر شاہ وارثی کا نام نہیں ہے۔ ان کا کلیات جس کو میں نے مرتب کیا ہے، ممکن ہے زیدی صاحب کے پاس بھی ہوگا۔ اس کی ابتدا حمد سے ہوئی ہے اس میں پہلی گیارہ غزلیں حمد میں ہیں، اس کے بعد نعت ہے۔ ردیف میم میں ان کا ایک بڑا شاندار قصیدہ نعت میں ہے۔ "کلام بے نظیر" میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ مجھے سوئے اتفاق سے ایک شعر بھی یاد نہیں، اور کتاب یہاں نہیں ہے۔ ●●

# رسالۂ تذکرات

از

## گارسین دتاسی

مترجم

## شمس العلماء منشی ذکاء اللہ دہلوی

مرتبہ

## ڈاکٹر تنویر احمد علوی

# گارسین دُتاسی

گارسین دتاسی ۱۷۹۴ء میں مارسیلز میں پیدا ہوا جہاں اس کا باپ جوزف ژاں گارسین تجارت کرتا تھا۔ دتاسی کو شروع ہی سے مشرقی زبانوں کے مطالعہ سے دلچسپی تھی چنانچہ اپنی رسمی تعلیم کی منزل سے گذرنے کے بعد بیس برس کی عمر میں اس نے عربی کی تحصیل شروع کی۔ جلد ہی اسے اس امر کا احساس ہوا کہ مارسیلز میں رہ کر وہ اپنے ذوقِ علمی کی تشفی کا سامان نہیں بہم پہنچا سکتا چنانچہ ۱۸۱۷ء میں وہ مارسیلز سے پیرس چلا آیا، جہاں اس نے اپنے عہد کے مشہور مستشرق سلوستر دساسی سے السنۂ شرقیہ کا درس لینا شروع کیا اور چار سال کی لگاتار محنت کے بعد وہ عربی فارسی اور ترکی زبانوں میں فی الجملہ دسترس حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ تعلیم کے اختتام پر اس نے مقدسی کی کتاب کشف الاسرار عن حکم الطیور والازہار کو متن اور فرانسیسی ترجمہ کے ساتھ شائع کیا۔ اسی زمانہ میں وہ اپنے معلم دساسی کی سعی و سفارش پر فرانسیسی کالج (برائے السنۂ شرقی) کا [illegible] مقرر ہوا۔ اسی سال دسمبر ۱۸۲۲ء کو اس نے شادی کی۔ ۱۸۲۲ء میں فرانس کی مشہور ایشیاٹک سوسائٹی قائم ہوئی تو وہ اس کا آنریری سکریٹری اور ناظم کتب خانہ مقرر ہوا۔ اسی زمانہ میں اسے اردو سیکھنے اور اس میں مہارت بہم پہنچانے کی ضرورت کا احساس پیدا ہوا۔ اس نے انگلستان کا سفر کیا اور ایسے انگریزوں سے یہ زبان سیکھی جو ہندستان میں رہ چکے تھے اور جنھوں نے ہندستانی زبان کے قواعد اور لغت نویسی سے متعلق کام کیا تھا۔ سلوستر کے مشورہ پر جب پیرس میں اردو زبان کی تدریس کا باقاعدہ [illegible] تسلیم کیا گیا تو پہلے وہ عارضی طور پر اردو کا پروفیسر مقرر ہوا بعد ازاں اس تقرر کو مستقل حیثیت دیدی گئی اور بقیہ عمر اس نے فرانس میں اردو زبان کی تعلیم و تدریس اور اس کو مقبول بنانے کی مختلف کوششوں میں صرف کی۔

وہ ہندستان و انگلستان کی علمی انجمنوں اور ادبی اداروں سے برابر خط و کتابت رکھتا

تھا، کتابیں منگواتا اور اخبارات حاصل کرتا نایاب کتابوں کی نقلیں مہیا کرنے کی سعی کرتا اور ہر نئے عیسوی سال کے شروع میں وہ گذرنے والے سال کی علمی وادبی سرگرمیوں سے متعلق ایک مبسوط خطبہ دیتا جس میں اردو کتابوں اور رسالوں، اخباروں، مصنفوں سے متعلق تفصیلی معلومات ہوتی تھیں اس کا سلسلہ ۱۸۵۰ء سے ۱۸۶۹ء تک جاری رہا۔

وہ اردو زبان وادب کی تاریخ مرتب کرنے سے گہری دلچسپی رکھتا تھا جس کی نشان دہی اس کے خطبوں سے بھی بخوبی ہو جاتی ہے۔ رسالہ تذکرات بھی اسی سلسلہ سے تعلق رکھتا ہے جس کے بارے میں مولانا عبدالحق نے "خطبات گارساں دتاسی کے مقدمہ میں لکھا ہے۔

"مصنف اپنی کتاب کے پانچویں خطبہ میں کچھ اضافہ کر کے اسے ہندوستانی مصنفین اور ان کی تصانیف کے نام سے الگ کتابی صورت میں شائع کیا تھا میں نے پانچویں خطبہ کی بجائے (کذا) اس اضافہ شدہ مقالہ کو اسی کتاب میں درج کر دیا ہے۔

(خطبات مقدمہ: ب)

یہاں مولانا سے سہو ہوا ہے انھوں نے اس مقالہ کو اسی خطبہ میں شامل کر دیا ہے۔

ان خطبات کے علاوہ اس کے ادبی کارناموں میں میر کی مثنوی "اژدر نامہ" تحسین الدین کی مثنوی "کام روپ وکلا" سرسید کی کتاب "آثار الصنادید" اخوان الصفا کے اقتباسات۔ تاج الملوک وگل بکاؤلی اور میر امن کی کتاب "باغ و بہار" کے تراجم، اور کلیات ولی کی ایڈیٹنگ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کی "تاریخ ادبیات ہندوی و ہندوستانی" کی ترتیب و تالیف اس کی بہترین ادبی تو قعات میں سے ہے۔

اس کا پہلا ایڈیشن رایل ایشیاٹک سوسائٹی برطانیہ عظمیٰ و آئرستان کے سلسلۂ مطبوعات

میں شریک ہے۔ اسے مصنف نے ملکۂ معظمہ برطانیہ کے نام پر ان کی اجازت سے معنون کیا تھا۔ اس ایڈیشن کی پہلی جلد ۱۸۳۹ء میں اور دوسری ۱۸۴۷ء میں شائع ہوئی اس درمیانی وقفہ میں بہت سا نیا مسالہ جمع ہوگیا جو بطور ضمیمہ شائع کیا گیا، وقت کے ساتھ ساتھ جدید معلومات کا اور اضافہ ہوتا گیا اور آخر ۱۸۷۰ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا جو تین جلدوں میں ہے۔

۲ دسمبر ۱۸۷۸ء کو ۸۴ برس کی عمر میں دتاسی کا انتقال ہوگیا، لاش مارسیلز لیجائی گئی اور سینٹ پیٹر کے قبرستان میں دفن ہوئی۔

(ملاحظہ ہو مقدمہ عبدالحق خطبات گارساں دتاسی۔ اردو ادب سنہ ۱۹۲۰ء شمارہ ۱)

---

# شمس العلماء منشی ذکاء اللہ دہلوی

منشی ذکاء اللہ دہلوی قدیم دہلی کالج کے طلباء میں سے تھے اور ان کا شمار اپنے وقت کے صاحب علم وفضل بزرگوں میں ہوتا تھا۔
۱۸۳۲ء میں دہلی میں پیدا ہوئے والد کا نام حافظ ثناء اللہ تھا جو مرزا کوچک سلطان بہادر شاہ ظفر کے سب سے چھوٹے بیٹے کے اتالیق تھے۔
منشی ذکاء اللہ بارہ برس کی عمر میں قدیم دہلی کالج میں داخل ہوئے جہاں اس زمانہ میں (مولوی) نذیر احمد اور (مولانا) محمد حسین آزاد بھی زیر تعلیم تھے۔ تعلیم سے فراغت پانے کے بعد اسی کالج میں ریاضی کے معلّم مقرر ہوئے۔ اس کے بعد آگرہ کالج میں فارسی کے پروفیسر مقرر ہوکر گئے۔ سات آٹھ برس تک تعلیمی لائن میں رہنے کے بعد گیارہ سال تک ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدے پر فایز رہے ۱۸۶۹ء میں دلی نارمل اسکول کے مدرس اعلیٰ مقرر ہوئے ۱۸۷۳ء میں اورنٹیل کالج لاہور کی پروفیسری کے واسطے نامزد کئے گئے مگر اسی اثناء میں ان کو سینٹرل کالج الہ آباد میں عربی و فارسی کے پروفیسر کی جگہ مل گئی اور وہ لاہور کے بجائے الہ آباد چلے گئے جہاں ۲۶ برس کی سرکاری خدمت کے بعد پنشن پائی اور تقریباً چوبیس برس گورنمنٹ کی پنشن سے بہرہ یاب رہ کر ۱۹۱۰ء میں انتقال کیا (تاریخ ادب اردو۔ نثر: ۶۲ - ۶۱)
مولانا کثیر التصانیف شخص ہیں انھوں نے ترجمہ تالیف، اور تصنیف کی صورت میں مختلف علوم و فنون سے اپنی دلچسپی کی بہت سی یادگاریں چھوڑی ہیں، تاریخ، ادب اخلاقیات اور ریاضی ان کے خاص موضوعات ہیں۔ رسالہ تذکرات کا ترجمہ تاریخ زبان وادب سے دلچسپی کی ایک مثال ہے۔ غالباً یہ ترجمہ انھوں نے دہلی نارمل اسکول کی ہیڈ ماسٹری ۱۸۶۹ء تا ۱۸۷۲ء کے مابین یا اس سے کچھ پہلے کیا اس لئے کہ صاحب خزینۃ العلوم نے اپنے تذکرہ میں ان کا تعارف نارمل اسکول کے ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے کرایا ہے، اور ایک موقعہ پر اس رسالہ کا حوالہ دیا ہے۔

(ملاحظہ ہو خزینۃ العلوم: ۴۶)

# تعارف

اردو شعروادب کے تاریخی اور تحقیقی مطالعے کے لئے تذکرے کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان تذکروں کے مطالعے کے بغیر نہ قدیم شعروادب کے فکری میلانات کو سمجھا جا سکتا ہے، نہ اس عہد کے تنقیدی شعور کا جائزہ لیا جا سکتا ہے اور نہ اس کے فنی معیاروں کو پرکھنے کی کوشش ہی کامیاب ہو سکتی ہے۔ غرض کہ قدیم ادب بالخصوص شعری ادب کی تفہیم و تنقید میں تذکروں کا غائر مطالعہ ناگزیر ہے۔

اردو تذکرہ نگاری کا آغاز فارسی کے زیر اثر ہوا، کیونکہ اس دور کی مختلف اصناف ادب میں فارسی نمونوں کی تقلید اور اس کی ادبی روایات کی نمایندگی کو معاشرے میں عیار و اعتبار کا درجہ حاصل تھا اور فارسی کے بعض تذکروں میں ان شاعروں اور ادیبوں کا ترجمہ شامل ہو چکا تھا جو فارسی کے ساتھ ریختہ میں بھی لکھتے تھے۔ بعد کو جب اردو شاعری کا رواج عام ہوا، تو صرف ریختہ گو شعرا کے تذکرے وجود میں آئے۔

اردو شعرا کے قدیم تذکرے بارہویں صدی ہجری کے نصف آخر سے شروع ہوتے ہیں۔ ان میں نکات الشعرا (میر تقی میر) مخزن نکات (قائم چاندپوری)، گلشن گفتار (خواجہ خان حمید)، تذکرہ ریختہ گویاں (فتح علی حسینی) نسبتاً زیادہ قدیم ہیں اور تھوڑے بہت فرق کے ساتھ تقریباً ایک ہی زمانے میں لکھے گئے۔

ان تذکروں کے مولف غالباً ایک دوسرے کی کوشش سے بالکل بے خبر نہ تھے چنانچہ میر نے محمد یار خان خاکسار کے ترجمے میں لکھا ہے: "برعکس ایں تذکرہ، تذکرہ نوشتہ بنام مشوق چہل سالہ خود"۔ اگر یہ بیان بعد کا اضافہ نہیں ہے، تو اس کے یہی معنی ہو سکتے

ہیں کہ میر کے تذکرے کے ساتھ ساتھ خاکسار نے بھی ایک تذکرہ لکھا تھا جس کا نام انھوں نے اپنے کسی ایسے دوست کے نام پر رکھا تھا، یا اس کے نام سے لکھا تھا جس کی عمر چالیس سال کی تھی (میرے خیال میں " بنام معشوق چہل سالۂ خود " سے مراد یہ نہیں ہے کہ خاکسار نے اس تذکرے کا نام " معشوق چہل سالۂ خود " رکھا تھا)

بعض حضرات نے سودا کے تذکرے کا بھی ذکر کیا ہے۔ ممکن ہے وہ بھی اسی ابتدائی دور سے متعلق ہو اگرچہ خاکسار کے تذکرے کی طرح اب دستیاب نہیں ہوتا۔

دکن بالخصوص اورنگ آباد میں بھی اسی عہد میں بعض تذکرے لکھے گئے اور جب رفتہ رفتہ شمالی ہند کے دوسرے شہروں میں اردو کے مرکز قائم ہوتے گئے تو تذکرہ نویسی کا دائرہ بھی وسیع ہوتا چلا گیا۔ تذکرہ گلزار ابراہیم، تذکرہ مسرت افزا اور تذکرۂ شعرائے اردو اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔

بہرحال بارھویں صدی ہجری کے نصف آخر سے لے کر تیرھویں صدی ہجری کے ربع ثالث تک یہ تذکرہ نگاری کا سلسلہ قدیم انداز پر جاری رہا اور کئی تذکرے لکھے گئے لیکن تعجب ہوتا ہے کہ خود تذکرہ نگاروں نے ایک دوسرے کا بہت کم ذکر کیا ہے۔ حالانکہ شعر و سخن کی انجمنوں کی طرح تذکرہ نویسی کی محفل میں بھی چراغ سے چراغ جلے ہیں ایک نے دوسرے سے استفادہ کیا ہے نیز معاصرانہ چشمک اور ادبی گروہ بندیوں کے زیر اثر ایک دوسرے پر اعتراضات بھی کئے ہیں۔ بعض کے یہاں تو سرقہ تک کا الزام بھی موجود ہے لیکن اس داد و ستد میں جو کہیں کہیں دارو گیر کا درجہ بھی اختیار کر لیتی ہے الا ماشاء اللہ کسی نے بھی سنجیدگی سے اس بات کی کوشش نہیں کی کہ اپنے سے پہلے تذکروں کا جائزہ لیتا، یا کم از کم اپنے ماخذ کی جانب ہی اشارہ کر دیتا جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ اس کے سامنے کون کون سے تذکرے رہے تھے یا کونسا تذکرہ سے اس کی تالیف کی اساس رہا ہے۔ شروع کے تذکرہ نگاروں سے اس کی توقع کو شاید بیش از وقت کہہ لیں لیکن بعد کو بھی کسی نے اپنے ماخذ کی واضح طور پر نشاندہی کو ضروری خیال نہیں کیا۔

تذکروں کی تاریخی اہمیت کا خیال سب سے پہلے بعض مستشرقین کے ذہن میں آیا د تاسی

ے

کا نام اس ضمن میں سرفہرست ہے اس نے ۱۸۲۷ء میں اردو شاعری کی تاریخ لکھنے کا عزم کیا۔ وہ اپنے پانچویں خطبہ (۴ دسمبر ۱۸۵۴ء) میں کہتا ہے![1]

"۱۸۲۸ء سے جب کہ نامور گل کرسٹ نے، جو انگریزوں میں ہندوستانی زبان کی تعلیم اور مطالعہ کا بانی ہوا ہے، اپنی اردو قواعد میں ایک تذکرہ کا حوالہ دیا، مجھے اس زبان کی ادبی تاریخ کا شوق پیدا ہوا بمنوار تحقیق اور تلاش سے مجھے سات تذکرے دستیاب ہوئے اور باوجود ناکافی سامان کے میں نے ہندوستانی ادب کی تاریخ لکھی جو اگرچہ ایک ناکمل تالیف تھی۔ لیکن اپنی نوعیت کی ایک ہی کتاب ہے، اور ۱۸۳۹ء میں شائع ہو چکی ہے۔ اس کتاب کا ہندوستانی زبان میں بھی ترجمہ ہو گیا ہے اور اس سے انگریز مستشرقین میں بھی اس زبان کے متعلق شوق پیدا ہو چلا ہے۔ ان کی اور میری تحقیقات نے مل کر بہت سے نئے تذکروں کا پتہ چلایا، مگر میں ان سے زیادہ استفادہ نہ کر سکا کیونکہ ان میں بھی متعدد تذکرے ایسے ہیں جو اب تک دستیاب نہیں ہوئے،

---

۱۔ خطبات گارسان دی تاسی: ۶۶

"اس کتاب کا پہلا ایڈیشن رائل ایشیاٹک سوسائٹی برطانیہ عظمیٰ و آئرستان کی تالیس تراجم کے سلسلۂ مطبوعات میں شریک ہے۔ اسے مصنف نے ملکۂ عظمیٰ برطانیہ کے نام پر معنون کیا تھا۔ اس ایڈیشن کی پہلی جلد ۱۸۳۹ء اور دوسری ۱۸۴۷ء میں شائع ہوئی اس درمیانی دفعہ میں بہت سا نیا مسالہ جمع ہو گیا، جو بطور ضمیمہ شائع کیا گیا۔ مرور زمانہ سے جدید معلومات کا اضافہ ہوتا گیا اور آخر ۱۸۷۰ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا، جو تین جلدوں میں ہے۔"

دیباچہ (مولوی عبدالحق) خطبات گارسان دی تاسی: ۵

اور بعض مصنفین نے ان کا حوالہ اپنی کتاب میں دیا ہے ابھی بہت
سے ایسے ہونگے جن کا نام ونشان مجھے اب تک معلوم نہیں ہوا"

دُ تاسی نے اپنی تاریخ کے اس پہلے ایڈیشن کی تیاری میں جن تذکروں سے مدد لی ہے، وہ یہ ہیں :

(۱) نکات الشعراء (میر تقی میر)؛ (۲) تذکرہ شعرائے اردو (مصحفی)؛ (۳) تذکرۂ فتح علی حسینی گردیزی؛ (۴) گلزار ابراہیم (نواب ابراہیم علیخاں)؛ (۵) گلشن ہند (لطف)؛ (۶) دیوان جہاں (بینی نرائن)؛ (۷) گلدستۂ نشاط (منولال) [۱]

۱۸۳۹ء اور ۱۸۵۴ء کی درمیانی مدت میں [۲] جن ماخذ تک دتاسی کی رسائی ہوئی اس نے اپنے اس خطبے میں اُن پر روشنی ڈالی ہے [۳]

مجھے ہندستانی مصنفین کے تقریباً ستر تذکروں اور انتخابات وغیرہ کا علم ہے یہ ایک بہت بڑا ذخیرہ ہے لیکن ہندستان کی ادبی تاریخ میں ان سے کوئی کام نہیں لیا جاتا

غالباً یہی خطبہ زیر نظر اساسی طور پر رسالۂ تذکرات کا ماخذ ہے۔ مولوی عبدالحق نے اس خطبے کے ضمن میں لکھا ہے کہ دُ تاسی نے اسے ایک الگ رسالے کی صورت میں بھی شائع کیا تھا ۶۸ سے ۱۰۰ تک موجود نہیں رسالے میں بعد میں اضافہ کیا گیا ہے [۴]

---

۱۔ طبقات شعرائے ہند (مولوی کریم الدین) : ۹

۲۔ اسی اثناء میں ڈاکٹر اشپرنگر نے فہرست کتب خانہ اودھ مرتب کی۔ اس کی پہلی جلد ۱۸۵۴ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی اس کا پہلا باب تذکروں سے متعلق تھا اس میں شعرائے اردو کے مندرجۂ ذیل تذکروں کی نشان دہی کی گئی ہے :۔ نکات الشعرا (میر) تذکرۂ ریختہ گویاں] (گردیزی) مخزن نکات (قایم) گلزار ابراہیم (علی ابراہیم خاں) تذکرہ شورش (شورش) تذکرۂ ہندی (مصحفی) تذکرہ عشقی (عشقی) گلشن ہند (مرزا لطیف) عیار الشعرا (ذکا) عمدۂ منتخبہ (سرور) مجموعۂ نغز (قدرت اللہ قاسم) طبقات سخن (مبتلا عشق) دیوان جہاں (بینی نراین جہاں) گلدستۂ نشاط (منولال) گلشن بیخار (شیفتہ) گلشن بیخزاں [گلستان بیخزاں] (قطب الدین باطن) انتخاب دواوین (صہبائی) گلدستۂ نازنین [گلدستۂ نازنیناں] (مولوی کریم الدین) تذکرہ [طبقات شعرائے ہند] (مولوی کریم الدین) چمن بینظیر (محمد ابراہیم) [یادگار شعرا: ۹-۱۰]

۳۔ خطبات گارساں : ۶۶ ۔ ۴۔ خطبات گارسیں دتاسی ،

## رسالہ تذکرات

رسالہ تذکرات کب شائع ہوا، اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔ دتاسی نے اس کے متن میں اپنی تاریخ کی اشاعت ثانی (۱۸۷۰ء) کا کہیں ذکر نہیں کیا:[۴] اس سے خیال ہوتا ہے کہ شاید یہ رسالہ ۱۸۷۰ء سے پہلے شائع ہو چکا تھا۔ پہلے فرانسیسی زبان سے انگریزی میں ترجمہ کیا گیا۔ مترجم کون تھا اور کس سن میں ترجمہ کیا گیا اس کا حال معلوم نہیں۔ اردو میں یہ ترجمہ جس کا متن یہاں پیش کیا جا رہا ہے منشی ذکاء اللہ نے کیا تھا۔ اس کا ثبوت ایک اس خطبے میں نمبر ۶ پر آنے والے خود اس کے ذکر سے بھی فراہم ہوتا ہے جس کی عبارت یہ ہے:

> "مختصر احوال مصنفان ہندی کے تذکروں کا اس کا دوسرا نام رسالہ، ارباب تذکروں کا (کذا) مؤلف اس کے ذکاء اللہ دہلوی ہیں یہ رسالہ ہذا کے پہلے ایڈیشن کا محض ترجمہ ہے اور کچھ بھی نہیں۔"
>
> "جناب فضیلت مآب منشی محمد ذکاء اللہ۔۔ اپنے ایک رسالہ اور حصہ خزینۃ العلوم کے اس میں بھی سابق میں جو تذکروں کے تذکرے میں انگریزی سے تیار ہوا تھا۔ زیب ارقام فرماتے ہیں کہ ڈی تاسی صاحب فرانسیسی نے فرنچ زبان میں ایک تذکرہ ہندی شاعروں کا لکھا ہے۔[۵]"

خزینۃ العلوم مارچ ۱۸۷۶ء (ربیع الاول ۱۲۹۳ھ) میں مطبع مفید عام لاہور سے پہلی بار شائع ہوا تھا۔ اس سے ثابت ہوا کہ اردو میں رسالہ تذکرات کی اشاعت اس سے پہلے عمل میں آ چکی تھی۔

منشی ذکاء اللہ دہلوی نے جو اس کے مترجم ہیں اس کے ساتھ ایک مختصر دیباچہ بھی لکھا ہے، جس سے اس کے ماخذ اور سبب تالیف یا ترجمہ کا علم تو ہو جاتا ہے، لیکن زمانۂ اشاعت پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔

---

۴۔ خطبات گارساں دی تاسی: ۱۰۹: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دتاسی نے اس کے متن میں ایک سے زیادہ مرتبہ ترمیمیں اور اضافے کیے۔ ۵۔ خزینۃ العلوم۔

[۶] اس کتاب کی فہرست ماخذ کے ضمن میں بھی اس رسالے کا حوالہ موجود ہے۔

متن تسامحات اور فروگذاشتوں سے خالی نہیں اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ "یہ ترجمہ در ترجمہ" ہے۔ پہلے کسی صاحب علم نے اسے فرانسیسی زبان سے انگریزی میں منتقل کیا۔ پھر یہ انگریزی سے اردو میں آیا تلفظ کا اختلاف بھی غالباً بعض فروگذاشتوں کا سبب بن گیا اس کی ایک سے زیادہ مثالیں اس متن میں مل جاتی ہیں اور اس وقت یہ صورتِ حال اور زیادہ وضاحت کے ساتھ سامنے آتی ہے، جب ہم اس متن کا تقابل خطبات کے متن سے کرتے ہیں مثال کے طور پر ہندی تذکروں یا کب مالاؤں کے ضمن میں آنے والی ایک کتاب کا ذکر زیر نظر متن ان الفاظ میں کیا گیا ہے:۔

"سجن چرترا ۔ یہ ہندی زبان میں ہے اور اچھے اچھے آدمیوں کا ذکر اس میں ہے ۔ دو سو شاعروں کا احوال اوس میں مندرج ہے ۱۷۴۸ء میں سدا ماکوی یا سدا ما شاعر نے اسے تصنیف کیا ہے ۔ افسوس ہے مجھے اس کا حال کما حقہ نہیں معلوم"۔

اسی کتاب کا ذکر خطبات میں اس طرح کیا گیا ہے :

"افسوس ہے کہ مجھے "سجان چرتر" کے متعلق زیادہ واقفیت نہیں ہے اس میں دو سو سے زیادہ ہندی شاعروں کا حال ہے ۔ سودن کوی نے ۱۷۴۸ء میں لکھی[۶]"۔

یہاں کتاب کا نام بھی تلفظ کے ساتھ بدل گیا ہے اور شاعر کا نام بھی جب کہ اس کتاب کے سلسلے میں موخر الذکر روایت زیادہ صحیح ہے ۔ بعض ناموں کا اختلاف بھی اسی اختلاف تلفظ کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے ۔ مثلاً تذکرہ مسرت افزا کے مؤلف کا نام ابوالحسن کے بجائے ابوالقاسم لکھا گیا ہے اور شاہ محمد کمال یا کمال الدین حسین کا نام کامل درج کیا گیا ہے ۔ "راگ کلپ درم" کو "راجہ کلپا دھرما" لکھا ہے ، اور قوسین میں اس کا ترجمہ "اچھے راگوں کا درخت" دیا گیا ہے ۔ "مجمع الانتخاب" کو "مجموعۃ الانتخاب" بنا دیا ہے ۔ اسی طرح

---

۶۔ خطبات گارساں دی تاسی : ۷۰

"عمدۂ منتخبہ" کو "عمدۃ المنتخب" اور "مجالسِ رنگیں" کو "مجلس رنگین" کہا گیا ہے وغیرہ بعض مقامات پر عبارت میں کسی تبدیلی یا صرف نظر سے بات کچھ سے کچھ ہو گئی ہے۔ مثلاً مصحفی کے سلسلے میں متن زیر بحث کی ایک عبارت اس طرح ہے:۔

"سودا اور جرأت اور انشا، کے آخری زمانے میں مصحفی ہوا ہے اور حاتم کے عین زمانے میں اس کے دیوان کے دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مصحفی کا ہم عصر تھا۔ قائم جس نے مصحفی کو دلی میں کچھ سکھایا پڑھایا تھا، بہت شعر اپنے تذکرہ میں اس کے لکھتا ہے۔"

یہ عبارت خطبۂ (۱۸۵۴ء) میں اس طور پر ملتی ہے:

"ان کی شہرت اسی دور کے آخر میں ہوئی شروع ہوئی جس میں سودا۔ جرأت اور انشا کا دور دورہ تھا۔ وہ حاتم کے بھی ہم عصر رہے ہیں جیسا کہ قائم کے دیوان زادہ کے دیباچے سے معلوم ہوتا ہے۔"

یہ بیان تسامحات سے بھی خالی نہیں ہے۔ مصحفی، سودا اور حاتم کے شریک عصر ضرور ہیں، لیکن معاصر نہیں سمجھے جا سکتے۔ سودا کا انتقال ۱۱۹۵ھ میں ہوا؛ حاتم کا ۱۲۰۲ھ جرأت کا ۱۲۲۵ھ میں اور انشا، کا ۱۲۳۳ھ میں جب کہ مصحفی کا انتقال ۱۲۴۰ھ میں ہوا تھا اس طرح سودا اور انشا کا آخری زمانہ ایک نہیں ہو سکتا۔ حاتم نے اپنے دیباچہ اور قائم نے اپنے تذکرے میں مصحفی کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ خود مصحفی نے اپنے تذکرۂ ہندی میں حاتم کا ترجمہ پیش کرتے ہوئے ایک موقعہ پر دیوان زادہ کا حوالہ دیا ہے: اور قائم کے ترجمے میں اس کے اشعار کا طویل انتخاب دیا ہے۔

تسامح کی ایک ایسی ہی مثال شاد کمال کے تذکرہ کے ایک حوالے کے ساتھ اکبر شاعر کے حالات میں ملاحظہ ہو۔

"کامل (کمال) کے کلام سے جس نے اکبر (نواب اکبر علی خاں) شاعر کی تقلید میں

---

۷۔ خطبات گارساں دی تاسی: ۸۳

ایک تذکرہ لکھا تھا، مترشح ہوتا ہے کہ اکبر نے جب تذکرہ لکھا تھا تو چالیس تذکرے اردو شعرا کے (اس کے پاس تھے)"

خطبات میں عبارت یہ ہے:۔

"کمالؔ نے اپنا تذکرہ اکبر شاعر کی فرمایش سے ۱۸۰۴ء میں تصنیف کیا۔ اس تذکرے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اکبر نے کئی سال قبل چالیس ہندستانی تذکرے بہم پہنچائے تھے[8]"

مولوی عبدالحق مرحوم خطبات کے حاشیے میں اس غلطی کی نشان دہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مصنف کو کمالؔ کی عبارت کے سمجھنے میں کچھ سہو ہوا ہے۔ اول تو اس نے کہیں یہ نہیں لکھا کہ اس نے یہ تذکرہ اکبر کی فرمایش سے لکھا۔ دوسرے کمالؔ نے چالیس کے ساتھ "دواوین" کا لفظ لکھا ہے جسے مصنف نے تذکرے خیال کیا۔ تیسرے یہ سامان خود کمالؔ نے جمع کیا تھا، نہ کہ اکبر نے۔ اصل عبارت یہ ہے:۔

بعدازاں قریب چہل دواوین ریختہ گویاں کہ ہمراہ فقیر بود از یکطرف سیر بہ دواوین ساختہ۔ بعدازاں خود شوق شعر گفتن آغاز نمودہ، رجوع ایں معنی بفقیر آوردہ بعرصۂ چند بہ فیض کلام سخنوراں کلام خود را بہ پایہ اعتبار کشیدہ" رجوع ایں معنی سے مراد یہ ہے کہ مجھ سے اصلاح لینے لگا اس کا مطلب مصنف یہ سمجھا کہ تذکرہ لکھنے کی طرف توجہ دلائی"

"ایسے تسامحات کا تعلق ظاہر ہے کہ ترجمے سے نہیں ہے، مواد کی تحقیق اور چھان بین پورے طور پر نہیں ہو سکی[9]۔

پیش کیے جانے والے متن اور خطبہ چہارم کے متعلقہ حصے کی عبارتوں کے باہمی تقابل سے

---

۸- خطبات گارسان دی تاسی: ۴۷

۹- ایضاً: ۶۱

پتا چلتا ہے کہ دونوں میں طرزِ عبارت اور اسلوب ادا کے علاوہ بعض تفصیلات یا روایت کا بھی اختلاف ہے ایک مثال ملاحظہ ہو۔

"سات تذکرے آخری صدی کے لکھے ہوئے ہیں اور پندرہ ایک
زمانے کے اور متاخرین نے چھ تذکرے اردو میں لکھے ہیں"

یہ عبارت خطبات میں اس طرح ہے:-

"آٹھ تو گزشتہ صدی کے ہیں اور انیس ہماری صدی (انیسویں صدی)
کے ان انیس میں سے صرف آٹھ ایسے ہیں جو ہندوستانی زبان میں لکھے گئے ہیں"[1]

رسالہ تذکرات کی زبان قدیم ہے، املا میں بھی قدامت کا اثر ہے مثلاً اس کو (اوس کو) ان کو (اون) اس نے کو (اسنے) اور جس سے کو (جسسے) لکھا ہے۔ کل متن اٹھارہ صفحات پر مشتمل ہے۔ پہلے صفحے میں ساڑھے ۱۶ اور اخیر کے صفحے میں ساڑھے سترہ سطریں ہیں: باقی صفحوں کا مسطر پچیس سطری ہے (صفحات کی نشان دہی متن کے دوران میں کر دی گئی ہے)

اصلی نسخے کا سرورق ساقط ہو گیا ہے جس سے سن اشاعت معلوم نہیں ہو سکا البتہ آخری صفحے پر تمام شد کے بعد مطبع کا نام درج ہے: مطبع مظہر العجائب میں باہتمام بندہ سرفراز حسین طبع ہوئی۔

جس کا نام پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے کیٹلاگ میں "رسالہ خطبہ ڈی تاسی" دیا گیا ہے۔ یہ لائبریری کے اردو سیکشن میں ہے۔ اور مشاعرہ دہلی ۱۲۹۷ھ گلدستہ انجمن شاعرہ دہلی ۱۳۰۰ھ "شکنتلا ناٹک" اور "انشائے بہار بے خزاں" وغیرہ کتب و رسائل کے ساتھ ایک ہی جلد میں موجود ہے

متن کے حاشیے پر کسی ایسے شخص کے حاشیے ہیں جسے بظاہر تذکروں کے مطالعے سے خصوصی شوق اور شغف رہا ہے اور بعض تذکرے یہ حواشی قلم بند کرتے وقت بھی اس کے

---

۱۔ خطبات گارساں دتاسی: ۔۔۔

سامنے ہیں جس کا ثبوت صفحات کے وہ حوالے ہیں جو ان حواشی میں موجود ہیں۔ یہ حاشیے یادداشتوں کے طور پر قلم بند کئے گئے ہیں۔ ان میں بہت سے دستیاب تذکروں کے علاوہ بعض ایسے تذکروں کا ذکر بھی ہے جو ابھی تک ہماری دسترس سے باہر ہیں۔ حال آنکہ حاشیہ نگار ان سے اپنی ذاتی واقفیت کا اظہار کرتا ہے مثلاً تذکرۂ ہذا سے متعلق لکھتا ہے:

" عاقبت محمود خاں صدر الصدور شاہجہاں آباد عالم متبحر و فاضل جلیل القدر فضیلت علمی کے ساتھ فارسی و ریختہ دونوں زبانوں میں شعر بھی خوب کہتے ہیں۔ مرزا رفیع السودا کے معاصر اور مرزا جانِ جاناں مظہر کے شاگرد تھے۔ آپ نے ایک تذکرۂ شعرائے ریختہ گو کا تالیف فرمایا جو پنڈت کشوری لال کے پاس ہے، راقم الحروف نے دیکھا ہے "

ان حواشی نے متن کی اہمیت کو دو چند بڑھا دیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ دتاسی کی طرح حاشیہ نگار کے بیانات بھی تسامحات سے خالی نہیں۔ نیز بعض ایسی کتابوں کو بھی تذکروں کی ذیل میں پیش کیا گیا ہے، جو دراصل صرف مجموعۂ اشعار ہیں۔ پھر بھی جتنے تذکروں کا ذکر حاشیہ نگار نے کیا ہے، وہ بھی اس دور کے لحاظ سے کچھ کم حیرت کی بات نہیں ہے۔

ہم نے سب سے پہلے منشی ذکاء اللہ دہلوی کا دیباچہ دیا ہے۔ اس کے بعد مطبوعہ متن کی نقل دی ہے۔ اس کے ذیل میں قلمی حواشی درج کئے ہیں۔ بعض غلط اسما اور الفاظ کی قیاسی تصحیح خطوط وحدانی میں دے دی گئی ہے۔ نامعلوم حاشیہ نگار نے اپنے قلم سے متن میں جو اصلاحیں کی تھیں، وہ قوسین میں درج کی گئی ہیں۔

اس کے بعد حواشی الف اور ب میں دتاسی سے متن اور قلمی حاشیوں سے متعلق بعض ضروری توضیحات پیش کی گئی ہیں۔

تنویر احمد علوی

گارسین ڈی ٹیسی ترجمہ:- منشی ذکاءاللہ

# "رسالہ تذکرات"

یہ رسالہ افضلِ فضلائے روزگار و اکملِ کملائے شہر و دیار جناب فیض مآب ڈی ٹیسی صاحب کی تصنیف سے ہے۔ صاحب موصوف فرانس میں تشریف فرما ہیں اور ایسا ذہن خداداد اور طبیعتِ رسا رکھتے ہیں کہ گھر بیٹھے فقط قوّتِ مطالعہ اور زورِ استعداد سے زبانِ اردو و ہندی اور فارسی میں (وہ) کمال پیدا کیا ہے اور واقفیت حاصل کی ہے کہ ان پر اہلِ زبان بھی رشک کھاتے ہیں۔ ان کی تصنیف کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے کیا کچھ تحقیق بہم پہنچائی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ ان صاحب ہی کا کام تھا کہ ایسی اجنبی زبانوں کا علم ایک بلادِ دُور دست میں حاصل کیا اور کسی کی اوستادی کے منت کش نہ ہوئے فقط اپنی جودت طبع اور جہاں کشی اور کتب کے مطالعہ سے ان زبانوں میں ملکہ بہم پہنچایا۔

اس کتاب میں ہندی اور اردو تذکروں کا ذکر ہے اور ان کے مصنفین کا حال بہت تحقیق اور تدقیق سے لکھا ہے اصل کتاب فرانسیسی زبان میں تھی۔ ایک صاحبِ کمال نے اس کے مضامینِ دل نشیں کو ملاحظہ فرما کر انگریزی زبان میں ترجمہ کیا، کیونکہ کتاب قابل اس کے تھی کہ ہندوستانی بھی اس سے مستفید ہوں اور اس کے مطالب عالی سے محروم نہ رہیں اردو میں خاکسار محمد ذکاءاللہ نے ترجمہ کیا۔

## جناب ڈی ٹسی کی تصنیفات سے مختصر احوال

### (الف) مصنفانِ ہندی کے تذکروں کا

سات تذکروں سے زیادہ تذکرے اور مجموعہ انتخابات مجھے معلوم ہوئے ہیں کہ مصنفانِ

ہندی نے تصنیف کیئے .. ہندوستانی علم ادب میں باب تذکروں کا طویل ہے اور اس میں آج تک تحقیقات کافی دوانی نہیں ہوئی اس لئے مختصر احوال اس قسم کی تصنیفات اور مصنفین کا لکھتا ہوں، سابقین لاحقین پر مقدم ہوتے ہیں .. اس لئے ہندی شاعروں کے تذکروں کا ذکر (ث) جو قدیم ہیں اور ان سے زمانۂ دور و دراز کے شاعروں کے احوال پر علم ہوتا ہے بیان کرتا ہوں ..

بھگت مالا۔ (بھگتوں کی مالا) اس کتاب میں ہندوؤں کے وشنوا قوم کے گروہوں کا احوال ہے جنہوں نے مذہبی کوششیں بنائی ہیں، زبان ہندی در حقیقت صلوان دین ہنود کی بولی ہے لیکن وشنوا کا قدیم فرقہ سنسکرت ہی کا معتقد رہا اور ہندی زبان میں مرتبہ ترقی کا حاصل نہ کیا۔ بھگت مال کے بہت سے نسخے ہیں لیکن اصل سب کی یہی اشعار ہیں جن کو چوپائی اس سبب سے کہ ان میں چھ یا چھ سے زیادہ مصرعے اشتباہ بالائی ہوتے ہیں، کہتے ہیں آخر دو مصرعہ ہر بجھن کے اول مکرر سہ کرر آتا ہے ان میں عام فہم اشعار جنمی وشنوا قوم کے گروہوں کے باب میں ہوتے ہیں یا مضامین مذہبی قدیم ہندی زبان میں ثابت ہوئے ——

نوبھاجی جو اندھے مادر زاد پیدا ہوئے تھے اور جن کی نیک طینتی و خوش سیرتی بہت مشہور ہے اور حقیقت میں انہوں نے ہی ان بجھنوں کو سنہ ۱۵۷۴ء میں الفاظ سلیس میں لکھا تھا۔

شاہ جہاں کی سلطنت میں سنہ ۱۰۲۹ھ [ ۱۶۲۸ | سنہ ۱۶۵۹ء کے درمیان نرائن داس نے پھر اس نظم کی ترمیم کی اور سنہ ۱۷۱۳ء (میں) اول کرشنا داس اور عنبر نرائن داس نے اس پر شرح ہندی زبان کے محاورات میں بخط ناگری لکھی راجہ ساگر مصنف راج کلپا در مانزا آٹ کلپ دم ؟

---

: تذکرہ حسینی - میر حسین دوست سنہ ۱۱۶۸ [ ۱۱۶۸ ] سنبھلی کی تصنیف ہے اگرچہ یہ تذکرہ فارسی شعرا کا ہے مگر اس میں ہندی گو شاعر بھی بہت ہیں ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فارسی عربی ترکی و ہندی میں عمدہ شعر کہتے تھے سنہ ۱۱۶۳ھ میں لکھا گیا تھا جو سنہ ۱۲۹۲ھ کو منشی نول کشور کے مطبع میں چھپ گیا ہے بڑا عمدہ تذکرہ ہے۔

کا ترجمہ ہم عصران مصنفین کا تھا، اور جس کا ذکر ابھی میں کروں گا اس نے ارادہ اس کتاب کے چھپوانے کا کیا تھا لیکن معلوم نہیں اس کا ظہور بھی ہوا یا پردۂ عدم ہی میں رہا۔ بھگت مال کا ایک نسخہ اردو میں بھی ہے۔ لیکن اس کے حال پر مجھے آگاہی نہیں۔ ٹیپ کو جو متصل بیان کیے گیے ہیں، بھجنوں سمیت بھگت مال کہتے ہیں، اس میں ہر شاعر کا احوال چرپائی سے شروع ہوتا ہے اسی لئے ہر بھجن کو ٹیپ مال کہتے ہیں اور اس کی شرح کو ٹیکا ادب ہندی کی تاریخ چھپنے سے پہلے میں نے فقط نسخۂ کرشن داس کا مطالعہ کیا تھا اور بعد ازاں پرماداس کا نسخہ جس کی قلمی نقل میرے ہاتھ لگی اور مجھے یقین ہے کہ وہ تمام یورپ میں ایک ہی

چھپی ... تھا

پرماداس ... ـــــــ پیاریوں کا لوک کرشنا سے نسبت فرزندی کی رکھتا ہے اور کرشنا بنگالے کا باشندہ ہے اس تنلی کے ہندو ہندوی زبان کو ایسا ہی پڑھ لکھ سکتے ہیں جیسے اپنی ... زبان کو، اور مسلمان اردو کا اسی طرح مطالعہ کر سکتے ہیں جیسے اضلاع مغربی وشمالی ... اسلام ... ایک وشنو کی خاص فرقہ کا جس کا بانی نبتیانند ہے، ولی تھا اور ... نے ... بھگت مال کی گیتوں میں لکھی ہے اور نام اس کا بھگت رماس مدبانی ہے ... حاشیے اس نے بھگت مال پر لکھے ہیں اسے بھگت مال پر کبک (کبت) گفتگو بھگت مال پر کہتے ہیں۔ اس مصنف کا نام بھاگوت کی تصنیف سے بہت مشہور ہے ... کا پد دھرما (اچھے رایوں کا درخت) (کذا) اس کے قریب اٹھارہ سو صفحے کے ہونگے اور اس میں اشعار عام فہم مجتمع ہیں۔ مجموعہ کرشنا [۳] نند باسدیو نے جس کو خطاب

---

[۳] تذکرہ علما عادل شاہی ... ابراہیم عادل۔ سلطان بیجاپور دکنی نے نورس نامی ہندی علم موسیقی کی (تاریخ) دو جلدوں میں تالیف کی ہے اس کی اول جلد میں عمدہ عمدہ راگ راگنیوں کا بیان ہے جلد دوم میں کبت اور دوہرہ اور ریختہ جو اس وقت کی رائج الوقت زبانوں میں مروج تھے جمع کیے۔ یہ بادشاہ ۱۰۳۵ھ کو فوت ہوا۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

سلطانی راجہ ساگر کا ملا تھا بنایا ہے اس کی شہرت کتاب من راجہ ساگر چھپوانے سے اس نام سے ہوگئی ہے گویا یہ خطاب تخلص اس کا ٹھیر گیا ذات کا گوڑ برہمن تھا اور دوارکوٹ یا اودے پور کا جو میواڑ کا ایک ضلع ہے۔ رہنے والا، اس نے بارہ لاکھ پچیس ہزار اشعار اکھٹے کئے تھے۔ سنہ ۱۸۴۲ء میں کلکتہ کے اندر یہ مجموعہ اشعار چھپنا شروع ہوا اور صورت سنہ ۱۸۴۵ء میں اختتام کی پائی۔ اس کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے یہ سرمایہ بائیس برس کی محنت و جان کاہی سے جمع کیا تھا اور سب شعرائے اکابر و نامآور کے کے اشعار بہم پہنچا کر کے لکھے تھے، اس کے کئی حصے ہیں، ان میں سب سے بڑے یہ سات ہیں اول حصے میں ایک سو چونسٹھ صفحے ہیں اور مختلف راگوں کے اشعار سے مزین ہیں حصہ دوم میں چھ سو صفحے اس میں سر د کذا ہرساگر کے ہیں حصہ سوم میں ۳۴۴ صفحے

---

(حاشیہ گذشتہ سے پیوستہ) نصرتی دکنی بیجاپوری ملازم سلطان عادل شاہ مذکور، تذکرہ گلدستۂ عشق،[3] اس کی تالیف ہے جس میں دکنی و ہندی شعر کا کلام جمع کیا ہے۔ تواریخ عادل شاہی،[4] بھی اس کی تصنیف ہے۔

تذکرہ قطب شاہی[5] یہ مجموعہ سلطان قلی قطب شاہ بادشاہ دکن نے سب دیوان ہندوستانی اور بنگالہ کی زبان کے جمع کر کے ان کا انتخاب کیا اور ہر شاعر کے ساتھ اس کے حالات بھی اس میں شامل کر کے اس کی شان کو اور بھی دو بالا کیا اور یہ بادشاہ سنہ ۹۸۹ھ کو تخت نشین ہوا تھا۔ سنہ ۱۰۲۱ھ کو انتقال کیا۔ معراج نامہ او ردیوان قطب شاہی اس کی یادگار ہیں۔

مجموعہ دواوین دکھنی و ہندی[6] یعنی تذکرہ نظام شاہی قدیم نظام الملک صوبدار دکن کے بزرگوں میں سے کسی نے تالیف کیا تھا انھوں نے اپنے زمانہ تک کے کل دیوان شعرائے متقدمین ریختہ گو جو بنگالہ و ہندوستان میں گذرے تھے جمع کر کے ان کا کلام انتخاب کیا ان نواب صاحب نے سنہ ۱۱۶۱ھ میں انتقال کیا۔

تذکرہ ابن نشاطی دکھنی[7]۔ چارلس منٹو صاحب فرماتے ہیں کہ نظم میں ایک مثنوی اس مضمون کی اور ہے جس کا حال ابن نشاطی نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے۔

ہیں اور اس میں ہولیاں اور موسم بہار کی تعریف کے اشعار مرقوم ہیں۔ حصہ پنجم کی دو فصلیں ہیں اول فصل کے دو سو آٹھ صفحے اور فصل ثانی کے ڈیڑھ سو ان میں دھرپت اور خیال ہیں اور فصل دوم غزل اور ریختہ سے بھری ہوئی ہے حصہ ہفتم کے دو سو اسی صفحے ہیں اور راجہ بھرتری گوپی چند کے ابیات ہیں اگرچہ یہ کتاب بالکل تذکرہ نہیں ہے کیونکہ اس میں فقط لوگوں کے اشعار جمع کر دیئے ہیں لیکن ان میں کچھ شاعروں کا حال جنھوں نے گیت عوام الناس کے بنائے ہیں، لکھا ہے اس سبب سے تذکروں میں شامل کرنا مناسب ہے۔

سجن چرترا۔ یہ ہندی زبان میں ہے اور اچھے اچھے آدمیوں کا ذکر اس میں ہے۔ دو سو شاعروں کا حال اس میں درج ہے ۱۸۴۳ء سدا ماکوی یا سداما شاعر نے اسے تصنیف کیا ہے افسوس ہے مجھے اس کا حال کماحقہ نہیں معلوم۔

اب میں تذکروں کا ذکر چھیڑتا ہوں وہ ہندی مسلمانوں کی زبان میں خصوصاً زبانِ اردو میں ہیں اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ جن لوگوں کا حال اس میں ہے وہ سب مسلمان ہیں بلکہ یہ کہ جن لوگوں نے مسلمانوں کی بولی میں تصنیفات کیں ان کا بیان ان میں ہوتا ہے خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان یا کوئی اور یہ تذکرے قدیمی نہیں ہیں پرانے سے پرانا تذکرہ آخری صدی کے وسط میں لکھا گیا ہے۔ سات تذکرے آخری صدی کے لکھے ہوئے ہیں اور پندرہ ایک اور متاخرین نے چھ تذکرے اردو میں لکھے ہیں۔ اب میں ان تذکروں کا بیان زمانے کی ترتیب سے، یعنی جو اول تصنیف ہوا اس کا تذکرہ اول اور جو اس کے بعد تصنیف ہوا ہے پھر اس کا بیان اور علیٰ

---

(بقیہ حاشیہ ۱) ابن نشاطی اور اواثری ؟ کذا، دونوں قطب شاہ بادشاہ گول کنڈہ کے درباری شاعر تھے۔

بیاض مشتاق ۔ یہ ایک بیاض بطور تذکرہ، اشعار ریختہ گو شعرا نواب امیر خاں عمدۃ الملک نے جمع کی تھی اس میں ابتدائے زمانہ اور رواج ریختہ سے تا بدر خود جہاں تک ہو سکا بہت سے شعرا کا حال و مقال لکھا راقم کے ماموں کے پاس ہے۔

ہذالقیاس کرتا ہوں۔

**نکات الشعراء** ۔ وحید العصر یگانہ روزگار میر محمد تقی کی تصنیف سے ہے۔
فارسی زبان میں اس کے اندر ۱۰۳ شاعروں کا حال بیان کیا ہے[۹] اور اساتذہ کے اشعار
لکھ کر ان پر کچھ اعتراض اور نکتہ چینیاں کی ہیں۔ اور عیب چھلنے ہیں۔ میر کے ہر نیسے

---

۱۔ تذکرہ گجراتی[۱۰]۔ میر شاہ علی گجراتی کی تصنیف ہے جو ۹۷۳ھ میں راہی ملک بقا ہوا دیوان
گجراتی جو سرکاری کتب خانے واقع لندن میں رکھا ہے۔ اس کی تصنیف ہے جو تاریخ وفات ان کی
مولوی مظہر الحق اکبر آبادی نے اپنی مجمع الواصلین ... میں لکھی ہے اس سے واضح ہوتا ہے

سنہ نسخہ فارسی و ہم عربی کردہ تالیف در خدا طلبی
باز در اصطلاح گجراتی گفت سر سفاتی و ذاتی

**انتخاب اشعار ھندی**[۱۱]۔ عبد الرحیم خانخانان متخلص رحیم نے جمع کی ہے۔ میرے ایک
دوست کے پاس ہے رحیم کا دیوان فارسی و ریختہ اور تذکرہ ایک مجلد میں ہے۔

**مجموعہ اشعار ھندی ودکھنی** ۔ یہ تذکرہ ٹیپو سلطان بادشاہ سرنگا پٹم نے فراہم کیا تھا، جو
سرکاری کتب خانے واقع لندن میں بحفاظت رکھا ہے۔

**ریاض النصر**[۱۲]۔ محمد النصر ایک ہندوستانی کی تالیف ہے جس میں شعرائے ریختہ گو کی غزلیں
جمع کی ہیں . . . . فہرست قلمی میں ایک جلد اس کی پائی جاتی ہے ۱۱۵۴ھ میں مرتب ہوئی تھی۔

**تذکرہ عاصم**[۱۳]۔ نواب معلے القاب امیر الامرا بخت الملک صمصام الدولہ خاں دوراں خاں بہادر
منصور جنگ شہید کی تالیف ہے جو خود بھی ریختہ کہتے تھے۔

**تذکرہ اکبر**[۱۴]۔ نواب مکرم الدولہ نواب اکبر علی خاں بہادر مستقیم جنگ دہلوی متخلص اکبر برادر
والدۂ مرزا جہاں دار شاہ خلف شاہ عالم بادشاہ دہلی اکبر موصوف فتح علی حسینی کے شاگرد تھے حسینی
کے تذکرے کی تالیف سے چند روز بعد اکبر نے تذکرہ جمع کرنا شروع کیا چونکہ بادشاہی کتب خانہ اور انکا
موروثی کتب خانہ ان کی تحویل میں تھا اس سبب سے یہ تذکرہ ایسا لکھا گیا کہ سب پر فوقیت لے گیا اسمیں شاعر زیادہ تھے
اور حالات بھی تشریح میں لکھے تھے خود لکھتے ہیں جبکہ یہ تذکرہ میں نے تالیف کیا ہے اسوقت (۴۰) تذکرے ریختہ گو شاعروں کے
میرے پاس موجود تھے جن سے مجھکو مدد ملی ہے چند شاعروں کے جھگڑے میں نے لکھے ہیں وہ سب انھیں کا فیضان (ہے)،

لوگ اس پر سادات کا گمان نہ کریں، ذات کا شیخ تھا اور میر اس کا تخلص، چچا
اس کا آگرہ کا رہنے والا تھا اور شعر و سخن میں دستگاہ رکھتا تھا۔ میر نے اپنے والد کی
وفات کے بعد اپنے عم کے یہاں دہلی میں سکونت اختیار کی اور اس کی اصلاح
سے اپنے اشعار گذرانے (۱۱۹۶ھ - ۱۷۸۱-۸۲ء) میں لکھنؤ روانہ ہوا آصف الدولہ
نے اس کا درماہہ بخشش قرار دو سو تین سو روپیہ کا مقرر کیا۔ یہاں عمر صد سال کے بعد
راہی ملکِ بقا ہوا کمال نے جو مجموعہ انتخاب (مجمع الانتخاب) ۱۸۰۴ء میں
تصنیف کیا ہے اس میں لکھا ہے کہ میر کی عمر نوے اسی برس سے تجاوز کر گئی تھی ناسخ
نے جو تاریخ اس کی وفات کی لکھی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ (۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء)
میں وفات اور بعض تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ میر لکھنؤ میں (۱۲۱۵ھ اور ۱۸۰۰ء،
۱۸۰۱ء اور ۱۲۲۱ھ ہجری ۱۸۰۶ء، ۷ء) میں اس جہان سے رحلت کر گیا۔ قاسم نے اسکے
تذکرے پر نام دھرے ہیں اور میر کے اعتراضوں کو اساتذہ و معاصرین کے اشعار پر
پوچ و لغو بتلایا ہے لیکن آثار الصنادید میں میر کا ذکر اس عظمت کے ساتھ ہے کہ میر کی
زبان ایسی صاف و شستہ ہے اور اس کے شعروں میں ایسے اچھے محاورات
بے تکلف بندھے ہیں کہ آج تک سب اس کی تعریف کرتے ہیں۔ سودا کی زبان
بھی اگرچہ بہت خوب ہے اور زبان کی تیزی میر پر غالب ہے مگر میر کی زبان کو اسکی
زبان نہیں پہنچتی۔ مخلص کی وفات کے بعد میر نے اپنے تذکرے کے لئے قلم اٹھایا
تھا اور زمانہ مخلص کی وفات کا ۱۱۶۴ھ، ۱۷۵۱ء ہے میر کے لکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس
کے لکھنے سے پہلے کوئی تذکرہ زبان ہند کے شعرا کا موجود نہ تھا۔ دیباچہ میں نکات الشعرا
کے لکھا ہے کہ مخفی نہ رہے کہ کسی نے زبان ریختہ کے شعرا کا تذکرہ آج تک نہیں لکھا
اور ایسے تذکروں کا پتہ کہیں صفحۂ روزگار پر نہیں ملتا، یہ بیان میر صاحب کا سچا
معلوم نہیں ہوتا کیونکہ یہ امر بالتحقیق ہے کہ اس تذکرے سے پہلے اور تذکرے
شعرائے ہند کے موجود تھے چنانچہ فتح علی حسینی اپنے تذکرے کے دیباچہ میں جو ۱۱۶۵ھ
اور ۱۷۵۲ء میں تصنیف ہوا ہے، اور میر نے بھی اسی زمانہ میں اپنا تذکرہ لکھا ہے،

بیان کرتا ہے کہ میرا سبب اس تالیف کا یہ ہے کہ جن لوگوں نے پہلے شعرائے ریختہ کا تذکرہ لکھا ہے ان کی غرض ان کے اشعار پر اعتراض کرنے سے تھی اور کچھ نہیں لیکن میں نے انصاف کو ہاتھ سے نہ دے کر صاف صاف جو حال شاعروں کا تھا لکھا اور زبان اعتراض (کو) بند کیا اور حسد کو کام کو کام نہ فرمایا اس بیان سے اگرچہ یہ خیال کر سکتے ہیں کہ فتح علی حسینی نے میر کے تذکرہ پر ایک طنز اور چوٹ کی ہو مگر وہ ایک تذکرہ نہیں بیان کرتا بلکہ لکھتا ہے کہ بہت تذکرے اردو شاعروں کے لکھے گئے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس نے کئی برس میر حسینی کے تذکروں سے (کذا) تذکرہ تصنیف کیا ہے لیکن وہ اپنی اس بات پر بڑا فخر کرتا ہے کہ شعرائے اردو کا تذکرہ سب سے پہلے ہم نے ہی لکھا ہے ،کامل (کمال) جس نے اکبر (نواب اکبر علی، حسان) شاعر کی تقلید پر ایک تذکرہ لکھا تھا مترشح ہوتا ہے کہ اکبر نے جب تذکرہ لکھا تھا تو چالیس تذکرے اس ( کے) (پاس) اردو شعرا کے ( تھے ) اور . . .
عین شباب کی حالت میں ۱۸۰۳ء، ۱۲۱۸ھ عالم باقی کو کوچ کیا ان تذکروں

---

بہ تذکرہ مبتلا[۱۵] ۔ میر کاظم بیگ مبتلا کی تصنیف ہے۔ صاحب کو نواب وزیر الملک صفدر جنگ دلاور جنگ (یہ عبارت حاشیہ نگار نے لکھ کر کاٹ دی ہے۔ علوی) کی پیش گاہ سے نواب مرزان علی خاں کا خطاب مرحمت ہوا تھا ان کے والد ماجد کی (قبر) مشہد مقدس میں ہے وہ قدیم زمانہ سے غازی پور کے رئیس تھے چند مدت اس میں مقیم رہے پھر لکھنو میں چلے آئے۔ نواب برہان الملک و نواب صفدر جنگ کی سرکار میں بڑا اقتدار پایا تھا صاحب دیوان و تذکرہ اردو و فارسی تھے سخن شعرا۔ ۱۴۰ پر ان کا حال لکھا ہے۔
طبقات الشعرا[۱۶] ۔ چونکہ یہ تذکرہ ٹیپو سلطان کے کتب خانے میں موجود تھا۔ اغلب کہ ۱۲۱۵ھ کو تصنیف ہوا چونکہ جس فہرست میں یہ تذکرہ مندرج ہے وہ اسی سن ۱۲۱۵ھ کی تحریر ہے (اللہ اعلم)
تذکرہ[۱۷] میر محمد علی ترمذی۔ یہ تذکرہ اشعار ہندیہ کا ہے جس کا ذکر علی ابراہیم (نے) اپنے تذکرے میں لکھا ہے۔

کی تعداد سے چوتھائی مجھے بھی معلوم ہیں۔ اس کثرت تعداد سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض تذکرے تذکرہ سے زیادہ قدیم تھے۔

میر کے اشعار اردو میں بے شمار ہیں۔ ۱۸۱۱ء میں اس کا کلیات چھپا جس میں اس کے تمام اشعار درج ہیں فقط تھوڑے ایک فارسی شعر اس کے نہیں ہیں جو کچھ اس کی تصنیفات سے کلیات میں چھپنا باقی رہ گیا تھا۔

کانپور میں مطبع مصطفٰی خاں نے صادق خاں کے اشعار کے ساتھ منطبع کر دیا اور اس کتاب کا نام مجموعہ مثنویات رکھا۔

میر کو بعض سودا کے بعد، بعض اس کے برابر بعض اس سے برتر کہتے ہیں۔ تذکرہ (میر) فتح علی (خاں) حسینی جس کا حال قابل اطلاع ہے۔

فتح علی حسینی مزاج کا صوفی اور ذات کا شیخ (تھا) ① دلی کے اندر فارسی زبان میں یہ تذکرہ لکھا ہے ایک صدی کے شاعروں کا حال بیان کیا ہے، میر کے تذکرہ کے طور پر شاعروں کے ناموں کو حروف تہجی کی ترتیب کے موافق ترقیم کیا۔ سن تصنیف اس تذکرہ کا اسے معلوم ہوتا ہے کہ انجام کے تذکرہ میر اس نے لکھا ہے کہ انجام (۱۱۵۹ھ/۱۷۴۶ء) میں چھ برس پہلے اس تذکرہ کی ترتیب سے دنیا سے سفر کر گیا۔ اسے معلوم ہوا کہ یہ تذکرہ ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء میں تالیف ہوا اور اسی زمانے میں میر نے بھی تذکرہ لکھا تھا معلوم ہوتا ہے کہ میر کی نکات الشعراء حسینی کی دیکھی ہوئی تھی کیونکہ اس کے تذکرہ میں التقاط نکات الشعراء سے معلوم ہوتا ہے اور تذکرہ کے دیباچہ سے بھی جس میں خیالات میر کے جو دربارۂ ریختہ کے ہیں، لکھے ہیں یہ امر ظاہر ہوتا ہے۔

قاسم نے تذکرہ ۱۸۱۱ء [۱۸۰۶ء] (۱۲۲۱ھ) میں تصنیف کیا ہے تو اس میں حسینی کا حال اس طرح درج کیا ہے کہ حسینی اس سن تک تو زندہ تھا۔ مخزن نکات ۱۱۶۰ھ/۱۷۵۴ء

---

① لفظ شیخ کاٹ کر دیئے نشان کے ساتھ حاشیہ نگار نے سید لکھا ہے۔

[illegible]ھ جب انتقال کیا "انتخاب سلف" مادۂ تاریخ وفات ہے، بھوجلا پہاڑی پر اپنے والد میر عوض علی خاں بن عثمان علی خاں کی درگاہ کے احاطہ کے اندر اپنے والد ماجد کے پہلو میں دفن ہوئے۔

میں شیخ محمد قیام الدین قایم چاندپوری نے اس تذکرہ کو فارسی زبان میں مرتب کیا مضامین اس کے دل نشین و دلچسپ ہیں اس کے تین طبقے ہیں اول میں متقدمین کے اشعار طبقۂ ثانی میں متوسطین کے طبقۂ ثالث میں متاخرین کے تمام ایک سو دس شاعروں کا احوال (۴) اس میں ہے اس تذکرہ میں ایک عجیب و غریب بات یہ ہے کہ مصنف مدعی ہے کہ

---

(۴) طبقات الشعراء ۱۸۰۱ء۔ مؤلفہ مولوی قدرت اللہ شوق رامپوری شاگرد قایم چاندپوری (ولی) ۱۱۸۲ھ کو اپنا تذکرہ لکھا ہے اس میں فرماتے ہیں۔

"چوں دیدم کہ ذکر اکثر اوستاداں در تذکرۂ مؤلفین سابقین موجود است از آنہا بر آوردیم و اشعار اکثر اوستاداں و تازہ گویاں و نوشقان کہ خارج از آنہا بود نیز از بیاض ہا تجسس کردہ درج کردیم ہا چنیں موجب اشتہار و یادگار تا نام چندیں و تالیف ایں مختصر کہ مسمی بہ طبقات الشعراء ہست مشتمل بر چہار طبقہ و خاتمہ، طبقہ اول در بیان ایجاد ریختہ و ذکر شعرائے دکھنی و بعضے متاخرین طبقہ دوم در ذکر شعرائے ایہام گو و بعد از طبقہ شاعران دکھنی کہ معاصر ولی بودہ اند رواج ایہام بسیار شد و ایہام عبارت است از لفظ کہ دو معنی داشتہ باشد یکے معنی قریب کہ از (قریب الفہم باشد دوم بعید کہ قریب الفہم نہ باشد بعید منظور شاعراں باشد اقرب متروک) طبقہ سوم در ذکر شعرائے متاخرین و بعضے نوشقاں، دیگر مشتمل بر پنج مقالات است، مقالہ اول در ذکر سادہ گویاں سر آمد روزگار، مقالہ دوم سلاطین روزگار و وزرائے نامدار و امرائے والا تبار و منصب داران دیار و امصار و صاحب، شہزادہ عالی وقار، بیگمات مستورات مقالہ سیم در ذکر امرا و افغانان ایں دیار و اعزہ افاعنہ قریب و جوار مقالہ چہارم در ذکر عزیزان و یاران ہمدم و دوست داران ثابت قدم، مقالہ پنجم بعضے برادران خویشاں و یاران و بعضے نوشقان کہ چنداں مایہ شاعری ندارند لہٰذا بسبب طبیعت موزونے خود را از خود زیادہ پنداشتہ در جرگہ شعرا بشمارند"

اس تذکرے میں ساڑھے چار سو سے زیادہ شعراء کا حال و مقال ہے۔

میں نے ہی اردو شعرا کا تذکرہ اول لکھا ہے یہ بات اس کی پایۂ اعتبار سے ساقط ہے اور محض ادعا ہے اور راستے اس کی جہالت تذکرات متقدمین اور میر وحسینی کے تذکروں سے معلوم ہوتی ہے، غرض کہ اس کو نہ میر وحسینی کے تذکروں پر وقوف تھا نہ اس سے پہلے تذکروں کو جانتا تھا، . . . . لیکن اس بات سے اس کی کتاب کے حسن وخوبی میں فرق نہیں آتا۔ ایک بات اس میں ایسی لکھی ہے کہ تذکرات سابق الذکر میں کہیں اس کا پتہ نہیں لگتا اگرچہ یہ بات بالکل سچ و تحقیق نہ ہو اور وہ بات یہ ہے کہ شیخ سعدی شیرازی نے دکن کے سفر میں دکھنی زبان میں اشعار کہے اس واسطے حضرت شیخ سعدی کو چاہیئے کہ زبان ہندی کے شعرا میں گنیں، یہ امر تو میر وحسینی کے بالکل خلاف رائے ہے کیونکہ وہ ان اشعار کو ایک اور سعدی متصنع (کذا) دکھنی کی طرف منسوب کرتے ہیں، قایم کی رائے کو کامل (کمال) نے بھی اختیار کیا ہے۔ کامل (کمال) نے قایم کی بڑی معاونت کی تھی۔ شورش جس نے دس برس بعد قایم کے تذکرہ کے لکھا ہے بالکل اس بات کو اڑا گیا ہے نہ اشعار کو شیخ سعدی سے نہ سعدی متصنع.. منسوب کرتا ہے میں نے اس امر کی تنقیح ایک اور جگہ خوب کی ہے۔ قایم بڑا نام آور وعالی قدر شاعر ہے سب اس کو مانتے ہیں اور اس کی استادی کے قایل ہیں کامل (کمال) اس کی حد سے زیادہ تعریف کرتا ہے اور کہتا ہے کہ سودا ہی قایم پر سبقت لے گیا ہے اور باقی خیر۔ اور اپنے اظہار کی صداقت کے لئے اس کے دیوان میں سے اشعار اور ہجوئیں اور صوفیانہ اشعار تذکرے میں تسطیر فرمائے۔ شیفتہ بھی قائم کی رباعیات اور قطعات کی تعریف کرتا ہے اگرچہ کامل (کمال) کی طرح اس کی مداحی میں سرگرم نہیں اور کہتا ہے کہ قایم کو سودا کے برابر ٹھیرانا حمق سے خالی نہیں، قایم اپنے اقبال کے دنوں میں دلی کے اندر آیا تھا کہ بارگاہ سلطان سے علاقہ ومنصب پایا۔ ادھ سنہ ۱۲۱۰ھ مطابق ۱۷۹۳ء و ۱۷۹۵ء میں اس نے بستر مرگ پر آرام فرمایا۔

تذکرہ ابوالقاسم (ابوالحسن) (۱) نام اس تذکرہ کا مسرت افزا ہے، فارسی زبان میں

---

(۱) میر آزاد کے تذکرے سرو آزاد ابوالقاسم کی جگہ ابوالحسن لکھا ہے۔ حاشیہ

سنہ ۱۱۹۱ھ، ۱۷۷۷ء میں تالیف ہوا اپنی ہندی علم ادب کی تاریخ میں اس تذکرے کے خود نہ دیکھنے کا اظہارِ افسوس کرچکا ہوں فقط اس کے نام سے میں نے اون نے قلمی فہرست کتب سے واقفیت پیدا کی ہے صاحبِ موصوف کے پاس ایک قلمی نقل اس کی موجود ہے اوکس فرد کے یونے ورسٹی میں اس کی نقلیں سر ولیم صاحب کی کروائی ہوئی موجود ہیں۔ میرے ایک کمال مہربان و شفیق بلینڈ صاحب مجھ سے اقرار کرتے ہیں کہ تمہارے لئے اس تذکرہ کو دیکھ کر اور کچھ انتخاب کر سکوں گا مجھے اس سے کمال استفادہ ہوگا، کیونکہ داکٹر اسپرنگر صاحب نے (؟) اس تذکرہ کا کچھ ذکر نہیں کیا مصنف اس کا ابوالقاسم [ابوالحسن] امیرالدین احمد امیرالدولہ الہ آبادی کے نام سے مشہور و معروف ہے اس نے اپنی جنم بھوم عظیم آباد کو چھوڑ کر الہ آباد میں سکونت اختیار کی اور اس سبب سے لکھنو میں اس کا گذر ہوا شعر و شاعری کا اس کو کمال ہی شوق تھا۔ اس نے اس شوق کے مارے اثنائے سفر میں ہندوستانی شعراء کا یہ تذکرہ تالیف کیا اور جب لکھنو پہنچا تو اسے اپنے تذکرہ کے لئے بہت کچھ سرمایہ ہاتھ لگ گیا۔

تذکرہ شورش (سنہ ۱۱۹۲ھ، ۱۷۷۸ء، ۱۸۰۰ء) یہ تذکرہ تصنیف ہوا، اور یہی نام اس کا ہے اور کوئی نہیں۔ مصنف کا اسم شریف میر غلام حسین ہے اور عرف میر بھنا دیر بہ حاشیہ نگار) اس تذکرے کے خود دیکھنے سے میں محروم رہا، فقط ڈاکٹر اسپرنگر صاحب نے الیٹ صاحب سے ایک قلمی نسخہ اس کا لیکر جو کچھ اس تذکرے کے باب میں لکھا ہے اتنا ہی مجھے معلوم ہے اور باقی کچھ نہیں اس قلمی نسخہ کے پانسو صفحے ہیں اور اس میں تین سو چودہ شاعروں کا حال بہت اختصار اور ایجاز کے ساتھ لکھا ہے۔

تذکرہ نواب ابراھیم خاں۔ نام اس تذکرہ کا گلزار ابراہیم مصنف نے اپنے نام کی مناسبت اور اس رعایت سے کہ حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ کو جب نمرود نے آگ میں پھنکوایا تھا تو ان کے اعجاز سے (آگ) گلزار بن گئی تھی رکھا ہے اس

تذکرے کے باب میں میں نے بہت کچھ اپنی علم وادب ہندی کی تاریخ میں لکھ
وہ فارسی زبان میں (۱۱۹۶ھ سجری و ۱۷۸۲ء) میں تالیف ہو کر ختم ہوا تین
شاعروں کے ترجمے مع ان کے اشعار کے مندرج ہیں جو کچھ مصنف کا حال میں نے
بیان کیا اس سے زیادہ یہ اور ہے کہ نام مصنف کا ابراہیم خاں امیر الدولہ ناصر جنگ
ہے اور رہنے والا پٹنہ کا ہے اور تخلص اس کے دو، خالؔ و خلیلؔ ہیں اور یوسف بھی اد
شورش نے اس کا تخلص خلیل لکھا ہے اور عشقی نے خالؔ۔
تذکرہ مصحفی [ہندی گویاں] اٹھارہویں صدی کے تذکرات اسی تذکرہ پر ختم
ہوتے ہیں (۱۲۰۹ھ و ۹۴-۱۷۹۵ء) میں تصنیف ہوا ہے، شیفتہ نے مصحفی کا
حال اس طرح لکھا ہے کہ مولد اس کا دہلی ہے اور اردو اور فارسی کے اندر شعر گوئی
میں اس کو دستگاہ تمام دکمال بہتی اور لکھنؤ میں اسے ملازمت اور مجھے (بھی) نصیب
(کذا) اور ضابطہ ارتباط کا مربوط۔ کریم الدین لکھتا ہے کہ اس کے چھ دیوان ریختہ کے
ہیں اس کے دیوان کا ایک قلمی نسخہ ہے جس کی چار جلدیں ہیں اور فرخ بخش لکھنوی
کے پاس موجود ہیں فارسی دیوان بھی اس کے کئی ایک ہیں اور فارسی شعرا کا تذکرہ
بھی اس نے لکھا ہے اور شاہنامہ بھی شاہ عالم کی سلطنت تک تاریخ کے طور پر
لکھا ہے لیکن وہ تمامی کو نہیں پہنچا اردو شعرا کا تذکرہ اس نے میر مصطفےٰ خاں کی
فرمائش سے مرتب کیا تھا اس میں ڈیڑھ سو شاعروں کا احوال جو محمد شاہ
بادشاہ اور اس کے زمانے کے درمیان پیدا ہوئے ہیں، لکھا ہے مصحفی کی بڑی عمر
بھی کیونکہ گلشن بے خار سے معلوم ہوتا ہے کہ بارہ برس پہلے اس تذکرہ کی تالیف
وتصنیف سے ۸ ۱۲۲۶ء میں اس کی عمر آخر ہوئی۔ اور کریم الدین کے موافق ۱۸۱۴ء
(کذا) (۱۸۲۴ء) میں مرا ہے سودا و جرات اور انشا کے آخیر زمانے میں مصحفی ہوا
ہے اور قایم کے عین زمانہ میں (کذا) اس کے دیوان کے دیباچہ سے معلوم ہوتا
ہے کہ وہ مصحفی کا ہم عصر تھا۔ قایم جس نے مصحفی کو دتی میں کچھ لکھایا
پڑھایا تھا۔ بہت شعرا اپنے تذکرہ میں اس کے لکھتا ہے اور سرور نے

ن کے حال میں سینتالیس ۴۷ صفحے سیاہ کئے ہیں۔

تذکرہ لطف:۔ مرزا علی خاں نے اس تذکرہ کو انیسویں صدی کی ابتدا ۱۲۱۵ھ ۱۸۰۱ء میں تالیف کیا ہے میرے نزدیک یہی شخص ہے جس نے اردو زبان میں ول تذکرہ لکھا اور متقدمین کے طور کا مقلد نہ ہوا یعنی فارسی زبان میں تذکرہ لکھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی زمانے سے لوگوں کو خیال اپنی زبان کا ہوا تھا ام اس تذکرہ کا گلشن ہند ہے اور چھ ۶۶ سو چھیاسٹھ (کذا) شاعروں کے ترجمے مع اشعار کے مندرج ہیں۔ لطف نے اپنے ترجمہ کے بعد ایک دیوان غزلوں کا اور قصیدے اور مثنوی گیت لکھے ہیں دیوان کے میرے قلمی نسخہ میں ۳۱ صفحے ہیں اور قصیدوں کے ستر۱۷ اور گیتوں کے بیس غرض ۷۰ صفحوں میں اپنا ہی جھگڑا لکھا ہے اور صفحہ بھی سترہ سطر کا ہے اپنی تاریخ میں لطف کا حال لکھ چکا ہوں۔ یہاں بیان کرنا اتنا کافی ہے کہ وہ دہلی میں پیدا ہوا اور لکھنو اور پٹنہ میں اکثر مقیم رہا اور آخر کو حیدرآباد چلا گیا وہاں ایک برس بعد کامل (کمال) کے آیا تھا۔ کمال نے لکھنو کی صورت آشنائی پر خیال کر کر اس کے ساتھ بہت سلوک کیا۔ لطف کے والد کا نام قاسم بیگ ہجر تھا اور اپنے باپ ہی کا شعر و سخن میں شاگرد تھا لیکن شیفتہ اس کو میر کا شاگرد کہلاتا ہے۔[۱۲]
اس کا باپ اردو میں شعر کہتا تھا۔

---

[۱۸] تذکرہ مذا عاقبت محمود خاں صدر الصدور شاہجہاں آباد عالم متبحر فاضل جلیل القدر فضیلت علمی کے ساتھ فارسی و ریختہ دونوں زبانوں میں شعر بھی خوب لکھتے تھے۔ مرزا رفیع السودا کے کے معاصر اور مرزا جان جاناں مظہر کے شاگرد تھے آپ نے ایک تذکرہ شعرائے ریختہ گو کا تالیف فرمایا جو پنڈت کشوری لال کے پاس ہے راقم نے دیکھا ہے اس کے علاوہ فارسی دیوان بھی ضخیم ان سے یادگار ہے۔

تذکرہ میر فخر الدین خلف اشرف علی خاں شاگرد مرزا رفیع السودا کا تھا ۱۱۹۰ھ کو لکھنو میں رہتا تھا طبقات الشعراء صفحہ ۱۷۳ میں ترجمہ لکھا ہوا ہے۔

تذکرۂ عشقی[۱]۔ اس کی تصنیف کا وہی زمانہ ہے جو تذکرہ مذکورۃ الصدر کا تھا فارسی زبان میں متقدمین کے طور پر لکھا گیا ہے اگرچہ میں نے اس تذکرہ کو بچشم خود نہیں دیکھا لیکن مجھے اس کا حال ایک طرح معلوم ہوا ہے اس میں حروف تہجی کی ترتیب سے موافق تین سو اٹھائیس شاعروں کے ترجمے ہیں۔ مصنف میاں رحمۃ اللہ عشقی پٹنہ کا رہنے والا تھا اور نسبت ولدیت کی محرم حسین محرم عظیم آبادی فارسی گو کے ساتھ جو ایک مشہور و نامور شاعر اردو کا ہے۔ رکھتا ہے اس کو اردو کا شاعر کہتے ہیں اگرچہ اس نے فارسی زبان میں بہت کچھ کہا ہے اس کو عشقی مرادآبادی جس کا ذکر میں نے اپنی تاریخ میں کیا ہے نہ کہنا چاہئے ورنہ اس کو عشقی دکھنی سے ملانا چاہیئے یہ دو شاعر اور ہیں اور وہ اور تھا اس کو سعادت تلمذ کی اپنے والد اور شاہ محمد وفا کی خدمت میں حاصل تھی۔

مجموعۃ الانتخاب (مجمع الانتخاب)[۲] اس کا مصنف ہے کامل (کمال) فقیر شاہ احمد کمال الدین حسین ہے رایل ایشیاٹک سوسائٹی کے سب صاحبوں کا شکرگزار ہوں، مجھے بعد انطباع تاریخ یہ کتاب دیکھنی میسر ہوئی یہ تذکرہ اکثر زیر نظر رہتا ہے۔ فارسی زبان میں ہے اور اٹھارہ فصلیں ہیں (۵) مطلب بڑی دل لگی کے لکھے ہوئے ہیں۔ میرے نصیب کی خوبی ہے کہ نسخہ جو میرے پاس ہے اگرچہ خاص نستعلیق لکھا

---

[۲] یہ تذکرہ ۱۲۱۹ھ میں مرتب ہوا اور مجموعہ انتخاب اس کا تاریخی نام ہے۔

ریاض قصائد:- یہ تذکرہ اسماعیل یار جنگ رئیس حیدرآباد نے جمع کیا ہے اس میں اُن شعراء کا فارسی و ریختہ کلام ہے جنھوں نے امیر اعظم ارسطو جاہ صوبہ دار ملک دکھن کے دربار میں گذرانے اس میں تھوڑی کی طبیعت (کذا) نذر ناظر دین ہے وقت ورود نواب موصوف کے سال اربعہ تسعین و مایتہ الف زمان کہ خمسہ عشرہ مائتین والف است، تاریخ و اشعار قصائد بسیار گذرانیدہ اند لیکن جا بجا متفرق و بہ تلاش آنچہ بہم رسید باستصواب اسماعیل یار جنگ بہادر کہ منشی بلاغت انتخاب سرِ دفتر اخلاق و قدر بیہا است دریں عجالہ زینت تحریر یافت (اگلے صفحہ پر)

ہے لیکن کاتب نے اس پر وہ ستم روا رکھا ہے جس کا میں کچھ بیان نہیں کر سکتا اُلٹ پلٹ کر کچھ کا کچھ واہی تباہی لکھ دیا ہے۔ اور نہیں سمجھا کہ میں کیا لکھتا ہوں جہاں لوگوں کا حال لکھا ہے وہاں ایسا ہوتا ہے تو بری خرابی اٹھانی پڑتی ہے ⓔ

مجموعۂ نغز[۱۵] ۔ سید ابوالقاسم دہلوی کی تصنیف سے ہے اور سید صاحب کا نام قدرت اللہ قادری مشہور ہے تاریخ چھپنے کے بعد مجھے اس تذکرہ کا علم کلی حاصل ہوا (سنہ ۱۲۲۱ء و سنہ ۱۸۰۶ء و ۷ء) میں وہ تصنیف ہوا ہے جو اس کا نام ہے وہی تاریخ اس کی تاریخ تصنیف کی ہو اس کی فارسی بہت شستہ و پاکیزہ ہے اور زبان اس کی بہت فصیح معلوم ہوتی ہے اس کے مطالعہ میں دل بہت لگتا ہے اور بہلتا ہے، ایک بڑا دیباچہ شعر کے حسن و قبح میں لکھا ہے۔ ایک خوبی اور سب تذکروں سے زیادہ ہے کہ نام شاعروں کے بہت تصحیح کے ساتھ لکھے ہیں اور ان میں خلط ملط نہیں ہوا ان کو کمال خوش ترتیبی سے بیان کیا ہے اگرچہ اس تذکرہ میں سیکڑوں مضمون اور ترجمے ہیں لیکن ضخامت ذکا اور سرور کے تذکروں کے برابر نہیں اور نہ اس میں قصہ کہانیاں عجیب عجیب ایسی التقاط کر رکھی ہیں کہ ان کا کہیں اور پتہ نہیں ۔ قاسم شعرائے ہند میں ایک مرتبہ کا شاعر تھا اور ابتدائے عمر سے شوق شعر و شاعری کا دامن گیر رکھتا تھا۔ اس کی تقلید رمز و کنایات سخن میں ہدایت نے کی ہے ۔ تذکرہ لکھنے کے وقت انھوں نے آٹھ ہزار

---

(گذشتہ سے پیوستہ)

آیندہ آنچہ بہم خواہد رسید و خواہند گذرانید بعونہ تعالیٰ جلد علیحدہ زینت خواہد شد۔ ضعیف نحیف ... علیا در اقدام تحریر دیباچہ سعادت حاصل نمود تحت مقادر الکلام ........

۱۴۱ شعرا کا کلام جتنا حال معلوم ہوا مندرج کیا ہے اور باقی کا کلام لکھ دیا ہے اس پر ۲۱۵ جز اور ۱۴ سطر کشمیری کاغذ عمدہ خط جدول شنجرف سے تخلص شاعر عدد تاریخ نام صنعت وغیرہ مثلاً قطعہ، رباعی، مخمس، مسدس، سرخی سے لکھا ہے ۔

ⓔ ۱۱ تذکرہ سرور ۔ شرف الدین احمد خلف غلام محی الدین عشق باشندۂ میرٹھ ۔

شعر کہہ کر ایک دیوان مرتب کیا تھا اور ایک مثنوی قصہ معراج میں ساڑھے تین ہزار شعر کی اور ابوالقاد۔ [عبدالقادر] جیلانی کے کرامات اور خرق عادات میں بوستاں کے وزن پہ پانچ ہزار دوسو شعروں کی کہی تھی۔ قاسم کا نام دلالت کرتا ہے کہ وہ فرقہ قادریہ میں سے تھا۔ قاسم علم طب میں بھی مہارت رکھتا تھا لیکن معلوم نہیں یہ مطب بھی کرتا تھا یا نہیں۔

کامل : کمال : سرور و کریم الدین اس کے مداح ہیں اور اس کے اشعار و ذہن کی تعریف کرتے ہیں۔ اگر کریم کے لکھنے کا اعتبار کریں تو اس کو ۱۸۴۲ء میں سفر آخرت پیش آیا۔

عمدۃ المنتخب۔ (عمدۂ منتخبہ) ۱؎ اس تذکرہ کو سرور نے ۱۲۲۱ھ و (۱۸۰۶ء) میں تالیف کیا ہے جب تاریخ میں نے چھاپی تھی تو اس کا مجھے کچھ حال معلوم نہ تھا۔ لیکن بعد الطباع اس کی قلمی نقل میرے ہاتھ لگی ہے ما ہے فرصت کے وقت اس کا مطالعہ کیا کرتا ہوں اس تذکرہ کے مصنف کا نام ہے۔ میر محمد خاں سرور جن کا لقب اعظم الدولہ ہے اس کے باپ کا نام ابوالقاسم مظفر الدولہ ہے وہ شاگرد ساقی جو سامی بھی کہہ کر مشہور ہے اور موزوں اور تعجل کو تھا۔ علاوہ اس تذکرہ کے ایک اور بڑا دیوان ریختہ کا اس کی تصنیف سے ہے یہ تذکرہ فارسی زبان میں ہے اور اس میں ہزار بارہ سو شاعروں کے ترتیب حروف تہجی کی ترتیب سے لکھے ہیں اور ہر شاعر کے ترجمے کے ساتھ کچھ نہ کچھ اس کی تصنیفات سے نقل کیا ہے زبان اس کی فصاحت

---

۱؎ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے کئی تذکرے لکھے ہیں چنانچہ ایک تذکرے کی تاریخ میر نظام الدین ممنوں نے "معیار نقادسخن۔ ہے" (سے نکالی ہے جس کے معنی ہیں کہ) ۱۲۱۵ھ میں تیار ہوا اور ایک ۱۲۲۱ھ میں اور ایک ۱۲۳۶ھ اس کی تاریخ ذوق نے دریائے اعظم سے نکالی ہے مولوی کریم الدین پانی پتی فرماتے ہیں کہ یہ تذکرہ اول سب تذکروں کے دہلی میں لکھا گیا ہے۔ شیفتہ صاحب گلشن بے خار نے اس سے بہت مدد لی ہے اور مصحفی وغیرہ نے بھی اس سے امداد پائی ہے مگر تذکرہ میرا سب سے اول ہے۔

وبلاغت سے خالی نہیں، یہ تذکرہ دہلی میں بہت مشہور ہے اور مصنف نے اپنے [illegible]
کئی ایک صفحوں میں مرقوم کیا ہے اور اپنا عجز [illegible] اظہار کیا ہے کہ جیسے گل کے
ساتھ خار کا ہونا لوازمات سے ہے ایسے ہی میرے شعر بھی اُن اشعار کے ساتھ ہونے
ضرور ہیں۔ قاسم کے تذکرہ کا اور اس کا زمانہ تصنیف ایک ہی ہے لیکن یہ [illegible]
پیچھے لکھا گیا ہے اور شیفتہ کے تذکرے پہلے جیسا کہ میں نے قاسم کے تذکرے [illegible]
کچھ زیادہ کہا تھا۔ ایسا ہی شیفتہ نے قاسم کے تذکرہ کو بڑھایا ہے۔ [illegible]
کہ عمدۃ المنتخبہ (عمدہ منتخبہ) دہلی میں بہت مشہور کتاب ہے[18] اور [illegible] سلیقی
سے اس کی تدوین ہوئی ہے اور شیفتہ [illegible] صاحب تذکرہ اس کتاب کا تتبع [illegible]
[illegible] میں سرور کو موت نے آگھیرا اور اس کا خلف الرشید محمد [illegible] ہوا جو اپنے
باپ پر پیدا ہوا۔ شیفتہ اس کو اپنے باپ کے معاصرین میں گنتا ہے۔
طبقات سخن[19] (۱۲۲۲ - حاشیہ نگار) اس کا حال مجھے معلوم نہیں کچھ [illegible] لکھتا
ہوں کہ مصنف اس کا شیخ غلام محی الدین قریشی ہے وہ اردو [illegible] شعر کہتا تھا
تخلص اس کا عشق ہے اور مولانا [illegible] کا پیر بھائی نعمت اللہ اس کا باپ تھا اس کی تصنیف
سے ایک بہت اچھا دیوان فارسی کا ہے عشق فارسی زبان میں بھی شعر کہتا تھا اور عربی
زبان میں بھی اس کی تصنیفات سے کچھ ہے اور دو دیوان فارسی زبان میں اس کے ہیں
اول دیوان میں تخلص مبتلا کیا ہے اور دوسرے میں عشق اور اسی آخری تخلص [illegible]
[illegible] ہے۔ اسی تذکرہ کے نام سے زمانہ اس کی تالیف کا (۱۲۲۲ھ و ۱۸۰۷ء) [illegible]
معلوم ہوتا ہے اس کے دو طبقے ہیں اول طبقہ میں شعرا اردو شاعروں کا مذکور ہے اور
طبقہ ثانی میں فارسی شعرا کا حال۔
تذکرہ دو جہاں[20] - (کذا) یہ تذکرہ ان چھ تذکروں میں سے ہے جو اردو زبان میں

---

* طبقات الشعراء۔ مولوی قدرت اللہ شوق رام پوری شاگرد قائم چاند پوری کی تالیف ہے۔ فارسی
اردو دونوں زبانوں کے شعرا کا حال لکھا ہے، فارسی تذکرہ کا نام، تکملۃ الشعرا ہے[23]
ریاض عنبر[24] ذکر شعرائے ہند و عجم میں عنبر شاہ خاں رام پوری متخلص عنبر نے تالیف کیا ہے۔

لکھے گئے ہیں اس کتاب کا نام دیوانِ جہاں ہے شاید یہ مصنف کے نام کی مناسبت سے ہو یا اس رعایت سے کہ بعض اوقات جہاں سے اشارہ ہند کی طرف ہی ہوتا ہے اور اس میں اشعار شعرائے ہند کے منتخب کر کر بیاض کے طور پر لکھے ہیں (شاید اسی وجہ سے دیوانِ جہاں نام رکھا ہو. زمانہ اس کی تصنیف کا (۱۲۲۶ھ ہجری ۱۸۱۲ء) ہے مصنف اس کا بینی نرائن گرچہ ہندو تھا لیکن تذکرہ اس نے مسلمانوں کی بولی میں لکھا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ بینی نرائن قوم کا کھتری اور بعض کے نزدیک دہلی کا رہنے والا اور بعض کے نزدیک لاہور کا باشندہ تھا اس کے باپ کا نام سداشیب نرائن اور دادا کا بھیمی نرائن تھا دیوان جہاں تذکرہ تو کیا ہے بیاض کے طور پر ایکسو پچاس شاعروں کے اشعار منتخب کر کے بہت اختصار کے ساتھ ان کا بیان لکھ دیئے ہیں اور کتابوں میں سے کچھ کچھ التقاط کر کر اسی میں مندرج کر دیا ہے علاوہ اس کے اور کتابیں بھی اس کی تصنیف سے ہیں چار گلشن بھی اس میں ہلالی کے بہت سے قصے کہانیاں لکھی ہوئی اور بادشاہ و نوکر و شاہ و گدا کے قصے لکھے ہوئے ہیں ان میں سے کچھ اشعار منتخب کر کے اپنے تذکرے میں لکھے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولف اس کتاب کا وہی ہے اور تنبیہ الغافلین کا فارسی سے اردو میں ترجمہ اس نے کیا ہے یہ کتاب مولوی سید احمد سے جنھوں نے فرقہ وہابیہ بنایا تھا اور جن کے زہد و تقویٰ و سنیانیت کی بڑی شہرت ہے متعلق ہے اصل فارسی زبان میں تھی اس کتاب کے دیباچے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسلمان ہو کر فرقہ وہابیہ میں داخل ہو گیا تھا دیباچہ ایسا لکھا ہے جیسے کوئی مسلمان لکھتا ہے۔

عیار الشعراء ۱۲ اس تذکرہ کے مصنف کا نام خوب چند ہے اور تخلص ذکا فارسی میں یہ تذکرہ ۱۲۰۸ھ و ۱۷۹۳ء (۹۴ء) اور (۱۲۴۷ھ و ۱۸۳۱ء ۳۲ء) کے درمیان لکھا گیا کیونکہ مصنف لکھتا ہے کہ تیرہ برس تک تو میں اپنے استاد شاہ نصیر جنکا نام میر نصیر الدین ہے اور عرف میر کلو ہے کی خدمت میں کمربستہ رہا ہوں، اور ڈاکٹر اسپرینگر صاحب کو اس کے پوتے کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ ۱۸۴۲ء میں اس دارِ فانی سے انتقال کر گیا، یہ تذکرۂ ذکا بھی ان پانچ تذکروں میں سے ہے کہ جن پر مجھے

علم اور لوگوں کے طفیل سے ہوا ہے اس میں پندرہ سو شاعروں کے ترجمے لکھے ہیں اور ان کے شعر بھی منتخب کر کر مرقوم کئے ہیں، قلمی نسخہ اس کا جو ڈاکٹر اسپرنگر صاحب کے پاس ہے اس کے سو صفحے (کذا) ہیں اور ہر صفحہ میں پندرہ سطریں۔ یہ فاضل صاحب کمال اس تذکرہ کو لکھتا ہے کہ اس تذکرہ سے کچھ مصنف کی استعداد ذہنی نہیں معلوم ہوتی ہے بہت باتیں غلط لکھی ہیں اور بعض امور مکرر سہ کرر لکھ دیے ہیں۔ اس سے کوئی بری بات نہیں ہونے کی یہ خیال کر کے تمام یورپ میں اس کی کوئی نقل نہیں ہے یہ مشکل ہے۔ (کذا)

گلشن بے خار[۱] یہ تذکرہ ۱۸۳۴ء و ۱۲۵۰ میں چھپا ہے اگرچہ نسخہ اس کے مختلف ہیں لیکن مجھے بوٹر اس پرنسپل مدرسہ دہلی کی عنایت سے ایک قلمی نسخہ حاصل ہوا ہے۔ یہ تذکرہ فارسی زبان میں ہے اور جتنے تذکرے اس زبان کے ہیں ان میں سے بھی زیادہ مشہور و معروف ہے اور کوئی تذکرہ اس کے لگ کا نہیں، اس میں چھ سو شاعروں کے ترجمے مع ان کے اشعار کے لکھے ہوئے ہیں یہ تذکرہ اور تذکروں کی نسبت زیادہ صحیح و درست ہے اور تمام تذکرہ قاسم کا اس میں موجود ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف بروقت تصنیف کے اس تذکرہ کو بہت زیر نظر رکھتا تھا مصنف اس کتاب کے نواب مصطفےٰ بہادر متخلص بہ شیفتہ رئیس دہلی ہیں۔ نواب صاحب علم و فضل میں بدرجۂ کمال لئیق ہیں۔ اس کے (کذا) باپ کا نام نواب مرتضیٰ خاں بہادر ہے اور نسبت شاگردی کی مومن سے کہ دہلی کے شعرائے اکابرین میں سے ہیں، رکھتے ہیں اول حسرتی تخلص کرتے اب شیفتہ ہی تخلص ان کا بہت مشہور ہے، ان کے والد مرحوم کو بھی ریختہ گوئی میں کمال تھا تذکرہ میں اپنا ذکر بہت خاکساری و عجز کے ساتھ لکھا ہے اور اپنے تضیع اوقات کا بہت حسرت و افسوس ظاہر کیا ہے۔ بارہ ایک صفحوں میں اپنے ہی اشعار لکھے ہیں اور ان کا ایک اردو کا دیوان بھی ہے اور مولود مقدر؟

---

[۱] ۱۲۴۹ھ میں تالیف ہوا۔

کا انھوں نے ترجمہ بھی کیا ہے اور اب تک زندہ ہیں ایک زمانہ میں ان کے ہاں مجلس مشاعرہ گرم ہوتی تھی، اتفاق ایسا ہوا کہ ۱۸۴۷ء میں کسی طرف کو جانا ہوگیا اس سبب سے یہ مجلس موقوف ہوگئی، پنڈت دھرم نرائن اپنے اخبار قران السعدین میں اس مشاعرہ کی بہت تعریف کرتے تھے۔

گلشن بے خزاں (گلدستۂ بے خزاں) ۲۳ اس تذکرہ میں کچھ اور نہیں لکھا فقط حکیم قطب الدین باطن نے تذکرہ باقی الذکر کا ترجمہ کر دیا ہے باطن آگرہ میں پیدا ہوا تھا، اور اپنے آبائی پیشے طبابت کو حاصل کیا (۱۲۵۹ھ، ۱۸۴۳-۴۴ء) میں کہ اتنا زندگی نے اس کو جو بہادر بادشاہ کے اقربا و لواحقین قریب سرائے میں کہ دہلی سے پانچ میل کے فاصلے پر ہے سکونت رکھتے ہیں۔

گلدستۂ نازنینان (گلدستۂ نازنینان) کریم الدین کی تصنیف سے ہے وہ پہلے طالب العلم مدرسہ دہلی کا تھا اور اب آگرہ کے مدرسہ میں مدرس اردو کا ہے اس نے ایک اور کتاب جس کا ذکر میں کروں گا فیلن صاحب کے ساتھ شریک ہو کر تالیف کی ہے اس کتاب کے اشعار مشہور ورثہ ۱۲۶۱ھ (۱۸۴۵ء) میں یہ کتاب مطبع دہلی اس کے تین سو بیس صفحے ہیں اور ہر صفحے میں بیس سطریں اس میں دربار شاہی کے شاعروں کا حال بھی ہے ہیں لکھا ہے اور ایک رسالۂ عروض و قوافی میں اس نے ساتھ لگایا ہے اور پچاس شاعروں کے ترجمے مع ان کے اشعار (ریختہ) مرقوم کئے ہیں۔

انتخاب دواوین ۲۵ مولوی امام بخش صہبائی کی تصنیف سے ہے۔ مولوی صاحب دہلی کے مدرسے کے مدرس ہیں اور زبان فارسی میں کامل ہونے کے سبب بہت نامور اور جہاں میں مشہور ہیں اگرچہ انتخاب دواوین ہے یعنی شاعروں کے دیوان میں سے اشعار تیس نے انتخاب کر رکھے ہیں لیکن اس میں کچھ کچھ شاعروں کا بھی

---

* باطن حکیم قطب الدین خاں کا تخلص ہے نغمۂ عندلیب ان کا تاریخی نام ہے منشی نولکشور نے ۱۲۹۲ء میں چھاپ کے مشتہر کیا۔

حال ہے اس سبب سے اس پر تعریف تذکرہ کی صادق آتی ہے اس میں ولی،
درد، سودا و میر و جرأت و حسن و نصیر و ممنون و ناسخ و مول چند و ذوق و مومن
کے دواوین میں سے اشعار منتخب کرا کر لکھے ہیں اور ایک دیباچہ ابتدا میں ۲۳ صفحہ
کا اس کے اول لکھا ہے اور اس میں عروض و قوافی کا بیان ہے اور اس میں مثالیں
اچھی اچھی لکھی ہیں سنہ ۱۲۶۰ھ و ۱۸۴۲ء) میں منطبع ہوا تھا صفحہ اس کے دو سو ۲۲ بہتر
ہیں اور ہر صفحہ میں اس کے ۲۳ سطریں ہیں اور دہلی میں جو خلاصہ دواوین چھپا ہے وہ
بھی انتخاب دواوین ہے صہبائی کا سن قریب ساٹھ برس کے ہوگا ۳۱ [illegible]
انھوں نے بہت کم شعر لکھے ہیں اور اور کتابیں ان کی تصنیف سے ہیں [illegible]
کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے اور ایک رسالہ اردو زبان کی صرف و نحو میں مرتب
کیا ہے اور ایک رسالہ ترجمے میں بھی لکھا اور بہت کتابیں ان کی تصنیف سے ہیں
طبقات الشعراء سنہ ۱۸۴۸ء میں دہلی میں یہ کتاب منطبع ہوئی صفحے اس کے پانچ سو
چار ہیں اور اس کے اول صفحہ پر یہ لکھا ہے کہ تاریخ شعرائے اردو کی جو دو جلد میں فرانس
کی ہندوستانی علم ادب کی تاریخ سے ترجمہ کر کے فالن صاحب اور مولوی کریم الدین
نے تالیف کی حقیقت میں وہ میری تاریخ کی جلد اول کے تتبع سے لکھی گئی ہے لیکن
اس میں گھٹا بڑھا بہت دیا ہے اور اس کم و بیشی سے کتاب قابل دیکھنے کے ہوگئی
ہے اس میں بادشاہ زادوں کا حال جنھوں نے شاعری کو بہا دے اور دکھیل سمجھ لیا ہے
اور رات دن اسی میں مصروف رہتے ہیں اور مدرسہ دہلی کے متعلقین کا ذکر اور زیادہ لکھا
ہے مدرسہ کے فضلا کی لیاقت و محنت کا حال لکھنے سے اس میں بڑی رونق ہوگئی کریم الدین
نے جو جو کتابیں لکھی ہیں اس کی تفصیل طول طویل ہے بارہ ایک کتابیں جس میں ترجمے و
تصنیف و تالیف سب شامل ہیں اس کی تصنیف سے ہوں گی۔
زبان ہند کے تذکروں کا ذکر تمام کرنے کے لئے اور مجموعہ انتخابات و تذکرات کا ذکر کرتا
ہوں اس میں ایسے ایسے مضامین و انتخابات آتے ہیں کہ ہند کے مشاعرے کا ذکر اسی تذکرے کے لئے

مطالب دلچسپ حاصل ہوتے ہیں، اور کہیں ان کا پتہ نہیں لگتا۔ زمانے کی ترتیب سے جس طرح مجھے معلوم ہوئے ہیں لکھتا ہوں ۔

دو مجموعے ہیں۔ اور مصنف دونوں کے دو انگریز صاحب علم و فضل ہیں۔ اوّل مجموعہ میں کرنل بروٹن صاحب نے ہندوؤں کے اشعار کہ عوام الناس میں مروج ہیں منتخب کر کے لکھے ہیں اور اس سے متقدمین شعرا کے حال پر آگاہی ہوتی ہے اگرچہ مصنف اس بات کے درپے نہیں ہوا کہ اس سے خالی شعرائے متقدمین معلوم ہو۔

دوسرا مجموعہ ایک مشہور فاضل کامل نامی جرن سترکی اعانت و مدد سے لکھا گیا ہے۔ یہ شخص اور بہت اچھی اچھی کتابوں کا مصنف ہے جس کا میں بیان کرونگا اسی میں بے تال پچیسی کی کچھ کہانیاں اور بھگت مالا سے کچھ لے کر اور کبیر کے اشعار اور تلسی داس کی رامائن سے ایک کیفیت (کذا) اور ایک باب باغ و بہار کا اور گل بکاولی اور آرائش محفل سے کچھ کچھ چن کر اور بست اپدیش کا اردو ترجمہ اور کہانی سنگھاسن (کذا) جو جو ان نے لکھی ہے اور تین سو اڑتالیس چھوٹی چھوٹی غزلیں جن میں سے اکثر شعرا (کذا) عوام الناس کے بنائے ہوتے ہیں غرض ان سب کو یکجا کر کے لکھ دیا ہے ۔

گلدستۂ نشاط اس کتاب سے میں نے بہت کچھ التقاط کر کر اپنی تاریخ میں لکھا ہے [illegible] ۱۸۳۶ء ۲۷ میں طبع ہوئی (کذا) اور اسی سال میں کلکتہ کے اندر منطبع

---

[illegible] مولوی اشرف علی خلف مولوی نجف علی بدایونی . . . . . مولانا غلام رسول [illegible] کے شاگرد [illegible] کیا ہے جو عربی فارسی میں با استعداد تھے، مدت تک گورنمنٹ انگلشیہ کی ملازمت [illegible] کارگذاری سے معزز و مفتخر رہے آخر غدر ۱۸۵۷ء میں خان بہادر خاں باغی رئیس بریلی کی رفاقت [illegible] فرد ہونے [illegible] کے ۱۸۵۸ء میں بجرم بغاوت گولی کھا کر رحلت فرمائی صاحب دیوان عربی و فارسی [illegible] و دیگر تصنیف نظم و نثر گذرے ہیں طبیعت عالی پائی تھی اشعار عاشقانہ لکھتے تھے۔ (علوی)

خلاصۃ [illegible] سخن (گلستان سخن) [illegible] صاحب عالم مرزا قادر بخش کے نام سے مشہور ہے مگر حقیقت میں ان کے استاد مولوی امام بخش صہبائی جنت ماوائی کی تصنیف ہے اس کی عبارتیں اس بات کی شاہد ہیں اور [illegible] کے خاص خاص اشخاص کو یہ حال معلوم ہے ۔

ہوئی اس میں شعر کی فصاحت و بلاغت کا بیان بھی ہے ، اور فارسی شاعروں کے اشعار میں سے اچھے اچھے شعر مثالوں کے طور پر لکھے ہیں اور بہت شعر ہندوستانی زبان کے شعرا کے بھی لکھے ہیں۔ مصنف اس کا تحصیلدار ہے اور کلکتہ میں رہتا ہے۔

مجموعہ واسوخت[۲۸] - اس میں اکیس واسوخت شعرائے مختلف کے لکھے ہیں ایک چھوٹی جلد اس کی اڑسٹھ صفحوں کی جس کے حاشیہ و متن میں وہی واسوخت (کذا) لکھے ہوئے ہیں ۱۲۶۱ ہجری و ۱۸۴۹ء میں لکھنو میں مطبع ہوئی ہے۔

اب ان تذکروں کے بیان کے بعد جن کا علم مجھے خواہ اپنے مطالعہ سے یا رسالوں کی مدد سے حاصل ہوا تھا ان تذکروں کا بیان کرتا ہوں جن کا علم مجھے ان تذکروں کے دیکھنے سے یا کہیں اور سے حاصل ہوا۔

کوی پرکاش - ایک ہندی تذکرہ ہے۔ ورتا برتا اس میں عجیب و غریب کہانیاں ہیں وہلیا (ولہا) کی جو سرگروہ ہندؤں کی ایک قوم کا تھا اور اس کے اڑتالیس ابتدا کے شاگردوں کی لکھی ہوئی ہیں وہلیا (ولہا) اور اس کے شاگردوں نے بہت سے بھجن بنائے تھے۔

دلا رام کے اشعار بے شمار رام فرقے کے سنیاسی دل کا بیان بہت عظمت و کثرت سے کرتا ہے اور پھر اس نے ..... ہندوؤں اور مسلمانوں کا بھی ذکر کیا ہے۔

تذکرہ حسن[۲۹] (میر حسن خلف، حاشیہ نگار) میر غلام حسین ضاحک کی تصنیف سے ہے۔ سرور (خلیل، حاشیہ نگار) اور اور بھی اپنے تذکرہ میں اس کا بیان اس طرح کرتے ہیں کہ یہ تذکرہ ریختہ (گو) شاعروں کا بہت فصیح ہے۔ حسن شعرائے مشاہیر میں سے تھا مثنوی بے نظیر جو بدر منیر و سحر ہلال (سحر البیان) کے نام سے مشہور ہے۔ مصنف اس کے آپ ہی ہیں۔ گلزار ارم اس کی تصنیف سے ہے۔ اور صاحب دیوان بھی ہے دیوان کی لوگ بڑی قدر کرتے ہیں اگرچہ (اکثر) اس کے . . . . . . . . . . . . اشعار کے مضامین بلند و

۵۴۹

دل نشین ہوتے ہیں چنانچہ جس دعا کو میں نے اپنی تاریخ میں مع ترجمہ کے لکھا ہے اس کے کیسے مضامین و مطالب عالی ہیں لیکن وہ بعض وقت واہی تباہی بھی بکنے لگتا ہے اور منہ کو لگام نہیں دیتا ایسے خراب اشعار ہوتے ہیں کہ اس سے ممالک ـــ (کذا) کے لوگوں کے اخلاق خراب ہوتے ہیں۔

تذکرہ سودا[۲۲] ۔ سودا کی لیاقت اور یگانہ عصر ہونا ایک عالم میں مشہور ہے تاہم اس تذکرے کا بیان سعدی کے ترجمے میں لکھتا ہے لیکن وہ مجھے معلوم نہیں ہے۔

جواہر مضامین :۔ یہ کتاب (۱۱۹۳ھ ۱۲۰۴ھ ۱۷۷۹ء و ۱۷۸۵ء) میں ظاہر ہوئی اس میں ایک مشہور شاعر محتشم کی غزلیں منتخب کر کر لکھی ہوئی ہیں لیکن وہ تذکرہ ہے، چونکہ مصنف دیباچہ میں اردو شعرا کا حال لکھتا ہے اور جن لوگوں کے سبب سے اس فن نے ترقی پکڑی ہے ان کا ذکر کرتا ہے۔

گلدستہ حیدری ہے۔ حیدر بخش حیدری کی تالیف سے ہے ابتدائی سری ... یہ شخص پیدا ہوئے (ہوا) اور لوگوں نے اس کی تصنیفات سے فائدہ کثیر حاصل کیا ہے اور صاحب دیوان ہے (کذا) اور کچھ حکایات بھی لکھی ہیں۔

تذکرہ میر محمد علی[۳۱] (ترمذی۔ حاشیہ نگار) یہ شخص ہندوستانی زبان کا شاعر ہے) اور فردوسی کے شاہنامہ کا اختصار بھی اس نے کیا ہے۔

---

تذکرہ فائق[۲۹] قاضی نورالدین فائق نے شعرائے دکن کے حال میں جمع کیا ہے مخزن شعرا اس کا ... نام ہے یہ تذکرہ سرکاری کتب خانے واقع دہلی میں رکھا ہوا ہے اس میں ایک سو ... شاعروں کا ... بزبان فارسی لکھا گیا ہے اس پر میرے مہربان منشی درگا پرشاد (نے) خزینۃ العلوم فی متعلقات منظوم تذکرہ شعرائے دکن تیار کیا ہے۔

تذکرہ مبتلا[۲۹] مرزا کاظم بیگ متخلص بہ مبتلا متوطن مشہد مدرس مولا لکھنو فارسی شعر بھی کہتا تھا صاحب دیوان تذکرہ ہے طبقات الشعرا ۲۴۹ صفحہ میں اس کا مذکور ہے۔

سراپا سخن[۳۰] سید محسن علی محوی (کذا) کی تصنیف ہے

دیوان الفصاحت ... مولوی محمد ... خان ولد غلام قادر خان شاہجہانپوری اس میں تین مقالے ہیں عربی فارسی ہندی جن میں نظم و نثر ہر ایک شاعر کی تصنیفات سے دکھائی گئی ہے۔

مقالات الشعراء صفحہ ۲۹۳۔ حاشیہ نگار، گلزار ابراہیم میں اس کا ذکر ہے اور مجھے کچھ معلوم نہیں
تذکرہ اختر لکھنوی۔ ⊕ ایک تذکرہ بہت بڑا ہے اور پانچ ہزار اردو اور فارسی
شعرا کا حال اس میں مندرج ہے اور کچھ زیادہ اس کے باب میں مجھے معلوم نہیں۔
آزردہ کا مختصر تذکرہ شعرائے اردو کا۔ آزردہ تخلص مولوی مفتی صدر الدین خاں
کا ہے وہ اردو شعر بھی کہتے تھے اور بعض اوقات عربی شعر بھی فرماتے ہیں۔ شیفتہ
اس تذکرہ کا مذکور سودا کے ترجمہ میں کرتا ہے ڈاکٹر اسپرنگر صاحب جو آزردہ کے ساتھ کمال
رابطہ و اتحاد رکھتے تھے کہتے ہیں کہ میں نے اس کتاب کا ذکر کبھی نہیں سنا۔ آزردہ کا
سن ساٹھ ستر برس کا ہوگا اور وہ مفتی بھی ہیں اور مولوی بھی، اور خطاب خان کا بھی
ان کو حاصل ہے۔
تذکرہ عاشق[۲۳] نواب مہدی علی (حسان۔ حاشیہ نگار) کی تصنیف سے
ہے اس شخص کے اردو اشعار سے بہت کم لوگ فائدہ مند ہوتے ہیں۔ تین دیوان
اس کی تصنیف سے ہیں۔ اور خاور شاہ کا قصہ نظم میں لکھا ہے اور بہت کچھ اس نے
تصنیف کیا ہے، اس کے یہاں دہلی میں مشاعرہ ہوتا تھا جو مشاعرہ [شعرا] ہوتے
تھے انھیں کا تذکرہ اس نے لکھا ہے۔
تذکرہ آزاد[۲۴]۔ اس تذکرہ کا بیان ابوالحسن نے مسرت افزا میں کیا ہے اس سے معلوم ہوتا
ہے کہ وہ شعرائے اردو کا تذکرہ ہوگا اور مسٹر بلینڈ صاحب اسے فارسی کا تذکرہ بتلاتے
ہیں دونوں باتیں سچی ہو سکتی ہیں۔ کیونکہ بہت ایسے ہیں کہ انھوں نے ایک کتاب فارسی
میں بھی لکھی ہو اور اردو میں بھی۔ آزاد ایک اردو کا بڑا شاعر ہوا ہے۔ ⁘

---

⊕۔ (لکیر کھینچ کر سامنے حاشیہ پر لکھا ہے) مسمی آفتاب عالم تاب قاضی محمد اختر خان صادق اختر کی تالیف ہے۔
⁘ حسان الہند لقب، اور میر غلام علی بلگرامی کا تخلص آزاد ہے وہ بڑے زبردست شاعر تھے ہمیشہ فارسی
و عربی میں کہتے تھے گاہ بگاہ ریختہ کہنے کا بھی اتفاق ہوتا تھا ان کی تصانیف بہت مشہور ہیں (کذا)
صاحب تذکرہ شمع انجمن نے ان کے حالات اور تذکرہ لکھے ہیں۔ آزاد ۱۱۱۶ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۰۰ھ
میں فوت کی۔ ساری عمر تصنیف و تالیف کے مشغلہ میں بسر ہوئی بہت کچھ یادگار چھوڑی۔

اس سے یہ گمان کرتا ہوں کہ اس نے ایک تذکرہ فارسی شعرا کا بھی لکھا ہے اور اس کا نام خزانۂ عامرہ ہے اور لوگ اس کی بڑی قدر کرتے ہیں اور تذکرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت کچھ لکھا ہوا ہے کیونکہ دیباچہ میں لکھا ہے کہ میں نے بیس تذکرے سامنے رکھ کر اپنا تذکرہ مرتب کیا ہے اور ایک اور دلیل دونوں باتوں کے سچے ہونے کی یہ ہے کہ مصنف نے ایک رسالہ لکھا ہے اور اس میں ہندوستانی شعرا کی غزلیں جمع کیں اب دو باتیں ہیں یا تو یہ کہ فقط اشعار منتخب کر کر ہندوستانیوں کے اس کتاب میں اس نے لکھ دیے ہوں یا تذکرہ ہو اور سرو آزاد اسی کا نام ہو۔ سرو آزاد کا فارسی سے اردو میں موتی لال نے ۱۸۴۷ء میں ترجمہ کیا صاحب موصوف ہاپوڑ (میرٹھ) کے ہیں ان کی انیس بیس برس کی عمر ہوگی اور گلستاں کا بھی اردو میں ترجمہ کیا اور دہلی کے مدرسہ کے بہت اچھے اور عمدہ طالب علم تھے اور ترجمہ قرآن الحمید کا انتظام بھی ان کے ذمے تھا۔ افسوس آرائش محفل میں آزاد کا بیان اس طرح مرقوم کرتا ہے کہ میر غلام علی آزاد اپنے زمانہ میں شاعری کے اندر جواب نہ رکھتے تھے اور خوش اطوار اور نیک کردار بھی بڑے درجے کے تھے ⑯ معاصرین میں کوئی اس کی برابری نہیں کر سکتا عربی شعر میں کبھی ایسا ملکہ ان کو ہے ایسا کسی ہندوستانی کو کم ہوتا ہے باوجود فصیح و بلیغ ہونے کے مرگو بہت تھے۔ اہل عرب ان کے شعر سن کر عالم سکوت میں گئے اور ان کی زبان نہ تھی کہ تعریف کر سکتے۔ (۱۱۱۶ھ ۱۷۰۴ء) میں پیدا ہوئے اور ۱۲۰۰ھ و ۱۷۸۶ء) میں اجل نے آگھیرا۔

تذکرۃ الکاملین[۳۳]۔ جو لوگ صاحب کمال گذرے ہیں ان کا تذکرہ ہے ماسٹر رام چندر صاحب کی تصنیف سے ہے اور اس کے علاوہ اور بہت کتابیں ان کی تصنیف سے اردو زبان میں ہیں، دلی میں ۱۸۴۹ء میں یہ تذکرہ منطبع ہوا اگرچہ یہ تذکرہ بالکل تذکرۃ الشعرا نہیں ہے لیکن اس میں شاعروں کا بھی ذکر آگیا ہے اس لئے اس کا ذکر یہاں ہوا۔

تذکرۂ ہند[۳۴] ⑮ ۔ یہ تذکرہ شعرائے اردو کا شوق نے لکھا ہے اور شوق تخلص مولوی

---

نوٹ: موتی لال ہمارے مدرسے کے طالب علم کشمیری ہیں، اور دہلی کے رہنے والے اور (گمان) غالب ہے کہ انھوں نے سرو آزاد کا اور گلستاں کا ترجمہ اردو میں کیا اور بعض کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی ہیں۔

⑮ مولوی امیر احمد اس تذکرہ کا نام طبقات الشعرا لکھتے ہیں۔

رت اللہ رامپوری کا ہے، مصحفی، سرور، کریم سب اس کا حال بیان کرتے ہیں لیکن میری نظر سے نہیں گزرا اس شخص کی تصنیف سے لاکھ شعر ہیں اور تلامذہ اس کو تلامذہ چاندپوری سے اس کے یہاں مشاعرہ ہوتا تھا اور ۱۲۰۰ھ تک کہ حکیم قاسم نے تذکرہ لکھا ہے۔

تذکرہ خاکسار، محمد یار کی تصنیف سے ہے اور اس کا عرف کالا یا کالا ہے یہ بادشاہ زادہ (کذا) ۱۲۰۵ھ میں عالم باقی کو روانہ ہوا۔ شورش (اور مولوی قدرت اللہ شوق۔ حاشیہ نگار) اس تذکرہ کچھ بیان نہیں کرتا۔ شاید اس کا یہ سبب یہ ہو کہ یہ تذکرہ شعرائے فارسی کا ہو لیکن اس قیاس کے لئے کوئی دلیل نہیں۔

تذکرہ محمدی[۳۷] مصنف اس کا سید محمد خاں ہے اس میں شعرائے فارسی و اردو دونوں کا ذکر ہے، مصنف اسی زمانہ کا معلوم ہوتا ہے وہ ذات کا پٹھان اور قرآن کا حافظ اور زبان اردو کا شاعر تھا اپنے شعر بھی تذکرے میں لکھے ہیں۔

تذکرہ مضمون۔ امام الدین خاں کی تصنیف سے ہے عشقی اس کا تخلص ظاہر بتلاتا ہے اور محمد شاہ کے نام سے یہ شخص لوگوں (میں) مشہور ہے عشقی کے قول کے مطابق وہ تذکرۂ شعرائے ریختہ کا مصنف ہے[۳۸]

تذکرہ شیخ محمد ابراھیم ذوق[۳۹] استاد شاہ دہلی کی تصنیف سے ہے خطاب بادشاہی ان کا عمدۃ الاساتذہ و ملک الشعراء ہے اس تذکرہ کی نقل ہوتا اس صاحب کے پاس دہلی میں ایک تھی یہ تذکرہ بہت خوب ہوگا چونکہ مصنف اس کا صاحب کمال ہے جس کو سب مانتے ہیں اور اس کی استادی کے سب قائل ہیں اور ریختہ گوئی میں کسی کو اس کا ہم سر نہیں جانتے اور طوطی شکرستان سخن سمجھتے ہیں اس کے مضامین کی گرمی خاکستر کو بھی گرم کر دیتی ہے اور اس کے خیالات کی رنگینی گل تر کو شرمندہ۔

تذکرہ جہاں دار[۴۰] مرزا جواں بخت جہاں دار شاہ فرزند شاہ عالم ثانی کی تصنیف سے ہے یہ شہزادہ حتی الوسع اردو شاعری کی ترویج کے درپے تھا خود بھی اس نے بہت اچھے شعر موافق محاورہ کے کہے ہیں مصحفی کے کلام سے معلوم ہوتا ہے (کہ)

حقیقت کی معرفت علم ہوا کہ جرأت نے امام بخش کشمیری کے کہنے سے تذکرہ اس کا حقیقت کو نقل کرنے کے لئے دیا سو حقیقت نے اس میں دیکھا کہ مصحفی کی تصنیفات سے اپنے تذکرہ میں بہت کچھ سرقہ کرکے لکھا ہے اس مضمون کا مصحفی نے ایک قطعہ لکھا ہے جس کا میں نے ترجمہ بھی کیا ہے اور جرأت نے اپنی تصنیفات میں امام بخش سے بہت مدد لی ہے۔

تذکرۃ النساء[42] افریقہ اور ایشیا کی عورتوں کا تذکرہ کئی برس ہوئے کہ یہ کتاب کریم الدین مصنف طبقات نے مرتب کی تھی معلوم نہیں کہ ختم ہوئی یا نہیں۔

تذکرۃ الحکماء اور تذکرۃ المفسرین۔ فقط اپنی یاد سے کہتا ہوں کہ یہ دو تذکرے ہیں اور تذکرۃ المفسرین کے مؤلف ہیں سبحان بخش کہ فضلائے کیرانہ میں سے ہیں اور کتب اردو ان کی تصنیفات ہیں۔

---

(گذشتہ سے پیوستہ)

بہارستان سخن[45] محیط کی تالیف ہے۔

شمیم سخن[46] مولوی عبدالحی بدایونی۔

بہارستان اشعار۔

فیضان تعبیر۔ ۱۲۹۱

سیر ستان بشیر۔ ۱۲۹۳ھ

نگارستان بشیر[47]۔ ۱۲۹۴ھ

تذکرۂ فرخ بخش[48] یار محمد خاں بھوپالی کی تالیف ہے۔

بہارستان ناز[49] حکیم فصیح الدین رنج ساکن میرٹھ نے مرتب کیا ہے (۳۲ صفحہ) عورات شاعرہ کے بیان میں۔ دوبارہ ترمیم کی (۷۲ صفحہ) تیسری دفعہ ۱۱۴ صفحہ۔

گلشن ناز۔ ۳۲ صفحہ۔ چمن ناز[50] ۹۶ صفحہ۔ شاعرہ عورتوں کے حال میں تذکرہ مذکور منشی درگا پرشاد نادر نے لکھے ہیں۔ دونوں ایک جلد میں ترمیم کئے گئے۔ ۱۹۲ صفحے ہوئے۔



شاہد

تذکرۃ المشاهیر[47] ایک تذکرہ ہے۔

ان تذکروں کے بعد اور ان انتخابوں کا جو نظم کے ہیں، بیان کرتا ہوں اور جنکا حال تذکروں کے دیکھنے سے معلوم ہوا اور ان کو اسی ترتیب سے جو میں نے تذکروں میں ملحوظ رکھی بیان کرتا ہوں۔

سبھا ولاس۔ ایک انتخاب ہندی زبان کی کتابوں میں سے منتخب کر کر ایک خوش اسلوب پنڈت دھرم نرائن نے جن کا تخلص نیّر ہے بنایا ہے ان کی عمر بیس بائیس برس کی ہوگی اور اب مہتمم مالوہ اخبار کے ہیں اور بہت کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی ہیں۔

نورتن[48] یہ نام اس مناسبت سے ہے کہ زمین کے نو کھنڈ ہیں یا ہندی شعر کے نو ا... ہیں عشق نے اس کتاب کو تصنیف کیا ہے ایک دفعہ ۱۸۴۵ء اور دوسری دفعہ[49] میں بمبئی میں منطبع ہوئی۔

انتخاب مشتاق۔ حافظ سراج الدین مشتاق کی تالیف ہے۔ (۱۲۲۲ھ و ۱۸۰۷ء) میں لکھی گئی ہے میں نے یہ کتاب نہیں دیکھی۔ سرور و شیفتہ و عشق و کریم کے لکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مشتاق میرٹھ کا رہنے والا تھا اور دکن کے شعرائے دربار میں سے اصل میں ہوا تھا اور مشق سخن اردو زبان میں عشق سے حاصل کی تھی۔

تذکرہ لکھنے والے ایک اور تذکرہ مشتاق کا ذکر کرتے ہیں اور اس مشتاق کا نام محمد قلی ہے۔[*] (۱۲۱۶ھ و ۱۸۰۱ء و ۲۲ء) میں اسی دارِ فانی سے رحلت فرما ہوا۔ ڈاکٹر اسپرنگر صاحب

---

[*] محمد قلی قطب شاہ بادشاہ گولکنڈہ ان کا تخلص کسی نے قلی کسی نے قطب بعض نے ظل اللہ اور بعض نے مشتاق لکھا ہے۔ ر ا ۵

تذکرہ ارمان[50] راجہ جنم جی مترجیرہ راجہ ملیمبر جی متر بنگالی شاگرد حافظ اکرام احمد ضیغم جو الی شہر کے سوندی کاکڈا میں رہتے ہیں شعر اچھا کہتے ہیں تذکرہ خوب لکھا ہے ۱۲۷۶ میں جو چھپ گیا ہے۔

گلستان سخن۔ مرزا صاحب کے نام سے مشہور ہے مگر درحقیقت مولوی صہبائی کی تصنیف ہے ۱۲۷۱ اس میں فارسی و اردو دونوں زبانوں کے شاعروں کا حال و مقال مندرج ہے۔

گلدستہ حفیظ اللہ خاں[53] (۳۸) قصائے چمنستان۔ مجمع الاشعار . . . . شعرائے ریختہ گو کا کلام ۱۸۹۶ د (برصفحہ ۲۲)

حقیقۃ لہ اس نے سب دیوان، ہندوستان وبنگالہ کے جمع کئے تھے (۵) ان سب کا
حقیقۃ ۔۔۔ تا تھا جس زمانہ میں شورش اپنا تذکرہ لکھتا تھا ان دونوں مشتاقوں کا حال
۔ ط ہے، کچھ اچھی طرح سے مفصل جدا جدا انہیں معلوم ہوتا ۔
۔ بے نظیر یا مجمع الشعرا۔ یہ دونوں نام ایک ہی کتاب کے ہیں اوّل دفعہ
۔ ہجری۔ ۱۸۴۹ء میں محمد حسین نے اور دوبارہ (۱۲۶۶ھ و ۱۸۵۰ء) محمد ابراہیم
پھیوانی مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی شخص ہے جس نے دکھنی زبان میں ترجمہ
ملی کا کیا اور منارراس میں ۱۸۴۲ء میں منطبع ہوا اس کتاب کے دو حصے ہیں اول
نہ ۔ حصے کا اس میں فارسی اشعار ہیں اور دوسرے حصے کے دو سو انچاس (۲۴۹) صفحے
۔ ور ایک سو مقامی شاعروں کے شعر اس میں منتخب کرکر لکھے ہیں۔
۔ موعہ دواوین ۔ اس کا ایک نسخہ نظام کے کتب خانے میں بھی ہے اور اس کو

---

زشتہ سے پیوستہ)

فنہ سے ی تک ردیف وار جمع کیا ہے جو ۱۸۹۵ء میں چھپ گیا ہے) صفحہ ۸۰ ۔

ہر راگ ۔ اس میں بھی مشہور مشہور غزلیں جو رنڈیاں گاتی ہیں جمع ہیں ۱۸۵۳ء صفحہ ۸۰ ۔

رستان ۸۴ صفحہ ۔ دیوان چشمۂ فیض۔ گل دستہ سخن۔ یہ رسالہ انجمن مشاعرہ بیت العلوم پنجاب

بابتہ ماہ مئی ۱۸۸۱ء (ہے)

ستان اشعار ۔ سید محمد مہدی علیخاں بحیثیت تخلص خلف نواب سید محمد علی خاں بہادر مطبع دلکشا

ٹو میں چھپ کر شائع ہوا صفحہ ۱۰۰

بوستان شعرا ۱۲۰ (بارہ کے بعد کاغذ کٹ گیا ہے)

محمد فضل اکرم ابن مولوی عین الدین بدایونی اس تذکرہ میں صرف انھیں لوگوں کا حال و مقال

نوں نے مولوی مذاق سے نسبت تلمذ بہم پہنچائی ہے ۹۶ صفحہ پر چھپ کر شائع ہوا۔

انجمن ۔ ۴۲ صفحہ پر مطبع صبح (دل کشا) بدایوں چھپوا کر صفا بدایونی نے مشتہر کیا۔

شوکت نادرہ ۔ تذکرہ سعادت خاں ناصر تذکرہ ماہ درخشاں ۱۰۶ صفحہ ۔

انتخاب دواوین سے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے نہیں ملانا چاہیئے ۔

مجلسِ رنگین[۵۲] (مجالس رنگین) مصنف نے تمام اپنے معاصرین کے اشعار او ان کا احوال نکتہ چینی کے ساتھ لکھا ہے. رنگین سعادت یار خاں کا تخلص ہے جن نظم کی کتابیں آگرہ اور لکھنو میں منطبع ہوئی ہیں ۔ اس میں اساتذہ کے اشعار منتخب کر لکھے ہیں. مصطفےٰ خاں دہلوی نے مطبع مصطفائی میں اسے چھاپا ہے ۔ اس مطبع میں اکثر ایسی کتابیں منطبع ہوئی ہیں ۔

گلدستۂ ہند[۵۳] اس میں قصے کہانیاں جمع کردیے ہیں اس کے آٹھ باب ہیں اور ہر باب کا نام کتاب کی رعایت سے گلشن رکھا ہے اکثر شعر اس کے قابل دیکھنے کے ہیں

معیار الشعرا[۵۴] اس میں متقدمین و معاصرین کی تصنیفات سے منتخب کر کر کچھ کچھ لکھا ہے جسے قمر الدین خاں نے جن کا تخلص قمر ہے، (اسے) آگرہ میں چھپوایا ۔

یادداشت کے لیے میں ایک اور مجموعہ کا ذکر کرتا ہوں، اس میں تین سو اردو کے شاعروں کے شعر میاں مقبول یعنی مقبول دہلوی نے جمع کئے تھے لیکن افسوس کہ وہ جل کر خاکستر ہوگئے ۔

## تمام شد

(مطبع منظر عجائب میں بہ اہتمام بندہ سرفراز حسین منطبع ہوئی)

...لکھنو آئے تو ایک ٹوٹی پھوٹی عمارت میں جو خالی پڑی رہتی تھی اترتے تھے۔ ایک دفعہ
...آٹا گوندھ رہے تھے کہ.. بانی مجلس وارد ہوئے۔ خلیق ہاتھ دھو کر ساتھ ہو لئے۔
دیکھا کہ میر ضمیر.. مصروف مرثیہ خوانی ہیں.. اسی دن سے خلیق کی مرثیہ خوانی کی دھوم
مچی صنہ۔

مقالے میں اس روایت کی صحت اس بنا پر مشتبہ قرار دی گئی ہے کہ راوی اشک۔ دلگیر حریف ضمیر کے شاگرد تھے، لیکن خود اس مقالے میں اس روایت کی صحت اس بنا پر مشتبہ قرار دی گئی ہے کہ راوی اشک دلگیر حریف ضمیر کے شاگرد تھے۔ لیکن خود اس مقالے میں انھیں تلمیذ ناسخ اور ان کے والد کو شاگرد دلگیر کہا گیا ہے ۲۴۔ باپ بیٹے کا تلمذ ایک بات نہیں۔ اس سے قطع نظر، روایت جس طرح بیان ہوئی ہے، ہرگز قابل قبول نہیں۔ میر حسن کی انتقال کے کچھ بعد سے قریبی زمانہ مراد ہونی چاہیے، میر حسن کی وفات ۱۲۰۱ھ میں ہوئی، اس کی برسوں بعد تک ضمیر کی مرثیہ گوئی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ میر حسن کا تعلق سالار جنگیوں سے تھا۔ اور امامیہ مذہب کے لوگ مرثیہ گویوں کی جو قدر کرتے ہیں ظاہر ہے۔ خلیق کا لکھنو آکر اس کس مپرسی کی حالت میں رہنا جنا بر تذکرہ شعر ہی، دور از قیاس ہے۔

۱۵۔ نجات حسین خاں کے سفرنامہ کے بعض اجزا معاصر پٹنہ میں شائع ہو چکے ہیں ۲۸۔ سفرنامہ نہیں، اس کے ملخص مطالب پروفیسر سید حسن ذ اردو میں منتقل کرکے معاصر میں چھپوائے ہیں۔ تقریباً کل مطالب آگئے ہیں، بعض اجزا اسی نسخے ہی پہ ایک ہی ہو

۱۶۔ ص ۷۳ میں بروایت نجات حسین خاں ضمیر کو مرثیہ سنانے کا ذکر کیا ہے، اور لکھا ہے کہ مرثیہ گو بعض اوقات متبذل گوئی تک سے گریز نہیں کرتے۔ نجات حسین خاں نے ضمیر کا مرثیہ درج کتاب نہیں کیا؛ اس کے مطالب قلمبند کئے ہیں جنھیں پروفیسر سید حسن نے نظر انداز کیا۔ میں نے اصل سفرنامے میں یہ مطالب دیکھے ہیں، خلیفہ ثانی اور ان کی والدہ پر کرم فرمائی ہوئی، دیر تک حیرت رہی کہ ایک مدعی سیادت ایسی بیہودہ
تیں کہہ سکتا ہے مرثیوں میں گالی گلوچ کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔